—— : یادِ ہمایوں : ——

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

میرزا ادیب

سالگرہ نمبر ۱۹۴۲ء

بیادگار علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

ہمایوں

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی۔ اے (آکسن)

بیرسٹرایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر حامد علی خاں
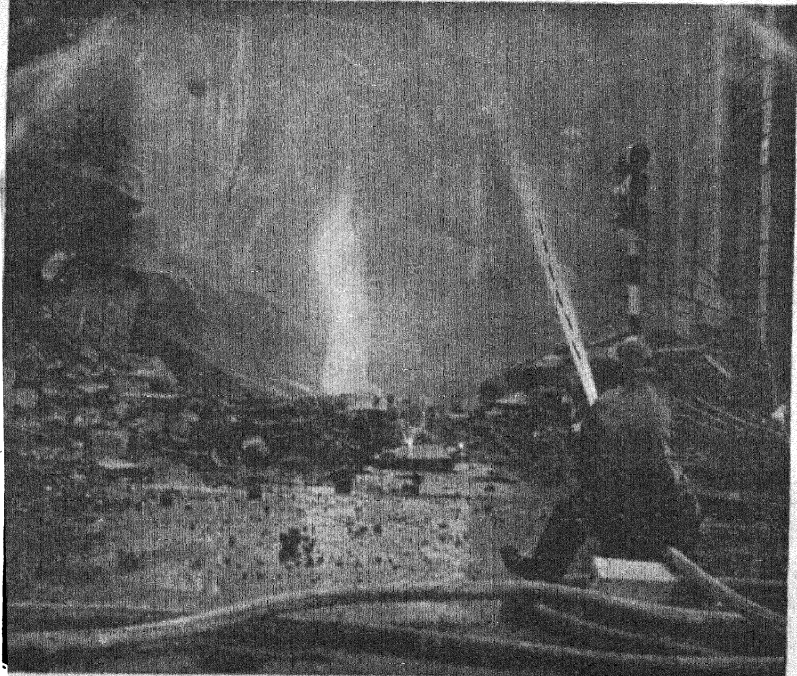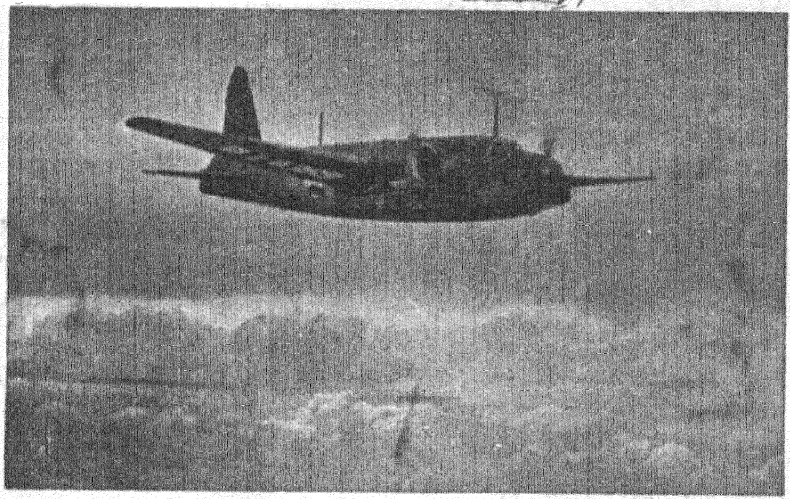
مہذب جنگ کی تباہ کاریاں

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

جلد نمبر ۲۱
نمبر ۱

سالگرہ نمبر سنہ ۱۹۴۲ء

تصاویر: (۱) مہذب جنگ کی تباہ کاریاں (سرورق) (۲) حضرتِ ہمایوں مرحوم (۳) عکسِ تحریرِ علامہ اقبال رح (۴) کراچی میں سمندر کا نظارہ (۵) کلفٹن کے مندر کا کبوتر خانہ

چندہ سالانہ صہ - ششماہی سے (مع محصول)   قیمت سالگرہ نمبر ۱۲ر

کلامِ ہمایوں

ظالم ہے سنگدل ہے یہ تہذیب جس کو آج
تم سمجھے خاص رحمتِ پروردگار ہو

چاندی کا اس کا جسم ہے سونے کا اس کا دل
اس تاک میں نگہ کہ گھر کا شکار ہو

کانوں پہ اس کی آنکھ فلزّات پر نظر
دُھن ہے یہی کہ بھاپ ہو بجلی ہو تار ہو

تہذیب اور زمانے کی ہو جب کہ یہ روش
چشمِ کرم کا کیا کوئی امیدوار ہو

جون ۱۹۰۳ء — حضرتِ ہمایوں مرحوم

قولِ اصغر

کسی سے پوچھ دیکھو کہ زندگی میں تمہارا مقصد کیا ہے؟ تم یہ معلوم کرکے حیران ہو گی کہ کتنے ہی ہیں جن کا کوئی مقصد نہیں اور پھر دوسرے ہیں جو صرف آرام چاہتے ہیں۔ اور جب ان کو بتایا جائے کہ تمہارا آرام ایک ایسی سوسائٹی میں جس کی بنیاد جبری عدمِ مساوات پر ہے ہمیشہ معصوم غریبوں کو تکلیف دے کر حاصل کیا جاتا ہے تو اُن کی آنکھیں حیرت سے کھُلی کی کھُلی رہ جاتی ہیں یا تو ایک اور تمدّن تعمیر کرو یا ایسے تمدّن میں رہو جہاں زندگی کے کوئی معنی ہیں نہ مقصد اور اگر کوئی مقصد ہے تو صرف اتنا کہ اُن لوگوں پر مسلسل ظلم ڈھائے جائیں جو بدقسمتی سے سوسائٹی کے نچلے طبقوں میں پیدا ہوئے۔ یہ ہے زندگی۔ یا اسے بدلو اور یا پھر اپنی پیدائش کے دن سے لے کر برابر جھوٹ میں پھولو پھلو۔ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ اپنی زندگیوں میں ہمیں ایک نئے دور کی اوّلیں کرنوں کی جھلک بھی نظر نہ آئے گی تو میں یہی محسوس کروں کہ میں فقط بادل کا ایک ننھا سا ٹکڑا ہوں جو ہوا میں معلّق ہے اور جسے صرف یہ انتظار ہے کہ اس طرح گمنامی کی گہرائیوں میں گر کر ناپید ہو جائے جیسے کوئی ایک قطرہ دوسرے بے حد و شمار قطروں کے ہجوم میں ممکن ہے یہ سب کچھ تخیّل کی آوارگی معلوم ہو لیکن کس قدر ناقابلِ برداشت ہے یہ بات کہ انسان زندگی کی دشوار گزار گھاٹی کو طے کر چکے اور پھر دیکھے کہ وہ کہیں بھی نہیں پہنچی!

انگلستان - ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۹ء بہن کی طرف خط

(ترجمہ از ب)

اصغر بشیر

یادِ ہمایوں

از جناب شیخ سر عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا

رسالہ "ہمایوں" آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب مرحوم متخلّص بہ ہمایوں کی ادبی خدمات کی موزوں یادگار ہے۔ میاں صاحب موصوف بہت سی صفات کے جامع تھے۔ پنجاب کی چیف کورٹ کے سب سے پہلے مسلمان جج اور کچھ عرصہ کے لئے چیف جج کی حیثیت سے عدالت اور قانون کے میدان میں انہوں نے بہترین شہرت حاصل کی۔ اور شاندار روایات ودیعت کی ہیں۔ مگر اُن کے جس کام نے ملک و قوم کے دلوں پر گہرا نقش چھوڑا ہے وہ اُن کی ادبی خدمات ہیں۔ تحریر و تقریر میں وُہ نہ صرف خود بہت ممتاز تھے۔ بلکہ بہت اور لوگوں کے ادبی شوق کو ترقی دینے میں اُن کا معتد بہ حصہ تھا۔

میاں صاحب پہلے اپنی عمدہ انگریزی دانی اور انگریزی زبان میں خوبیٔ تقریر کی وجہ سے مشہور ہوئے اور پھر اُردو تقریروں میں اُنہوں نے نام پیدا کیا۔ وہ فصیح تھے مگر جوشیلی تقریر نہیں کرتے تھے۔ اُن کی تقریر کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے آبِ رواں چل رہا ہے۔ مگر اُس پانی کی رفتار میں شور و غل نہ تھا۔ جب وہ انگلستان سے واپس آئے تو میں ابھی ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ یہ سُن کر کہ وہ اسلام پر انگریزی میں لیکچر دیں گے۔ میں اُن کا لیکچر سننے گیا۔ اُس پہلی تقریر کی لذّت میرے کان اب تک نہیں بھولے۔ لب و لہجہ دلکش۔ الفاظ دلنشیں۔ اور مطالب پُر مغز۔ سامعین گرویدہ ہو گئے۔

لاہور میں قیام کے کچھ عرصہ بعد میاں صاحب نے کالجوں کے نوجوان طلبہ کو ایک دن اپنے ہاں جمع کیا اور ایک مجلس[1] قائم کی۔ جس کے جلسے کئی سال تک ان کے بنگلے میں ہوتے رہے اور وُہ فرائضِ صدارت انجام دیتے رہے اس سوسائٹی کا مقصد تھا کہ مسلمان طلبہ کو انگریزی میں اچھی تقریریں کرنے کی مہارت ہو جائے اور وہ مفید علمی اور اصلاحی مضامین پر طبع آزمائی کریں۔ اس مقصد کے حصول میں میاں صاحب کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور انہوں نے بہت سے نوجوانوں میں خدمتِ قوم کا شوق پیدا کر دیا۔ جب کوئی مضمون اس مجلس میں پڑھا جاتا تھا تو اس کے بعد حاضرین میں سے جو چاہے اس پر رائے زنی اور بحث کرتا تھا۔ اور اخیر میں صدرِ جلسہ اپنے خیالات کا اظہار کر کے شرکاءِ جلسہ کی رہنمائی کرتے تھے۔ میں بھی اتنے میں کالج میں داخل ہو گیا تھا اور ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔ مگر چونکہ بہت سے مقرر مجھ سے اوپر کی جماعتوں کے طالبِ علم تھے۔ میں مباحثہ میں شریک ہونے سے جھجکتا تھا۔ چند دوستوں کے اصرار سے ایک دن میں نے بحث میں حصہ لیا۔ اُس دن میاں صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ جلسہ ختم ہوتے ہی میاں صاحب اُس طرف آئے جہاں میں تقریر کے بعد جا کر بیٹھا تھا۔ اور اُنہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا "آپ نے یہ ظلم کیا کہ اس سے پہلے تقریروں میں شریک نہیں ہوئے۔ اب چاہیئے کہ ہر جلسے میں تقریر کریں اور اس مجلس کے لئے وقتاً فوقتاً مضامین لکھیں۔ چنانچہ جو سلسلۂ مضامین میں نے انگریزی میں اُس وقت کے زندہ مصنّفینِ اُردو کے متعلق لکھا تھا اُن میں سے بیشتر اسی مجلس میں پڑھے گئے تھے اسی طرح میرے معاصرین میں بہت سے اور دوستوں کی مشقِ تحریر و تقریر اُس دبستان میں ہوئی جس کے اعزازی صدر میاں محمد شاہ دین تھے۔

میاں صاحب کی انگریزی تحریر بہت پُر زور تھی۔ کشمیر کی سیر کے بعد انہوں نے لاہور کے انگریزی اخبار "سول ملٹری گزٹ" میں چند مضامین لکھے تھے۔ جن میں یہ لکھا تھا کہ جہاں قدرت نے خطۂ کشمیر کو خوب سے خوب تر مناظرِ فطرت سے آراستہ کرنے میں فیاضی سے کام لیا ہے۔ وہیں انسان نے افسرانِ حکومت کی بے پروائی کے سبب وہاں کے باشندوں کو آرام اور خوشحالی سے محروم رکھا ہے۔ یہ مضامین ایسے دلچسپ تھے کہ اگر انہیں ڈھونڈ کر کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو بہت مفید اور دلچسپ ہوں۔ انگریزی تقریروں کے بعد میاں صاحب کی اُردو تقریروں کا شہرہ ہوا۔ مجھے پہلے معلوم نہ تھا کہ اُردو کتابوں کا مطالعہ میاں صاحب نے بہت کیا ہے۔ کیونکہ اُن دنوں انگریزی خواں طبقہ کی توجہ اُردو کی طرف کم تھی۔ میاں صاحب سے جب ذرا اچھی واقفیت

---

[1] اس مجلس کا نام محمڈن ینگ منز ایسوسی ایشن تھا۔

ہوئی تو پتہ چلا کہ اُردو نظم و نثر دونوں خوب لکھتے ہیں۔ میں خود بھی اُردو کا دلدادہ تھا۔ اس لئے ہمارا یہ شوقِ مشترک مزید ربطِ باہمی کا ذریعہ بنا۔ اور مجھے اُن سے اردو کی ترقی کی کوششوں میں بہت مفید مشورے ملے۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ انگریزی داں اصحاب سے اُردو میں تقریریں کرائی جائیں جن میں زبان کی سادگی اور صفائی کے ساتھ خیالات کی بلندی اور پختگی ہو۔ اور ان میں وُہ نئی معلومات جو مغربی کتابوں سے جمع کی گئی ہوں درج کی جائیں۔ کئی سال متواتر ایسے لکچروں کا انتظام ہم کرتے رہے۔ میاں صاحب نے خود بھی اس سلسلے میں تقریریں کیں۔ اور دوسروں کو بھی اُدھر راغب کیا۔ ایک سال جب وہ مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے تو اُن کا اُردو خطبۂ صدارت بہت کامیاب رہا۔ اور صوبجاتِ متحدہ کے بہت سے قابل حضرات نے اس کی تعریف کی۔ میاں صاحب سر سید احمد خاں مرحوم کے بے حد مدّاح تھے اور اپنی نثر میں انہی کے نمونے کی پیروی کرتے تھے۔ نظم میں مولانا حالی مرحوم کی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں انہیں پسند تھیں اور خود بھی جب کبھی شعر کہنے کے لئے فرصت پاتے تھے تو زیادہ تر ایسے اشعار لکھتے تھے جن میں مناظرِ فطرت کا نقشہ ہوتا تھا۔ یا اخلاق اور فلسفہ۔ ان کے بعد اُن کی نظموں کا مجموعہ ان کے خلف الرشید میاں بشیر احمد صاحب نے شائع کیا جو ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا ہے۔

عادات و اطوار میں میاں صاحب متانت کا نمونہ تھے۔ مگر اُن کی طبیعت میں ظرافت تھی۔ جو بعض اوقات عجیب پیرائے میں ظاہر ہوتی تھی۔ اس کی ایک دو مثالیں خالی از دلچسپی نہ ہوں گی۔ ایک دفعہ ایک صاحب ایران سے ہندوستان آئے۔ وہ لباس اور شکل و شباہت میں بارعب آدمی تھے مگر بدقسمتی سے شعر گوئی کو بہانہ طلبِ زر بنائے پھرتے تھے۔ انہوں نے ایک فارسی قصیدہ کہہ رکھا تھا۔ یا کہیں سے حاصل کر لیا تھا جس کے الفاظ پُرشوکت تھے۔ جس بڑے آدمی سے ملتے۔ قصیدے کے اخیر کے اشعار میں اس کا نام یا کچھ حالات درج کر کے اس سے انعام کے طلبگار ہوتے۔ وہ میاں صاحب سے بھی ملنے آئے اور اِس بات پر اصرار کیا کہ وُہ اُن کو قصیدہ پیش کرنے کی اجازت دیں۔ میاں صاحب تو قصیدوں کے شائق نہ تھے۔ بلکہ اس کو معیوب سمجھتے تھے کہ کوئی اپنی قابلیت یا ذہانت کو دوسروں سے کچھ مانگنے کا وسیلہ بنائے۔ انہوں نے عذر کیا کہ انہیں معاف رکھا جائے۔ مگر جب اُنہوں نے کہا کہ وہ مسافر ہیں اور اُن کا حق ہے کہ اُنہیں اپنے شہر کا مہمان تصوّر کیا جائے تو میاں صاحب نے اُن سے کہا۔ کہ وُہ ایک شام کو کھانا ان کے ہمراہ کھائیں۔ ایرانی صاحب نے سمجھا کہ جب کھانے پر آئیں گے تو قصیدہ سنا لیں گے اور میزبان کو انہیں روپے دینے سے انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔ میاں صاحب نے جس شام کے لئے انہیں مدعو کیا۔ اس کے لئے چند اور دوستوں کو بھی کھانے پر بلایا۔ میں بھی اُس دعوت میں شریک تھا۔ کھانے کے بعد ایرانی صاحب نے قصیدہ اپنی جیب سے نکالا۔ اور پڑھنا شروع کیا۔ بہت سے اشعار بندش اور لفظی خوبیوں کے لحاظ سے اچھے تھے۔ ہم لوگ خوب واہ واہ کرتے رہے۔ جب ایرانی صاحب اپنے اشعار پڑھ چکے تو میاں صاحب نے ہم لوگوں سے کہا کہ تم اپنے ہاں کے فارسی شعرا کا کلام سنائیں۔ میاں صاحب نے خود بھی چند شعر مہمان کو سنائے۔ جب رخصت ہونے کا وقت آیا تو ایرانی صاحب متوقع تھے کہ کچھ نقد بھی ملے گا۔ مگر میاں صاحب نے کہا۔ آپ نے ہمیں اشعار سنائے۔ ہم نے آپ کو۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔ بیچارے ایرانی کا اترا ہوا چہرہ اُس وقت دیکھنے کے قابل تھا۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ قصیدے والا منتر ہر جگہ نہیں چلتا۔ ایک اور چھوٹا سا قصہ قابلِ ذکر ہے۔ سیرِ کشمیر کے دوران میں میاں صاحب مارتنڈ گئے جو ہندوؤں کا ایک مشہور مذہبی مقام ہے۔ وہاں کے برہمن پجاری بھولے بھالے مسافروں سے پیسے لینے کے طرح طرح کے ڈھنگ جانتے ہیں۔ اُن کے پاس بڑی بڑی کتابیں ہوتی ہیں۔ جن میں ہر مسافر سے کچھ نہ کچھ لکھواتے ہیں اور اس کا نام اور پتہ محفوظ کر رکھتے ہیں۔ جب کوئی اور شخص اسی شہر سے آتا ہے۔ تو اس کو کتاب دکھا کر یہ کہتے ہیں کہ اس شہر کے لئے وُہ خاص پروہت ہیں۔ اس کی تھوڑی سی تواضع کر کے اس سے پیسے بھی لیتے ہیں اور کتاب میں اپنی بابت لکھوا لیتے ہیں کہ یہ اچھا پروہت ہے۔ میاں صاحب نے یہ قصہ مجھے سنایا کہ ایک ایسا آدمی انہیں وہاں ملا۔ اور انہیں ہندی سمجھ کر لاہور کے اور ہندی سیاحوں کے نام لینے لگا جو اس کی کتاب میں نام لکھ گئے ہیں میاں صاحب سے بھی اس نے کہا کہ وُہ اس کی کتاب میں کچھ لکھ دیں۔ میاں صاحب نے انگریزی میں اس کی کتاب میں لکھ دیا "یہاں کے پجاری مسافروں کو بے وقوف بنانے میں مشّاق ہیں۔ مگر اُن میں سے کئی خود بھی بے وقوف ہیں اور اُن میں یہ بڑا بے وقوف ہے" اس نے جب بعد کو یہ سند کسی سے پڑھوائی ہو گی تو بہت پشیمان ہوا ہو گا۔

افسوس میاں صاحب مرحوم کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اور وُہ قبل از وقت گزر گئے۔ پنجاب کے ادیبوں میں اور رہنماؤں میں جو جگہ ان کے انتقال سے خالی ہوئی۔ اُن کے بعد پُر نہیں ہو سکی۔ ایک خاص امتیازی رنگ اُن میں تھا۔ جو اُنہی کا حصّہ تھا۔ ان کی قابلیت۔ ان کی اصول پسندی اور ان کی ہمدردیٔ قومی دیر تک یاد رہے گی۔ ہمارے ہمایوں صاحب پنجاب کے اُن فرزندوں میں سے تھے جن پر پنجاب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

میاں شاہدین کا زمانہ

(از جناب میاں عبدالعزیز صاحب فلک پیما)

۱۸۹۴ء میں انٹرنس پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا۔ اُسی دن مرحوم خانصاحب شیخ عبدالعزیز سابق ایڈیٹر آبزرور داخل ہوئے۔ میری عمر کم اور قد کافی چھوٹا تھا۔ کالج میں ڈرتے ڈرتے دبک کر چلتا۔ حُسنِ اتفاق سے مرزا اعجاز حسین مرحوم اور مسٹر عبدالرشید چشتی مرحوم کے حلقۂ اثر میں ہم دونوں عزیز (مزنگ والے کا نام Primus اور میرا نام Secundus ان دنوں میں زبان زد تھا) علمی مجلسوں میں حصہ لینے لگے۔ چشتی صاحب اس زمانے میں ینگ مین محمڈن ایسوسی ایشن کے سکرٹری تھے۔ صدر میاں شاہدین بیرسٹر تھے۔ موری دروازے کے باہر ان کی کوٹھی میں اس ایسوسی ایشن کے جلسے ہوتے تھے۔ کچھ بھی نہ تھا۔ خرچ بھی برائے نام تھا۔ میاں شاہدین کے ملازم ایک میز کچھ کرسیاں اور چند بنچ کوٹھی کے سامنے کھلی جگہ میں لگا دیتے اور ہفتہ وار جلسہ ہو جاتا۔ بحث اکثر پُر لطف ہوتی اور اخیر میں میاں شاہدین کی تقریر فصیح انگریزی کے قدر دانوں کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہوتی۔ میاں محمد شفیع بیرسٹر بھی اکثر شامل ہوتے۔ ایک دوسرے کو Learned Cousin کہہ کر تقریروں میں یاد کرتے۔ ہم چھوٹے چھوٹے اس جملے کے استعمال سے اکثر متحیر ہوتے مگر یہ جملہ برابر کئی سال چلتا رہا میاں شاہدین نہایت لطف سے بعض دفعہ اپنے Learned Cousin کی رائے پر نکتہ چینی کرتے۔ لیکن ان دونوں میں بے انتہا محبت تھی۔

ایک تقریر کے دوران میں میاں محمد شفیع نے ذکر کیا کہ انہوں نے پانسو ناول پڑھے ہیں۔ آخری تقریر میں میاں شاہدین نہایت خوش طبعی سے فرمانے لگے کہ زندگی ضائع کرنے کا اس سے زیادہ کامیاب طریقہ انتخاب کرنا مشکل ہے۔ اُن کا اصل مطلب تو یہ تھا کہ ہم طالب علم ناول خوانی میں وقت ضائع نہ کریں مگر یہ جملہ میاں شاہدین کے خشک زہد اور میاں محمد شفیع کی طبعی رنگینی کا اچھا فوٹو تھا۔ چشتی صاحب کی مہربانی سے ۹۶ء میں مجھے سکرٹری مقرر کیا گیا۔ میرے زمانے میں ایسوسی ایشن کو کافی فروغ ہوا اور Debate میں کچھ چمک سی پیدا ہو گئی۔ اتنا جتلا دینا ضروری ہے کہ اس زمانے میں ہم سب بہت پکے مسلمان تھے اور ہمارا اوڑھنا، بچھونا، ماوا و ملجا صرف ایک چیز تھی یعنی **قومی درد**۔ میاں شاہدین نوجوان مسلمانوں میں جوشِ خدمت کے اس احساس سے بہت خوش ہوتے۔ ویسے وہ زمانہ یہ تھا کہ نادانستہ ہم سب کا دلی اعتقاد تھا کہ اوپر خدا نیچے انگریز، دنیا انگریز کے اشارے پر چلتی ہے کئی واعظ ملکۂ معظمہ کی وفاداری کو مذہبی فریضہ بیان کرتے تھے مسلمان ہونا اور انگریز پرست ہونا گویا مترادف تھا۔

انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں میاں شاہدین کی انگریزی تقریر کو سننے کے لئے کالجوں کے طالب علم جوق جوق جمع ہوتے فصیح تو خیر تھے ہی مگر خوبی یہ تھی کہ آواز میں رس تھا اور رُکتے نہ تھے۔ جو دو ایک اور کبھی انگریزی تقریر کے لئے اس زمانے میں کھڑے ہوتے تو رُک رُک کر، اٹک اٹک کر الفاظ کی تلاش میں سرگرداں ہو کر فقرہ ختم کرتے۔ میاں شاہدین کی تقریر میں قدرتی روانی تھی اور اس زمانے میں یہ بات اس قدر انوکھی تھی کہ انگریزی تقریر کو دلفریب بنانے میں میاں شاہدین کا کوئی ثانی نہ تھا۔

جب مسٹر آرنلڈ علی گڈھ سے قطعِ تعلق کر کے لاہور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے تو میاں شاہدین کی کوٹھی میں رہی

موری دروازے کے باہر والی کوٹھی) ان کے اعزاز میں کھانا ہُوا۔ میرا حصہ اس میں زیادہ تھا۔ مجھے بہت تعجب ہُوا کہ پروفیسر آرنلڈ فرش پر ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے۔ یہی سمجھا کہ سرسید احمد خاں کے جادو کا اثر ہے اور یہ جادو وہ میاں شاہدین کو سکھلا چکے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ مجھ پر بہت مہربان تھے اور میاں شاہدین اور پروفیسر آرنلڈ نے بے انتہا کوشش کی کہ ۱۹۰۰ء میں سٹیٹ سکالر شپ مجھے مل جائے مگر یہ انعام میرے دوست مسٹر منوہر لعل (اب سر منوہر لعل فنانس منسٹر پنجاب گورمنٹ) کی قسمت میں لکھا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں میاں شاہدین نے پھر سر توڑ کوشش کی کہ سٹیٹ سکالر شپ مجھے ملے مگر اس دفعہ خان فضل محمد خاں (آج کل وُہ حیدرآباد میں محکمۂ تعلیم کے ممتاز افسر ہیں) کو مل گیا۔ اس زمانے میں وہ اکثر مجھے بلاتے۔ دو ایک دفعہ شام پیادہ سیر کو مجھے ہمراہ لے گئے۔

۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء میں میاں شاہدین نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کو ایک مضمون میں "تماشا" کا لفظ استعمال کر کے مطعون کیا۔ اس کے برخلاف میں نے ایک لمبا مضمون آبزرور میں شائع کرا دیا۔ اس سے میاں شاہدین کو مجھ پر گلہ رہا۔ میرے مضمون میں زور اس بات پر تھا کہ حاجی شمس الدین، میاں علی محمد اور مولوی کرم بخش بہت پُرجوش کام کرنے والے ہیں۔ ان کی سرگرمی سے انجمن کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہے۔ ان کے کام کو تماشا کہنا غیر مناسب ہے۔ میاں شاہدین کا ارشاد بالکل بجا تھا کہ جلسوں میں نمائش اور چندہ ضرور مگر اصل تعلیمی کام ندارد۔

۱۹۰۴-۵ء میں ایک لمبی بحث چھڑ گئی۔ انجمن والوں کو کئی حضرات "ٹھیکہ دارانِ انجمن" کہنے لگے۔ اس پر میں نے کئی مضمون سول ملٹری اخبار میں لکھے۔ مولوی کرم بخش مالک اسلامیہ سٹیم پریس جواب اور جواب الجواب لکھتے رہے مگر انجمن والے آخر مجبور ہو گئے کہ جنرل کونسل مقرر کریں۔ میاں شاہدین کو اس سے خاص خوشی ہوئی کہ انجمن کے نظام میں تبدیلی ہوئی۔

۱۹۰۷ء میں کراچی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا ساتھ ہی میاں فضل حسین اور میاں محمد شفیع کی لیگوں کی رقابت کا قصہ زیرِ بحث رہا۔ وہاں میاں شاہدین، میاں محمد شفیع، میرے عمِ بزرگوار مرحوم خان بہادر شیخ محمد بخش اور میں سب ایک ہی کمرے میں ٹھہرے۔ میاں شاہدین کی ٹھوس ثقاہت پر کئی دفعہ خوش گپی کا عنصر فتح پا جاتا اور میں حیران رہ جاتا کہ ایسا ٹرالیڈ بھی ہنسی مذاق چہل میں حصہ لے سکتا ہے۔

۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰ء کے اخیر تک میں صوبۂ سرحد میں رہا اور میاں صاحب سے ملنا کم ہُوا۔ جب پنجاب واپس آیا تو اس کے تھوڑی دیر بعد وُہ جج ہو گئے۔ میرے دل میں کچھ حجاب سا پیدا ہو گیا کہ اگر زیادہ ملا تو کہیں یہ نوبت نہ آجائے کہ وُہ اپنے آپ کو جج اور مجھے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر سمجھنے لگیں۔ میں اس لطف سے بھی جاؤں کہ وُہ مجھے عزیز سے محض ایک ماتحت عہدہ دار خیال کرنے لگیں۔ اس زمانے میں میاں محمد شفیع سے ملنا زیادہ ہوا۔

میاں شاہدین کے حاسد یہ خیال پھیلاتے رہے کہ وُہ اپنے سوا کسی اور کا بڑھنا پسند نہیں کرتے۔ یہ خیال قطعی غلط تھا۔ وہ صرف ان اشخاص کو پسند نہ کرتے تھے جو اُن کے تعلیمی کام میں حارج ہوں۔ ایک ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ہٹ کے پکے تھے۔ یوگ کا علم تو غالباً انہیں نہ تھا مگر عملاً وُہ پورے ہٹ یوگی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وُہ انگریزوں میں بہت مقبول نہ تھے۔ کسی سے دبتے نہ تھے، زمانہ ساز نہ تھے اور صاف گو تھے۔ مسلمانوں میں ہمیشہ وُہ مولوی شاہدین کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

ہمایوں اُن کی یادگار ہے۔ یہ رسالہ اُن کے صاحبزادے میاں بشیر احمد بی۔اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا کی سعادت مندی کا شاہکار ہے۔ اگر بشیر سے مجھے دلی محبت نہ ہوتی، میاں شاہدین سے پُرانی عقیدت نہ ہوتی تو ضرور چند تعریفی جملے لکھتا۔ اب صرف بشیر کو یہ لکھ کر ختم کرتا ہوں۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

بزمِ ”ہمایوں“

آج ہمایوں کو جاری ہوئے بیس سال ہو گئے ہیں۔ یہ والدِ محترم کی یگانہ ہستی کی یادگار ہے۔ نام اُن کا تھا کام اپنا لیکن سچ یہ ہے کہ یہ اُسی نام کی برکت اور اُسی ہستی کا اثر تھا کہ ہمایوں میں چند خوبیاں پیدا ہوئیں باقاعدگی، استقلال اور ایک خاص اخلاقی معیار۔ کبھی کسی وجہ سے کوئی کہہ دیتا ہے کہ ہمایوں اُردو کا بہترین رسالہ ہے تو اک خوشی سی محسوس کرنے کے ساتھ ہی میں کانپ جاتا ہوں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ بہترین رسالہ نہیں ہے مگر اس کے لئے یہ عزت کیا کم ہے کہ اُردو کی محفلِ ادب میں اک ذرا سی جگہ اسے بھی مل گئی ہے۔ ہاں ایک بات پر فخر کرنے کو آج جی چاہتا ہے اور وُہ یہ کہ اُردو ادب کی تاریخ میں ”ہمایوں“ پہلا رسالہ ہے جو بیس سال کے عرصے میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہؤا۔

جب ”ہمایوں“ جاری ہوا تو اس کی ایک خاص روش تھی۔ ارادہ تھا کہ اس کی یہ روش جوں کی توں قائم رہے۔ شکر ہے کہ قدرت نے اس ارادے کو منجمد ہونے سے بچا لیا اور ہمایوں بھی بعض باتوں میں زمانے کی نئی ضروریات کے پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ ہمایوں کی دسویں سالگرہ کے موقع پر ہمایوں تک کے دہ سالہ کام کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اگر اُس وقت کی حالت کا آج سے موازنہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ادب میں اور اُس کے ساتھ ہی ہمایوں میں بعض تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ پہلے افسانے زیادہ تر ترجمے ہؤا کرتے تھے اب طبع زاد افسانوں کی کمی نہیں رہی مقامی حالات اور ذاتی تجربات کی بولتی چالتی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔ بے قافیہ شاعری انقلابی شاعری اور نئی شاعری کے دوسرے نمونے اب جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ زمانے کی نئی تحریکات کا شوق سے مطالعہ کیا جاتا ہے باوجود ملکی تفرقوں کے ہندوستان کے حالات میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تنقیدی اور دوسرے اصول اب محض خشک اصولوں کی طرح بیان نہیں کر دیئے جاتے بلکہ انہیں پرانے اور نئے ادب پر عائد کر کے مفید نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اُردو پر جو بے جا حملے ہوتے اور ہو رہے ہیں اہلِ اُردو اب نہ صرف اُن کی مدافعت کرتے ہیں بلکہ اپنی حالت کو مضبوط کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں گو ابھی کئی تعمیری کاموں کی طرف عملاً توجہ نہیں کی گئی۔ اُردو کا ذخیرہ نہ صرف غیر ملکی زبانوں کے ترجموں سے بھر رہا ہے بلکہ اب دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادب سے واقفیت حاصل کر کے اُن سے براہِ راست تعلق پیدا کیا جا رہا ہے۔ اس سے نہ صرف اُردو ادب کی بلکہ اُردو زبان کی توسیع ہو رہی ہے۔ اُردو کا دروازہ ہمیشہ نئے الفاظ کے لئے کھلا ہے بشرطیکہ اِن نو واردوں کی تدریج اور خوش اسلوبی سے کھپت ہو۔ اس سلسلے میں ریڈیو مفید کام کر سکتا ہے اگر اُس کی باگ ڈور خوش ذوق اور بلند نظر لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ پچھلے چند برسوں میں ریڈیوی مضامین کی بدولت ہمایوں اور دوسرے اُردو رسالوں میں بارہا ایسے مقالے چھپے جن میں دلچسپ اور عام فہم ادب کا دلکش ملاپ تھا۔

پچھلے بیس بائیس سال میں جہاں دنیا میں عظیم الشان تبدیلیاں ہوئیں، وہاں ہندوستان میں بھی ایک انقلاب آ گیا۔ اس انقلاب سے اُردو ادب خاص متاثر ہؤا۔ خودداری، جدت پسندی، آزادی کی محبت، عوام کی بہتری، اپنی قومی چیزوں کا احیاء اور اُن کی قدر دانی۔ انہوں نے ”عروقِ مُردہ مشرق“ میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ مانا اُردو ادب میں ابھی بہت سی کمیاں ہیں لیکن اب اُس میں نرا دُنیائے فانی کا رونا اور فرضی زلف و خال کے قصے ہی نہیں۔ آج کل کے دس بارہ مشہور بلکہ بعض نئے رسالوں کو اُٹھا کر دیکھئے اُن میں کافی مفید معلومات اور بعض جدتیں بھی ہوتی ہیں، علم و ادب کی رُوح بے تاب ہو رہی ہے، اُردو کا کارواں جادہ پیما ہے۔ رسالوں

کے سالنامے دیکھئے اُن کے خاص نمبروں پر ایک نظر دوڑائیے۔ گزشتہ سال میں حال کے شعراء، ریڈیو، افسانہ، تاریخ، ٹیگور وغیرہ مختلف موضوعات کے لئے خاص نمبر نکلے اور اب رسالے نری ادبیت کے لئے وقف نہیں ہیں۔ "جامعہ" "سائنس" "ہل" "سیاست" "نیا ادب" وغیرہ رسائل یا خاص علمی و اصطلاحی علوم کے حامل ہیں اور یا نئی اقتصادی و معاشرتی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ اُردو انسائیکلو پیڈیا کی طرف پھر توجہ ہوئی ہے۔ اُدھر حیدر آباد سے اس کا ابتدائی نمونہ جاری ہوا اور اِدھر لاہور سے "کتاب العلم" کی پہلی قسط۔ باوجود جنگ کی مشکلات کے ایسے کاموں کا ہونا یقیناً حوصلہ افزا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا قیام تو اُردو زبان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن گزشتہ بیس سال میں اِس ضمن میں اور قابلِ ذکر مساعی بھی ہوئیں جن میں سب سے نمایاں جامعہ ملیہ دہلی کا کام ہے۔ ساتھ ساتھ کئی مقامات پر چھوٹی چھوٹی کوششیں کی گئیں مثلاً جامعۂ آگرہ اور انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) نے خالص اُردو نصاب اور اُردو کے امتحانات جاری کئے۔ انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) اب محض ایک کتابیں شائع کرنے والی انجمن نہیں رہی بلکہ مقتضائے زمانہ سے اُس نے اُردو کے تحفظ و اشاعت کا کام اپنے ذمّے لیا ہے جو نہایت ضروری تھا۔ ملک بھر میں انجمنوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس سلسلے کی کڑیوں میں زیادہ ٹھوس کام کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ آج کل "انجمن آرائی اور رسالہ افزائی" کا دور ہے۔ امید ہے یہ زندگی کے آثار محض ظاہری ٹیپ ٹاپ مخالفانہ پروپگنڈا اور باہمی واہ وا تک محدود نہ ہو جائیں گے۔ دُنیا کی نئی تحریکات اُردو ادب کے پانیوں میں جا بجا ہلکورے پیدا کر رہی ہیں اور اِس سے کئی ندیاں بہ نکلنے کو ہیں۔ اُدھر زبان کی اشاعت و طباعت کے مسائل زیرِ غور ہیں اِدھر ادب میں نئی شاعری اور انقلابی و اشتراکی خیالات کی نشو و نما کے علاوہ تعلیمی و تنقیدی حس بیدار ہو رہی ہے سینما اور ریڈیو کے شعبوں میں زبان کے لئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور ترقی کی تازہ راہیں کھُل رہی ہیں، یہ راہیں خواص و عوام کے لئے میل جول کا نیا طریقہ وضع کریں گی۔ ذریعہ تعلیم کا نقیب قومی زبان کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا ہے، یہ نکتہ بھی اب حل کرنا پڑے گا۔

قومی زبان کا مسئلہ جو ایک صدی سے گاہے گاہے موسمی پھوڑے کی طرح پھوٹتا رہا ہے پچھلے پانچ برس سے پھر اپنی بھیانک شکل دکھا رہا ہے ہندی والے اتھوا ہندوستانی یا محض ہندوستانی کی آڑ میں اور حال میں بعض اس آڑ کو چھوڑ کر سنسکرتی ہتھیاروں کی مدد سے راشٹر بھاشا کے تخت پر قبضہ کیا چاہتے ہیں وہ خواص و عوام میں اپنا پروپیگنڈا کر رہے ہیں لیکن دقّت یہ آ پڑی ہے کہ عام انسانوں میں بہت کم ہیں جو اُن کی زبان سمجھتے ہیں۔ گاندھی جی سمپورن جی راجندر جی راجہ جی وغیرہ اب علانیہ طور پر ہندی کی طرفداری کر رہے ہیں لیکن خوشی کا مقام ہے کہ سر تیج بہادر سپرو کی قیادت میں ہندوؤں کی ایک جماعت ہندوستانی اتحاد کے اس آخری نشان کو بلند رکھنے پر تُلی ہوئی ہے۔ گزشتہ سال دہلی میں ایک "اُردو سماج" بنائی گئی۔ اور وہیں اکتوبر میں جو گاندھی جینتی کا مشاعرہ ہوا وہ سو فی صدی اُردو مشاعرہ تھا، گاندھی جی کی تعریف خود ہندوؤں نے ہندی میں نہیں اُردو میں کی۔ خود گاندھی جی نے جولائی میں فرمایا کہ "قومی زبان ابھی بنی نہیں ابھی تو اُس کا جنم ہی ہوا ہے"۔ ہندی رسالہ سرسوتی (نومبر ۱۹۴۱ء) میں ایک مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ "صوبہ متحدہ کے بہت سے ہندو تقریروں اور کتابوں میں تو کچھ نہ کچھ ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن گھروں میں وہی اُردو فارسی کے گلا گھونٹ الفاظ بولتے ہیں۔ اس کی درستی کی بڑی ضرورت ہے"۔ سچ یہ ہے کہ اُردو مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی زبان ہے اور گو بدقسمتی سے اب اس کے محافظین میں مسلمان پیش پیش نظر آتے ہیں لیکن سربر آوردہ ہستیوں کا منظرِ عام پر آ کر کھُلے طور سے اُردو کی حمایت کرنا ملک کے لئے ایک نیک فال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کم از کم شمالی ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہے۔ یہ درست ہے کہ فرقہ وارانہ کشمکش کی وجہ سے اب بعض لوگوں کی طرف سے اس کا کھلم کھلا اعتراف نہیں کیا جاتا اور اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد یا ڈھائی اینٹ کا مندر یا گوردوارہ بنانے کی کوشش بھی گاہے گاہے جاری کی جاتی ہے اور اس طرح ہندوستان کو بابل کا بُرج بنا دینے کا افسوس ناک کام جاری رہتا ہے لیکن یہ ہم کیوں نہ اُمید کریں کہ یہ محض عارضی رکاوٹیں ہیں، ہم کیوں نہ سمجھیں کہ ہندوستان کی قسمت اچھی ہے اور اُردو کا سیلاب ایک دن اِن سب کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ اُردو کو مقامی بولیوں یا زبانوں سے ہرگز بیر نہیں۔ یہ اِن زبانوں اور سب لوگوں کے فائدے کی بات ہے کہ اُردو کی ملکی حیثیت تسلیم کر لی جائے تاکہ ملک میں کم از کم ایک مشترکہ پلیٹ فارم تو رہ جائے جہاں آپس میں لڑنے بھڑنے والی قومیں تبادلۂ خیالات کر سکیں!

سال بھر میں جو اُردو کانفرنسیں منعقد ہوئیں اُن میں زیادہ قابلِ ذکر گوالیار (جنوری ۱۹۳۸ء) لائل پور (فروری)، لاہور ("یومِ اُردو" انجمنِ حمایتِ اسلام منعقدہ ۱۲ اپریل) اور مدراس (اگست) کی کانفرنسیں تھیں۔ ۱۳ فروری کو اُردو والوں کا ایک اہم وفد وزیرِ اعظم پنجاب کی خدمت میں یہ مطالبہ لے کر حاضر ہوا کہ پنجاب میں اُردو کے واحد ذریعۂ تعلیم ہونے کی مسلّمہ حیثیت کا ہر طرح لحاظ رکھا جائے۔ مارچ میں پرنسپل سوری کی درخواست پر جموں کالج میں اور پرنسپل سناتن دھرم کالج کی خواہش کے مطابق لاہور کے اِس کالج میں کانووکیشن کا ایڈریس اُردو میں پڑھا گیا۔ قومی زبان کے مسئلے کے بارے میں یہ حالات حوصلہ افزا ہیں۔ احتیاط اور کوشش ضروری ہے لیکن نااُمیدی نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ غلط اور بے جا ہے۔

"انجمن ترقی پسند مصنّفین"، "ترقی پسند" ادیب اور دوسرے انقلابی ذہنیت رکھنے والے اصحاب بھی اپنے غیر ادبی مقاصد کی تکمیل میں اُردو کو ذریعۂ کار بنا رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو جنوری فروری ۱۹۳۸ء کے "نیا ادب" میں لکھتے ہیں کہ "انجمن ترقی پسند مصنّفین کا قیام ایک بہت بڑی ضرورت کا پورا ہونا ہے اور اس سے ہماری بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔" مارچ اپریل کے پرچے میں رگھوپتی سہائے صاحب فراق (گورکھپوری) نے ترقی پسند ادب کے ملک بھر میں پرچار کے متعلق ایک دلچسپ تجویز پیش کی ہے کہ ایک کمپنی بنائی جائے جس کے تحت میں نئے زاویۂ حیات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اُردو ادب کا انتخاب کیا جائے اور نئے علوم اور نئی تحریکات کا خلاصہ چھوٹی چھوٹی کتابوں میں پیش کیا جائے جن کی قیمتیں صرف ایک پیسہ سے لے کر تین آنہ فی کتاب تک ہوں۔ گویا تجویز کا ماحصل ہے "کتابیں سستی زبان سہل"۔ مئی جون کے پرچے میں اِس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اُردو کے رسمِ خط اور تصویریں کی اصلاح لازم ہے اور اُردو انجمنوں کو چاہئے کہ وہ اَن پڑھوں کو اُردو پڑھانے اور آسان کتابیں چھاپنے کے اہم کام فوراً اپنے ذمّے لیں۔ یہ درست ہے، زمانہ بدل رہا ہے سو ہمیں بھی اپنے کام کے طریقے بدلنے چاہئیں۔

غرض ہم دیکھتے ہیں کہ اِس وقت ہمارے لئے مسائل کا ہجوم ہے مشکلات کی بھیڑ ہے لیکن اُردو جس میں قومی زبان بننے کی پوری صلاحیّت موجود ہے ہندوستانی دربارِ عام کی سرتاج بن سکتی ہے بشرطیکہ اُس کے حامی اپنی مسلسل توجہ اور محنت سے حقِ وفا ادا کرنے میں کوتاہی نہ کریں!

بشیر احمد

جہاں نما

۱۹۴۱ء کے اہم واقعات

تاریخ	ہندوستان	دوسرے ملک
۳ جنوری	مولانا ابوالکلام صدر کانگرس قید کر لیے گئے	
۶ ر		روزولٹ امریکی صدر نے جمہوریتوں کو زیادہ امداد دینے کا وعدہ کیا
۷ ر		مشہور فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں کی وفات (جس نے تخلیقی ارتقا کا نظریہ پیش کیا تھا)
۱۷ ر	لبرل لیڈروں کا بیان کہ انگلستان اپنے لئے ہندوستانیوں کے دل میں گرم جوشی پیدا نہیں کر سکا	
۲۲ ر		لیبیا میں جنرل ویول کی جارحانہ پیش قدمی۔ طبروق کی فتح
۲۳ ر	مسٹر ایمری سکرٹری آف سٹیٹ کی تقریر کہ ہندوستان کا مسئلہ ہندوستانی ہی حل کر سکتے ہیں۔	
۲۴ ر		نجاشی ابی سینیا میں داخل ہوا
۲۶ ر	کانگرس نے "یوم آزادی" منایا	
۲۸ ر	سبھاش بوس کی روپوشی	
۸ ر فروری		ممالک متحدہ (امریکہ) میں انگلستان کو مالی و حربی امداد دینے کا قانون منظور ہوا
۱۰ ر		برطانوی فوجیں طرابلس تک بڑھیں (لیکن بعد میں پیچھے ہٹ آئیں)
۲۲ ر	مسٹر جناح پھر مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے	
یکم مارچ	لاہور میں مسلم طلبا کی پاکستان کانفرنس (مسٹر جناح کی تقریر) لاہور میں ہندو اقلیتوں کی کانفرنس	بلغاریہ محوری طاقتوں سے مل گیا
۱۴ ر	سر سپرو کی اپیل کہ کانگرسی اور لیگی لیڈروں کی باہمی گفت و شنید ہونی چاہئے	وشی کی فرانسیسی حکومت نے انڈوچائنا کے متعلق جاپانی مطالبات مان لئے۔
۲۵ ر		یوگوسلاویہ بھی محوری طاقتوں سے مل گیا
۲۷ ر		یوگوسلاویہ میں اس ملاپ کے خلاف بغاوت
۶ ر اپریل		جرمنی نے یوگوسلاویہ اور یونان پر دھاوا بول دیا
۱۲ تا ۱۴ ر	آل انڈیا مسلم لیگ کا اٹھائیسواں سالانہ اجلاس مدراس میں (لیگ نے پاکستان کو اپنا سیاسی نصب العین قرار دیا)	
۱۳ ر		سوویٹ روس اور جاپان کے درمیان غیر جانب داری کا معاہدہ

تاریخ	ہندوستان	دوسرے ملک
۱۶ر اپریل		یوگوسلاویہ پر مکمل جرمن قبضہ
۲۳ر		یونانی فوجوں نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے
۲ر مئی		برطانوی اور عراقی فوجوں میں جھڑپ
۸ر مئی	کانفرنس نے مسٹر جناح کے خلاف بیان جاری کیا	
۹ر		دشمنی کا سمجھوتا جرمنی سے
۱۲ر		ہیز ہس سکاٹ لینڈ میں ہوائی جہاز سے نیچے اُترا
۲۰ر		جرمنوں کا حملہ جزیرۂ کریٹ پر
۲۴ر	گاندھی جی نے غنڈوں کے خلاف تشدّد کا استعمال جائز قرار دیا	جرمنوں نے برطانوی جہاز ہُڈ کو غرق کر دیا
۲۷ر		جرمن فوج پھر سرحد پار کر کے مصر میں آ داخل ہوئی۔
۳۰ر		رشید عالی بغداد سے بھاگ نکلا۔ سارا عراق برطانیہ کے قبضے میں آ گیا
یکم جون		برطانیہ نے کریٹ خالی کر دیا
۴ر		فرانس اور جرمنی کے درمیان باہمی امداد دینے کے معاہدے کی افواہ۔ سابق قیصرِ جرمنی کی وفات
۵ر	سارے ہندوستان میں خاکساروں پر قانونی پابندیاں	
۸ر		برطانوی اور "آزاد" فرانسیسی فوجوں نے شام پر حملہ کیا اور آزادی عطا کرنے کا وعدہ کیا
۱۷ر		جرمن کونسل ممالکِ متحدہ (امریکہ) سے خارج کر دیئے گئے۔
۱۸ر		جرمنی اور ترکی کا سیاسی معاہدہ کہ وہ ایک دوسرے کے علاقے پر حملہ نہ کریں گے
۲۲ر		جرمنی نے رُوس پر دھاوا بول دیا (تین بج کر منٹ بوقت شب) برطانیہ اور امریکا نے رُوس سے کچھ مدد کا وعدہ کیا۔ جرمن فوجیں رُوس میں تیزی سے بڑھتی گئیں۔
۳۰ر	ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فساد	
۴ر جولائی		"یوم آزادی" کی تقریب پر روزولٹ کا براڈکاسٹ کہ امریکہ کی آزادی انگلستان سے وابستہ ہے
۷ر	وائسرائے نے مرکزی اسمبلی کی مدت میں توسیع کر دی	امریکہ نے آئس لینڈ پر قبضہ کر لیا
۹ر		شام کی فرانسیسی حکومت نے عارضی صلح کی درخواست کی
۱۳ر		رُوس اور برطانیہ میں معاہدہ
۲۰ر		یورپ کی اَن دیکھی فوج : V کا نشان ہر جگہ نمودار ہوتا ہے

ہندوستان	دوسرے ملک
۲۱ر وائسرائے کی کونسل کی توسیع اور ڈیفنس کونسل کی تشکیل	
۲۲ر	جاپان نے انڈوچائنا کو الٹی میٹم دیا
۲۶ر پونا میں غیر جانب دار کانفرنس	انگلستان اور امریکہ نے جاپان کو سرزنش کی
۳۰ر مسٹر جناح کا اعلان کہ اُن مسلم لیگیوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی جو وائسرائے کی کونسل یا ڈیفنس کونسل میں شریک ہوئے ہیں	جاپان نے انڈوچائنا میں چند ہوائی اور بحری اڈے قائم کئے
یکم اگست۔ مسٹر امری کی تقریر ہندوستان پر	جرمن رُوس میں رُک گئے
۷ر ٹیگور کا انتقال کلکتے میں (عمر ۸۰ سال)	
۱۲ر	انگلستان اور رُوس نے تُرکی کو اپنی دوستی کا یقین دلایا۔
۱۴ر	روزویلٹ اور چرچل کی سمندر پر ملاقات اور ایک اہم مشترکہ اعلان آزادی
۲۴ر بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں مسٹر جناح کی فتح مندی سر سکندر نے ڈیفنس کونسل سے استعفا دے دیا	مسٹر چرچل کا براڈکاسٹ، جاپان کو تنبیہ اور یہ اعلان کہ جنگ کے بعد جرمنی کو معاشی طور پر تباہ نہ کیا جائے گا۔
۲۵ر کشمیر نیشنل کانفرنس کا مطالبہ خود اختیاری حکومت کے لئے	رُوسی اور برطانوی فوجیں ایران میں داخل ہوئیں۔
۳ر ستمبر	جنگِ عظیم کی دوسری سالگرہ
۵ر بنگال کونسل نے پاکستان کی قرارداد منظور کرلی	
۹ر	چرچل نے وقیانوسی اعلان کا مفہوم بتایا اور واضح کیا کہ یہ ہندستان پر عائد نہیں ہوتا۔
۱۴ر ہندوستان میں چرچل کے بیان پر احتجاجی جلسے	
۱۷ر	لندن میں نئی اتحادی لیگِ اقوام کا قیام
۲۱ر	رُوس اور جاپان نے اپنی مشترکہ سرحد پر فوجیں جمع کیں۔
یکم اکتوبر۔ چرچل کے بیان پر سر سکندر کی نکتہ چینی	ماسکو میں دولِ ثلاثہ کی کانفرنس
۳ر	ہٹلر کی تقریر کہ رُوسی جنگ کا اعلان میری زندگی کا سب سے مشکل فیصلہ تھا
۱۷ر	جاپان میں نئی جنگ پسند وزارت (زیرِ قیادت ٹوجو)
۱۸ر مالوی جی کی اپیل کہ ۲۱ سے ۲۷ر اکتوبر تک "گئوماتا کا ہفتہ" منایا جائے	روسیوں نے اوڈیسا خالی کر دیا
۲۰ر عید کے دن مسٹر جناح کا پیغام مسلمانوں کو	افغانستان جرمنوں اور اطالیوں کے اخراج پر رضامند ہوگیا۔
۲۳ر بمبئی اور ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فسادات	
۲۴ر	جرمنوں نے خارکوف پر قبضہ کرلیا

ہندوستان	دوسرے ملک
۲۶ر مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کے مقاطعہ کی قرارداد منظور کی	
۳۱ر گاندھی جی نے کانگریس کے سول نافرمانی کے پروگرام کو بدلنے سے انکار کردیا	
یکم نومبر۔ علی گڑھ میں مسلم لیگ کانفرنس	جرمنوں نے کرائمیا کے دارالسلطنت پر قبضہ کرلیا
۷ر	انقلاب اکتوبر کی چوبیسویں سالگرہ پر سٹالن کی تقریر
۸ر	میونخ میں ہٹلر کی تقریر کہ جرمن فتح یقینی امر ہے
۱۸ر	برطانیہ کی پیش قدمی لیبیا میں
۲۳ر	ماسکو پر نیا جرمن حملہ
۲۹ر لکھنؤ میں پاکستان کانفرنس اور لاہور میں اکھنڈ بھارت کانفرنس	امریکا کا الٹی میٹم جاپان کو
۳۰ر	جرمن فوجوں کی مراجعت راسٹوف سے
یکم دسمبر۔ بنگال کی وزارت کا استعفا۔ کانگریس اور دوسری پارٹیوں سے فضل الحق کا اتحاد	امریکا اور جاپان کے درمیان نازک صورتِ حالات
۴ر مولانا ابوالکلام پنڈت نہرو اور بعض ستیہ گرہیوں کی رہائی	
۷ر امرت سر میں ہندو سکھ لیڈروں کی کانفرنس	۷ر جاپان نے امریکا اور انگلستان کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا فلپائن اور ملایا میں اپنی فوجیں اتار دیں اور امریکا کے کئی جنگی جہاز ڈبو دیئے تھائی لینڈ (سیام) نے جاپان کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔
۸ر	
۱۰ر	جاپانی ہوا بازوں نے برطانیہ کے دو بڑے جنگی جہاز ڈبو دیئے۔
۱۱ر فضل الحق کا اخراج مسلم لیگ سے	امریکا نے جرمنی اور جرمنی اور اطالیہ نے امریکا کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ جرمنی اطالیہ اور جاپان میں فوجی اتحاد
۱۷ر مسٹر جناح پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں اور پنڈت نہرو ہندوستان کی مکمل آزادی کا	روس میں جرمن فوجوں کی مراجعت۔ ملایا میں جاپانی فوجوں کی پیش قدمی
۱۸ر	لیبیا میں جرمنوں اور اطالویوں کی پسپائی
۱۹ر جاپانی فتوحات پر کلکتہ میں گھبراہٹ	ملایا میں جاپانیوں نے پینانگ پر قبضہ کرلیا
۲۱ر برطانوی مزدور پارٹی نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے رہنماؤں سے جلد سمجھوتا کیا جائے	ہٹلر کا اعلان کہ اُس نے جرمن فوجوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے

۱۹۴۱ء کا سب سے اہم واقعہ جرمنی اور رُوس کی جنگ ہے۔ اٹھائیس مہینے ہوئے کہ جرمنی اور روس کے غیر متوقع معاہدے کے بعد یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ یورپ کا آغاز ہُوا۔ یہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد جنگ ٹھنڈی پڑ گئی لیکن ۹ راپریل ۱۹۴۰ء کو ناروے پر جرمن حملے کے ساتھ وُہ پھر بھڑک اُٹھی یہاں تک کہ ۲۲ رجون ۱۹۴۰ء کو فرانس نے جرمنی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ ایک اور زیادہ حیرت انگیز واقعہ تھا۔ پھر اس کے عین ایک سال بعد ۲۲ رجون ۱۹۴۱ء کو جرمنی نے رُوس پر دھاوا بول دیا اور یہ یقیناً ان سبھی واقعات سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والا واقعہ تھا۔ دنیا عجیب وغریب سانحات کی عادی ہو چکی تھی لیکن اس نئی جنگ نے سب کو ششدر کر دیا۔ کیا ہٹلر نے روس پر اس لئے حملہ کیا کہ بقولِ ہٹلر رُوس انگلستان سے ساز باز کر رہا تھا؟ یا اس لئے کہ چونکہ انگلستان پر حملہ نہ ہو سکتا تھا اب ہٹلر رُوس کو پامال کر کے دُنیا کا فاتح بننا چاہتا تھا؟ بہرحال ہُوا یہ کہ جرمن فوجیں رُوس میں بڑھیں اور بڑھتی گئیں، رُوس کے علاقوں پر بتدریج جرمنوں کا قبضہ ہوتا گیا لیکن لینن گراڈ اور ماسکو کو جلد فتح کر لینے کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ رُوس فرانس سے بدرجہا زیادہ مضبوط نکلا اور ہتھیار ڈال دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہُوا۔ جیسے ۱۹۴۰ء میں انگلستان نے ڈٹ کر جرمنی کی ہوائی طاقت کا مقابلہ کیا تھا ویسے ہی ۱۹۴۱ء میں رُوس نے ایسا مقابلہ کر دکھایا کہ دُنیا حیران رہ گئی۔ فن لینڈ کی لڑائی کے بعد رُوس نے اندر ہی اندر اپنی کمزوریوں کو دُور کرنے کی ہر تدبیر اختیار کی اور فرانس کی شکست سے بھی ہر ممکن سبق سیکھا۔ اور صرف رُوس کی فوج نہیں بلکہ اُس کی تمام آبادی جرمنوں کے خلاف سینہ سپر ہو کر کھڑی ہو گئی جس سے پوری طرح ثابت ہو گیا کہ اشتمالیت کس طرح رُوس کے رگ وپے میں سرایت کر چکی تھی کہ اب رُوس کا ایک ایک فرد آزادی اور اشتمالیت کے نصب العین کے لئے لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا ہے۔ جرمنی اور رُوس کی جنگ نے جنگ کی کایا پلٹ دی۔ انگلستان سے ہٹ کر جرمنی کی توجہ اب رُوس پر ہو گئی جس سے انگلستان کو جنگ کی مزید تیاری کے لئے خاصی مہلت مل گئی۔

اس سے پہلے جرمنی یوگوسلاویہ یونان اور جزیرہ کریٹ پر اور انگلستان عراق اور شام پر قابض ہو چکا تھا۔ اب جرمنی اور رُوس کی جنگ کے بعد جنگ اور پھیلی۔ اُدھر جرمنی نے دیکھا کہ اگر اُسے کامیابی حاصل کرنی ہے تو جلد حاصل کرنی چاہئے اس لئے اُس نے جان ومال کی پروا نہ کرتے ہوئے رُوس کے دو ہزار میل کے محاذ پر شبانہ روز جنگ جاری کر دی اِدھر رُوس نے اپنے شہر جرمنوں کے حوالے کرنے سے پہلے اُنہیں خود تباہ کر دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ طرفین کے جان ومال کے نقصان کا فی الحال صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ رُوسی کہتے ہیں جرمنی کے تیس چالیس لاکھ آدمی کام آ چکے ہیں۔ جرمن کہتے ہیں ہمارے پاس ۳۰ لاکھ رُوسی قیدی ہیں۔ اس جنگ کے نتائج اِس قدر اہم ہو سکتے ہیں کہ اس وقت طرفین کو ہزاروں لاکھوں جانوں یا کروڑوں اربوں روپے کی مطلق پروا نہیں۔ گویا ہر ایک کے لئے سوال تخت یا تختہ کا ہے ہر ایک اپنے نصب العین کے لئے ہر چیز کی قربانی دینے پر تُلا بیٹھا ہے۔ ایسی ہولناک جنگ دُنیا نے نہ کبھی دیکھی نہ سُنی۔ ہتھیار ایسے تباہ کُن تباہی اتنی تند و تیز، صرف چند لاکھ فوجیں نہیں کروڑوں کی آبادیاں باہم گتھم گتھا ہیں، شاید قیامت اسی کو کہتے ہیں! یہ جنگ روز بروز پھیل رہی ہے، شاید اَور بھی پھیلے یہاں تک کہ دُنیا کا ہر شہر اور گاؤں اِس کا اثر محسوس کرنے لگے ۱۹۱۴ء-۱۸ء کی جنگ جنگِ عظیم تھی تو یقیناً یہ جنگ جنگِ اعظم ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں عالمگیر ہو رہی ہے۔ جون ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے رُوس پر حملہ کیا۔ جولائی میں جاپان نے انڈوچائنا میں اپنے ہوائی اور بحری اڈے قائم کر لئے۔ اگست میں رُوسی اور انگریزی فوجیں

ایران میں داخل ہوئیں۔ اکتوبر میں افغانستان جرمنوں اور اطالویوں کے اخراج پر رضامند ہو گیا۔ اور دسمبر میں جاپان نے انگلستان اور امریکہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

جنگِ رُوس و جرمنی کے بعد ۱۴ اگست کو امریکی صدر رُوز ولٹ اور برطانوی وزیرِ اعظم چرچل نے بحرِ اوقیانوس میں مل کر ایک مشترکہ اعلان شائع کیا جو ممکن ہے دُنیا کی آئندہ تاریخ کے لئے ایک اہم ترین اعلانِ آزادی ثابت ہو۔ اس میں انہوں نے دُنیا کو یقین دلایا ہے کہ اُن کے پیشِ نظر کسی قسم کی فتوحات نہیں ہیں بلکہ وُہ تمام ملکوں کی چھنی ہوئی آزادی کو بحال کریں گے اور دُنیا میں ایک ایسا نظام قائم کرنے میں مدد دیں گے جس میں تمام قوموں کو خود اختیاری حاصل ہو دُنیا کی دولت میں اُن سب کو مناسب حصہ ملے اور سب قوموں کو غیر مسلّح کر دیا جائے تاکہ ہر کہیں امن و امان کا بول بالا ہو جائے۔ جرمنی نے اس تجویز کو بندر بانٹ تقسیم قرار دے کر جوابی اعلان کیا کہ اس کا صحیح جواب جرمنی کی تلوار دے گی یعنی وہی "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"! اس سلسلے میں ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ "اوقیانوسی" اعلان کے بعد بھولے بھالے ہندوستانی کہیں کہہ بیٹھے کہ یہ اعلان گویا ہم پر بھی عائد ہوگا۔ اس پر مسٹر چرچل نے غلط فہمی دُور کرنے کے لئے فوراً مزید اعلان کر دیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ اوقیانوسی اعلان بھی کہیں "دقیانوسی اعلان" ثابت نہ ہو!

یہ جنگ کیا اصولوں کی جنگ ہے؟ کیا جرمنی اور اطالیہ اور جاپان محض اپنی سلطنت بڑھانا چاہتے ہیں اور انگلستان اور روس اور امریکہ محض انصاف اور امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی جنگِ عالمگیر کے بعد جرمنی کو کمزور کر دیا گیا اور جرمنی اور اطالیہ اور جاپان نے دیکھا کہ انگلستان اور فرانس نہ اپنے مقبوضات کو چھوڑنا چاہتے ہیں نہ اُن کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ باقی ماندہ ملکوں پر ہاتھ صاف کریں۔ سرمایہ داری اور سلطنت کی خواہش انہیں بھی تھی انہیں بھی۔ جب "مہذب" ترکیبوں سے قوت حاصل کرنا ممکن نہ رہا تو "محوری" طاقتوں نے علانیہ ڈاکو بن کر ادھر اُدھر چھاپے مارنے شروع کئے یہاں تک کہ جنگ ٹھن گئی۔ اب دونوں فریق دُنیا والوں سے ایک "نئے نظام" کا وعدہ کر رہے ہیں۔ لیکن صرف بعد کے عمل ہی سے یہ پتہ چل سکے گا کہ وعدہ وفا ہوا یا نہیں۔ ہاں ہم ہندوستانی جس بلندی پر یا جس پستی میں ہیں وہاں سے ہماری نگاہیں صرف اوقیانوسی اعلان کی جمہوریت اور روسی اشتمالیت کی فتح میں نوعِ انسان کی بہبود و فلاح دیکھ سکتی ہیں۔

نئی دُنیا بنے یا نہ بنے لیکن دُنیا کے رہنے والے مدت سے اُس کے سنہری خواب دیکھ رہے ہیں۔ جنگ کے دوران میں بھی یہ گاہے گاہے یہ دل خوش کن سراب نظر آتا ہے اور کیوں نظر نہ آئے، دُنیا اُمید کے سہارے قائم ہے۔ مشہور انگریز سوشلسٹ مفکر ہیرلڈ لاسکی کہتا ہے کہ وقت آگیا ہے کہ اب ہم شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیں اور اُس کا ایک ثبوت ہم یہ دے سکتے ہیں کہ ہم ہندوستان کو آزاد کر دیں۔ اس کا اثر جرمنی اور اطالیہ اور امریکہ سب پر ہوگا۔ مشہور مُصنّف ایچ جی ویلز نے حال میں ایک مقالہ لکھا ہے "جنگ کردو کا دو یا سر جھکا دو"۔ وُہ کہتا ہے کہ دنیا میں ایک عظیم انقلاب آگیا ہے۔ سائنس کی بدولت ہمارے پاس ہر شے کی بہتات ہے صرف اک امن کی ضرورت ہے کہ ہم دُنیا بھر کو نہال کر دیں۔ لیکن موجودہ نظام مہذب انسان کی بے چین سرگرمی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جس کا نتیجہ ہے باہمی کشمکش اور جنگ سوم "اگر ہم جنگ کا خاتمہ نہ کریں گے تو جنگ ہمارا خاتمہ کر دے گی"۔ اس کا ایک ہی

علاج ہے پُرانے اداروں کی قطعی تبدیلی یعنی ایک عالمگیر انقلاب اخر میں وہ کہتا ہے کہ جنگ کو اس طرح کہ دنیا بھر کو ایک خاموش انقلاب سے بدل ڈالو اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر یا تم اپنے لئے کہیں گڑھا کھود کر کچھ سونا دبا رکھو جس کے معنی ہیں کہ لوگوں کو دھوکا دو اور یا کسی طرف کو بھاگ نکلو اور پھر پکڑے جاؤ یعنی اس طرح زبردستوں کے آگے ذلیل ہو کر اپنا سر جھکا دو۔ شہرۂ آفاق فلسفی برٹرنڈ رسل کہتا ہے کہ میں ۱۹۱۴-۱۶ء کی جنگ کا مخالف تھا اور بعد میں بھی میونکھ تک میں صلح کا حامی رہا لیکن جب سے میں نے دیکھا ہے کہ جرمنی نے محض معاہدۂ ورسائی کی نا انصافی کا تدارک نہیں کیا بلکہ وہ اب خود دوسروں پر ظلم توڑ رہا ہے اور ایک عالمگیر سلطنت کی داغ بیل ڈالنا چاہتا ہے اُس وقت سے میں بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا حامی ہو گیا ہوں۔ وُہ کہتا ہے کہ "میں یہ تو مشکل ہی سے اُمید کر سکتا ہوں کہ اگر ہم جیت جائیں گے تو دنیا جنگ کے بعد ایک اچھی دنیا ہو جائے گی لیکن اگر ہم ہار جائیں گے تو غالباً ایک مدت تک دنیا جہنم کا نمونہ بنی رہے گی" ہاں مجھے اس کی اُمید ہے کہ جنگ کے خاتمے پر لیگِ اقوام سے کوئی کم نکما ادارہ مرتّب کیا جائے گا جس کے قیام سے ہمیں دُنیا کی فیڈریشن کی ایک جھلک دکھائی دینے لگے گی۔ مشہور انشا پرداز جوڈ کہتا ہے کہ تمدّن کا پہیہ سر پھیر کر پھر وہیں آتا معلوم ہوتا ہے جہاں پہلے تھا۔ چنانچہ اشتمالی مصنف جان سٹریچی نے حال میں پہلی بار محبت اور صداقت کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اب اکثر سوشلسٹ اخلاقی تصورات کا اُس طرح ٹھٹھا نہیں اُڑاتے جیسا کہ وہ اڑایا کرتے تھے۔ اب زندگی کا مقصد صرف اس کا اپنا قیام نہیں بلکہ اُس میں اچھی زندگی کے عناصر یعنی حسن اور صداقت اور نیکی اور محبت بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں فرصت تعلیم اور مالی اطمینان کی ضرورت ہے۔ زندگی میں نری جدوجہد کافی نہیں باہمی محبت بھی ضروری ہے۔ مارکسیت نے صرف زندگی کے معاشی پہلو اور ذرائع پر زور دیا۔ سچی اشتراکیت ہمیشہ اخلاق اور مقاصد کو پیشِ نظر رکھتی ہے۔ جوڈ کہتا ہے کہ آکسفورڈ میں جو پچھلے دس سال اشتمالیت کا مرکز بنا رہا آج اخلاق کی پکار سنائی دیتی ہے مثلاً یہ کہ کیا خدا کا منشا تھا کہ یہ جنگ برپا ہو؟ آکسفورڈ کی مشہور یونین سوسائٹی میں حال میں ایک مباحثہ ہوا اور طلبا اس نتیجے پر پہنچے کہ جنگ کے بعد دنیا کی تجدید کی ضروری شرط یہ ہے کہ وُہ منظّم مذہب کے ذریعے سے خدا کی طرف پھر رجوع کرے۔ مباحثے کے بعد ایک شخص نے خوب کہا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ "خدا آنے والا انسان ہے"۔ دنیا کی آئندہ اصلاح یا درستی کے لئے قوت کا استعمال ضروری ہے لیکن بغیر محبت کے قوت صرف بے سُود نہیں ضرر رساں بھی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جون ۱۹۴۱ء میں اپنی ایک ریڈیوی تقریر میں کہا کہ "جنگ کے بعد دُنیا میں غالباً چار بڑے وفاق ہوں گے برطانوی امریکن وفاق اور یورپی اور روسی اور جاپانی وفاق۔ سرمایہ داری کا نظام ختم ہو جائے گا معیشت کسی منصوبے کے ماتحت ہو گی لیکن یہ دُنیا نئی دنیا نہ ہو گی کیونکہ اداروں سے عقیدے نہیں بدلتے۔ انسانیت کے دل میں تلاطم ہونا لازم ہے نئے ادارے کافی نہیں یہ راہیں ہیں منزل نہیں۔ نئی دنیا کے لئے نیا ایمان ضروری ہے۔ نئی دنیا ایسے سیدھے سادے آدمیوں کی شکل میں ظاہر ہو گی جو بے غرض بے تکلّف اور نیک آدمی ہوں گے جو دل کی بات کہیں گے اور وہ سب کے دل میں اُترے گی، وہ اداروں کو نہ بدلیں گے آدمی کو بدلیں گے۔ جو کچھ کام کا ہے وہ لے لیں گے مگر رُوح سب کی بدل دیں گے"۔

موجودہ جنگ میں کون جیتے گا اور کب تک؟ کس نظام کی فتح ہو گی اور کس حد تک؟ یا کیا سب ملیا میٹ ہوں گے یا سبھی تھک کے چور ہو جائیں گے؟ نہیں معلوم کیا ہو گا؟ —— ہاں دنیا بدلے گی ضرور، خدا کرے اچھی بدلے!

بشیر احمد
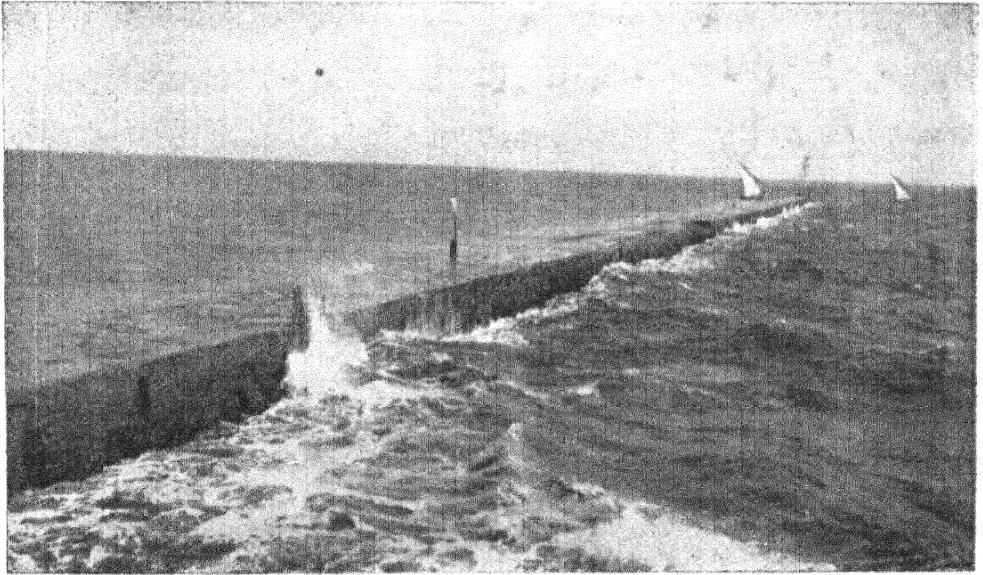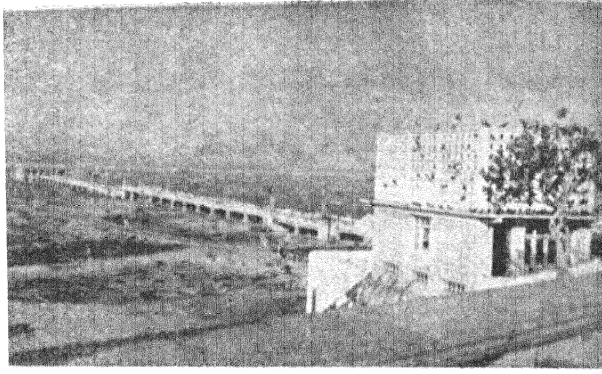
کراچی میں سمندر کا نظارہ

چند دن سمندر کے کنارے

سمندر سے مجھے ہمیشہ محبت رہی ہے۔ جب کبھی پہاڑ اور سمندر کا مقابلہ ہُوا میں نے ہمیشہ سمندر کا ساتھ دیا۔ پہاڑ اٹل ہے لیکن سمندر میں جنبش ہے زندگی کی نشانی۔ میرا بس چلے تو میں سمندر کو ذوی العقول اشیاء کے زمرے میں جگہ دُوں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر جانداروں میں شامل ہے۔ پھر سمندر میں ایک اَور عجیب و غریب کیفیت پائی جاتی ہے۔ پہاڑ کثرت کی جلوہ گاہ ہیں تو سمندر وحدت کا آئینہ دار ہے۔ دُنیا کی تمام چیزوں میں شاید سمندر ہی ہے جو خدائے لایزال کی طرح واحد یکتا اور لامتناہی معلوم ہوتا ہے۔ جب میں سمندر کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو کبھی کبھی ایسا محسوس کرتا ہوں گویا میں خدا کے حضور کھڑا ہوں۔ وُہ افق تک اُس کی یکسانیت، وُہ دُور دُور اور اُس سے بھی دُور محض اُسی کا وجود، وُہ اُس کی پاکیزگی، وُہ اُس کی قوّت و عظمت، وُہ اس کی گہرائیاں ہر چند کہ یہ سبھی محدود ہیں مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی حد نہیں کوئی انتہا نہیں اور اگر ہے تو وہ لامحدودیت سے ہم کنار ہے۔ اگر میں اَن دیکھے خدا کا ماننے والا نہ ہوتا اگر میرا میلان یہ ہوتا کہ میں اُسے پوجوں جو دکھائی دے تو دُنیا کی سب چیزوں میں سے میں سمندر کو چُن لیتا اَور اُس کے سامنے سرِ نیاز خم کرتا۔ اپنے سکون میں بھی مُتحرک، اپنی کثرت میں بھی واحد، اُس کی سخت گیری نرمیوں کا مجموعہ، انتہائی خاموشی اُس کی گہرائیوں میں، قیامت کی شورش اُس کے طوفانوں میں، ہر روز اُس کی شان نرالی، ہر لمحہ زندہ ظاہر اور زبردست لیکن بایں ہمہ پُر اسرار اور ہمیشہ اپنے اندر مستغرق! ساحل سے دُور سمندر میں جہاں سمندر ہی سمندر ہو نیلے رنگ کی حکمرانی ہے۔ اُدھر اُوپر کو ہر طرف نیلا آسمان اور اِدھر نیچے دائیں بائیں آگے پیچھے نیلگوں سمندر، اُدھر اُوپر خاموش و روشن آسمان اور اِدھر نیچے بھی ایک آسمان زندہ و مُتحرک ہلتا ہلاتا جھُولتا جھُلاتا! —— گویا ہماری سیمابی طشتری پر کسی کا "جامِ واژگوں"!

یہ تھے میرے خیالات سمندر کے متعلق یہ تھی میری عقیدت اُس سے جب اس دفعہ ۱۹۴۲ء کے موسم گرما میں مَیں نے اپنے بیوی بچوں سمیت کراچی کا رُخ کیا۔ اِس سے پہلے بھی مَیں دو بار کراچی آچکا تھا۔ پہلی بار جب ۱۹۰۹ء میں سولہ برس کی عمر میں مَیں اپنی والدہ کی معیّت میں یہاں آیا اَور میں نے پہلے پہل سمندر کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا اور دوسری بار جنوری ۱۹۱۸ء میں جب والدِ محترم کی رحلت سے چھ ماہ قبل وُہ اور میں تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے یہاں آئے اور مجھے اس ہمایونی صحبت سے تنہا مستفید ہونے کا آخری موقع نصیب ہُوا۔

چند روز ہوئے دو تین خط ہاتھ آئے جن سے اُن گزرے ہوئے وقتوں کی یاد تازہ ہوئی بہ منظر کو ایک کتاب میں سے میرے بہنوئی کا بھیجا ہُوا ایک تصویری کارڈ ملا جو لندن میں ۲۰ جولائی ۱۹۰۹ء کا لکھا ہُوا تھا اور جو مجھے کراچی میں ۱۰ اگست کو پہنچا۔ کارڈ پر آکسفورڈ کی تصویر تھی وہی

آکسفورڈ جہاں بعد میں میں نے تعلیم حاصل کی اور جہاں میرے بعد ہمارا اصغر گیا اور وہاں سے واپس نہ آسکا۔ دو خط والدِ مرحوم کے تھے جو انہوں نے کراچی کے ایک دوست کے نام سولن اور شملے سے مئی ۱۹۱۸ء میں لکھے۔ ان میں اپنے آئندہ پروگرام کا ذکر کیا ہے وُہ پروگرام جو موت کے ہاتھوں اُسی سال ۲ر جولائی کو ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ خط میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے اور نیچے دستخط والدِ مرحوم کے تھے۔ کاغذ اور دستخط موجود ہیں دستخط کرنے والا چل دیا۔ یہ یادگاریں ہمارے لئے کتنی قیمتی اور کتنی دل خراش ہوتی ہیں!

کراچی کیا وہی کراچی ہے؟ کہتے ہیں اس عرصے میں یہاں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں یہ شہر پہلے سے وسیع ہوگیا ہے بندرگاہ پہلے سے بڑی ہوگئی ہے۔ مانا جگہیں بھی تھوڑی بہت بدلتی ہیں لیکن اصلی تبدیلی تو انسان میں ہوتی ہے۔ پہلی بار جب میں نے کراچی کو بچپن کی آنکھوں سے دیکھا تو کراچی اور تھی۔ دوسری بار جب میں نے اس پر جوانی کی نظر ڈالی تو اور تھی اور اب اس عمر میں زمانے کی اونچ نیچ سے گزر کر اسے دیکھ رہا ہوں تو یہ کچھ اور ہی نظر آرہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا تو کچھ ویسی ہی رہتی ہے لیکن انسان اسے اور کا اور بنا دیتا ہے۔

ایک بات مجھ میں تھی رہی اور اب تک ہے سمندر کی کشش۔ جب ۱۹۱۰ء میں تعلیم کی غرض سے میں انگلستان گیا تو سمندر کو جی بھر کے دیکھا۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں تو سمندر سے اکثر ہی واسطہ پڑتا تھا۔ انگلستان میں کوئی جگہ نہیں جو سمندر سے چھ گھنٹے کی مسافت سے زیادہ فاصلے پر واقع ہو۔ اسی لئے انگریزوں کو قدرت نے گویا زبردستی لیکن ساتھ ہی آسانی سے سمندر کا مالک بنا دیا اور سمندر ہی کے طفیل یہ دُنیا کے پانچویں حصے پر حکمران ہو کر نپولین اور ہٹلر کو دُور باش کہتے آج تک اپنے گھر میں تقریباً محفوظ بیٹھے ہیں۔

کہنے کو تو ہندوستان کا ساحل کئی ہزار میل لمبا ہے اور اس لئے یہاں کے باشندوں کو سمندر سے قریب کا تعلق ہونا چاہئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ کم از کم ہم شمالی ہندوستان والے خالص خشکی کے رہنے والے ہیں اور سمندر کو ظاہراً ہماری زندگی سے دُور کی نسبت بھی نہیں ہمیں ناز ہے تو اپنے ہمالیہ اور اُس کی فلک بوس چوٹیوں پر یا پھر اُن پانچ دریاؤں پر جن کا نام لیوا پنجاب ہے۔

میں جب کہیں کسی نئی جگہ کی سیر کو جاتا ہوں تو وہاں پہنچتے ہی پہلے اُس کا نقشہ ڈھونڈتا ہوں۔ ایسا ہی میں نے یہاں کیا۔ ایک کتب فروش کی دُکان پر پہنچا۔ کہا کراچی کا "رہنما" اور نقشہ درکار ہے۔ نقشے کا نام سنتے ہی اُس نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور مسکرا کر انگلی سے نفی کی علامت بنائی۔ میں حیران ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اُس نے کہا چند دن ہوئے ہم نے کراچی کا نقشہ اپنی دکان کے باہر لٹکا رکھا تھا کہ ایک انگریز افسر غصے میں بھرا ہوا اندر آیا اور اُس نے کہا "تم لوگ لڑائی کے زمانے میں یہ نقشہ یہاں لٹکاتا ہے؟" یہ کہہ کر اُس نے نقشے کے پُرزے پُرزے کر دیئے تاکہ کہیں کوئی "پانچویں کالم" والا جرمن پسند شخص اس پر اپنا ہاتھ نہ ڈال سکے۔ میں نے "قانونِ تحفظِ ہند" کو یاد کرتے ہوئے اپنے گھر کا رُخ کیا۔ ابھی پچھلے مہینے مئی میں عراق میں وہاں کی نئی حکومت اور انگریزوں کے درمیان چپقلش ہوئی تھی، جرمن خطرہ کراچی میں ہوّا بن کر نظر آرہا تھا، کئی ہزار لوگ یہاں سے بھاگ نکلے تھے۔ ہم چھ مہینے کے لئے سمندر کے کنارے کلفٹن میں ایک کوٹھی کرایے پر لے چکے تھے ہم نے مصلحت اور ہمت اسی میں سمجھی کہ جرمن خطرے کے ہوتے ہوئے بھی ڈٹ کر اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ شہر کو "بلیک آؤٹ" کے ذریعے کال کوٹھڑی بنانے کا محکمہ جسے انگریزی میں A. R. P اور سندھی میں "ھوائی حملہ جی بچاء"

کا لقب دیا گیا مدت سے قائم ہو چکا تھا۔ ہم کو بھی اس کا تھوڑا سا تجربہ ہوا۔ ہماری کوٹھی "خدیجہ منزل" عین سمندر کے کنارے ہونے کی وجہ سے سامنے کے فوجی جزیرے منورا سے اپنے بجلی کی روشنیوں کی وجہ سے فوجی دُوربینوں کا نشانہ بن گئی۔ ایک رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے دو انگریز ہمارے ہاں آدھمکے جن میں اے۔آر۔پی کا اعلیٰ ترین افسر بھی تھا۔ بدقسمتی سے حضرت شراب کے نشے سے مسرور ہو رہے تھے ہمیں اُنہوں نے یوں بجلی جلائے رکھنے پر ایسے الفاظ میں ڈانٹا کہ قریب تھا کہ ہمارے ایک عزیز اور ایک دوست سے جو اُس وقت یہاں موجود تھے اِن کی ہاتھا پائی ہو جائے۔ افسر صاحب یہ کیفیت دیکھ کر ہمارے مورچے سے ہٹ گئے، ہم نے بھی آئندہ کے لئے اپنی کھڑکیوں پر کالے پردے ڈالنے کا پروگرام بنایا اور جب تک اتحادیوں نے شام کا ملک فتح نہ کرلیا۔

"پردہ چھوڑا تھا وُہ ہم نے کہ اُٹھائے نہ بنے" یہ تھی ہماری پہلی جنگی کوشش"!

ہماری دوسری "جنگی کوشش" سرکارِ دولتمدار کے دولت کدے "گورنمنٹ ہاؤس" میں "رقصِ جنگی" کی نظارہ بازی تھی کہیں شریف آدمی اور عورتیں ناچ رہی تھیں کہیں شریف عورتیں اور آدمی جُوا کھیل رہے تھے۔ ہم نے بھی رات کے ایک بجے تک اپنی بینائی کی ساری قوت اِن شرفا کی حرکات کے مشاہدے میں صرف کردی تاکہ کسی طرح ہٹلر کی پیش قدمی رُک جائے اور وُہ جلد سے جلد ایک معذرت نامہ لکھ کر ہماری خدمت میں گزرانے۔ ہماری تیسری "جنگی کوشش" "جنگی نمائش" میں جا کر ایک مصری مداری کے کرتبوں کی داد دینا اور بجلی سے چلنے والے جھولوں میں اپنے بچوں کو بٹھانا اور انہیں جم کے بیٹھے رہنے کی تاکید مزید کرنا تھا۔ جب ہم لوگ اپنی ساری جمعیت سمیت نمائش گاہ کے دروازے میں داخل ہوئے تو دروازے کے عین بیچوں بیچ V کی فتح انگیز معلق علامت حضرات چرچل و روزویلٹ کے بحرِ اوقیانوس والے "ہشت نکاتی" اعلان کا ڈنکا بجاتی معلوم ہوتی تھی۔ یہ دیکھ سُن کر ہم بھی آمنّا و صدّقنا کہتے نمائش کے ہر محاذ پر بڑھتے اور چڑھتے چلے گئے۔ اپنی چوتھی "جنگی کوشش" زیادہ دل خوش کُن نہ تھی۔ یہ پٹرول کا راشن ہو جانا تھا۔ ہماری نقل و حرکت پر پابندیاں لگائی گئیں ورنہ ہم کارزارِ آزادی میں سبقت کرتے ہوئے خدا جانے کہاں سے کہاں جا پہنچتے!

اس جنگ کے زمانے میں ہم نے قسم قسم کی تکلیفیں اُٹھا کر اور بھی کئی طرح اپنے ایثار کا ثبوت دیا۔ کراچی اگرچہ بے پایاں سمندر کے کنارے واقع ہے مگر گرمیوں میں یہاں خدا کے فضل سے پانی کی کمی ہو جاتی ہے۔ جون کے مہینے میں ایک دن دورانِ غسل میں ہماری کوٹھی کا پانی یک لخت ختم ہو گیا۔ لہٰذا دوسرے ہی دن محض نیک نیتی سے ہم نے یہاں کے مقامی "آبدار" کو بلا بھیجا اور ایک مسلّمہ دستور کے مطابق اُس کی مُٹھی گرم کردی۔ پھر کیا تھا جس طرح ہوا دن رات فرفر چلتی تھی اُسی طرح پانی بھی دن بھر شرشر آنے لگا۔ آج کل کی مصروف مہذّب دُنیا میں براہِ راست تعلق پیدا کرلینا زیادہ آرام دہ اور قرینِ مصلحت ہے ورنہ اگر ہم باقاعدہ طور پر کمیٹی میں درخواست دیتے تو ظاہر ہے کہ اُس میں کتنی کچھ دقتوں کا سامنا ہوتا۔ مُنہ اُٹھائے ہوئے بے سوچے سمجھے نیکی کرتے چلے جانا عقلمندی نہیں۔

ہم نے بہت سی دوڑ دھوپ سے یہ بنگلہ سمندر کے کنارے حاصل کیا تھا، جب ہم یہاں آئے تو سمندر کو اپنے قدموں میں لوٹتا

دیکھ کر مطمئن ہوگئے ہمارے نصب العین کے اور ہمارے درمیان صرف چمکتی ہوئی ریت کا چھوٹا سا خطہ تھا۔ لیکن ہمیں جلد معلوم ہوگیا کہ لذتِ وصال اتنی آسان نہیں۔ پہلے تو یہ ہوا کہ سمندر کی زندگی بخش ہوا اس قدر تند و تیز نکلی کہ ہم بفضلہ چوبیس گھنٹے ریت پھانکنے لگے۔ کپڑوں پر، بدن کے روئیں روئیں میں کھانے پینے کی ایک ایک چیز میں ریگِ رواں کا جلوہ نظر آنے لگا۔ سمندر سمندر سمندر! یہ تو سامنے تھا ہی لیکن اس جنتِ نگاہ کے ساتھ جب ریت ریت ریت اور چمک چمک چمک مل گئیں تو جلوۂ جاناں سے نگاہیں خیرہ ہونے لگیں اور خصوصاً میری جس کا یہ حال ہے کہ

نزاکت اس گلِ نرگس کی دیکھیو بھیّا! شعاعِ مہر جو چھو جائے آنکھ ہو خیرہ

بہت کوشش کی کہ ریگستان کے نظارے سے عربستان کی یاد تازہ ہو اور اونٹوں والی گاڑیوں سے پاکستان کا سلسلۂ رسل و رسائل مگر ہندوستان کے اس شہری تہذیب کے خوگر اس منحنی نازک بدن بدلیسی میہماں کو یہ تیز ہوا اور یہ چمک دمک راس نہ آئی پر نہ آئی۔ نازک آنکھوں کے لئے یہ "جلوۂ طور" نگاہ سوز ثابت ہوا۔ مجبوراً خانہ نشین ہونا پڑا۔ لیکن اہلِ معرفت کو چین کہاں نصیب، اُن کے لئے جد و جہد ہی زندگی ہے۔ اول تو نیند تیز ہواؤں ہی کی نذر ہوگئی پھر جو رتجگے کا ذرا لطف آنے لگا تو رات بھر بدن میں خارش ہونے لگی۔ ڈاکٹروں سے صلاح کی خود غور و خوض کیا گھر والوں کے سامنے قصہ بیان کیا مچھلی کھانی چھوڑ دی نیبو پانی پینا چھوڑ دیا مسہل لیا دن کو بستر جھڑوایا کمرہ صاف کرایا مگر وہ اپنے آپ سے شبانہ کشتی بدستور جاری رہی۔ قریب تھا کہ میں خدا کی خدائی سے مایوس ہو جاتا کہ ایک رات جو میں نے اپنی برقی "ٹارچ" جلائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ پسوؤں کی جرمن فوج میرے قلب و عقب و میمنہ و میسرہ پر پلّہ بولتی ہوئی آرہی ہے۔ بہت اُچھلا کودا تڑپا، ہاتھ پاؤں پر امونیا چھڑکا، بدن پر تیل ملا، کسی حسینہ کی طرح منہ پر پوڈر کی تہہ بھی جمالی لیکن جو ہونا تھا ہوا اور ہوتا رہا۔ خدا خدا کرکے صبح ہوئی۔ اب ہم نے اپنے عزیز و اقربا اور متوسلین و ملازمین کو جمع کرکے ایک اتحادی جنگی کونسل قائم کی۔ پلنگ کی نواڑ کھلوادی، آبِ گرم سے اُس کے پائے دُھلوا دیئے، ایک ایک کونے میں فلٹ کی پچکاری چلوائی جب جاکے کہیں اس جرمن غنیم پر فتح پانے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اب جو کبھی اُن راتوں کا سماں پھر نظروں میں پھر جاتا ہے تو شب بیداری کی برکتوں سے دل بیزار ہو جاتا ہے چھٹی ساتویں جماعت کے کورس کی پڑھی ہوئی ایک نظم یاد آتی ہے کہ

جتنا دبایا اُتنا ہی اونچا اُچھل گیا اِن کی تو پھرتیوں سے مرا جی ہی جل گیا

پسو ہمیں ستاتے ہیں صاحب پہاڑ پر

کراچی میں ان دنوں اپنے تینوں بچوں کو زیادہ انگریزی زدہ پاکر میں خود اُنہیں اُردو پڑھانے لگا۔ دن کو رفعت کے ساتھ غالب و اقبال کے کلام سے لطف اندوز ہوتا اور رات کو خواہ مخواہ یہ اشعار وردِ زبان ہوتے :-

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں سونا سوگند ہوگیا ہے غالب

یا پھر وہ کسی بلا کے لیکسدن معین ہونے والا شعر جس میں سوال کیا گیا ہے کہ "نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟"

یا "نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں" جس نے یہاں یہ شکل اختیار کی کہ

رتجگہ اُس کا ہے دُکھ اُس کا ہے کھجلی اُس کی ہے — پسوؤں کی فوج جس کے گھر میں مہماں ہوگئی

پسوؤں پر بہت سی فتوحات پا کر بھی پاؤں کی کھجلی نہ گئی۔ کسی نے کہا تم کو وہم ہوگیا ہے ڈاکٹر نے کہا اعصابی کمزوری ہے میں نے بھی سوچا کوئی ایسی ملی جلی وجہ ہوگی کہ اتفاقاً ایک دن صبح کو میرے سندھی سلیپر پر دو چار چیونٹیاں چلتی دکھائی دیں میں نے پاؤں زور سے جھٹک دیا۔ چیونٹیوں کے ساتھ ایک دو پسو بھی قلابازی لگاتے گرے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ پسوؤں کی قوم سے جو راتوں کو اپنا کاروبار کرتی ہے۔ چیونٹیوں نے ایک صبح آکر انسانی مال ومتاع میں سے حصہ طلب کیا، طرفین میں گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی جس سے پسوؤں کے مورچے کا پتہ چل گیا کہ انہوں نے "گھر بنایا تھا سکوتِ دامنِ بیزار میں"۔ یہ انہیں اہلِ سکوت کی حرکت کی برکت تھی جس نے ایک خاموش طبع انسان کو یوں "مجبورِ نوا" کر دیا ؎

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

یعنی ایک معمولی سے جسمانی حادثے نے دنوں اور راتوں کو روحانیت کے بند دروازے قطعاً وا کر دیئے۔ کیا عجب ہے کہ نوعِ انسان کی بعض بڑی بڑی مہمات دراصل کسی پسو قسم ہستی کے مذاق کا نتیجہ ہوں!

ناانصافی ہوگی اگر میں اِن "روحانیات" سے مرعوب ہو کر انسانی دلچسپیوں کی کہانی بیان نہ کروں۔ کراچی خوب جگہ ہے صاف ستھرا شہر ہے۔ سڑکیں بازار کھلے عمارتیں شاندار موسم معتدل بلکہ کم از کم اکثر پنجابیوں کے لئے ضرورت سے زیادہ معتدل۔ کہتے ہیں کراچی کی آب وہوا ہندوستان میں بہترین ہے مگر اپنا اپنا تجربہ اپنی اپنی پسند فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ طبیعت پر ذرا سستی سی چھائی رہتی ہے۔ لیکن ہماری چستی کی کہانی سنیئے۔ ہوائی جہاز میں سمندر کی سیر کی چڑیا گھر اور اُس کے بندر دیکھے۔ بندرگاہ میں گئے، بادبانی و دخانی کشتیوں میں سوار ہوئے، کراچی کے پاس کی ساحلی سیرگاہیں منورا، سینڈ سپٹ، بلیجی (جس کا نام یاد رکھنے کے لئے میں نے "کلیجی" کا خیال کیا) یہ سب دیکھیں۔ یہاں طوفانی سمندر کی شان نظر آئی۔ بلیجی کراچی سے دس پندرہ میل پر واقع ہے۔ اس کی مستقل آبادی بیس تیس کالے کلوٹے غریب آدمیوں پر مشتمل ہے۔ اُمرا نے یہاں اپنی اتوار کی چھٹی گزارنے کے لئے ذرا ذرا سی چوبی جھونپڑیاں بنا رکھی ہیں جن کی محافظت بلیجیوں کا کام ہے۔ میں بلیجی کے گاؤں میں گیا اور وہاں اُردو میں اُن لوگوں سے بات چیت کرتا رہا۔ میں نے پوچھا اِن پاس کی پہاڑیوں کا کیا نام ہے جواب ملا "جَبَل"۔ اِس جبلِ بلیجی سے مجھے فوراً جبل الطارق کا خیال آگیا!

ہم کراچی کلب کے ممبر ہوگئے لیکن ہم نے دیکھا کہ آج کل کی کلب کی زندگی میں اگر کوئی نہ شراب پیئے پلائے اور نہ جُوا کھیلے اور نہ ٹینس ہی کھیلے تو وہ باقاعدہ طور پر کلب باشی نہیں کر سکتا۔ کلب مغربی تہذیب کا ایک ادارہ ہے۔ "مہذب" ہندوستانیوں کی زندگی مغرب کی یورش سے اصل بے جوڑ ہوچکی ہے ؎

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے — واں کنٹر سب بلّوریں ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے

پنجابی کی ایک ضرب المثل ہے" ذات کی چھپکلی اور شہتیروں سے ہمکنار"۔ یہ حال ہم ۹۹ فی صدی "مہذب" ہندوستانیوں کا ہے۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے"۔ ٹن چاپ چھری کانٹے سے کھا رہے ہیں لیکن اس کے بعد جو سالن کی نوبت آئی تو بائیں طرف رکھی ہوئی انگریزی پلیٹ میں سے دیسی چپاتی دائیں ہاتھ سے کھا رہے ہیں۔ دُھوبی کا کُتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ یہ درست ہے کہ اب پُرانی دُنیا کبھی واپس نہیں آسکتی لیکن ہماری نئی نویلی پیوندلگی دُنیا بھی ہمارے لئے اطمینان بخش ہرگز نہیں مشرقی سُستی اور مغربی چُستی کا ملاپ کچھ کامیاب نہیں رہا۔ اپنے پُرانے تمدّن کو ہم حقارت سے دیکھتے ہیں لیکن نئے فلسفے نے ہمیں زیادہ سے زیادہ نفسیاتی تجزیہ کرنا، بےچین رہنا، انگریزی ہندوستانی کو ملا کر بولنا، اپنی آمد سے اپنا خرچ بڑھانا ہر تیسرے دن کسی پارٹی میں شریک ہونا ہر دوسرے دن سینما دیکھنا اور ہر روز تازہ ترین خبروں کے لئے اخبار پڑھنا سکھا دیا ہے۔ اس کا کیا انجام ہوگا؟ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اس وقت رَو تیز ہے ہم سب بہے جا رہے ہیں۔ دیکھئے کیا ہو؟

سندھ کی سیاست عام ہندوستانی سیاست سے بہتر نہیں شاید بدتر ہی ہو۔ یہاں بھی کانگرس ہے لیگ ہے ترقی بھی ہے لیکن زیادہ تر جاہ طلبی ہے خود غرضی ہے تعصّب ہے۔ مسلمان ۷۲ فی صدی ہیں لیکن زیادہ تر غیرمسلم اثرات کے تحت میں ہیں۔ کانگرس اور صوبوں میں عدم تعاون کرتی ہے لیکن یہاں وزارت سے تعاون ہے۔ ہندو مسلم کشمکش کی ایک نہایت دلچسپ اور سبق آموز مثال یہاں سننے میں آئی۔ محکمۂ تعلیم والوں نے ایک علمی اصلاح کا اعلان کیا کہ قاعدے اور کتابوں میں جو غلط اعراب لگائے جاتے ہیں وُہ درست کئے جائیں۔ مخالفین نے اعتراض کیا کہ یہ عربی کی نقل ہوگی اور محض مسلمانی کا مظاہرہ۔ مصلحین نے مثال دے کر کہا کہ لفظ بکری میں بجائے ی کے زیر ر کے نیچے لکھی جانی چاہئے۔ مخالفین نے اصرار کیا کہ ی کے نیچے سے زیر نہ ہٹائی جائے۔ میرے پاس سندھی کا ۱۹۲۸ء کا سرکاری قاعدہ ہے جس میں کتاب کے نام میں سندھی کا لفظ یوں لکھا ہے سندھِی۔ اس بات پر سخت شورش برپا کی گئی کہ ی کے نیچے سے زیر نہ ہٹائی جائے۔ واہ رے ہندی جذبۂ قومیّت! ہلکی نظر سے دیکھئے تو کئی مزیدار چیزیں دکھائی دیتی ہیں یہاں کی بعض توندل اور بعض منحنی شخصیتیں بُھلائی نہیں جا سکتیں۔ ایک دفعہ کہیں پڑھا تھا کہ دُبلے آدمی چڑچڑے ہو جاتے ہیں لیکن موٹے آدمی زندہ دل رہتے ہیں۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ انسانی چربی میں بہت کچھ سما جاتا ہے فربہی بہت کچھ ہضم کر لیتی ہے وُہ گھبراتی نہیں بےچین نہیں ہوتی مست رہتی ہے جو آئے سو آئے اور سر سے گزر جائے اِس لئے فربہ آدمی اچھا سیاست دان بن سکتا ہے۔ وُہ اصول پرست نہیں ہوتا مصلحتِ وقت کو دیکھتا ہے ہزار آفت آئے اُس کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور سو جائے تو کوئی اُسے جگا نہیں سکتا۔ ؎

سودا کے جو بالیں پہ گیا شورِ قیامت
خدّامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

سندھ میں بھی "فربہ خواہ مخواہ معتبر" کا تجربہ ہوا۔

ہم امیر لوگ غریبوں کی حالت سے بہت کم آگاہ ہوتے ہیں اور پھر اگر کوئی امیر گوشہ نشین ادیب یا پاکباز فلسفی بن کر

اپنے محل میں محصور ہو جائے تو اُسے لوگوں کی حالت سے اَور بھی کم واقفیت ہوتی ہے۔ اُس کی نزاکت اَور لطافت اُسے اجازت نہیں دیتی کہ وُہ ایک ہمدرد دل رکھتے ہوئے بھی عام لوگوں کے رنج و راحت میں شریک ہو اور اس طرح زندگی کی اُونچ نیچ سے آگاہ ہو سکے۔ پھر بھی غربت اَور عُسرت کی ہمہ گیری کا یہ حال ہے کہ کوئی شخص جس میں ذرا سا احساس بھی باقی ہے اپنے گرد و نواح سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری کوٹھی سے دو تین سو گز کے فاصلے پر نشیب میں ایک چھوٹی سی بستی ہے جس میں دس بارہ ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں ہوں گی۔ یہاں سے ہر صبح و شام چند بچے سمندر کے گھونگے اور سیپیاں لے کر آتے اور سیر کرنے والوں سے خریدنے کو کہتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا تو معلوم ہُوا کہ یہ بھیل ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے جھگڑالو اپنے محلوں اور گھروں میں مزے سے بیٹھے ہیں اور ملک کے اصلی باشندوں کو جھونپڑیاں بھی نصیب نہیں!

صبح و شام سمندر کی سیر کو جاتے ہوئے بیسیوں مچھیرے نظر آتے تھے۔ اِن کے علاوہ کوئلے والے تھے۔ میرے لئے یہ ایک نئی بات تھی کہ کوئلہ سمندر سے بھی نکلتا ہے۔ ایک کوئلے والے سے میں نے پوچھا جو کوئلے کا ایک بہت بڑا ٹکڑا شاید من ڈیڑھ من کا اپنی پیٹھ پر اُٹھائے لئے آ رہا تھا کہ وُہ ہر روز کتنا کوئلہ سمندر سے لاتا ہے اور کتنی کمائی کر لیتا ہے۔ اُس نے کہا پندرہ آنے روپیہ روز کما لیتا ہوں۔ میں نے پوچھا ہر روز؟ اُس نے کہا صاحب یہ صرف انہیں دنوں میں ہے جب کہ سمندر اپنی جوانی پر ہوتا ہے۔ اِدھر سمندر صرف دو تین چار مہینے جوش میں رہتا ہے اور اپنا سارا کوئلہ باہر نکال پھینکتا ہے۔ پھر جب بارش کے موسم کے بعد سمندر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو کوئلہ آنا بند ہو جاتا ہے۔ اگر مجھے یہ نہ بتایا جاتا تو میں شاید یہی سمجھتا کہ یہ سارا کوئلہ برطانوی بحری بیڑے کی خیرات ہے ہمارے ملک کے لئے۔

ایک دن میں نے یہاں کے اخبار میں پڑھا کہ دن دہاڑے تین ڈاکٹروں پر چند ڈاکو آ پڑے اور ذرا اُن کی مرمت کر دی ایک ڈاکٹر صاحب نے جو ہندو تھے دُہائی بھی دی کہ میں تو مسلمان ہوں مگر اتنے میں مسلمان ڈاکٹر صاحب بھی پٹ چکے تھے۔ پولیس کا بیان ہے کہ مہذب حضرات کی طرف سے کچھ چھیڑ خانی ہوئی تھی۔ اسی طرح کا واقعہ ایک دن ہمارے تین بچوں کو بھی پیش آیا۔ ایک دن شام کے وقت تین عدد ڈاکو اِن کو سمندر کے کنارے گھیر بیٹھے۔ لیکن یہ ڈراما جلد ختم ہو گیا۔ ایک ڈاکو منظر کو الگ لے گیا اور اُس سے کلمہ پڑھنے کو کہا۔ یہ نمازی تھے فوراً فر فر کلمہ پڑھ دیا۔ اس پر خُدا ترس ڈاکو نے دوسروں سے اصرار کیا کہ یہ سب رہا کر دیئے جائیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اِن مُبلّغین کو خاطر خواہ سزا مل گئی۔ لیکن ذرا غور کرو تو ایسے واقعات عموماً اُس بے پناہ غربت کا پتہ دیتے ہیں جو یُوں تو ہندوستان جنّت نشان کے ہر کنجِ عافیت میں پناہ گزیں ہے لیکن جو خاص کر سندھ سے ریگستان میں جلوہ نما ہے ایسے واقعات کی فہرست میں ہمارے ہندو بھائی بھی مسلمانوں سے پیچھے نہیں۔ چنانچہ (Oyster Rock) سمندر کی چٹانوں والے سنسنی خیز قتل کا مقدمہ ہمارے دوران قیام ہی میں ہوا۔ ایک دُور اندیش شخص ہن سکھانی نے جس کی آمدنی ۵۵ روپیہ ماہوار تھی فروری ۱۹۴۳ء میں ایک خاتون سے شادی کی اور شادی کے جلد بعد مختلف بیمہ کمپنیوں سے خط و کتابت کر کے اپنی شریکِ حیات کا تقریباً بیس

ہزار روپیہ کا بیمہ کرالیا اور کمپنی سے یہ طے کرلیا کہ اگر میری بیوی خُدانخواستہ ڈوب گئی تو کمپنی فوراً مقررہ رقم ادا کردے گی۔ اِس کے بعد ایک طرف تو ان حضرت نے اپنی بیوی سے بے حد محبت کرنی شروع کردی اور دوسری طرف اُن تمام مقامات کا جائزہ لینا شروع کیا جہاں سے عدم آباد کو سیدھا رستہ جاتا ہو۔ اتنے میں وُہ بھلی مانس حاملہ ہوگئی۔ اب اس عقل مند کو اَور بھی فکر لاحق ہوگئی چنانچہ اکتوبر ۴۰ء میں ایک دن آپ اُسے محض تھوڑا سا زیور پہنا کر کلفٹن کے سامنے والی خطرناک چٹانوں میں (جو سمندر کے عین بیچ میں واقع ہیں) سیر کے لئے گئے اور شام کے وقت اُسے احتیاط سے سمندر میں دھکا دے کر شور مچانا شروع کردیا ہائے میری بیوی ہائے میری بیوی۔ ملاح بھاگے آئے تو کہا یہ سنبھالو میری سونے کی گھڑی میں تو ابھی مرتا ہوں۔ انہوں نے دم دلاسا دیا۔ مجبوراً مان گئے۔ مقدمہ چلا اور دو دفعہ چلا جب کہیں جاکر یہ فیصلہ ہوا کہ اِس باوفا شوہر کو سرکار کے خرچ پر جلد اپنی چہیتی بیوی کے پاس پہنچا دیا جائے۔ آل انڈیا نسوانی کانفرنس کو ایسے بیوی پھینک مردوں کے حق میں خاص ریزولیوشن پاس کرنا چاہئے!

ہندوستان کی بعض اَور سوغاتیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ پیر پرستی کا خوب زور ہے۔ "خواجو خضر" سندھ کے "زندہ پیر" ہیں ہندو بھی انہیں دریائے سندھ کا دیوتا مانتے ہیں۔ سکھر کے مقام پر دریا میں ایک جزیرے پر ایک درگاہ اُن کے نام سے منسوب رہی۔ علاوہ بریں پیر پگّڑ شاہ' پیر ظاہر الدین' داتا لاکھ پرشاد اور اَور خُدا جانے کَون کَون؟ اِس پیر کے پیرو اُسے خُداوند مانتے ہیں اُس داتا کے ہاں مرد عورت اور عورت مرد بن جاتی ہے۔ نہ مسلمان اِس مرض سے بری ہے نہ ہندو۔ مغرب کم ازکم اِس بلا سے تو محفوظ ہے۔ کیا پیر پرستی خدا پرستوں ہی کے لئے وقف ہے؟ "ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!" ہمارے قریب سمندر کے کنارے ہندو مُسلمانوں کے ماتھا ٹیکنے کی جگہیں ہیں۔ ایک طرف پیئر[1] (Pier) کے ساتھ ایک مہادیو کا مندر ہے جس کے باہر جلی حروف میں لکھا ہے کوئی غیر ہندو اندر نہ آنے پائے۔ مندر ایک کھوہ میں بنا ہے۔ اندر ایک مورتی ہے کچھ پجاری ہیں ایک لمبے بالوں والا سادھو بھی بھبھوت رمائے بیٹھا ہے۔ ساتھ ایک کبوتر خانہ ہے۔ جس میں سینکڑوں پالتو کبوتر ہیں۔ جتنا دانہ پانی اِن پرندوں کے لئے مہیّا کیا جاتا ہے شاید اِن کے بعض ہمسایہ انسانوں کو کبھی نصیب نہ ہوتا ہو۔

چار پانچ سو گز کے فاصلے پر ایک ٹیلے کے اُوپر غازی عبداللہ شاہ کا مزار ہے۔ نیچے ٹیلے کی کھوہ میں ایک پنجابی مجاور صاحب مع اپنی بکریوں گایوں اور حواریوں کے جلوہ گر ہیں۔ مجھے دیکھ کر ایک حواری نے کُرسی آگے رکھ دی۔ میں بیٹھ گیا۔ مجاور صاحب فرمانے لگے یہ حضرت غازی عبداللہ شاہ کا مزار ہے جو سندھ میں محمّد بن قاسم کے ہمراہ چھ سو سال ہوئے آئے اور یہیں شہید ہوئے۔ میں نے سوچا کہ محمّد بن قاسم کو یہاں آئے چھ دُونی بارہ۔ بارہ سو سال ہوگئے مگر میں نے بحث چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد اشارہ ہُوا تو ایک دوسرا حواری مجھے کھوہ کے اندر لے گیا اور کہا کہ دیکھئے

---

[1] پیئر ساحلی مقامات میں ایک کئی سو گز لمبی پل نما عمارت ہوتی ہے عموماً سمندر کے کنارے پانی میں ایک آبی تفریح گاہ کے طور پر بنائی جاتی ہے۔ لیکن کلفٹن کا یہ پیئر پانی تک نہیں پہنچتا۔

خُدا کی قدرت اور غازی صاحب کی برکت کہ عین کھاری سمندر کے کنارے اِس کھوہ میں میٹھے پانی کا چشمہ جاری ہے۔ سینکڑوں عقیدت مند ہر روز دُور دراز مقامات سے آتے ہیں اور یہ مقدس پانی پیتے اور اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر اُس نے گلاس پیش کیا۔ نیم اندھیرے میں مجھے کچھ تری سی دکھائی دی۔ کہنے کے مطابق میں نے اپنا بوٹ اُتار دیا اور چشمے کی زیارت کو آگے جھکا لیکن زیارت کرنے کے بعد میں نے پانی پینے سے معذوری ظاہر کی۔ خضر آبِ حیات پیش کر رہا تھا، سکندر ہی کو پینے کی توفیق نہ ہوئی۔ حواری نمبر ۲ نے کہا دیکھئے ہندوؤں نے بھی مندر سمندر کے کنارے بنایا اور بہتیری کوشش کی مگر اُن کی کھوہ میں سے پانی نہ نکلا پر نہ نکلا۔ میں نے خیال کیا واہ یہ بھی خُدا کی مہربانی اور ایشور کی کرپا ہے کہ روزِ روشن میں ہندو مسلمان اپنی اپنی کھوہ میں رام اور رحمان سے لَو لگائے بیٹھے ہیں۔ اُدھر کھوہ میں رہے ہیں اِدھر میٹھے پانی کی سبیل لگی ہے اللہ اکبر! منظر اور میں اپنے قیام کے آخری دنوں میں اپنا اپنا کیمرہ لئے جا بجا گھوم کر تصویریں لیتے رہے۔ ایک دن ہم غازی کی درگاہ میں بھی جا پہنچے۔ مجاور صاحب فوراً اپنی کھوہ سے نکل کر نیا عمامہ پہن کر کسی سینما سٹار کی طرح شوق سے تصویر اُتروانے کو تیار ہو گئے۔ میرے تجربے میں تصویر کھچوانے کا شوق ہر زندہ ہستی کو دامن گیر ہے۔

ایک دفعہ ایک سندھی آئی سی ایس مسٹر کرپلانی نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ سندھی زبان میں ایک زبردست شاعر گزرے ہیں شاہ عبد اللطیف۔ اُنہوں نے کہا اِنہیں دُنیا کے بہترین شاعروں میں شمار کرتا ہوں۔ سو سندھ میں آکر مجھے اکثر شاہ عبد اللطیف یاد آتا۔ ایک سندھی ہندو میلا بہ شوق دیکھ کر ایک رات ہمیں صوفیوں کی ایک مجلس میں لے گئے۔ مجلس ایک ہندو "صوفی" کے بنگلے میں منعقد ہونے والی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ ہر اتوار کو یہ لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ کمرے میں ایک تخت تھا جس پر ایک داڑھی والے بزرگ کی بڑی تصویر رکھی تھی۔ اس کے سامنے سب لوگ عورتیں مرد فرش پر بیٹھے تھے ہم بھی بیٹھ گئے۔ جو عقیدت مند آتا وہ داڑھی والے بزرگ کی تصویر کے سامنے جا کر سر جھکاتا اپنے ہاتھوں کو چومتا اور فرش پر بیٹھ جاتا۔ میں نے اپنے "فرشتۂ رحمت" سے پوچھا یہ کن بزرگ کی شبیہِ مبارک ہے۔ جواب ملا کہ یہ ہیں "سخی قبول محمدؐ" جو ۹۰ سال کی عمر میں تھوڑا عرصہ ہوا عالمِ بقا کو سدھارے۔ یہ بڑے بزرگ تھے بڑے صوفی تھے بہت لوگ اِن کے معتقد ہیں۔ تیس چالیس آدمیوں میں ہمارے علاوہ دو تین آدھی اور پوری داڑھی والے مسلمان تھے باقی سب ہندو مرد و عورتیں تھیں۔ رفتہ رفتہ گانا بجانا شروع ہوا ہارمونیم گھڑا ستار سارنگی اِن سب سے معرفت کی تانیں نکلیں خاص سماں بندھ گیا جس سے معتقدین پر ایک خاص کیفیت چھاگئی۔ موسیقی نے مجھ پر بھی اثر کیا۔ ایک نوجوان ہندو نے جو کراچی میں سندھی کے پروفیسر ہیں بڑے جوش سے ایک کافی گائی جس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے "نہ میں تاب نہ میں بے تاب نہ میں آب و ناب ناب!" لیکن سچ یہ ہے کہ اُن کے نغموں نے آب و تاب بھی پیدا کی اور تاب بھی اور بے تابی بھی، شاید صوفیوں کی دُنیا میں نفی اثبات کے معنی رکھتی ہو! ایک شخص کے پاس بیاض تھی میں نے اُٹھا کر دیکھی تو اُس میں شاہ عبد اللطیف کی ایک آدھ کافی بھی تھی۔ مطلوبہ تعارف ہو گیا۔

اِنہیں شاہ عبد اللطیف کے نام اور کلام کی کشش کے سبب میرے دل میں اُمنگ اُٹھی کہ میں ایک سندھی قاعدہ حاصل کر کے سندھی کی اب ت سیکھ لوں۔ زبانیں سیکھنے کا یوں بھی مجھے شوق ہے۔ جس ملک یا صوبے میں جاؤں کم از کم

وہاں کی زبان کے حروف اور چند فقرے سیکھنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ جب یہ سیکھ لیتا ہوں تو شوق اور اُس کے ساتھ میرا مبلغ علم پورا ہو جاتا ہے۔ سندھی قاعدہ حاصل کر کے چند روز میرا یہ معمول ہو گیا کہ کسی باغ میں جس بسر کرنے والے یا کسی پارٹی میں جس سندھی جاننے والے واقف کار کو دیکھ پاتا فوراً جیب سے سندھی قاعدہ نکال کر سبق لینا شروع کر دیتا۔ پہلے چند سبق بہت دلچسپ تھے۔ ایک یہ بھی لُطف آیا کہ حروف کے ساتھ ساتھ تصویریں تھیں۔ پھر بچپن کے مزے لئے۔ "سنڌي ٻارَ الُو ڪتاب" یعنی سندھی کی کتاب بچوں کے لئے مزیدار ہے۔ پہلے کتاب کا عنوان ہی لیجئے۔ دیکھئے سندھی کا رسم خط عربی ہے فارسی نہیں۔ یہ دو نقطوں والی ڌ ہماری دھ ہے سندھیوں کو دو چشمی حروف پسند نہیں اُن کے ہاں دو آنکھوں کی جگہ نقطے ہی نقطے ہیں۔ معمولی ب کے علاوہ ایک اور دو نقطوں والی ٻ ہے مگر ملاحظہ ہو کہ نقطے ایک دوسرے کے نیچے ڈالے گئے ہیں اُس کا تلفظ میں نے بیسیوں دفعہ کیا مگر صرف یہ سمجھ میں آیا کہ معمولی ب انسان کی آواز ہے اور دُو نقطی ب بکری کی آواز ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ اوّل تو بکری سندھی میں اِس ٻ سے لکھی جاتی ہے اور دوسرے یہ آواز بالکل بکری کی "بے بے بے" سے ملتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے سندھ کے صحراؤں میں بکریاں کثرت سے ہوتی ہیں جب ہی انسانوں کو ان معصوم ہستیوں کی زبان سے بھی آشنا ہونا پڑتا ہے۔ اِسی طرح عجب نہیں اگر سندھی میں اونٹ کی آواز کی نشانیاں بھی پائی جائیں کیونکہ یہ عربی جانور ماشاء اللہ یہاں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ یہاں مہذب سڑکوں پر اکثر ربڑ کے پہیوں والی گاڑی کھینچتے ہوئے اُونٹ میں نے دیکھے جو ایسی بے نیازی سے مُنہ اُٹھائے چلے جا رہے ہیں کہ میں نے بے اختیار اُنہیں ذوق کے اس شعر سے خطاب کیا کہ ؎

مُنہ اُٹھائے ہوئے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرنا

مگر اونٹ صاحب سندھی اور عربی کے سوا کچھ سمجھتے تو جواب دیتے۔ انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کو انجمن ترقیٔ اُردو (کراچی) کی توجہ اِس طرف مبذول کرانی چاہئے۔ سندھ خواہ ہندوستان میں شامل ہو یا پاکستان میں اُس کے انسانوں حیوانوں کو اُردو ضرور سیکھنی پڑے گی۔

ب کے نیچے یوں ٻ چار نقطے ڈالے جائیں تو وُہ بھ ہو جاتی ہے۔ اب بیچاری ت کی باری ہوئی ت ث کے علاوہ یہاں تین اور ت نما حروف ہیں یہ ٽ ہے ٹھ اور یہ ٺ ہے ٹ اور یہ ٿ ہے تھ۔ پھر پ کے ساتھ ایک ڦ بیٹھی ہے یہ پھ ہے۔ ج کے بعد ڄ ہے یہ ی ملی جیم ہے پھر جھ ہے جوجھ اور گھ کے علاوہ سندھ کی تنہا دو چشمی ہستی ہے۔ پھر ایک اور ج آتی ہے جس میں ن ملا ہوا ہے۔ ڃ چھ ہے۔ دال کے خاندان میں بھی کھلبلی مچی ہے ڌ ہے دھ، پھر دو ڈالیں ہیں ڏ جو ڏيڏُر (پنجابی ڈڈّو کا بھائی) یعنی مینڈک کی بولی ہوئی ڈال ہے اور ڊ یعنی معمولی انسانی ڈال۔ ڍ ہے ڈھ۔ ڙ کیا ہے ڑ۔ گ دو بلکہ تین ہیں ایک معمولی گ ہمارے گ جیسا یعنی گدھوں والا گاف اور دوسرا ڳ ہے ڳڙو والا (لفظاً تو ہمارے پنجابی ڈھگے کا بھائی ہے لیکن حرفاً مختلف ہے)۔ پھر ڱ ہے ن ملا گ۔ اور ک ہے کھ۔ اور ہمارا کاف ہے یوں ڪ۔ ن کا ایک اور کرخت بھائی ہے ڻ جو ڑنڑ پکارا جاتا ہے۔ اور یوں یہ عجائبات تمت بالخیر ہوتے ہیں۔ سندھی میں کُل ۵۲ حروف ہیں اگر سیکھنے ہوں یا محض دیکھنے بھی ہوں تو یہ لیجئے حاضر ہیں:-

ا ب ٻ پ ت ٽ ٺ ٿ ٽ ث پ ڦ ج ڄ جھ ڃ چ ڇ ح خ د ڌ ڏ ڊ ڍ ذ ر
ڙ ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ڦ ق ڪ ک ڳ گ گھ ڱ ل م ن ڻ و ھ ء ي۔

دُنیا میں یا تاش کے پتے باون ۵۲ ہیں یا سندھی کے حروف باون ہیں۔

اب چند الفاظ سے بھی تعارف ہو جائے۔ اَکھ (= آنکھ) آنکھ ہے۔ بَدَکُ (= بَدَک) بطخ ہے۔ بُلبُل وہی بلبل۔ باجو باجا ہے تارو تارا ہے یکو یکا ہے رُوپیو روپیہ ہے (یعنی جس چیز کی سندھی نہ آئے اُس کے نام کے آگے واؤ لگا دو سندھی بن جائے گی۔ میں سندھی ہوتا تو اُردو کی لغات کے ایک ایک لفظ کے بعد واو لگا کر اپنا لیتا اور اس طرح زبان کو ایسا وسیع بنا لیتا کہ اُردو والے بھی مُنہ تکتے رہ جاتے، اقبال کا ترانہ "اقبالو کا ترانو" بن جاتا ؎

سارو جہوں سو اچھو ہندوستوں ہمارو   ہمو بلبلو ہوں اُسو کیو وہو گلستوں ہمارو

ہر لفظ ایک دوسرے کا ہم قافیہ ہو جاتا، شاعری کو اتنا فروغ ہوتا کہ سندھی میں کئی غالب اور شیکسپئر پیدا ہو جاتے۔

سندھی کے چند لفظ سیکھ لیجئے کام آئیں گے کھانا کھائٹ (= کھائنٹر) پینا پئین (= پینٹر) (واضح ہو کہ یہ ٹر ملا ہوا نون ہے) اسی طرح اگر کبھی سندھ میں جینا مرنا پڑے تو جینا جیوڻ ہے اور مرنا مرڻ (= مرڑن) ہے (یعنی مرتے وقت بھی نون میں ڑ ملا کر مرنا ہے۔ المدد!) یہاں کے انسانی نام بھی دلچسپ ہیں۔ اکثر ہندو "آنی" ہیں اکثر مسلمان "او" ہندو جیسے گوربخشانی، چیتلانی، من سکھانی۔ پنجاب کا سندھ سے بہت تعلق رہا ہے۔ کیا عجب ہے کہ انہیں سندھیوں کی بہنیں جا کر پنجاب میں آباد ہو گئی ہوں یعنی سرمے دانی، مدھانی سوہرے جانی وغیرہ۔ اس آنی جانی کے مقابل میں مسلمان "او او" ہیں کوئی پگارو ہے کوئی کھورو ہے شاید کسی زمانے میں انہیں کے بزرگوں نے موہن جدارو کے تمدن کی بنیاد ڈالی اور پانڈو کورو کی رگوں میں ان ہی کا خون دوڑتا ہو۔ ان کے علاوہ ایک اور حیرت انگیز نام سننے میں آیا "گبول"! کوئی صحرائی نظارہ آنکھوں میں پھر گیا!

سندھی اب ت سیکھنے کے بعد میں نے فوراً شاہ عبداللطیف کے کلام کی طرف رجوع کرنا چاہا۔ یہ ایسا ہی مضحکہ خیز تھا جیسے کوئی اُردو کا قاعدہ ختم کر کے جھٹ غالب کو پڑھنا اور سمجھنا چاہے۔ میرے دوست راشدی صاحب نے مجھے دو کتابیں دیں ایک انگریزی میں تھی "Sind Ballads by Hart Davies" یعنی "سندھی گیت"، اس سے معلوم ہوا کہ سندھ میں کچھ اُسی قسم کے عشقیہ گیت ہیں جیسے ہماری پنجابی ہیں۔ انگریز مصنف نے کتاب کے اخیر میں ایک نوٹ ان عشقیہ قصوں کے متعلق لکھا ہے۔ سسّی پنّو کا قصہ ہے کہ سسّی ٹھٹہ میں پیدا ہوئی، پنّو مکران کے ایک امیر کا لڑکا تھا، سسّی کسی سے اپنی عصمت بچانے کے لئے زمین میں سما گئی اور پنّو بھی اُس کے بعد زمین میں دھنس گیا۔ پھر سوہنی اور مہار کا قصہ ہے کہ کس طرح سوہنی اپنے محبوب مہار سے ملنے کے لئے سندھ کے پار "تِپی جاتی" یعنی گھڑے پر جایا کرتی تھی۔ کس طرح آخر ایک کچے گھڑے پر دریا میں جاتی ہوئی وہ ڈوب گئی۔ یہ سوہنی مہار وہی پنجاب کے سوہنی مہینوال ہیں سندھیوں کی حُبّ الوطنی ان کو چناب کے کنارے سے کھینچ کر سندھ

کے کنارے۔ لے آئی۔ اسی طرح اُمراؤ اور مرونی اور رانا اور مومل کے قصّے ہیں۔ سب سے زیادہ گیت سچّو کے ہیں جو سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی کی مدد سے سندھی سے ترجمہ کرنا سوہانِ رُوح ہے:۔

کاش تو بول سکے اے کوّے!
اور بتائے کہ میرے محبوب کا کیا حال ہے؟
کیونکہ جُدائی نے مجھے بے حال کر رکھا ہے
اور غم میری دردمند رُوح پر چھا گیا ہے (سچّو)

سوہنی کہتی ہے:۔

کاش میں ہمیشہ ہی اپنے محبوب کے پہلو میں رہوں
اور جونہی یہاں سے چلوں فوراً ہی اُس کے پاس پہنچ جاؤں
کاش میں اس کنارے زیادہ دیر نہ ٹھہروں
لیکن افسوس کہ پانی گہرا ہے اور موجیں تیز ہیں
اور میں تیرنا نہیں جانتی۔ سو میں اپنی "چاٹی" لوں گی
اور ایک بار جب میں چل دوں گی تو ہرگز نہ لوٹوں گی
بلکہ وہاں پہنچ کر اپنی "چاٹی" کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی
اور پھر کبھی اس کنارے واپس نہ آؤں گی

یوں گیت گاتا ہے اصغرؔ کہ "محبت کی نظروں میں
یہ دریا جو اتنا چوڑا ہے محض ایک ندی ہے ذراسی!"

یہ اصغرؔ شاعر ہمارے راشدی صاحب کے جدِّ امجد تھے۔

دوسری کتاب "دیوانِ بیدل" سندھی میں ہے۔ اس سندھی شاعر نے کئی زبانوں میں شعر کہے ہیں

عربی:۔ صرفت العمر جهلاً فی الخطایا حسبتك معجباً خیر البرایا

(یعنی تُو نے اپنی جہالت کی وجہ سے خرابیوں میں عمر گزاری۔ تجھے دھوکا ہوا کہ تُو لوگوں میں سب سے افضل ہے)

فارسی:۔ عشقش نہ منصبے ست کہ ہر خس بدو رسد بلک از ہزار خاص یکے کس بدو رسد

اُردو:۔ دو جگ کا بادشاہ ہے مستِ شرابِ عشق عالی ہے ہر جناب سے لاشک جنابِ عشق

اِس کی ملتانی سے ملتی جلتی سندھی کے بعض شعر سمجھ میں آجاتے ہیں:۔

عاشق آپ معشوق بہ آپی ڈوجھا بیچ سماوے کون
بیدل سُن العشق ھو اللّٰہ اس بن مار جیوا وے کون

عام سندھی بھی پنجابی سے کچھ ملتی جلتی ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا بلکہ سارا مضمون ختم کر چکا تھا کہ حاتم علوی صاحب کی وساطت سے میں ڈاکٹر ایچ ایم گوربخشانی اسسٹنٹ پرنسپل ڈی جی کالج سے ملا۔ ڈاکٹر گوربخشانی نے حال ہی میں شاہ عبداللطیف پر تین جلدوں میں سندھی میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ وُہ انگریزی سنسکرت عربی فارسی سندھی پنجابی اُردو وغیرہ کئی زبانیں بخوبی جانتے ہیں۔ میں بالکل ایک کاروباری آدمی کی طرح اُن سے ملنے گیا جیسے کوئی امریکی کسی غیر ملک کی سیر کو آئے۔ اَور جلد جلد اپنا مطلب حل کرنا چاہے۔ میں نے جاتے ہی شاہ عبداللطیف کا ذکر چھیڑ دیا اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ "آپ شاہ کی شاعری سے خوب واقف ہیں تو مجھے اُس کا تھوڑا سا نمونہ دکھا اور سمجھا دیجئے۔ کیا واقعی آپ شاہ کو ایک بڑا شاعر سمجھتے ہیں؟ کاش آپ اُردو جانتے اور اُردو میں شاہ پر ایک کتاب لکھ دیتے"۔ ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔ "علوی صاحب سے میں ذکر کر چکا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اور آپ کے عزیز میرے ہاں فلاں روز چائے پر آئیں۔ میں چند اَور علمی ادبی اصحاب کو بھی بُلاؤں گا"۔ میں گھبرا گیا اس قسم کی چائے سے میری ادبی پیاس کیسے بجھ سکتی تھی؟ بلکہ اس کا اثر تو اُلٹا ہوگا اور میں اپنے مدعا سے محروم رہ جاؤں گا۔ میں نے چائے پارٹی سے گریز کرنا چاہا مگر وہ نہ مانے۔ آخر یہ طے پایا کہ پارٹی سے ایک گھنٹہ قبل میں اُن کے ہاں آجاؤں اور وہاں صرف ہم دونوں موجود ہوں اور ضروری باتیں کریں۔ میں نے دوبارہ پوچھا" شاہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا انگریزی یا اُردو میں اس کی شاعری پر کوئی کتاب ہے؟ اگر نہیں تو آپ لکھئے اور کیا آپ اُردو جانتے ہیں؟"۔ "اُنہوں نے جواب دیا" شاہ واقعی دُنیا کے بہترین شاعروں میں شمار ہونے کے قابل ہے میں اسے حافظ کے برابر سمجھتا ہوں۔ اور انگریزی اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہیں۔ اور اُردو میں مَیں نے غالب اور اقبال کا کلام پڑھا ہے"۔ اُن سے غالب اور اقبال کا ذکر سُن کر میں خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ چائے اَور "لطیف" ادبی گفتگو کا دن مقرر ہوگیا۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے انگریزی میں شاہ کے متعلق ایک کتاب دی جو ۱۸۸۹ء میں ایک سندھی بیلا رام وطن مل کی لکھی ہوئی تھی میں اسے لے آیا اَور پڑھنا شروع کیا۔ دیباچے میں مصنّف لکھتا ہے کہ اُس نے آٹھ سال تک شاہ لطیف کے کلام کا مطالعہ کیا اور اِس غرض سے وُہ دو سال قرآن حدیث تصوّف وغیرہ سے واقفیت حاصل کرتا رہا۔ پنجابی میں اُس نے ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال بھی پڑھے۔ اس کتاب سے جس کا سرورق غائب ہے معلوم ہُوا کہ شاہ عبداللطیف سندھ میں ہالہ حویلی کے گاؤں میں جو بھٹ سے تقریباً ۱۸ میل پر واقع تھا ۱۱۰۲ھ یعنی ۱۶۸۹ء میں پیدا ہُوا۔ اور ۱۴ صفر ۱۱۶۵ھ (مطابق ۱۷۵۲ء) کو ۶۳ سال کی عمر میں مر گیا اسی زمانے میں پنجاب میں وارث شاہ نے اپنی ہیر رانجھا ۱۷۶۶ء میں لکھی۔ (شاہ لطیف کو سندھ کا بُلّھے شاہ سمجھنا چاہیئے۔

وہ ایک زبردست صوفی شاعر تھا۔

شاہ لطیف کا شجرۂ نسب ستائیسویں پشت میں حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب تیمور ہرات میں آیا تو اُس کی فوج میں ۲،۶۲،۳۱۲ سپاہی تھے۔ شاہ لطیف کے ایک بزرگ سید مرالی تیمور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۲،۶۲،۳۱۲ ہی روپے اُس کی نذر کئے۔ تیمور اس سے بہت خوش ہُوا اور اس کے بیٹوں کو بڑے عہدوں پر فائز کردیا۔ ایک بیٹا سید حیدر شاہ تیمور کے ہمراہ ہندوستان چلا آیا۔ یہاں اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے وُہ ہالہ پہنچا جہاں اُس نے شادی کرلی۔ ایک بیوی اُس کی یہاں تھی دوسری ہرات میں۔ اور دونوں کے ہاں اولاد ہوئی۔ شاہ لطیف اِس ہالوی خاندان کا ایک رُکن تھا۔ اس کے صدیوں بعد شاہ لطیف کے باپ شاہ حبیب نے بھی دو شادیاں کیں۔ شاہ کی ماں شاہ دیانو ساکن ہالہ کی بیٹی تھی۔ یہ شاہ دیانو مخدوم عربی بھی کہلاتا تھا کیونکہ وہ عرب سے آیا تھا۔ اپنے جوشیلے پن اور متلون مزاجی کی وجہ سے وہ "دیوانو" یا دیانو کہلانے لگا۔ ہالہ میں آج تک "دیانی فقیروں کا ڈیرہ" ہے۔ شاہ لطیف نے مدرسے میں بہت تھوڑی تعلیم پائی لیکن اُس نے خود مطالعہ کرکے مختلف علوم میں خاصی دسترس حاصل کرلی۔ قرانِ مجید مثنوی مولانا رُوم اور شاہ کریم کا سندھی دیوان اِن تینوں کتابوں کو وُہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ شاہ لطیف کا سارا کلام مختلف اسلامی اور صوفیانہ تلمیحات سے بھرا پڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ شروع میں شاہ لطیف صرف الف کا حرف ہی پڑھ سکا۔ اُستاد نے باپ کے پاس شکایت کی۔ باپ نے پوچھا تو بیٹے نے جواب دیا کہ صرف الف ہی پڑھنے کے قابل ہے باقی حروف سب بیکار ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ اللہ کا لفظ الف سے شروع ہوتا ہے اور اسی میں سب کچھ آجاتا ہے۔ باپ بیٹے کی ذکاوت سے خوش ہُوا لیکن اُسے سمجھا بجھا کر دوسرے حروف پڑھنے پر بھی راضی کرلیا۔ شاہ لطیف نے بعد میں بھِٹ میں سکونت اختیار کی۔ اسی واسطے اُسے بھِٹائی کہتے ہیں۔ یہاں اُس کا روضہ ہے جس سے اُس کی تاریخِ وفات کا بھی پتہ چلتا ہے:

گفت ایں رجا مریدِ سنِ ارتحالِ پیر گردیدہ محوِ عشق وجودِ لطیف پیر

دوسرے مصرعے سے ۱۱۶۵ھ ہجری کا سن نکلتا ہے۔ بھٹ میں آج تک ہر سال شاہ لطیف کی یادگار کے طور پر ایک میلہ ہوتا ہے بھٹ حیدرآباد (سندھ) سے تقریباً ۲۵ میل پر واقع ہے۔

شاہ لطیف اوائل عمر ہی سے خلوت پسند اور معرفت کا دلدادہ تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ ایک درخت کے اُوپر اپنی تنہائی میں چھپا بیٹھا تسبیح پھیر رہا تھا کہ دو عورتیں درخت کے نیچے آئیں۔ ایک نے دوسری سے پوچھا کہ وُہ کتنی بار اپنے دوست سے مل چکی ہے جواب ملا کہ دوستوں کی ملاقات ایسی چیز نہیں جس کا حساب کتاب رکھا جائے۔ یہ سنتے ہی تسبیح شاہ لطیف کے ہاتھ سے گر پڑی اور اِس کے بعد اُس نے تسبیح پھیرنی چھوڑ دی۔ ایک دفعہ سنگرو نہر کے پاس کچھ بکریاں آئیں اور انہوں نے پانی پی کر نہر میں مینگنیاں کر دیں۔ شاہ نے سوچا کہ جب تک وُہ پیاسی رہیں اُنہوں نے ایسی حرکت نہ کی لیکن جب اُنہیں پانی مل گیا تو انہوں نے یہ بے جا حرکت کی۔ اِس پر اُس نے کہا کہ محبوب کے دیدار سے اُس کی جُدائی انسان کے لئے بہتر ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں مصنف نے شاہ لطیف کے شاعرانہ کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جرمن ڈاکٹر ٹرمپ کے مرتب کردہ شاہ لطیف کے دیوان موسوم بہ "شاہ جو رسالو" میں ۲۶ سُر دن کلیان کھمبات سارنگ سوہنی وغیرہ کے تحت میں شاہ کا کلام درج ہے۔ اُس کا محبوب خدا ہے اُس کی شراب شرابِ معرفت ہے۔ ایک جگہ وُہ کہتا ہے کہ اگر ہزاروں سورج بھی نکل آئیں اور چوراسی چاند بھی چڑھیں تو خدا کی قسم محبوب کے بغیر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو گا۔

وُہ کہتا ہے اُونٹ کو ذرا باندھے ہی رکھو کہ آوارہ نہ پھرے۔ (یہ انسان کی روح ہے) پھر کہتا ہے کہ کولھو کا اونٹ آنکھ بند ھا گھومے جاتا ہے۔ (یہ انسان کی قسمت ہے) ایک نظم میں ایک نہایت دلکش کہانی کی طرف اشارہ ہے کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے رُومی اور چینی مصوّروں کو بُلا کر تصویر سازی میں ایک دوسرے سے اُن کا اس طرح مقابلہ کرادیا کہ ایک بڑے ایوان کے عین بیچوں بیچ پردہ ڈال کر ایک دیوار پر چینیوں سے اور اُس کے بالمقابل دوسری دیوار پر رُومیوں سے نقش و نگار بنانے کو کہا۔ چینیوں نے طرح طرح کی تصویریں بنائیں، رومیوں نے اپنی دیوار کو صرف صاف شفاف کر کے خوب چمکا دیا جب پردہ بیچ میں سے اُٹھا دیا گیا تو بادشاہ نے دیکھا کہ ایک طرف چینیوں کی خوبصورت تصویریں نظر آتی ہیں اور دوسری طرف اُنہیں تصویروں کا صاف عکس۔ بادشاہ دونوں جماعتوں سے خوش ہو گیا شاہ لطیف کہتا ہے کہ اسی طرح انسان کو بھی چاہیئے کہ وُہ اپنے دل کو ایسا شفاف کرلے کہ اُس میں سب خدائی رنگوں کا عکس صاف نظر آنے لگے۔ انسان میں خُدا کا جلوہ منعکس ہے۔ دراصل دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں خُدا ہم سے کچھ بھی دُور نہیں، دل کو صاف کرو پردہ ہٹا دو وُہ آپ سے آپ نظر آجائے گا۔ ایک شعر میں وہ کہتا ہے کہ خُدا کا سچا عاشق عزازیل تھا دوسرے سب اپنی خواہش کے تابع تھے۔ وُہ مردُود ہوا تو صرف انتہائے عشق کی وجہ سے ہوا کیونکہ اُسے خُدا سے اتنی محبت تھی کہ وُہ خود خُدا کے کہنے پر بھی اُس کے سوا کسی کے آگے سر جھکانے پر تیار نہ تھا۔

علاوہ سندھی اور بلوچی روایات کے شاہ لطیف کے کلام میں حسنؓ حسینؓ، سسّی پنّو، سوہنی مہار اور ہیر رانجھو وغیرہ کے قصّوں کی طرف جا بجا اشارات ہیں۔ مجازی عشق سے اُس نے حقیقی عشق کا رستہ نکالا ہے۔

اِس کے بعد مقررہ دن میں چائے پارٹی کے وقت سے گھنٹہ بھر پہلے ڈاکٹر گوربخشانی کے ہاں پہنچا۔ پہلے میں نے شاہ لطیف کے متعلق چند سوالات کر کے اپنے بعض شکوک رفع کئے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے شاعرِ سندھ کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ لکھ رکھا تھا۔ اُس سے معلوم ہوا کہ شاہ (لفظ "شاہ" کے معنی سندھ میں شاہ عبداللطیف کے ہیں) کی زندگی کے تین حصّے تھے پہلا اکیس برس کی عمر تک اِس زمانے کے، خیر میں وہ اپنے باپ کے مُرید مرزا مغل بیگ کی لڑکی کا دلدادہ ہو گیا اور جب اسے حاصل نہ کر سکا تو تین چار سال کے لئے گھر سے نکل گیا اور ہندوستان میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ یہ اُس کی زندگی کا دوسرا حصّہ تھا۔ اپنے سفر سے واپس آکر اسے گوہرِ مُراد مل گیا لیکن وہ لاولد رہا۔ اُس کا قول تھا کہ عشقِ الٰہی کے ڈھونڈنے والے اور تارک الدُنیا لوگ یہ میرے بچے ہیں۔ عمر کے آخری دس سال شاہ نے بھٹ کی صحرائی خلوتوں میں گزارے۔ جب اُس کی موت کے دن قریب آئے

تو وہ مین وُد کے لئے عزلت گزیں ہو گیا۔ اکیسویں دن غُسل کر کے وُہ زمین پر اپنے اوپر ایک چادر ڈال کر لیٹ گیا اور اپنے مریدوں سے گانے کی درخواست کی۔ تین دن تک یہ لوگ اپنے گیت گاتے رہے آخر تیسرے دن شاہ کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ رومی اور چینی مصوّروں کی کہانی شاہ نے بیان نہیں کی بلکہ اُس نے جو اشارہ رُومی کی طرف کیا ہے وُہ مولانا رُوم صاحبِ مثنوی ہیں۔ اور یہ دلکش کہانی جو اُن کی مشہور مثنوی میں پائی جاتی ہے اس طرح شروع ہوتی ہے:-

چینیاں گفتند ما نقّاش تر ‏ ‏ ‏ رُومیاں گفتند ما را کرّ و فر......... الخ

ڈاکٹر صاحب مثنوی کا ایک عمدہ یورپی نسخہ اُٹھا لائے اور اُس میں یہ کہانی نکال کر خالص ایرانی لہجے میں پڑھنے لگے۔ اسی سلسلے میں علم السنہ پر بھی گفتگو ہونے لگی۔ میں گھبرانے لگا۔ چائے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ابھی مہمانوں کا ریلا آنے والا تھا۔ میرے اصرار پر ڈاکٹر صاحب نے "شاہ جو رسالہ" نکالا اور "سُر سھنئي" کے عنوان کے تحت میں پڑھنا پڑھانا اور سمجھانا شروع کیا۔ یہ کیا تھا "سوہنی مہینوال" کا قصہ۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ شاہ یہ عشقیہ قصّے بیان نہیں کرتا بلکہ اُن کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کر کے حقیقت کا نقشہ کھینچتا اور معرفت کا سبق دیتا ہے مثلاً:-

گھڑو پگھو تہ گھورِلوُ، آسَرَ مَ لاَ ھیجِ ‏ ‏ ‏ (سندھی)

(گھڑو بھگو تہ گھوریو آسرم لاہیج) ‏ ‏ ‏ (اُردو تلفظ)

لاَ تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَۃِ اللہِ، تُرَھی اِن تَرِیجِ

(" " " تُرہے اِنّ تریج)

جیباٹي ھیجِ، پَسین مُہ مہارَ جو۔

(جیبانے، ہیجَ، پسیں مُہ مہارَ جو)

سوہنی ہر رات دریا کے پار ایک گھڑے پر بیٹھ کر اپنے محبوب مہینوال سے ملنے جایا کرتی تھی۔ جب اُس کے والدین ایسا کرنے سے نہ روک سکے تو ایک دن اُنہوں نے ایک کچّا گھڑا وہاں رکھ دیا۔ سوہنی بے سوچے سمجھے اسے دریا میں ڈال کر چل دی۔ دریا کے عین بیچ میں پہنچی تو گھڑا ٹوٹ گیا۔ سوہنی ڈوب گئی۔ اُدھر سے مہینوال اُس کی چیخ پکار سُن کر دریا میں کُود پڑا اور اُسے بچانے کی ناکام کوشش میں وُہ بھی ڈوب گیا۔ آخر دونوں کو گاؤں والوں نے ایک ہی قبر میں ساتھ ساتھ دفن کر دیا۔ ہمارا شاعر کہتا ہے:-

"اگر گھڑا ٹوٹ گیا تو ٹوٹ جانے دے مگر تو آسرا نہ چھوڑ

تُو خُدا کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو بلکہ اُسی (رحمت کی) ناؤ کے سہارے تیر

کہ صرف سچی محبّت کے ذریعے ہی تو یار کا جلوہ دیکھے گا"

اتنے میں دو ایک پروفیسر مہمان آ گئے۔ میں نے درخواست کی کہ تھوڑا سا اور۔ اِن لوگوں نے کہا کہ آپ کمال کرتے ہیں کہ

چار ماہ یہاں رہے اور اب جانے سے دو روز پہلے شاہ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ میں نے صرف ڈاکٹر صاحب کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ وہ پڑھنے لگے:۔

ساهڙُ سا سُوهڻي سائرُ پڻ سوئي

(سائڑ سا سوہنی سائڑ پنڑ سوئی)

آهي ٻجوئي گجهه گجهاندڙ گالڙي

(آہے بجوئی گجھ گجھاندر گالڑی)

ساہر بھی وہی ہے جو سوہنی ہے اور دریا بھی وہی ہے یہ سبھی ایک ہیں۔

یہ ہے ایک بالکل پُراسرار بات، انتہا درجہ پُراسرار!

اب مہمان پر مہمان آنے لگے۔ ایسی حالت میں اُستادی شاگردی کے سلسلے کا جاری رکھنا شاہ کے حضور مہمانوں سے ڈاکٹر صاحب سے اپنے ۴۸ سال کے سن سے گستاخی اور بے انصافی اور بے ادبی تھی۔ قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اتنی تھوڑی سی دیر میں شاہ کے کلام کا کیا انتخاب ہو سکتا تھا۔ دوسرے دن اپنی تسلی کے لئے میں نے ایک کتاب "شاہ جو رسالو" (منتخب) خرید کر اپنے کتب خانے میں داخل کر لی۔ یہ تھا میری "شاہ دانی" کا لبِّ لباب۔ اب چائے شروع ہوئی۔ یہ ایک سندھیوں اور پنجابیوں کا مجمع تھا۔ ہاں ایک یُوپیا بھی تھا۔ پہلے چند لمحے خاموشی سی طاری رہی جیسے سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کیا کریں اور کیا کہیں۔ ادیبوں کی سی باتیں کریں یا انسانوں کی سی۔ اتنے میں مَیں نے اُن صاحب کو دیکھ پایا جنہوں نے صوفی مجلس میں "تاب بے تاب" والی نظم گائی تھی۔ اور جنہیں میں نے اپنے دل میں پروفیسر بے تاب کا نام دیا تھا۔ تعارف پر معلوم ہُوا کہ یہ پروفیسر رام پنجوانی سندھ کالج میں سندھی کے معلّم ہیں۔ میں نے کہا براہِ کرم ہمیں "وہ تاب بے تاب" پھر سُنا دیجئے لیکن افسوس ہے کہ یہاں کوئی ساز نہیں۔ ہمارے میزبان نے کہا ان کا ساز ہمیشہ اِن کے ساتھ رہتا ہے۔ میں نے حیرانی سے دیکھا۔ یہ ایک تپائی پر بیٹھ گئے اور تپائی سے ایسی صفائی اور خوبی سے طبلے اور ساز کا کام لیا کہ ہم دنگ رہ گئے۔ اِن کی آواز میں سوز تھا ہاتھوں میں موسیقی اور نظر میں ایک طرح کی وارفتگی۔ یہ واقعی حضرتِ بے تاب تھے۔ اک سماں بندھ گیا:

نہ میں تاب نہ بے تاب نہ میں ابر و آفتاب

نہ میں گویا نہ میں جویا نہ میں سوال نہ جواب

نہ میں خاکی نہ میں بادی نہ میں آگ نہ میں آب

نہ میں شیعہ نہ میں سُنی نہ میں گناہ نہ میں ثواب

نہ میں شرعی نہ میں ورعی نہ میں رنگ نہ میں رباب

نہ میں جنّی نہ میں انسی نہ میں مائی نہ میں باب
ذات سچل دی کی بچھ دے نالے تا نایا سب

یہ سندھی صوفی شاعر سچل کے اشعار ہیں مائی ماں ہے اور باب باپ اور آخری مصرع کے معنی ہیں:-

پوچھتے ہیں وُہ کہ غالب کون ہے؟ کوئی بتلاؤ کہ ہم تبلائیں کیا؟

یہ سندھی ہمیں گوارا تھی۔ اس کے بعد اُنہوں نے شاہ کی چند کافیاں گائیں جو ہم کچھ سمجھے کچھ نہ سمجھے مگر سب سبحان اللہ اور واہ وا کرتے رہ گئے! شاہ کا رعب تو خیر مجھ پر بیٹھ ہی چکا تھا لیکن اس سندھی نوازی کا اک یہ اثر مجھ پر ضرور ہوا کہ مجھے پنجاب کی بُلھے شاہ کی کافیاں اور ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال یاد آ گئے اور جی میں آیا کہ انہیں پھر غور سے پڑھ کر اُن سے لُطف اُٹھایا جائے۔

صوفی مجلس والی رات سے یاد تھا کہ بے تاب صاحب اُردو میں بھی گا سکتے ہیں۔ میں نے درخواست کی تو انہوں نے ظفر کی مشہور غزل گائی۔ ان کا گایا ہوا یہ شعر اب تک کانوں میں گونج رہا ہے:-

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اَوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

اُردو کی ہمہ گیری ظفر کے کلام کی تاثیر انسانی ہمدردی اور حقیقت بینی کا بلند نصب العین — مجلس پر وجد سا طاری ہو گیا!

اکتوبر میں لاہور واپس آ کر گاہے گاہے یہ محفلیں یاد آتیں۔ اسی سلسلے میں پنجابی کی مشہور کتابیں ہیر رانجھا سوہنی مہینوال اور بُلھے شاہ کی کافیاں خرید کر اپنے سرہانے رکھ لیں کہ جب کبھی رُوس جرمن جنگ سے جی اُکتا جائے تو اِن کی صحبت میں تھوڑا وقت گزار لیا جائے۔ انہیں دنوں میں پنجاب پبلک لائبریری میں ایک نئی انگریزی کتاب نظر پڑی "شاہ عبداللطیف بھٹائی" اس کے مصنف ایک آئی سی ایس انگریز ایچ ٹی سارلے ہیں جنہوں نے ۱۹۴۰ء میں اسے چھپوایا۔ اس کے ۴۲۲ صفحات ہیں اور یہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں تاریخ ہے دوسرے میں ادب اور تنقید اور تیسرے میں شاہ عبداللطیف کے "رسالو" کی بعض نظموں کا انگریزی نظم میں ترجمہ دیا گیا ہے۔ مصنف نے گوربخشانی صاحب کی علمیت کی داد دی ہے۔

انگریز مصنف نے یہ کتاب خاصی محنت اور توجہ سے لکھی ہے۔ اس وقت اس کا خلاصہ جو میں نے بنایا میرے سامنے ہے اور خطرہ ہے کہ اگر یہ زیادہ دیر تک سامنے رہے گا تو یہ مضمون سمندر کے کنارے کی بجائے" شاہ جو رسالو" سے متعلق ہو جائے گا۔ مصنف کہتا ہے کہ شاہ عبداللطیف جس کے کلام میں زیادہ تر فارسی اور تھوڑا بہت عربی اور کچھ بلوچی اور ہندوانہ اثر پایا جاتا ہے ایک سچا مسلمان موحد صوفی تھا جس نے رسمی فارسی شاعری سے ایک حد تک کنارہ کر کے سندھ کی دیہاتی زندگی اور مقامی عشقیہ قصوں کے پس منظر کو لیا اور پھر اس پر اپنے رنگ میں اسلامی تصوّف کی پُر درد تصویر کھینچی اُس کا کلام ہندوستانی راگنیوں کلیان کھمبات سوہنی وغیرہ کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔ جو نظم جس راگ میں گائی جاتی ہے اُس کے عنوان کے نیچے درج کی گئی ہے۔ اس طرح شاہ عبداللطیف

کا کلام ہندو مسلمانوں دونوں میں برابر ہر دلعزیز ہو گیا ہے۔ نظم کا حصہ "شاہ جو رسالو" (منتخب) سے لیا گیا ہے۔ "شاہ جو رسالو" کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

اوّل اللہ علیم اعلیٰ عالم جو ڌڻي	(سب سے پہلے ہے اللہ علیم اعلیٰ کُل عالم کا مالک
قادر پنھنجي قدرت سين قائم آھي قديم	(قادر، ازلی، اپنی قدرت سے آپ قائم
والی واحد وحدہٗ رازق رب رحیم	(والی، واحد، روزی دینے، رحم کرنے والا خدا
سو ساراہ سچو ڌڻي چئي حمد حكيم	(حمد کرو اُس خدا کی جو شفا دیتا ہے
ڪري پاڻ ڪريم جوڙون جوڙ جھان جون	(جو سچا ہے اور سب پر مہربان ہے۔)

پنجابی شاعر زیادہ سے زیادہ دریا کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اِدھر سندھ کا دریا دریاؤں کا بادشاہ ہے اور خود سمندر سندھ کے پاؤں دھو کر پیتا ہے۔ شاہ عبد اللطیف نے سمندر کا کئی جگہ ذکر کیا ہے :-

"جُدائی کے سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ہر علیحدہ اور جُدا روح کو غرق کر دیتے ہیں"

"وُہ جو سمندر میں تیر سکتے ہیں تھوڑے پانی اور گہرے پانیوں میں ہر ایک جگہ بے دھڑک تیرتے ہیں لیکن وہ جو تیر نہیں سکتے اپنے سروں پر بڑے بڑے عماموں کا بوجھ لاد لیتے ہیں اور بس"

"زندگی کے سمندر پر کسی نے صرف "میں" کو اپنا رہبر بنا کر کبھی قدم نہیں رکھا۔ صرف خدا واحد ہے اور صرف وہی وحدت پسند ہے"

صحراؤں اور پہاڑوں کا ذکر بھی وُہ بڑی شان سے کرتا ہے لیکن بہتر ہے کہ شاہ کی صحبت سے کسی اور جگہ لطف اٹھایا جائے۔ یہاں گنجائش نہیں۔ مجھے دوستوں سے جو کچھ پمفلٹ ملے اُن سے میں نے سندھ کے متعلق کچھ چوں چوں کا مربہ اکٹھا کر لیا۔ سندھ کی تاریخ کے بعض واقعات مشہور ہیں۔ غالباً آج سے پانچ ہزار سال پہلے شمالی سندھ میں لاڑکانہ یا لاڑکانہ کے شہر کے نزدیک وُہ تمدن پھولتا پھلتا تھا جسے آج موہن جدارو کا تمدن کہا جاتا ہے یہ لوگ آریاؤں سے زیادہ قدیم تمدن کے مالک تھے۔ انہوں نے صنعت وحرفت میں خاصی ترقی کی تھی ایک صرف زمین دوز نالیوں سے اُن کی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ آریا آئے اور اُنہوں نے اِس تمدن کا صفایا کر دیا۔ مہابھارت کے زمانے میں سندھ کا راجہ جیدرانتھ تھا۔ ایلور کئی صدیوں تک دار السلطنت رہا۔ کچھ عرصہ سندھ سکندرِ اعظم کی سلطنت میں شامل رہا آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے یہاں کے راجہ چچ کی سلطنت میں پنجاب بھی شامل تھا۔ ۷۱۲ء میں راجہ داہر کے وقت میں جب کہ ولید مسلمانوں کا خلیفہ تھا مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا لشکر محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ پر حملہ آور ہوا۔ اِس حملے کا سبب یہ تھا کہ عربوں کے چند جہاز لُوٹ لئے گئے تھے۔ اُس وقت محمد بن قاسم کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ فوج کی تعداد تھوڑی تھی اور اُس کے ساتھ

اس مضمون کے چھپنے سے پہلے "عالمگیر" کا سالانہ جون نمبر ۱۹۴۲ء میری نظر سے گزرا۔ اِس میں رفعت ہاشمی صاحب کا مختصر لیکن دلچسپ مضمون "شاہ عبد اللطیف بھٹائی" دیکھا کیا اچھا ہو اگر "صحرا" کی سی چند اَور نظمیں اُردو میں منتقل کر دی جائیں۔

ایک گروہ علما کا بھی تھا کہتے ہیں کہ جب اِن میں سے کچھ گھبرا گئے اور انہوں نے لَوٹنا چاہا تو محمد بن قاسم نے یہ شعر پڑھ کر اُنہیں غیرت دلائی،

ع اَلَا لَیتَ اللّحی کانت حشیشاً فتعلفھا دواب المسلمینا

(کاش تمہاری داڑھیاں گھاس ہوتیں کہ مسلمانوں کے جانور اُنہیں چر سکتے)

یہ لوگ مکران کے رستے سمندر کے کنارے کنارے آئے تھے۔ دیبل اور سہوان پر لڑائی ہوئی اور سندھ عربوں کے قبضے میں آ گیا جہاں تقریباً پانچ صدیوں تک اُن کی حکومت رہی۔ مختلف انقلابات کے بعد آخر سندھ مغلیہ سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اکبر سندھ کے علاقے میں امرکوٹ میں پیدا ہوا تھا۔ اور اُس کی ایک سندھی بیگم بھی تھی۔ اورنگ زیب کے عہد میں صرف ٹھٹہ (سندھ) میں بقول ہملٹن چار سو مدرسے تھے۔ لاہور کے مشہور ولی میاں میر اسی ٹھٹہ کے رہنے والے تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر سندھ کے میر برسر اقتدار ہوئے اور اُس افراتفری کے زمانے میں یہاں کی شائستگی آپ اپنی مثال تھی ۱۸۴۳ء میں سندھ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِس قبضے کی نوعیت اُس ذومعنی برقی پیغام سے ظاہر ہوتی ہے جو کہا جاتا ہے کہ سر چارلز نیپر نے گورنر جنرل کے نام بھیجا "I have Sinned (Sind)" (میں نے گناہ کیا یا میں نے سندھ لے لیا)۔

سندھ کا علاقہ فقط دریائے سندھ کی وجہ سے ایک آباد علاقہ ہے ورنہ یہ بھی راجپوتانہ کے صحرا کا ایک حصہ ہوتا۔ دریا کی نسبت سے علاقے کا نام بھی سندھ پڑ گیا۔ آریا جب ہندوستان میں پہلے پہل آئے تو اُنہوں نے یہاں کے سب سے بڑے دریا کو سندھو پکارا جس کے معنی سنسکرت میں سمندر کے ہیں۔ اس سے علاقے کا نام سندھ پڑا۔ پُرانی فارسی میں سندھ ہند بنا اور پھر اُس سے ہندوستان نے اپنا نام پایا۔ دریائے سندھ سندھ کے لئے وُہ کام کرتا ہے جو دریائے نیل مصر کے لئے یعنی سندھ کا وجود محض دریائے سندھ کے دم سے ہے۔ سندھ کا رقبہ ۴۶۳۷۸ مربع میل ہے۔ یہ ہندوستان کا سب سے گرم اور سب سے خشک صوبہ ہے۔ ۱۹۳۲ء میں آبپاشی کے لئے "سکھر براج" مکمل ہوا نہریں جو اس سے نکلتی ہیں اُن سب کی لمبائی تقریباً چھ ہزار میل ہے۔ یہ دُنیا کا سب سے بڑا نظام آبپاشی ہے۔ اس پر کئی کروڑ روپے صرف ہوئے۔ اس کے علاوہ خیرپور کی ریاست کی تقریباً ۷۵ لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوتی ہے۔ سندھ میں صرف ۴ انچ سالانہ بارش ہوتی ہے لیکن یہاں کی زمین زرخیز ہے اور ۶۰ فی صدی لوگ زراعت پیشہ ہیں اگرچہ اس وقت صوبے پر ۱۷½ کروڑ زرعی قرضے کا بوجھ ہے لیکن یقین کیا جاتا ہے کہ نئی نہروں سے سندھ کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جائے گی۔ سندھ کی آبادی ۴۵ لاکھ کے قریب ہے جس میں مسلمانوں کی نسبت ۷۲ فی صدی ہے سندھ کے دس گیارہ لاکھ ہندو بظاہر ہندو لیکن دراصل نانک شاہی سکھ ہیں جو عام ہندوؤں کی طرح بتوں کی پوجا نہیں کرتے گو عام سکھوں کی طرح وُہ اپنے بال بھی نہیں بڑھاتے۔ سندھ کے صوبے کے سالانہ اخراجات تقریباً ۴½ کروڑ اور آمد صرف تقریباً ۳¾ کروڑ ہے اور ایک کروڑ سالانہ حکومتِ ہند کی طرف سے بطور عطیہ کے حاصل ہوتا ہے۔ سندھ اِس عطیے کا ہر طرح مستحق ہے وُہ مغرب کی طرف ہندوستان کا دروازہ بھی ہے اور دربان بھی۔ کراچی ہندوستان کا سب سے بڑا ہوائی اڈا ہے۔ سندھ کے معدنی وسائل اُس کی ماہی گیری کی پیداوار اُس کی زرخیز زمین اُس کے صنعت

بخش مقامات یہ اُس کی دولت کے خزانے ہیں جن سے ایک ترقی یافتہ حکومت کما حقہٗ فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سندھ میں ترقی کے لئے بہت گنجائش ہے اور وُہ کئی باتوں میں بہت پس ماندہ ہے۔ سندھ کو یکم اپریل ۱۹۳۶ء سے جداگانہ صوبہ بنا دیا گیا اور اب اُس کی ایک اپنی لیجسلیٹو اسمبلی ہے لیکن سندھ کی حکومت میں وزارتیں اس طرح بنتی اور ٹوٹتی ہیں جس طرح فرانس میں ہوتا آیا ہے۔ سندھ میں خواندگی بہت پست حالت میں ہے اور اگرچہ اب سندھی زبان جو تقریباً ۳۶ لاکھ نفوس کی زبان ہے ایک تعلیمی زبان بنائی جا رہی ہے مگر سچ یہ ہے کہ یہ ایک ترقی یافتہ زبان نہیں محض ایک مقامی بولی ہے جسے خواہ مخواہ ایک علمی زبان کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ اگر پنجاب کی طرح یہاں بھی اُردو کو فروغ دیا جاتا تو اس سے نہ صرف سندھ کا ہندوستان کے دوسرے حصّوں سے زیادہ قریب کا تعلق پیدا ہو جاتا بلکہ اُردو کا زیادہ وسیع لٹریچر سندھیوں کی روز افزوں ترقی کا ایک آسان ذریعہ بن جاتا۔ مگر آج کل بعض سیاسی مصالح کی بنا پر اپنی زبان کا نعرہ جا بجا بلند ہو رہا ہے۔ اسے کہتے ہیں ترقیٔ معکوس۔ یہاں کئی لوگوں کو اس کا احساس ہونے لگا ہے اور اسی احساس اور ضرورتِ وقت کی وجہ سے کراچی اور بعض دوسرے شہروں میں اب کثرت سے اُردو مدارس کھلنے لگے ہیں۔ کراچی میں اُردو کا اتنا چرچا ہے کہ یہاں سندھی جاننے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی۔ میں جہاں کہیں گیا جس کسی سے ملا میں نے ہندوستانی اور اسلامی ہر نقطۂ نظر سے اُردو کی اہمیت پر زور دیا۔ اسی سلسلے میں مجھے دو ایک تقریریں بھی کرنی پڑیں یہاں اکثر اُردو کے پبلک و پرائیویٹ مشاعرے ہوتے رہتے ہیں دو ایک صحبتوں میں میں نے بھی حصہ لیا اور لُطف اُٹھایا۔

سندھ کے مسلمان پنجاب کے مسلمانوں سے کئی باتوں میں ابھی پیچھے ہیں لیکن ایک سندھی مسلمان نے دوران گفتگو میں مجھ سے خوب کہا کہ زیادہ پیچھے ہونے کی وجہ سے یہی اُبھریں گے بھی پہلے۔ انسان کی حالت بہت بُری ہو جاتی ہے جب کہیں جا کر وُہ اسے اچھا بنانے کی فکر کرنے لگتا ہے مسلمانوں میں یہاں تعلیم کی اتنی کمی ہے کہ پانچ چھ ہندوؤں کے مقابلے میں ایک مسلمان پڑھا لکھا ہوتا ہے۔ سندھ کا سب سے بڑا کالج ڈی جی آرٹس و سائنس کالج ہے جو دیارام گڈومل کی یادگار میں قائم کیا گیا۔ اس میں ۴۰۰ کے قریب طلبا ہیں۔ آرٹس کالج میں تقریباً ۷۰ طلبا ہیں۔ اِن میں سے ۱۹ لڑکیاں ہیں جن میں ۴ یا ۵ مسلمان ہیں جتنی ہندو لڑکیاں اس کالج میں پڑھتی ہیں اتنے لڑکے نہیں پڑھتے۔ بعض مخیّر مسلمانوں نے اس تعلیمی کمی کے پورا کرنے میں دلیری سے پہلا قدم اُٹھایا ہے۔ حاجی سر عبداللہ ہارون نے جو ہندوستان کے مسلمان تاجر اُمرا میں ایک خاص حیثیت کے مالک ہیں علاوہ دوسرے قومی کاموں کے اسّی ہزار روپے کے عطیے سے چھوٹے پیمانے پر ایک سندھی سکول موسوم "جامعہ اسلامیہ و یتیم خانہ" ۱۹۲۷ء سے قائم کر رکھا ہے جس میں مسلمان نوجوان علاوہ تعلیم پانے کے صنعت و حرفت کے مختلف کام سیکھتے ہیں۔ یہاں کی پوری قوم موجودہ تعلیم کی مخالف تھی۔ چند دُور اندیش بوہروں نے اپنے کٹ مُلّاؤں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر کے ۱۹۰۶ء میں "کراچی اکاڈمی" کی بنیاد ڈالی جس کی سرپرستی میں اِس وقت چار سکول چل رہے ہیں۔ اِن میں ایک لڑکیوں کا سکول ہے۔ جس کے متعلق "اکاڈمی" کے ایک زبردست کارکن طیب علی صاحب علوی نے مجھ

سے اِس بارے میں مشورہ کیا کہ کس طرح مسلمان لڑکیوں کے لئے اُردو کا ایک نصاب تیار کر کے ایک کُل ہند، نسوانی اُردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اُمید ہے کہ انجمن ترقی اُردو (ہند) اس بات میں اُن کا ہاتھ بٹائے گی۔ اس سکول میں زیادہ تر پنجابی گجراتی اور سندھی مسلمانوں کی لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ مجھے تعجب ہُوا جب ایک جماعت کی لڑکیوں نے ہماری آمد پر اقبال کی مشہور نظم "دُعا" خوش الحانی سے پڑھ کر ہمیں سنائی :-

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو رُوح کو تڑپا دے اور قلب کو گرما دے

مردہ قوموں میں بھی اب ایک پُرجوش زندگی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔

حال میں سندھ کے چند باہمت مسلمانوں نے حیدرآباد کے شہر میں جامعۂ عربیہ یعنی ایک عربی یونیورسٹی بنانے کی تحریک جاری کی ہے جس میں صنعت و حرفت اور موجودہ علوم کی تعلیم بھی دی جائے گی۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن جو عربی کے بڑے عالم ہیں اس تحریک میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔

جب اس دفعہ میں کراچی آیا اور سمندر کے کنارے آ کر ڈیرے ڈالے تو کچھ صحت کے تقاضے سے اور کچھ دل خوش کرنے کو یہ مصمم ارادہ کیا کہ یہاں کے قیام کا زمانہ خالص سستی میں گزار دوں گا۔ لیکن افسوس کہ نہ آج کل کا انسان کامل فرصت سے لُطف اُٹھا نا جانتا ہے اور نہ آج کل کی دُنیا اُسے یہ لُطف اُٹھانے دیتی ہے چنانچہ خود یہ مضمون ایک حد تک لکھنے والے کی خود پسندی یا خود نمائی پر دلالت کرتا ہے خود داری کے لفظی اور اصلی معنی شاید ہیں اپنے آپ کو اپنے آپ میں سنبھال کے رکھنا لہذا خود دار یا خود سنبھال آدمی وُہ ہے جو اپنے تجربوں کو قلم بند نہ کرے مصنف یا انشا پرداز تو ہوتا ہی ہے خود بھینک یا خود دکھاؤ۔

یہاں میری فرصت کا پہلا شغل تو یہ تھا کہ ستیارتھی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ فرصت کے اوقات میں آپ کی کتاب "میں ہوں خانہ بدوش" کا مقدمہ لکھ دوں گا سو جب جون میں کلفٹن کی ریت اور کراچی کی چمک دمک نے آشوبِ چشم کا تحفہ دیا تو پہلی فرصت اُن کے گیتوں اور اپنی واہ واہ میں صرف کی۔

باقی فرصتوں کی خانہ پُری یوں ہوتی تھی۔ رات کو لیپوؤں سے ملاقات ہوتی تو صبح چڑچڑا مزاج لے کر اُٹھتا جیب میں جامعہ ملیہ کے "اُردو کے سو شعر" ڈالتا اور آدھ میل پر سمندر کے کنارے کالی عینک پہنے ایک بنچ پر اُس نل کے قریب جا بیٹھتا جہاں اُس وقت ایک مدراسی پولیس والا ایک الہ آبادی مندر کا پجاری ایک ٹیگور صورت دیوانہ کلرک اور ایک سندھی پان سگرٹ والا باری باری آکر اپنے گھڑے بھرتے اور میں اُن کی بے علم بے دولت اور بظاہر بے فکر سی زندگی پر غور کرتا۔ پھر گھر آتا۔ اخبار دیکھتا۔ برطانیہ نے کریٹ خالی کر دیا۔ جرمنی نے روس پر دھاوا بول دیا۔ گاندھی جی نے غنڈوں سے لڑنے کی اجازت دے دی۔ وائسرائے نے ڈیفنس کونسل بنائی۔ مسٹر جناح نے تادیبی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ V کا نشان ہمہ اُوست کی طرح ہر جگہ لہرانے لگا۔ جاپانی چینی ہند کی سیر کرنے آنکلے۔ سر سکندر جناح کے گلے مل گئے۔ روزویلٹ اور چرچل کی اوقیانوسی ملاقات ایک مشترکہ

اعلانِ آزادی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ برطانیہ اور روس بے تکلفی سے ایران کے غریب خانے میں جا پہنچے۔ چرچل نے ہندوستانیوں کو یقین دلایا کہ خدانخواستہ اوقیانوسی اعلان ہندوستان پر عائد نہیں ہوتا بعض ناشکرے ہندوستانیوں نے اس پر احتجاجی جلسے کر دیئے ——— اخبار پڑھنے والا کوئی تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سبھی کچھ گویا میں ہی کر رہا ہوں اور کوئی یہ کہ اگر میں ہوتا تو یہ کام زیادہ اچھی طرح کرتا۔

برٹرنڈرسل کی کتاب Power "طاقت" پڑھنی شروع کی۔ باوجودیکہ رسل دہریہ ہے ایک خدا پرست بھی اُس کی کتابوں سے بے حد فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ "طاقت" پسندی کا جذبہ نوعِ انسان میں مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں میں رُونما ہوا دولت فوجی قوت قانونی حکومت پروپگنڈا وغیرہ۔ طاقت وروں کو اپنی طاقت نوعِ انسان کی بہبود کے لئے استعمال کرنی چاہیئے اس کے لئے ہمدردی کے جذبات درکار ہیں اور وُہ ایک تو مذہب و اخلاق کی اشاعت سے اور دوسرے سیاسی و معاشی حالات کی تبدیلی سے پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ ہمارا نصب العین فرد کی بہتری ہونا چاہیئے جماعت کی تنظیم صرف اس کے لئے ایک ضروری آلۂ کار ہے۔ تمام قسم کی حکومتوں میں صرف صحیح قسم کی جمہوریت ہی مہذب انسان کے لئے مفید ہو سکتی ہے اور آمریت تو کسی حال میں قابلِ تعریف نہیں۔ اس سے میرے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال اُٹھا کہ آخر وہ کس قسم کی جمہوریت ہے جو ہندوستان کے لئے مفید ہو سکتی ہے؟ معلوم ہُوا کہ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور اِدھر کھانے والے بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔

انگریزی کے ایک چینی مصنّف لن یُوتانگ کی کتاب (The Importance of Living) "جینے کی اہمیت" کے بعض حصّے پڑھے۔ خوب زندگی بخش کتاب ہے۔ مصنّف کہتا ہے کہ مغربی تہذیب نے سرگرم زندگی کا جو نصب العین انسان کے سامنے پیش کیا ہے وہ تباہ کن ہے۔ چینی نظریۂ حیات فرد اور جماعت دونوں کے لئے زیادہ مفید اور دل خوش کن ہے۔ حقیقت پسندی تخیل اور حسّاسیت کے ساتھ انسان میں ظرافت کا عنصر بھی ہونا چاہیئے تاکہ وہ زندگی کو علیٰحدہ کھڑا ہو کر دیکھ سکے۔ خیال و عمل میں سادگی ہونی چاہیئے علم کی غلطندی سے گزر کر انسان بیوقوفی کی عقلمندی تک پہنچ جائے اور زندگی کے غموں کو محسوس کرتا ہوا ایک مسخرے فلسفی کی طرح اُس کی ہنسی اُڑائے۔ دُنیا میں سنجیدگی بہت زیادہ ہے اور فانی انسان ہمیشہ زندہ رہنے کی فکر میں گھلا جاتا ہے۔ اپنی خواہشات کے پورا کرنے میں وُہ عموماً خدا کو خواہ مخواہ تنگ کرتا رہتا ہے۔ اخیر میں مصنّف کہتا ہے کہ گو میں کافروں میں ہیں کافروں جو ہمیشہ خدا پر یقین رکھتا ہو لیکن جو غلط فہمی کے ڈر سے لوگوں میں اس کا چرچا نہ کرے۔ کائنات خوبصورت ہے اور عظیم الشان ہے۔ انسان ایک باوقار ہستی ہے جس کے لئے موت ضروری ہے جیسے دُکھ درد۔ اُسے چاہیئے کہ زندگی کی نعمتوں سے لُطف اُٹھائے اور جب اُس سے کچھ اور بن نہ پڑے تو رضائے الٰہی کے سامنے سرِتسلیم خم کر دے اور مطمئن رہے۔

اِس جنگ نے بچوں تک کو اخبار بیں بنا دیا ہے ایک ورق ابّا کے ہاتھ میں ہے ایک امّی کے پاس باقی بچوں میں حصّہ رسدی تقسیم ہو گئے ہیں۔ نقشوں کا مطالعہ ہو رہا ہے جنگی مباحثہ ہو رہا ہے۔ اخبار بینی کے بعد دیسی پردیسی گانا بجانا ہونے لگا۔ بچوں نے انگریزی

ہندوستانی ہر دو موسیقی سے ربط پیدا کر لیا ہے کوئی بتھوون کی سمفنی (نغمہ) سے لَو لگائے بیٹھا ہے کوئی ہندی راگ میں محو ہے کوئی ریڈیو کی سُوئی گھما رہا ہے اور ملک ملک کی خبریں اور گانے سُن سُنا رہا ہے۔ اتنے میں راگ رنگ ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ اب پڑھائی کا گھنٹہ آ گیا۔

ایک دن میری بیوی نے طنزاً کہا کہ آپ ہمایوں کے ایڈیٹر بنتے ہیں اور اُردو کے بڑے معاون لیکن چراغ تلے اندھیرا۔ آپ کے بچے ٹرٹ بٹ ٹٹ بٹ انگریزی ہی بولتے ہیں۔ میں شرمایا لیکن جب یہ یاد آیا کہ حاجی سر عبداللہ ھارون کے بچے اور سید امتیاز علی تاج کی بچی بھی اس میں ہمارے بچوں کی ہم نوا ہے تو ذرا تسلی ہوئی۔ پھر سوچا کہ اگر مولوی عبدالحق صاحب شادی شُدہ ہوتے اور کئی بچوں کے باپ تو باوجود انجمن ترقی اُردو کے کُل ہند پروپیگنڈا کے غالباً وُہ بھی اپنے گھر کو انگریزی کی لُوٹ مار سے محفوظ نہ رکھ سکتے۔ تاہم ارادہ کیا کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ گھر میں ہم پنجابی بولتے ہیں مگر بچے اردو بولتے ہیں لیکن دقّت یہ ہے کہ سکول سینما ریڈیو گراموفون اِن سب نے کچھ ایسا اثر کیا ہے کہ اب انگریزی اُن کی اُردو پر غالب آتی جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر میں نے کراچی میں اپنی فرصت کا ایک کام یہ قرار دیا کہ یکے بعد دیگرے تینوں بچوں کے ساتھ اُردو پڑھوں پڑھاؤں اس طرح مجھے بھی اُردو کے آسان اور عام و خاص ادب سے پھر روشناس ہونے کا موقع ملا۔ غالب اور اقبال کو جتنا بھی پڑھو وہ ہمیشہ تر و تازہ معلوم ہوتے ہیں۔ گھر کی اِس معلّمی سے میں نے فائدہ بھی اُٹھایا اور لُطف بھی

پڑھ پڑھا کر کھانا کھا کر سہ پہر کو ہم سب اپنے اپنے کمرے میں لیٹ جاتے۔ بچوں کو ہدایت تھی کہ وہ سو جایا کریں لیکن وُہ عموماً بجائے سونے کے مختلف انگریزی رسالوں کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے۔ میں بھی اپنے کمرے میں الگ تھلگ پہلے اپنی ڈاک اپنے سرہانے رکھ لیتا پھر نئے اخبار رسالوں پر ایک نظر ڈال لیتا۔ ڈیلی گزٹ (کراچی) اور ٹریبیون تو صبح آ جاتے۔ سہ پہر کو سول ملٹری، انقلاب، مدینہ، ہندوستان، ہماری زبان، منشور، نوائے وقت، ایسٹرن ٹائمز، حمایت اسلام، منادی، تہذیب نسواں، ہمایوں ان سب کی خریداری سرپرستی یا ملکیت کا حق ادا کرتا۔ اِن کے رطب و یابس سے اپنے دل و دماغ کو بھرتا اور اپنے جسم و رُوح کو مضمحل کر لیتا کبھی پنجاب یونیورسٹی کے کاغذات آ جاتے، کبھی پنجاب پبلک لائبریری کی فہرستِ کتب، کبھی انجمن حمایت اسلام اور پنجاب مسلم لیگ کے نوٹس اور کبھی پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی کارروائیاں اِن سب پر دستخط کر کے کچھ ایسا محسوس کرتا گویا میں بھی ایک کام کا آدمی ہوں۔ یہ ذرا ذرا سی خود فریبیاں نہ ہوں تو متمدن انسان اتنے آرام سے زندگی نہ گزار سکے۔ لُطف یہ ہے کہ یہاں میں نے کبھی کبھی "ہمایوں" بھی پڑھا ورنہ لاہور میں تو صرف اُس کا سرورق ہی دیکھنے میں آتا۔ یاد رکھیئے جس رسالے کے دو ایڈیٹر ہوں ایڈیٹر اور جائنٹ ایڈیٹر تو پہلا نام کا اور دوسرا کام کا ایڈیٹر ہوتا ہے۔

مضمون تھا سمندر کے کنارے پر اور میں کبھی گھر میں بند رہا کبھی کہیں گھُوما کبھی کہیں کھو یا گیا! ہم سمندر کے کنارے چار پانچ مہینے رہے اب چند دن باقی ہیں۔

وُہ راتیں یاد رہیں گی جب نیند نہ آتی تھی لیکن رات کی خاموشی میں سمندر کی مسلسل راگنی برابر سنائی دیتی تھی۔

وہ شامیں یاد رہیں گی جب سمندر کے کنارے بھیگی ہوئی ریت پر گھنٹوں چہل قدمی کی۔

اور کونسا دن تھا جب سمندر کو دیکھ کر ہمیں وہ محبوب ہستی یاد نہ آ گئی جو ساڑھے تین سال ہوئے یہاں سے

کچھ ہی دُور اسی سمندر کے کنارے ہم سے رخصت ہوئی، ایک بادبانی کشتی کی طرح وُہ افق کی طرف چل دی اور پھر آہستہ آہستہ نظر سے غائب ہوگئی۔ اُس کے محبت بھرے پیغام ہمیں آتے رہے، آتے رہے اور پھر ختم ہوگئے، وُہ اُس کی آواز اور اُس کے پیغام سبھی ختم ہوگئے نہیں اُس کی آواز اب بھی ہمارے دل میں گونج رہی ہے اُس کے پیغام اب بھی موجود ہیں مگر وہ خود . . . . . .

کیا یہ مضمون اس طرح ختم ہوگا! کیسے ہوسکتا ہے؛ دل میں آنسو بھرے ہوں مگر ابھی ہمیں اِن آنکھوں سے دیکھنا ہے، جگر خون ہو رہا ہے مگر ابھی اِس جسم میں سانس باقی ہے اور ہم کس دنیا میں رہتے ہیں جہاں آج کل ہزاروں لاکھوں ماں باپ کی آنکھوں کے چاند تارے خاک و خون میں لتھڑ رہے ہیں۔

کوئی گھر ہے جہاں دو ایک اور کوئی گھر ہے جہاں سوائے ایک آدھ بیکس و نامراد کے باقی سبھی موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ نوعِ انسان ماتم میں ہے شاید لاکھوں ہی ہم سے زیادہ رنجیدہ اور ہم سے زیادہ دُکھی ہوں گے ذرا سوچیں کہ یہاں کتنے تھوڑے دل ہیں جنہیں کبھی نہ کبھی غم کی ٹھیس نہ لگی ہو۔ اپنی زندگی میں ہم نے ہزاروں خوشیاں دیکھیں، آخر غم کی باری بھی آنی تھی سو اب ہماری تقدیر و تدبیر یہی ہے کہ اس صدمے کو سہیں سہے جائیں اور جب تک ہوسکے اس رنج و راحت کی دُنیا میں ہمّت کے قدموں سے چلیں اور محبّت و ہمدردی کی راہ پر گام زن ہوں!

سمندر سامنے ہے کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وُہ کھلا ہُوا رستہ ہے جو ہمارے بند وطن سے دوسرے ملکوں کو جاتا ہے اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ وُہ نہ ختم ہونے والی شاہراہ ہے جو اس فانی دُنیا سے کسی اور نہ معلوم کیسی دُنیا کی طرف جاتی ہے۔ جہاں خدا جانے کیا کچھ ہے؟!

ہاں سمندر سامنے ہے۔ موجیں اُٹھتی ہیں ہوائیں چلتی ہیں کہیں سے آ رہی ہیں کہیں کو جا رہی ہیں: ؎

کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے   بے تاب ہے اِس جہاں کی ہر شے

لیکن جیسے غیب سے ایک آواز آتی ہے: ؎

آغاز ہے عشق انتہا حُسن!   انجام ہے اِس خرام کا حُسن

بشیر احمد

"تو مجھ سے کتنی دُور ہے اے پھل!"

"میں تیرے دل میں پوشیدہ ہوں اے پھول!"

میں ایک راستوں کی دُنیا میں ہوں۔ رات آتی ہے۔ اپنا دروازہ کھول لے میرے گھر کی دنیا!

(ترجمہ از منظر بشیر)   ٹیگور

اے دل اے دل واپس آ

رُخ سورج نے پھیرا ہے   باہر سخت اندھیرا ہے
تاریکی نے گھیرا ہے   رات سے دُور سویرا ہے

اے دل اے دل واپس آ

بندۂ نفسِ امّارہ   بے کس بے بس بے چارہ
تو نہیں کوئی سیّارہ   کیوں پھرتا ہے آوارہ

اے دل اے دل واپس آ

راہ میں ڈسنے والے ہیں   بچھّو ہیں اور کالے ہیں
پاؤں میں تیرے چھالے ہیں   موت نے ڈورے ڈالے ہیں

اے دل اے دل واپس آ

باغ میں صیّاد، اہلِ ہوس   بیٹھے ہیں لے کر دام و قفس
اب تو نہیں پر رُک جا بس   تُو ہے ایک اور وہ ہیں دس

اے دل اے دل واپس آ

ہے وُہ بحرِ تلاشِ مال   جس میں رہتے ہیں گھڑیال

ماہی گیر کے بھی ہیں جال   موت کے ہیں یہ سب دلّال

اے دل اے دل واپس آ

باہر ردّ و کد بھی ہے   کینہ اور حسد بھی ہے

جور و ستم بے حد بھی ہے   خوفِ نگاہِ بد بھی ہے

اے دل اے دل واپس آ

اب یہ ہرزہ گردی چھوڑ   گھر کی جانب باگیں موڑ

اپنے آپ سے رشتہ جوڑ   باقی سب زنجیریں توڑ

اے دل اے دل واپس آ

باہر کیا کرتا ہے طلب   کیوں پھرتا ہے روز و شب

تو ہے ناداں ہائے غضب   تیرے اندر ہی ہے سب

اے دل اے دل واپس آ

دشت میں ہے نہ جبل میں ہے   مٹّی میں ہے نہ جل میں ہے

ملتا سب کچھ پل میں ہے   سب کچھ تیری بغل میں ہے

اے دل اے دل واپس آ

عبدالحکیم

لاڈو

(۱)

گاؤں کا نام تھا مکھن پور۔ کسی جاٹ نے جس کا ماں باپ نے لاڈ سے مکھن نام رکھ دیا تھا یہ گاؤں آباد کیا۔ ابھی تک اس کی اولاد کے قبضے میں ہے۔ پندرہ بیس گھر تو مکھن کی اولاد کے ہیں۔ چالیس پچاس گھر ان لوگوں کے مزارعوں اور متعلقین کے یعنی دو گھر لوہار اور بڑھئی کنبہ کے، چار گھر خاکروبوں کے چھ سات گھر جلاہوں کے ایک تیلی کا ایک موچی کا ایک مُلّا کا اور باقی کاشتکاروں کے۔

مُلّا کے لفظ سے شاید خیال ہُوا ہو کہ مکھن مسلمان تھا، ہرگز نہیں۔ مکھن کا بیٹا لدھو مسلمان ہُوا اور یہ صرف پانچ پشت کا واقعہ ہے۔ مُلّا صرف لدھو کے وقت آیا اور نماز روزہ سکھا گیا۔ لدھو نے اُسے رہنے کے لئے گھر دیا۔ ویسے بہت خاطر تواضع کی مگر جب مُلّا نے کہا کہ مسجد بناؤ، مسجد کے لئے علی الدوام زمین معافی کے لئے دو تو لدھو نے انکار کر دیا۔ اس دن سے گھر تو مُلّا کی اولاد کے قبضے میں ہے مگر جب کبھی عمارت کا سوال اُٹھا تو لدھو نے یہی جواب دیا کہ میرے باپ کی نصیحت ہے کہ گاؤں میں کبھی پکّی عمارت نہ بنانا اور میں اپنے بیٹوں کو نصیحت کر جاؤں گا کہ کبھی پکّی قبر بھی نہ بنوائیں۔

جاٹ کی سعادت مندی کا یہ کرشمہ ہے کہ آج تک مکھن پور میں پختہ اینٹ کی عمارت نہیں، قبر نہیں، دُکان نہیں۔ کئی دکاندار آئے مگر مکھن کی اولاد ہمیشہ مُصر رہی کہ پکّی دُکان نہ بننے دیں گے اور آخر کار وہ دُکاندار چلے گئے۔ مکھن پور میں یہ ہر ایک کی زبان پر ہے کہ اگر دُکان قائم ہو جاتی تو اب تک گاؤں اُجڑ جاتا۔ مکھن کی اولاد کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ عورت کو دُکان پر بھیجنے کو سب سے زیادہ ذلّت تصور کرتے ہیں۔ مکھن کی اولاد کی شکل و شباہت کے متعلق صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ کیا مرد کیا عورتیں سب کشیدہ قامت ہیں۔ آنکھیں موٹی موٹی ہیں مگر محض واقعاتی نگاہوں کی مالک۔ جادو پاس نہیں پھٹکا۔ رنگ بھی سنہری گندمی نہیں بلکہ کچھ پھیکے بے نمک سانولے پن کے چھوٹے بھائی کے لگ بھگ۔ مگر ایک چیز میں مکھن کی اولاد لاجواب ہے یعنی چال میں۔ سب کے سب ایسے سبک رفتار ہیں کہ اِنسان دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے۔ مکھن اپنے زمانے میں ایک نامی گرامی چور تھا مگر صرف اُسی کی گھوڑی یا اونٹنی یا بھینس چُراتا تھا جس سے عداوت ہو یا ضد ہو۔ مکھن کے بیٹے پوتے بھی اِس شغل سے متنفر نہ تھے مگر تین پشت سے انگریزی عملداری کے زور نے واضح کر دیا کہ ضد پوری کرنی ہو تو بجائے چوری کے یا لاٹھی چلانے کے وکیل چلانا زیادہ مفید ہے۔

(۲)

شہر کا نام ہے سیالکوٹ۔ بڑا شہر، چھاؤنی بھی اور شہر

اور چھاؤنی دونوں خوب ترقی پر، کارخانے، کوٹھیاں، سکول، ہسپتال، جیل خانہ سب کچھ۔ جیسا شہروں کا قاعدہ ہے محلے والے خود ایک دوسرے کو نہیں جانتے نہ کسی کو شہر سے خاص محبت ہے۔ کوٹھیوں کے رہنے والے تو اکثر خالص پردیسی ہیں۔ ایک کو دوسرے سے کچھ بھی سروکار نہیں۔ ملتے ضرور ہیں مگر ایسا ہی جیسے شہر والے ملتے ہیں۔ نہ باپ دادا کا قصہ، نہ زمین کی پیداوار کا چرچا۔ اخباروں کی باتیں کر لیتے ہیں۔ افسروں کا تذکرہ آجاتا ہے جلسوں میں شرکت ہو جاتی ہے۔ مگر ملا کر رکھنے والی، بکھرنے سے روکنے والی کوئی رسّی نہیں ہے۔ ہر گھر، ہر دُکان، ہر کوٹھی، ہر دفتر ایک جزو پریشان ہے ان گھروں دُکانوں بنکوں میں پوجا اسی دیوتا کی ہوتی ہے جو الگ رکھنے میں یکتا ہے یعنی

زر

کی۔

شالکوٹ کی ایک کوٹھی میں معمول سے کہیں زیادہ تموّل ہے اور غیر معمولی آزادی۔ یعنی لڑکیاں برجس پہنے ہیٹ لگائے گھوڑوں پر سوار ہوتی ہیں۔ دُنیا انگلیاں اٹھاتی رہے مگر دولت کے نشے میں کون دُنیا کی پروا کرتا ہے۔

ایک لڑکی جس کا نام خادمہ ہے جب شہر کی سڑکوں پر گھوڑا اُڑاتے اُڑاتے اکتا گئی تو ایک دن مکھن پور جا نکلی۔ مکھن پور شالکوٹ سے صرف تین میل دُور ہے کچا رستہ ہے مگر سایہ دار، اور خادمہ کو گاؤں کا منظر بے انتہا دلفریب معلوم ہوا۔ اکثر اُدھر جانے لگی۔ یہاں تک کہ گاؤں والے اُس کے گھوڑے کے حلیہ سے، اُس کی سواری کے ڈھنگ سے کافی واقف ہو گئے مگر کسی گاؤں والے نے کبھی اس کی شکل کو نہ دیکھا۔ یہی سمجھتے رہے کہ کوئی نیم فرنگن شالکوٹ سے محض سیر کے لئے آتی ہے۔

خادمہ نے کچھ دنوں بعد ایک نوکر بھی ساتھ لانا شروع کیا۔ یعنی نوکر بھی سوار اور یہ بھی سوار اور اب گاؤں کے بالکل پاس بلکہ گلیوں میں سے بھی نکلنا شروع کیا، ایک دن گاؤں والے کیا دیکھتے ہیں کہ نوکر کے پاس بالٹی ہے۔ اور یہ دونوں گھوڑوں سے اُتر کر، گھوڑوں کو درخت سے باندھ کر ایک کنوئیں سے بالٹی میں پانی بھرنے لگے۔ پھر لوگوں نے یہ دیکھا کہ اس نیم فرنگن عورت نے ایک بچے کو پیار سے بلایا۔ اس سے باتیں کیں اور پھر اس کا منہ ہاتھ اس لڑکی نے خود صابن سے دھو دیا۔ بال صاف کر دیئے۔ سفید تولیے سے اس کے مُنہ گردن کو پونچھ دیا اور سوار ہو کر واپس چلی گئی۔ دوسرے دن پھر یہی ہوا۔ تیسرے دن تو کئی بچے جمع ہو گئے۔ ایک دو بچوں کی مائیں بھی آئیں

گاؤں والی عورت۔ مس صاحب آپ کیوں یہ کام کرتی ہیں۔

خادمہ۔ مجھے صاف بچے پیارے معلوم ہوتے ہیں دیکھو، خدا نظر نہ لگائے، اس بچے کا کیا چاند سا مکھڑا نکلا ہے۔

گاؤں والی عورت۔ آپ تو عیسائی ہیں پھر آپ نظر کی بات کیوں کرتی ہیں؟۔

خادمہ۔ خدا نہ کرے کہ میں عیسائی ہوں۔ الحمد للہ۔ مسلمان ہوں۔

گاؤں والی۔ تو آپ کا مرد آپ کو اس طرح باہر بے پرد

پھرنے سے نہیں روکتا؟

خادمہ۔ میرے والد نے اجازت دے دی ہے۔

دوسری گاؤں والی۔ آپ مسلمان ہیں تو آپ نے بھنگی کے لڑکے کا مُنہ کیوں دھویا؟

خادمہ۔ مسلمان، مہتر، سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں اور بچوں میں فرق کرنا ٹھیک نہیں۔

گاؤں والی۔ ہم تو سمجھے کہ آپ آہستہ آہستہ گاؤں کو عیسائی کرنے کا پینترا جما رہی ہیں مگر ہمارے چودھری بڑے سخت ہیں۔ انہیں پتہ لگا تو آپ کا یہاں آنا بند ہو جائے گا۔

خادمہ۔ وہ کیسے؟

گاؤں والی۔ پہلے تو وہ آپ کو آرام سے منع کریں گے اور پھر بھی آپ نے نہ مانا تو آپ کے گھوڑے غائب کر دینگے

خادمہ۔ آپ کون ہیں؟ آپ بھی اُن میں سے ہیں؟

گاؤں والی۔ ہم تو جلاہے ہیں۔ ہماری کیا مجال کہ ہم چودھریوں کی بات میں دخل دیں۔

خادمہ۔ جب کوئی منع کرے گا تو ہم نہ آئیں گے۔

(۳)

دوسرے ہفتے کے اختتام پر خود خادمہ پر بھی کچھ واضح ہونے لگا کہ مکھن پور کی فضا میں شہری گلاب کا پھول کانٹا سا بن رہا ہے۔ گاؤں والوں کی مہمان نوازی کے چرچے اس نے سُن رکھے تھے مگر تعجب کرتی رہ گئی کہ مسلمانوں کا گاؤں اور لوگوں کو معلوم کہ میں مسلمان ہوں مگر چودھری جماعت کا کوئی فرد مرد تو کجا کوئی عورت یا لڑکی بھی پاس نہیں پھٹکتی

مہتروں اور جلاہوں کے بچے بھی مُنہ دھلوانے سے کتراتے نظر آئے۔ مجھے سے دل سے لوٹنے کے وقت معمول کا رستہ چھوڑ کر خیالات میں غرق ایک پگڈنڈی پر گھوڑا قدم قدم چلا کر روانہ ہوئی۔ ایک کنوئیں کے پاس کھیت سے اچانک ایک مہیب کُتا نکل کر گھوڑے کو بھونکا۔ خادمہ ڈھیلی ڈھالی بیٹھی تھی گھوڑے نے پہلو کی طرف جست کی اور خادمہ زمین پر آ رہی۔

آناً فاناً ایک نوخیز سی جاٹنی نے بڑھ کر

"بسم اللہ بسم اللہ"

کہہ کر خادمہ کو اُٹھا لیا اور متردد ہو کر پوچھا "چوٹ تو نہیں آئی؟"

خادمہ۔ نہیں بہن۔ بچ گئی۔ بے خیال بیٹھی تھی، گھوڑا جھپکا میں گر گئی۔

جاٹنی۔ چوٹ کا پتہ نہیں چلتا۔ کنوئیں پر ذرا دم لے لو، چارپائی پر لیٹ جاؤ گرم دودھ پی لو۔ پھر اگر کوئی چوٹ نہ ہوئی تو گاڑی بلوا کر اس میں چلی جانا۔ تمہارا گھوڑا تو بھاگ گیا اور تمہارا نوکر اس کے پیچھے گیا۔ اب گھوڑا شاید گھر جا کر دم لے۔

خادمہ۔ بہن آپ ہرگز فکر نہ کریں۔ کنی پر شاید کچھ خراش ہو اور پاؤں ذرا مُڑ گیا ہے۔ مگر کچھ تکلیف نہیں اور گھوڑا میرا ابھی آتا ہوگا۔

جاٹنی۔ کمر میں مضبوطی سے بازو دے کر، خادمہ کا بوجھ سنبھالے اسے کنوئیں کی طرف لے جاتی ہے اور چارپائی پر بٹھا دیتی ہے۔ پیتل کے صاف چمکیلے کٹورے میں گرم

دودھ پیش کرتی ہے۔

جاٹنی۔ ضرور گرم گرم پی لیجئے

خادمہ۔ آپ کی مہربانی۔ پی لیتی ہوں۔ بہن آپ کا نام کیا ہے؟ میرا نام خادمہ ہے۔

جاٹنی۔ میرا نام لاڈو ہے مس صاحب۔

خادمہ۔ خُدا کے لئے مجھے مس ٹس نہ کہو۔ مسلمان ہوں تمہاری بہن ہوں ہماری عمر میں بھی کچھ فرق نہیں۔ میں شاید تم سے کچھ چھوٹی ہی ہوں۔ ابھی اُنیّس سال کی بھی نہیں۔ شاید تم قدرے چھوٹی ہو۔

لاڈو۔ ہم لوگ نام سے تو بلاتے نہیں۔ خیر مس نہیں کہتی۔

خادمہ۔ آپ تو چودھری ہیں نا؟

لاڈو۔ جی، میں نمبردار کی بیٹی ہوں۔ ہمیں آپ کا سب حال معلوم ہے۔ آپ کے دادا وکیل تھے، آپ کے والد بیرسٹر ہیں۔ سب ہمارے مرد جانتے ہیں کہ آپ کے پاس بہت دولت اور حکومت ہے۔

خادمہ۔ (ہنس کر) حکومت تو خاک نہیں۔ روٹی کھانے کو خدا دے دیتا ہے۔

لاڈو۔ آپ سے باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا ہے مگر مجھے کام بہت ہے کاشت کا زمانہ ہے۔ دونوں بھائیوں کی روٹی کھیت میں لے جانی ہے

(یہ دیکھ کر کہ لاڈو نتھ پہنے ہوئے نہیں)

خادمہ۔ اچھا یہ تو بتا دو کہ تمہاری شادی کب ہوگی؟

لاڈو۔ (بڑی سادگی سے) جس سے میری نسبت ٹھہری تھی وہ بچارا گذر گیا۔ اب اس کے چھوٹے بھائی سے ایک سال کے بعد ہوگی

خادمہ۔ (پیار کے لہجے میں) تمہیں وہ پسند ہے؟

لاڈو۔ (بے تکلفی سے) میرے باپ کو پسند ہے۔ اچھا ہی ہے مگر مجھے اس میں کیا دخل! ہم لوگ کوئی شہری تھوڑے ہیں کہ بزرگوں کی باتوں کی جانچ پرتال کریں بڑوں کا فیصلہ ہمیشہ ٹھیک ہوتا ہے۔ اچھا میں اب آپ سے ایک بات پوچھوں؟

خادمہ۔ ضرور۔

لاڈو۔ آپ مسلمان ہو کر فرنگیوں کا لباس، فرنگیوں کی عادتیں کیوں اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ ہمارے سب مرد آپ کے والد کی بہت عزت کرتے ہیں مگر آپ پر اُن کو تعجب ہوتا ہے۔

خادمہ۔ کیا بُرا کرتی ہوں کہ بچوں کا مُنہ دُھلا دیتی ہوں۔

لاڈو۔ مُنہ دُھلایا پھر گھڑی میں ویسا ہو گیا۔ کوئی نیک کام سکھاؤ۔

خادمہ۔ صاف رہنا بھی نیکی ہے اور صفائی سے انسان بیماریوں سے بچتا ہے۔

لاڈو۔ بیماری تو خدا کے حکم سے آتی ہے۔

خادمہ۔ خدا نے انسان کو عقل دی ہے اور بیماری سے بچنا بڑی عبادت ہے۔

لاڈو۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، خیرات کرو اور اپنی عاقبت سنوارو۔ بیماری اور تکلیف آنی جانی چیزیں ہیں۔ خُدا سے گناہوں کی معافی مانگو۔

خادمہ۔ یہ تو سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔

لاڈو۔ (بات کاٹ کر) ٹھیک کا کیا مطلب؟ خدا کا حکم ہے۔ اس میں کون دخل دے سکتا ہے۔ ہم ٹھیک یا غلط کہنے والے کون؟

خادمہ۔ (سنبھل کر) ہاں بہن، مجھ سے غلطی ہوئی، معاف کر دو۔

لاڈو۔ میں معاف کرنے والی کون، خدا اپنے فضل و کرم سے معاف کر دے۔

خادمہ۔ جی ہاں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ گھروں میں اور جسموں میں اگر صفائی رکھی جائے تو خدا کو پسند ہے۔ غیر ضروری طور پر خاک میں اٹے رہنا کچھ اچھا نہیں۔

لاڈو۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔ آپ لوگوں کو خاک سے نفرت ہو تو الگ بات ہے۔ ہم لوگ تو خاک کی کمائی کھاتے ہیں۔ ہم مٹی کے، ہمارا رزق مٹی میں۔ ہم خاک کو کیسے برا کہہ دیں۔ لیجئے آپ کا گھوڑا آ گیا۔

خادمہ۔ اچھا بہن۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ چلی جاتی ہوں مگر میرا بہت جی چاہتا ہے کہ تم مجھے بہن بنا لو۔ مجھے تم بہت پیاری معلوم ہوتی ہو۔ کیا پھر کبھی تم سے ملنے کا موقع ہوگا؟

لاڈو۔ اپنے والد سے پوچھوں گی۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ یہ نتھو خیرے کے بچوں کے منہ دھلانے کا دھندا چھوڑ دیں اور شریفوں سے ملاقات بڑھائیں تو میرے والد کو اعتراض نہ ہوگا کہ میں آپ سے مل لوں۔ مجھے بھی آپ بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپ بہت دماغ دار حکومت والی ہوں گی مگر آپ تو بہت سیدھی سادھی معلوم ہوتی ہیں۔

خادمہ۔ اچھا خدا حافظ

لاڈو۔ اللہ بیلی

(۴)

اس دن گھر جا کر خادمہ جو شگفتگی کا سرچشمہ تھی اپنے کمرے میں پژمردہ سی الگ پڑی رہی۔ چوٹ جتنا اس کا خیال تھا اُس سے بھی کم نکلی۔ مالش تک کی ضرورت نہ ہوئی مگر خادمہ ہے کہ کمرے سے نکلنے کا نام نہیں لیتی۔ ماں نے باپ نے بھائی بہنوں سبھی نے پوچھا۔ اتوار کا دن تھا۔ سب گھر میں تھے مگر خادمہ پر چپ کا روزہ واجب ہو گیا۔ دوپہر کے کھانے کے لئے میز پر نہ گئی۔ یونہی ذرا ذہور کمرے میں منگوا کر چکھ لیا اور پھر سوچ میں پڑ گئی۔ سہ پہر کا وقت اُس نے یوں صرف کیا کہ اپنے منگیتر کو خط لکھتی رہی اور پھاڑتی رہی شام کو آخر کمرے سے نکلی مگر نہ کھیل کا شوق نہ سینما کا چرچا تھوڑی دیر بہن بھائیوں سے گرنے کا حال اور دودھ پینے کا قصہ بیان کرتی رہی۔ مگر لاڈو سے جو گفتگو ہوئی اُس کا ذکر اُس نے کسی سے نہ کیا۔ شام کے قریب اُس نے نوکر کو بلا کر کہا کہ ایک سفید موتیے کا ہار لکھن پور کے نمبردار کے گھر لاڈو کے باپ کو لاڈو کے لئے دے آئے اور یہ کہہ دے کہ لاڈو کی بہن خادمہ نے سلام کہا ہے اور کہلا بھیجا ہے کہ چوٹ بالکل نہیں آئی۔ بہن کا لفظ اُس نے نوکر کے سامنے استعمال تو کر لیا مگر اُس کے دل میں یہ بات چبھتی رہی کہ لاڈو نے ایک دفعہ بھی اسے بہن کہہ کر مخاطب نہ کیا۔

پورے چھ دن خادمہ نے مکھن پور کی طرف رُخ نہ کیا مگر اتوار کو جی کڑا کر کے آخر پھر مکھن پور کی طرف یعنی مکھن پور میں اسی کنویں کی طرف گئی جہاں لاڈو سے ملی تھی۔

لاڈو۔ بسم اللہ۔ میں تو سمجھی کہ آپ خفا ہو گئیں۔

خادمہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

لاڈو۔ امیر آدمیوں کا کیا پتا؟

خادمہ۔ بہن خدا کے لئے مجھ پر شبہ نہ کرو۔ تم بھی اپنے گھر کی امیر ہو۔ نمبردار کی بیٹی ہو۔ میرا باپ تو نمبردار نہیں ہے۔

لاڈو۔ وُہ ہار میں نے ڈرتے ڈرتے لیا۔ جب آپ کا نوکر آیا تو میرے والد گھر میں نہ تھے۔ ماں ہے نہیں۔ صرف دونوں بھائی گھر میں تھے۔ اُن سے پوچھ کر لیا۔ یونہی لٹکا دیا کیونکہ ہمارے ہاں کنواری لڑکیاں ہار نہیں پہنتیں۔ بڑی اچھی خوشبو والے پھول تھے۔ میری کوٹھری مہک گئی۔

خادمہ۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ہار تم نے لے لیا۔

لاڈو۔ آج اتفاق سے تم اچھے موقع پر آئی ہو۔ ہمارے مرد سب ایک غیر گاؤں کی برات میں گئے ہیں۔ مجھے کام کم ہے۔

خادمہ۔ تم کیوں نہیں گئیں۔

لاڈو۔ (قدرے تن کر) چودھری مکھن کی بیٹیاں غیر برادری کی برات میں شامل نہیں ہوتیں۔

خادمہ۔ مجھے یہ پتا نہ تھا۔

لاڈو۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ آج مجھے فرصت ہے بہی جلاہی کے ہاں سے بیسن کی روٹیاں پکوائی ہیں۔ ایک گھڑی تک گرم گرم وہ لائے گی مگر آپ بیسن کی روٹیاں کیوں کھانے لگیں۔

خادمہ۔ واہ میں خوب کھاؤں گی۔ میں تمہارے لئے خود بنا کر گاجر کا حلوا لائی ہوں۔ بڑا مزہ ہو کہ ہم دونوں مل کر کھانا کھائیں۔

لاڈو۔ ضرور۔ مگر آؤ تب تک کھیلیں۔ یہ کہہ کر لاڈو کنوئیں کے احاطے سے باہر ایک خالی کھیت کی طرف بڑھی۔ خادمہ کافی مضبوط تھی مگر دس قدم میں لاڈو سے قدرے پیچھے رہ گئی حالانکہ لاڈو کچھ تیز نہ چل رہی تھی۔

لاڈو۔ نرم زمین پر آپ لوگوں کو چلنے کی عادت نہیں۔ کیا کھیل کھیلو گی؟ آؤ مجھے پکڑو۔ خادمہ نے بہت کوشش کی کہ لاڈو کو پکڑ لے مگر وہ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر چکر کاٹ کر نکل جاتی۔ خادمہ کا دو منٹ میں سانس پھول گیا۔

اب وُہ کہنے لگی کہ اچھا تم بھاگو میں تمہیں پکڑوں گی خادمہ دس قدم بھی نہ بھاگی تھی کہ اس نے لپک لیا۔

لاڈو۔ یہ کھیل تمہیں نہیں آتا۔ آؤ واپس کنویں پر چلیں کوٹھے پر چڑھیں۔

خادمہ ہانپتی ہوئی، دُھول جو کھیت سے اُٹھی اس سے کھانستی ہوئی واپس کنویں کی طرف گئی۔ وہاں لاڈو نے کہا کہ آؤ اس کوٹھے پر چڑھو۔

خادمہ۔ سیڑھی تو ہے نہیں کیسے چڑھوں؟

لاڈو۔ (مسکرا کر) ناخن اٹکانے کی جگہ ہو تو انسان آسانی سے کوٹھے پر چڑھ سکتا ہے۔

یہ کہہ کر اُس نے پاؤں کا انگوٹھا دیوار کے انچ بھر کے سوراخ میں رکھا۔ ایک ہاتھ اونچا کر کے دیوار کے ایک کونے پر جمایا اور پھر جو اچکی تو بائیں پاؤں کا انگوٹھا زمین سے ڈیڑھ

گز اونچے ایک اور سوراخ میں تھا اور دوسری جست میں وہ کوٹھے پر دندنا رہی تھی۔

لاڈو- یوں چڑھو نا۔

خادمہ- نہ بہن مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔

لاڈو بڑی بے تکلّفی سے اُسی طرح اتر آئی کپڑے دیوار کی مٹی سے ضرور آلودہ ہوئے مگر اس نے جھاڑنے کا خیال تک نہ کیا۔ کھیل کی خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

لاڈو- آؤ گھٹّر گھٹّر کھیلیں۔

خادمہ- وہ کیا ہوتا ہے ؟

لاڈو- میں تمہیں گھٹّر بنا کر کندھے پر لاد کر چلوں۔ تم گرنے کی کوشش کرو- اگر تم گر جاؤ تو میں ہار گئی۔ اور اگر دس قدم تک تمہیں میں نے گرنے نہ دیا تو تم گڑ کی بھیلی ہار گئیں۔

خادمہ- منظور

لاڈو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ خادمہ کے پیچھے آکر جُھک کر اس کے ہاتھ پچھلی طرف اُٹھا ایک ریلے میں اسے کندھے پر یُسے لاد لیا کہ خادمہ کی کمر ٹھیک شانے پر مُنہ آسمان کی طرف، ہاتھ دونوں قابو میں۔ خادمہ نے لاکھ جتن کئے کہ کسی طرح کروٹ لے کر گرے مگر لاڈو یہ پشتارہ اُٹھائے ہرنی کی طرح دس نہیں پندرہ قدم بھاگ نکلی- پھر خود ہی کہنے لگی- اچھا تم مجھے اتنا ہی فاصلہ اُٹھا کر لے چلو میں گروں گی نہیں- خادمہ اُٹھا تو لائی مگر کمر دُہری ہوگئی- حالانکہ خادمہ خود کافی بلند قامت تھی مگر لاڈو سے دو انچ چھوٹی تھی اور اس کی ہڈی بہت وزنی تھی۔

یہ کھیل ختم ہوا ہی تھا کہ جلاہے کی عورت روٹیاں لے آئی

لاڈو- دادی! مجھے بڑی بھوک لگی ہے- جلدی نکالو-

بڑھیا جُلاہی نے چارپائی کھینچ کر اس پر دسترخوان بچھا دیا- لاڈو ساگ کا سالن لے آئی- جُلاہی نے دو کٹورے لسّی کے رکھ دئے خادمہ نے حلوا اور انڈے کی (Sandwiches) اور چار کیلے چن دئے- سرہانے کی طرف لاڈو نے خادمہ کو بٹھایا- پائنتی کی طرف لاڈو بیٹھی- جلاہی رومال ہلاتی رہی کہ مکھیاں نہ آئیں اور کھانا شروع ہوگیا-

خادمہ نے بیسن کی روٹیوں کی تعریف کی- لاڈو نے حلوے کو بہت پسند کیا اور دس منٹ میں یہ کھانا ختم ہوگیا- خادمہ نے خلافِ معمول لسّی پیٹ بھر کر پی- لسّی تھی بھی بہت اچھی- تصوّر میں اپنی میز کے تکلّف اور اس چارپائی کی سادگی کا مقابلہ کرتی رہی اور دل ہی دل میں کہہ اُٹھی کہ جہاں تک مزے کا تعلق ہے یہ بیسن کی روٹی کسی مُرغ پلاؤ سے کم نہیں-

کھانا ختم ہوتے ہی لاڈو نے جلاہی سے کہا

لاڈو- دادی! بہت ہی مزہ آیا- یہ روٹیاں تم بچوں کے لئے لے جاؤ- یہ حلوا بھی- اور مکھن ضرور لے جاؤ

جلاہی دعائیں دیتی رخصت ہوئی اور اب لاڈو اور خادمہ میں پھر باتیں شروع ہوئیں-

لاڈو- آپ یہ خیال کرتی ہوں گی کہ ہم لوگ بہت کورے ہیں- یہ غلط ہے- ہم لوگ بات کے پکے ہیں- شہر میں آپ کی کئی مُنہ بولی بہنیں ہوں گی ؟

خادمہ- (کچھ دلچسپی سے چونک کر) - جی ہاں تین چار ہیں اور مجھے ان سے بہت محبّت ہے- کئی دفعہ جی میں آیا ہے کہ آپ سے کچھ تعلقات بڑھ جائیں تو ان کو بھی ساتھ

لاؤں۔

لاڈو۔ اگر اُن آپ کی مُنہ بولی بہنوں کو کوئی غیر مرد ستائے تو کیا آپ کے بھائی جا کر لڑیں گے؟

خادمہ۔ نہیں۔

لاڈو۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن ہماری وضع یہ ہے کہ اگر میں آپ کو اپنی زبان سے ایک دفعہ بہن کہہ دوں تو میرا والد آپ کے والد کا بھائی۔ میرے بھائی آپ کے بھائی اور میری زندگی تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ںکھن کی اولاد اس بات میں مشہور ہے کہ چور ہیں مگر بے ایمان نہیں۔ شہر والے ہر آئے گئے کو بھائی بہن بنا لیتے ہیں۔ ہم لوگ سو دفعہ سوچ کر ہزار دفعہ آزما کر پھر یہ لفظ زبان سے نکالتے ہیں۔ اگر میں آپ کو بہن کہہ دوں تو آپ کے لئے بڑی مشکل ہو جائے۔ ہم لوگ چور آپ لوگ وکیل۔ یہ رشتہ کیسے نبھے۔

خادمہ۔ مگر اب تو تم چوری نہیں کرتے ہو اور میری نظروں میں تو تم ہزاروں سادھوں سے اچھے ہو۔ بات کے پکّے ہو۔ مقروض نہیں ہو۔ آن رکھتے ہو۔

لاڈو۔ ان سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ پانچ پشتوں سے آج تک ںکھن کی اولاد میں سے کسی مرد نے پرائی عورت کو نگاہِ بد سے نہیں دیکھا۔ ہمارے ہاں اس بات کی بہت سخت قسم ہے اور اگر شبہ بھی ہو جائے تو اس مرد کا گاؤں میں زندہ رہنا مشکل ہے۔ اسی وجہ سے ںکھن کی اولاد کا میل کسی اور سے ہونا مشکل ہے۔ ہم جو کہتے ہیں اسے اپنی عقل کے مطابق نباہتے ہیں۔ ہم لوگوں کو اپنے بزرگوں کے چور مشہور ہونے سے ذرّہ برابر بھی عار نہیں بلکہ ہمارا فخر یہ ہے کہ دشمن کی چوری کرنا عیب نہیں مردانگی ہے۔ چوری ہمارے مردوں نے چھوڑ دی ہے مگر چوری کا ہنر ہم نے ہاتھ سے نہیں گنوایا۔ ہمارے بزرگ اب بھی ہر نوجوان کو پوری طرح یہ فن سکھاتے ہیں۔ میرے باپ نے خود ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ جس کی کہو چوری کرا دوں۔ لڑکیوں کو لاٹھی چلانا سکھایا جاتا ہے۔ میں اکیلی شہر کے دس آدمیوں کا لاٹھی سے مقابلہ کر سکتی ہوں۔ مگر آپ کو اس دُنیا کا کیا پتا۔ آپ مُنہ دُھلانا جانیں یا خاک سے بچیں۔ بیماری سے ڈریں۔ کُتا بھونکے تو گھوڑے سے گر پڑیں۔ بہن بننا ہے تو لاٹھی چلانا سیکھو۔

خادمہ۔ لاڈو سچ کہتی ہو۔ میں تمہاری بہن بننے کے قابل نہیں۔

لاڈو۔ میں تمہیں دادا لدّھو کی باتیں سناؤں تو بڑی حیران ہو۔

خادمہ۔ ضرور سناؤ۔

لاڈو۔ دادا لدّھو بڑا گرانڈیل جوان تھا اور بتھیتی ہیں تو اس کے برابر ارد گرد کے چالیس پچاس گاؤں میں کوئی نہ تھا۔ سکھوں کا راج تھا۔ اتفاق سے سکھوں کا توپ خانہ جس میں زیادہ تر مسلمان تھے، ہمارے گاؤں کے پاس اُترا۔ گاؤں کے مزارع ڈر کے مارے جنگل میں جا چھپے۔ لدّھو کی عمر اس وقت تیس سال کی تھی۔ دو بڑے بھائی، دو بھتیجے اور خود لدّھو یہ کل ںکھن کی اولاد تھی۔ یہ گاؤں میں رہے۔ توپ خانے والے لوٹنے کے لئے آ گئے۔ لدّھو نے بڑے دونوں بھائیوں سے کہا کہ بھتیجوں کو لے کر بھاگ جاؤ۔ میں سمجھ لوں گا۔ وہ لدّھو کا کہنا مان کر کھسک گئے۔ اتنے میں توپ خانے کے دس جوان تلواریں تانے کچھ سوار کچھ پیادہ گاؤں کی طرف بڑھے۔ لدّھو نے اپنی بستر سے بہتر لاٹھی سنبھالی۔

اسے یقین تھا کہ دس کیا بیس بھی ہوں تو وُہ سمجھ لے گا۔ صرف موقع کی تلاش میں تھا کہ دس کے دس سامنے نہ ہوں بلکہ ایسی جگہ ہو کہ لدھو پہلو سے پہلے ایک کو لے پھر دوسرے کو اور جب وُہ کچھ تتر بتر ہوں تو پھر الگ الگ ہر ایک سے نپٹ لے۔ یہ سوچ کر ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اِسی خیال سے کہ جو اس کے سامنے آئے گا اس کا بایاں ہاتھ ہو گا۔ سوار کا بایاں ہاتھ نکما ہوتا ہے۔ یہ ترکیب دل میں سوچ کر خوب تیار کھڑا تھا کہ ایک بڈھا نحیف فقیر لدّھو کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

فقیر۔ چودھری لدّھو سلام۔

لدّھو۔ سلام سائیں جی

فقیر۔ چودھری کچھ راہِ مولا دلا دے۔

لدّھو۔ سائیں جی کیا لو گے؟

فقیر۔ تمہاری لاٹھی۔

لدّھو۔ (گالی دے کر) لاٹھی تو میں تیرے باپ کو بھی نہیں دوں گا۔

فقیر۔ (آسمان کی طرف اشارہ کر کے) باپ تو میرا تمہارا ایک ہی ہے۔

لدّھو۔ بک بک نہ کر۔ دشمن سامنے آ رہا ہے۔

فقیر۔ دشمن تیرے اندر ہے۔

لدّھو نے ارادہ کیا کہ پہلے اس منحنی فقیر ہی کا فیصلہ کرے۔ لاٹھی اُٹھانے کو تھا کہ اس بُڈھے فقیر نے لدّھو کی کلائی کو اس زور سے جھٹکا دیا کہ لاٹھی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ لدّھو اس فقیر کی گرفت سے بے قرار ہو گیا اور کلائی نہ چھڑا سکا۔

فقیر۔ چودھری لدّھو۔ ان ڈاکوؤں کو گاؤں لوٹنے دے پھر دیکھ خدا کیا دکھاتا ہے۔ ان کی موت تیرے ہاتھ سے ہی ہے۔ فقیر کا کہنا نہ ٹال۔

لدّھو نے سر جھکا دیا فقیر غائب ہو گیا اور لدّھو ایک طرف چھپ گیا۔

توپ خانے والوں نے خوب اچھی طرح گھر گھر لوٹا۔ کپڑے لئے زیور لئے۔ اور لُطف سے باہر نکلے۔ کرنا خُدا کا یہ ہوا کہ اُدھر سے دس سکھ ایک اور گاؤں لوٹ کر سامنے سے آ دھمکے۔ اب دونوں میں لوٹ کے مال پر وہ گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ بہت سے وہیں ڈھیر ہوئے۔ جو بچے وہ خوف کے مارے بھاگ گئے۔ دونوں گاؤں کی لوٹ کا سامان وہیں رکھا رہا۔ لدّھو نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ جس پر وہ حملہ کرنا چاہتا تھا اس کے پاس پستول تھا۔ سمجھ گیا کہ فقیر نے جان بچائی ہے۔ اُسی وقت پھر فقیر کی صدا آئی۔

"چودھری لدّھو یہ سامان اکٹھا کر کے کرنیل الٰہی بخش کو پہنچا دے"۔ لدّھو کے دل پر فقیر کی صدا کا ایسا اثر ہوا کہ سب سامان جمع کر کے بیس میل پر جہاں کرنیل الٰہی بخش تھا وہاں لے گیا۔ کرنیل الٰہی بخش نے لدّھو کے گاؤں کا سامان اُسے واپس کر دیا۔ ایک خوشنودی کا رقعہ دیا اور مہاراجہ سے گاؤں معاف کرا دیا۔

اسی فقیر کی وجہ سے لدّھو مسلمان ہو گیا۔ اب تم اپنے بزرگوں کی کوئی بات سناؤ۔

خادم۔ میرے بزرگوں نے پڑھنے لکھنے کا کام کیا۔ اس میں تمہیں کیا لُطف آئے گا۔ کتاب کے کیڑے تھے۔

لاڈو۔ ہم زمین کے کیڑے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ کتابیں بدلتی رہتی ہیں زمین نہیں بدلتی اور ہم زمین کے کیڑے نہیں بدلتے اڑے ہیں اپنی باتوں پر۔ جب تک آسمان میں پانی ہے اور زمین پر جاٹ کی محنت ہے کچھ نہ کچھ پیدا ہوتا ہی رہے گا۔ کوئی آئے کوئی جائے ہم ہیں اور ہماری زمین ہے۔

خادمہ۔ خدانخواستہ میں یہ تو نہیں کہتی کہ آپ بدلیں یا زمینداری چھوڑ دیں۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ گھر اچھے صاف ہوں، لباس صاف ہوں، کچھ تعلیم کا چرچا ہو۔

لاڈو۔ ہم اگر شہر میں جاکر وہاں کی موٹی موٹی بیویوں سے کہیں کہ چکی پیسو، کنوؤں سے پانی نکالو، دودھ خود دوہ کر بچوں کو گھی مکھن پر پالو۔ زیور زیادہ نہ پہنو، گاڑیوں میں نہ بیٹھو، تماشوں پر نہ جاؤ تو کیا آپ پسند کریں گی؟

خادمہ۔ میں تو پسند کروں گی مگر شہر والیاں ہرگز آپ کی اچھی نصیحت پر عمل نہ کریں گی۔

لاڈو۔ یہی حال ہمارا سمجھ لو۔ جب شہر سے ساڑھیاں پہنے گاؤں میں سلائی سکھانے اور چرخہ چلانے کا سبق دینے کچھ بھدی بھدی عورتیں آتی ہیں تو جی میں آتا ہے کہ اپنے کتے اُن پر چھوڑ دوں۔ مگر کون اپنے کتوں کا منہ پلید کرے۔ لیکن آپ کو چاہئے کہ کم ازکم چار سمجھدار انسانوں کو یہ تو سمجھا دیں کہ گاؤں والوں پر اور ظلم کیا کم ہیں کہ اب ہر تیسرے چوتھے دن شہر کی کاتیں کائیں والیاں دیہات سدھار کے نام پر خواہ مخواہ ہماری پُرلطف زندگی کو بدنام کرتی ہیں۔ کوئی مہتروں کی جمعدارنی بنتی ہے، کوئی جلاہوں کی سرداری کی دعویدار ہوتی ہے۔ کوئی کہتی ہے چرخہ چلاؤ۔ کوئی کہتی ہے کہ مزارع لگان نہ دیں۔ کوئی کہتی ہے زمین سب بانٹ دو۔ کسی کے پاس چھ سات گھماؤں سے زیادہ نہ ہو۔ کیا شہروں میں صرف پاگل آباد ہیں۔

خادمہ۔ میں تو پاگل نہیں ہوں۔ مجھے تم جیسی بہن نہ سہی چند دن کی سہیلی مل گئی۔ سو اب جاتی ہوں۔

لاڈو۔ میرا خیال ہے کہ اب تم یہاں کم آؤ گی۔

خادمہ۔ تم نہ بھی بلاؤ گی تو بھی تمہاری شادی پر تو ضرور آؤں گی اور اگر تمہارے باپ نے اجازت دی تو خود تمہیں دلھن بناؤں گی۔

لاڈو۔ دیکھا جائے گا مگر ایک بات بتاؤ۔ سب گاؤں والے کہتے ہیں کہ میری زبان بہت چلتی ہے۔ کہتے ہیں کہ نمبردار کے لاڈ سے میرا سر پھر گیا ہے۔ مگر سارے گاؤں میں اپنی عمر کی لڑکیوں سے دُگنا کام کرتی ہوں۔ کیا سچ مچ میں بہت بکّن ہوں؟

خادمہ۔ ہرگز نہیں۔ تم تو بہت پیاری باتیں کرتی ہو۔ اگر تم شہر میں ہوتیں تو لونڈے پاگل ہو جاتے۔

لاڈو۔ میں پاگلوں سے دُور ہی بھلی۔ ارے میرا بھائی آ گیا۔ اب تمہیں کہاں چھپاؤں۔

خادمہ۔ میں کیوں چھپنے لگی اور میں تو جا رہی ہوں۔

لاڈو۔ میرا بھائی تو تمہاری طرف دیکھے گا نہیں۔ تم کیا اسے دیکھو گی؟

خادمہ۔ جی چاہا تو دیکھ لوں گی۔

لاڈو۔ یہ بھی ہم میں تم میں فرق ہے۔ ہماری تربیت یہ ہے کہ اگر ساری عمر بھی تمہارے گھر میں آتی جاتی رہوں تو

آنکھ اٹھا کر تمہارے بھائی کو نہ دیکھوں گی۔ حیا ہماری جان ہے۔ جب شہر والیاں دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہمارے مردوں کو دیکھتی ہیں تو ہم لوگ دل ہی دل میں کانپ جاتے ہیں۔ مجھ سے تو تم نے پوچھ لیا جس سے تمہاری نسبت ٹھہری ہے اُس کا نام کیا ہے کیسا ہے؟

خادمہ۔ اشرف، اکھڑ سا ہے مگر یہ سمجھ لو کہ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے ہیں۔ آج اُسے خط لکھوں گی۔ دہلی گیا ہوا ہے۔

لاڈو۔ خط لکھتے ہوئے تمہیں حجاب سا معلوم نہیں ہوتا؟

خادمہ۔ ہرگز نہیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کبھی وہ مجھے کہہ لیتا ہے کبھی میں کچھ سُنا دیتی ہوں۔ آج تو تمہاری بابت لکھوں گی۔

لاڈو۔ بڑی دیدہ دلیر ہو۔

خادمہ۔ خدا حافظ لاڈو

لاڈو۔ اللہ بیلی، خادمہ

(۵)

جب خادمہ گھر پہنچی تو عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ایک طرف تو اس کا دل لاڈو کی جاذب شخصیت کا قائل تھا۔ حیران تھی کہ گاؤں کی ان پڑھ کمسن اور یہ غرور و وضع داری۔ دوسری طرف اسے اپنے نقطۂ نگاہ کا پاس تھا کہ اگر رسوم کی نیو دتوڑی نہ جائیں تو دُنیا چلے کیسے؟ جب خادمہ پر اس قسم کی ذہنی جنون کا وار ہوتا تو ہمیشہ اپنے منگیتر کو خط لکھنے بیٹھ جاتی۔ اکثر خط تو لکھ کر پھاڑے جاتے تھے مگر اس اتوار اُس نے یہ خط ڈاک میں ڈال ہی دیا۔

خط

اشرف! میرے اشرف

جہالت کا ایمان ہٹلر کے فولادی Maginot line سے زیادہ مضبوط اور زیادہ خطرناک ہے۔ تہذیب تعلیم کے تلعے لاڈو کے ایمان کی تاب نہیں لا سکتے۔ سرہو رہے ہیں وہ نصب العین جس پر تمہیں اور مجھے اس قدر فخر تھا۔ لاڈو کی گفتگو کے سامنے پوچ ہیں۔ تمہارا اور میرا دعویٰ یہ تھا کہ گاؤں اور شہر ایک جان دو قالب ہو سکتے ہیں مگر مجھے تو سو سال تک بھی یہ بات ممکن نظر نہیں آتی اور قصور سارا ہم شہریوں کا ہے۔ انگریزی تعلیم اور تمدن نے گاؤں اور شہر کے درمیان خلیج نہیں سو سمندر حائل کر دیے ہیں، شہر والے کتابوں اور کتابوں کے مندرجہ نظریوں کے زور سے ان سمندروں کو خشک کرنا چاہتے ہیں۔ ایں خیال ست و محال ست و جنوں۔ کاش تم یہاں ہوتے۔ کس حقارت سے اور صحیح حقارت سے لاڈو دیہات سدھار کے لئے کارکنوں کے لتے لیتی ہے۔ کیا اس سے ملنا چھوڑ دوں، مگر اشرف اشرف!! میں جو تندرستی اور توانائی کا شہر بھر کے لئے نمونہ ہوں لاڈو کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ چال اس کی غضب کی ہے، طاقت میں مجھ سے دونی۔ قد میں مجھ سے دو انچ اونچی، اپنے ایمان کی حدود کے اندر قطعی آزاد اور نڈر۔ شہر والے تو پچاس سال تک ایسی لڑکی پیدا نہ کر سکیں گے۔ کیا ہی شاندار ماں بنے گی ہمیں شرم آنی چاہئے کہ ایسی شیرنی کو تعلیم کے چڑیا گھر میں بند کرنے کی کوشش کریں۔ سنو اشرف! لکھن پور میں اصلاح کی کوشش جرم ہے، ہم کچھ اُن سے سیکھیں تو بہتر۔ اُن کو کچھ سکھانے کے قابل ہم ہرگز نہیں کیسی مجھے شکست ہوئی اور کہاں سے؟ سارا میرا غرور خاک میں مل گیا۔ اُس خاک میں جو لاڈو کو قدرتی طور پر عزیز ہے۔ باغ کی تتلیوں کا جنگل کی ہرنیوں سے کیا مقابلہ۔

خادمہ

اشرف نے صرف چند سطریں جواب میں لکھیں۔

میری جان۔

ہندوستانی شہری خاتونوں کی سب سے پیاری اور شاید سب سے ذلیل ادا یہ ہے کہ ذرا سی دقت کا سامنا ہوا تو بھاگیں مردوں کی طرف۔ تم صنفِ نازک میں بیداری کی علمبردار ہو۔ رکاوٹوں کا خود مقابلہ کرو۔ تم لاڈو نہیں بن سکتی ہو، لاڈو خادمہ نہیں بن سکتی مگر کیا تم دونوں مل کر کچھ نہیں کر سکتی ہو؟ کم از کم ایک دفعہ پھر اُس سے ملو۔ اُن کے مذہب، رسوم، عادات کو بُرا مت کہو۔ عملی کام کا شوق پیدا کرو۔ جا کر اُن کے ساتھ مل کر بیلوں کا چارہ کاٹو۔ اپنے ہاتھ سے روٹی پکا کر کھلاؤ۔ پھر خدمت کا نام لینا۔ اچھا ہوا کہ تمہارا غرور ٹوٹا۔

تمہارا
اشرف

اب میں اس کہانی کو یہیں چھوڑتا ہوں۔ اپنی اِس زندہ کہانی کو خاتمہ کا کفن پہنانا نہیں چاہتا۔

آج سے آٹھ نو سو سال پہلے چین میں مصوری کی ایک طرز یہ بھی تھی کہ مصوّر تصویر کو نامکمل چھوڑ دیتا تھا۔ منشاء یہ ہوتا تھا کہ دیکھنے والے اپنی لیاقت کے مطابق خود اپنے ذہن میں تصویر کی تکمیل کر لیں۔ مصوّر اپنے ہنر کے قدر دانوں کو اپنے کمال میں شمولیت کی دعوت دیتا تھا۔ تصویر محض تصویر نہ رہتی تھی بلکہ دو دلوں میں ایک خاموش ڈرامے کا آغاز ہوتا تھا۔ پڑھنے والی! وہی دعوت میری طرف سے تمہیں ہے۔ ڈراما شروع ہے۔ میرا پارٹ ختم ہے اب تمہاری باری ہے۔

گاؤں والی سروقد لاڈو کی بے تکلف تصنع سے خالی زندگی تمہارے حوالے ہے جو چاہو سو کرو مگر لاڈو کو بھدی چال نہ چلانا اس کی لچک ہیں میری جان ہے۔

اور کوٹھی والی میری خادمہ سے جو کام لینا ہو لے لو مگر اسے بہت دولتمند نہ بنانا جو لڑکی غریبوں کے بچوں کا مُنہ دُھلاتی ہو اس کے بچوں کو نوکروں کے بس میں نہ ڈالنا۔ یہ چھوٹی سی بڑی بات صرف وہی سمجھ سکیں گے جنہیں خود اپنی ماں نے پالا ہو۔ امیروں کے بچوں کو یہ دولت نصیب نہیں کہ ماں دودھ دے اور مُنہ دُھلائے۔

فلک پیما

جو تم ہو تم دیکھ نہیں سکتے۔ جو تم دیکھتے ہو وہ محض تمہارا سایہ ہے

خدا کی عظیم طاقت نرم ہوا میں ہے طوفان میں نہیں

آدمی ظالم ہیں لیکن انسان رحم دل ہے۔

خدا کا دایاں ہاتھ نرم ہے لیکن نہایت سخت ہے اُس کا بایاں ہاتھ۔

ٹیگور

(ترجمہ از رفعت بشیر)

اندھیر نگری

شاد مری نظموں کے کارن اماں بی دکھ سہتی ہیں — واقف ہیں خاموش فضا میں فکر کی دھاریں بہتی ہیں
دن بھر گھر کے کام کاج میں دُور دُور ہی رہتی ہیں — لیکن رات کو پوتوں[1] سے روز ایک کہانی کہتی ہیں
جس میں اکثر کسی بادشاہ کی سات بیٹیاں ہوتی ہیں

بادشاہ بیٹے کی خاطر جیتے جی مر لیتا ہے — دوا، دُعا، تعویذ اور گنڈے سبھی جتن کر لیتا ہے
بیگم سے ہر "مُلّا" "سیانا" نذر پیٹ بھر لیتا ہے — پہلا مُرغ و مُشک دوسرا "گھینٹا" (سور کا بچہ) "گوگر" (گوگل) لیتا ہے
قسمت دُور سے ٹھینگا دکھلاتی ہے اُمیدیں روتی ہیں

بادشاہ اِن ساتوں سے کرتا ہے کسی دن کوئی سوال — یا یہ حکم کہ لائے کوئی "امرت" اور جائے پاتال
یا دشمن کے ہاتھوں تخت و تاج و حرم سرا پامال — اَدل بَدل کر وہی مضامیں وہی تخیّل وہی مآل
القصّہ روز امّاں بی پوتوں کو سُلا کر سوتی ہیں

مُجھ کو یہ یکساں افسانے پہلے پہلے بار ہوئے — پھر آہستہ آہستہ اُس عادت سے دو چار ہوئے
جس کے ہوتے مُجھ کو نوبت نقّارے بیکار ہوئے — شور و غل سے "قطعِ سماعت" (قطعِ نظر کی وضع پر) جب چاہا اشعار ہوئے
وہ اشعار کہ جن کی خوشبوئیں کانٹے سے چُبھوتی ہے

آج رات جب دادی کو اُن کے پوتوں نے گھیر لیا — یہ بستر پہ چڑھ بیٹھا تکیوں کا اُس نے ڈھیر لیا
ٹھہرو۔ کہہ کر موصوفہ نے "قتّی" کا رُخ پھیر لیا — کھا کر پان۔ فسانے کا عنوان غضب اندھیر لیا
وُہ اندھیر کہ جس کا مُنہ ارواح خبیثہ دھوتی ہیں

بولیں۔ نام کہانی کا ہے "اندھی نگری، چوپٹ راجے"[2] — اس نگری میں بھولے بسرے ایک گرو دو چیلے آئے
سُنیں صدائیں۔ ٹکے سیر کوئی بھاجی لے کوئی کھا جا کھائے — چیلے اِس من بھاتی ریت پہ ریجھے اور گرو گھبرائے
بولے جلدی بھاگو "موجیں" یاں دریا کو ڈبوتی ہیں

---

[1] میرے بھتیجے

[2] اندھیر نگری چوپٹ راجہ اندھی نگری چوپٹ راجے دونوں طرح بولتے ہیں اور شاید موخر الذکر زیادہ صحیح ہے۔

جس بستی میں چلتی "گاڑی"[1] نقد مال "کھویا" کہلائے
چال جہاں چنچل گھوڑے کی "سرپٹ" (اندھا) اور "پویا" (پیدا ہوا) کہلائے
"خوب کلاں" رائی کا دانہ ہوشیار "سویا" (سرسبز ساگ) کہلائے
سمجھیں "پاک" جہاں شہدے کو بدنام "دھویا"[2] کہلائے
اُس بستی میں "پاپ" کی رہیں پُن کا خون بلوتی ہیں

ان رمزوں نے چیلوں کے ہردوں پر جب تاثیر نہ کی
گرو نے اُن کی ناسمجھی پر ہانتھ سے ملے تقریر نہ کی
چمٹا۔ لُٹیا ڈور اُٹھا لی چل نکلے تاخیر نہ کی
چیلوں نے تعمیر بدن میں لقمہ بھر تقصیر نہ کی
دُنبوں کی رگ رگ میں غذائیں نشو و نما سموتی ہیں

چارے کی بُو لیتے پھرتے تھے اک دن "بے" انی سانڈ
کسی سُود کے مارے نے کی سُود خوار کی بیوی رانڈ
دوڑے بچھڑے اُچھلے کودے بے آئین پولیس کے بھانڈ
دُبلے قاتل سے کترا کر لئے یہ موٹے چیلے ڈانڈ
کاٹھ کا "نیلا" "منصف"۔ بولا بندھ جائیں سو موتی ہیں

تھی تمہید کہانی کی کچھ ایسی "کڑوی" دل آویز
جیسے جامِ جہاں نما کے اندر مئے نمک آمیز
جیسے تُرشی کیف و خمارِ حال کو بیداری انگیز
جیسے چلتے پھرتے مُردوں میں احساسِ رستاخیز
جیسے پھوہاریں موتی سے سوکھے کانٹوں میں پروتی ہیں

میں نے پوچھا کیوں اماں بی اب بھی یہ نگری ہے کہ نہیں
جس کی زمینیں اُلٹی گنگا کے سیلاب کو موزوں نہیں
فرمایا، انجان نہیں تم، رہنے دو یہ بات یہیں
زیرِ "علم" (اسم موث) آسکتا ہے کیا کوئی "اسمِ عام" (اسم نکرہ)، کہیں
عام ہیں وہ سرکاریں جو "گیہوں" کے لئے "جو" بوتی ہیں

شاد عارفی

---

[1] کبیر کا مصرع ہے "چلتی کو گاڑی کہیں اور نقد مال کو کھویا" (مادا)

[2] غالب کا مصرع ہے "دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے"

لفظ

جس طرح حرف صَوت کی نمائندگی کرتا ہے لفظ جذبات و احساسات اور خیالات کی نمائندگی کرتا ہے لفظ کے اجزائے ترکیبی حرف ہیں اور زبان کے اجزائے ترکیبی لفظ ہیں۔

لفظ کی اہمیت۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لفظ "کُن" سے یہ دُنیا یہ تمام کائنات پیدا ہوئی۔ بتایا جاتا ہے کہ لفظ "آدم" کی عظمت اور برکت بیان سے باہر ہے۔ یہ ذکر اس غرض سے کیا گیا ہے کہ "لفظ" محض لفظ کی اہمیت پڑھنے والوں کے ذہن پر نقش ہو جائے۔ لفظوں سے عبارت اور عبارتوں سے ادب کی تشکیل ہوتی ہے۔ لفظ ہی زبان کا سرمایہ اور مُول ہوتے ہیں، لفظوں سے ایک زبان اور ادب کا درجہ قائم ہوتا ہے۔ انسانوں کی طرح لفظوں پر بھی جوانی، بڑھاپے اور موت کا عمل ہوتا ہے، چنانچہ لفظ پیدا ہوتے ہیں، جوان ہوتے ہیں، سٹھیاتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔ زبان میں رائج ہونا لفظ کی جوانی ہے کم استعمال میں آنا اُس کا بڑھاپا ہے اور متروک ہو جانا اُس کی موت ہے۔

علمِ ادب کی بارہ قسموں میں اگرچہ اول نمبر علمِ لغات کو دیا گیا ہے لیکن متقدمین کے نزدیک علمِ لغات کی ہستی لغت یعنی لفظ اور اُس کے معنی تک محدود تھی، اس کی صرفی اور صوتیاتی حیثیت کی طرف برائے نام توجہ تھی۔ ایسے لفظ بہت سے ہیں جو اپنی تاریخ میں اپنا شجرۂ نسب پوشیدہ رکھتے ہیں۔ بہت سے زمانے کے انقلابوں اور قوم کے سانحوں کی تواریخ کے امانت دار ہیں بہت لفظ ایسے ہیں جو ایک قوم کی سیاسی، اخلاقی یا معاشرتی ترقی یا زوال کی روئداد اپنے میں لئے ہوتے ہیں۔ ان سب امور کے دفتر کو فلسفۂ لغات کہنا درست ہوگا۔ آگے چل کر ان امور کے زیرِ نظر لفظ کی حیثیت سے بحث کی جائے گی یہاں اُردو کے الفاظ کو ادبی اور تواریخی روشنی میں دیکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

لغات کی اہمیّت۔ دُنیا کو دُون اور ہیچ اور پنج روزہ کوئی کچھ ہی کہے۔ لغات کی ایک مکمل کتاب کو اس کی سوانح عمری سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ کوئی چیز کوئی سانحہ اور واقعہ ایسا نہیں ہوتا جو اُس وقت ظہور میں آ چکا ہو اور اس کتاب میں درج نہ ہو۔ اگر ایک قوم کی تاریخ کے دفتر فنا ہو جائیں اور اس کی زبان کا لغت موجود ہو تو اس کی مدد سے اس قوم کی تاریخ پھر مرتب ہو سکتی ہے مثال کے طور پر ایک لفظ "ناؤ" کو لیجیے۔

"ناؤ" پانی میں چلنے والی سواری کو ہماری زبان میں کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی دریائی اور سمندری سواری کا نام ہے۔ وہاں ناؤ اُڑا کر ناخدا بنا لیا۔ ناؤ خُدا بھی فارسی ادب میں آیا ہے آج کل ہندوستانی سمندری قوم نہیں مانے جاتے اور نہ وُہ مغربی نفسِ معنیٰ میں سمندری قوم ہیں ہی۔ لیکن یہی ہندوستانی "ناؤ" ہند کے سمندروں سے چل کر مغرب میں پہنچی اور وہاں اس نے nautical اور navigation اور Navy اور nausea پیدا کئے، ہومر جہاز کو naus کہتا تھا۔ ناؤ جیسی ایک اور آبی سواری کو ہمارے ہاں بجرا کہتے ہیں اس لفظ سے اٹلی کا Barga اور لاطینی Barge بنا اور Bargana کی اصل بھی یہی لفظ بجرا بنایا جاتا ہے۔ پس ناؤ اور بجرا یہ دو لفظ اس امر کے ثابت

کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اہلِ ہند جہاز رانی اور سمندر کے سفر سے بیگانہ نہیں تھے اگرچہ اِس وقت وہ بحری قوم نہیں ہیں۔ آپ نے دیکھا کیونکر لفظ نے مردہ تاریخ کو پھر زندہ کر دیا۔ لانچ Launch کا لفظ بھی پرتگالی مشرق سے یورپ کو لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ بیچ Beach کا لفظ بھی ہندوستان سے یورپ گیا۔ بیچ اس ریتیلے میدان کو کہتے ہیں جو ساحل اور سمندر کے بیچ میں واقع ہو۔

الفاظ کون بناتا ہے۔ عالم اصطلاحیں گھڑتا ہے۔ ادیب محاورے بناتا ہے۔ شاعر صنائع بدائع کی پیدائش کا سبب ہوتا ہے لیکن عام الفاظ، عام لوگ بناتے ہیں۔ ان میں بڑا حصہ اہلِ حرفت کا ہے ان کا تصرف کا سلیقہ اور تخلیقِ لفظ کی قابلیت حیرت انگیز ہے "سُوئی، درانتی، دریسی، دُوفٹا، کھڑکی، نلائی، گڈائی، آری، رندہ، کھرپا، کرنی، یہ سب لفظ ثقات یا ادیبوں یا شاعروں نے نہیں پیدا کئے بلکہ اُن لوگوں نے پیدا کئے جن کے پیشے میں ان کی ضرورت تھی۔ سپاہی کے ایک اور اوزار تلوار کو لیجئے۔ اصل میں یہ "تروار" تھا "ترآر" درخت کو کہتے ہیں۔ پہلے درخت کاٹنے کو ایک اوزار بنایا گیا اور "ترور" کی نسبت سے اسے تروار کہنے لگے۔ پھر اِس سے جانور بھی مارنے لگے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے وہ اوزار جو درخت کاٹنے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ سپاہی کا نہایت کارآمد ہتھیار بن گیا۔ اسی طرح بہت سے لفظوں کی سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے۔ لفظیت اور معنویت کا مطالعہ اور تحقیق نہایت دلچسپ ہونے کے علاوہ لسانیات کی جان ہے۔ بھادوں کی سہانی پھوار کو دیکھ کر انسان نے اپنی تفریح کے لئے فطرت کی وارفتگی اور غیر مستقل مزاجی سے مقابلہ کیا خزانہ اور مال سے کام لیا جس کے نتیجے کو وُہ پھوارہ کہتا ہے اب وہ جب چاہتا ہے۔ پھوار کے مزے لوٹتا ہے۔ فارس کی زبان میں "پھ" نہ تھی "فوارہ" کہنے لگے۔

جاپانی میں بندہ ۔ لفظ اپنے ماخذ کی تحقیق سے ظاہر کرتے ہیں کہ وُہ اپنے ساتھ کیا کیا لائے جاپان کی زبان میں ہندوستانی زبان کے الفاظ کا وجود اس امر کی خبر دیتا ہے کہ جاپان کی کلچر ہندوستان کی کلچر سے کہاں تک متاثر اور مستفید ہوئی۔ بہت سے لفظ ہمارے وطن کے لہجے کے خفیف تغیر کے ساتھ جاپانی میں موجود اور اپنائے ہوئے ملتے ہیں اِن میں سے ایک لفظ بندہ ہے جو جاپانی خط کے آخر میں اپنے نام کے پہلے لکھتا ہے۔ جیسا کہ ہندوستان میں بڑوں کے نام خطوط کے بارے میں اب تک کم و بیش دستور ہے[1]۔

لفظوں پر ذی رسوخ ناموں کا تاریخی اثر ۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مہتم بالشان ہستی کی نسبت سے منسوب ہو کر ایک لفظ کے معنی متاثر ہوتے ہیں جیسے (۱) جدھشٹری راستبازی (۲) نوشیروانی انصاف (۳) سارنگی (۴) سلیم شاہی (۵) جہانگیری (۶) نادری۔ نادری حکم۔ نادر گردی (۷) مرہٹی گھس گھس (۸) سکھا شاہی وغیرہ۔

تشریح ۔ (۱) پانڈوں میں بڑا بھائی جدھشٹر راست بازی اور سچ بولنے کے لئے مشہور تھا جب یہ صفتِ نسبتی سچائی کے ساتھ مربوط ہوئی تو اس لفظ کے معنی میں بہت ترقی ہو گئی۔

(۲) عدل یا انصاف ہمیشہ اعلیٰ صفات سمجھے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ خدا کے ناموں میں "نیا نیکاری" کا لفظ داخل ہے نوشیروان عدل گستری

---

[1] مسٹر حنجیرتا کوشو کا مضمون۔ رسالہ ینگ ایسٹ مطبوعہ ٹوکیو بابت اپریل ۱۹۲۶ء میں

میں تاریخی شہرت رکھتا ہے اس نام سے نسبت پاکر عدل کی صفت اور بین ہو گئی۔

(۳) سارنگی خود بول رہی ہے کہ میں سارنگ دیو کی دست پروردہ ہوں۔

(۴) ایک خاص وضع کی جوتی جو شاہزادہ سلیم سے منسوب اور دوسری وضع کی جوتیوں سے متمیز ہے۔

(۵) جہانگیری۔ پونچے کا زیور جو ملکہ نورجہاں نے اختراع کیا اور جہانگیر بادشاہ کے نام سے منسوب کیا۔

(۶) نادر شاہ کی کڑی سیاست۔ استبداد اور جلال مشہور ہیں۔ اس شخصیت سے منسوب ہو کر گنجفہ میں نادری اور سیاست میں نادری حکم یعنی اٹل حکم۔ اور نادر گردی یعنی استبداد۔ یہ مرکب لفظ وضع ہوئے۔

(۷) مرہٹوں کی حکومت میں دفتر کے پیچیدہ دستور العمل کی وجہ سے جسے آج کل کے زمانے کا لال فیتا سمجھئے معاملات کے فیصل ہونے میں دیر لگتی تھی اور محکمہ کی رپوٹوں میں قلم بہت گھسایا جاتا تھا اس وجہ سے مرہٹی گھس گھس کا وجود ہوا۔ یعنی معاملات کے طے ہونے میں غیر معمولی اور بے ضرورت دیر لگنا

(۸) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد پنجاب میں طوائف الملوکی، بے ضابطگی اور بدانتظامی کا غلبہ رہا۔ اس سے سکھا شاہی کا مرکب پیدا ہوا۔

عام لفظ پارس کا اثر قبول کرتے ہیں۔ عربی میں مدینہ محض شہر کے معنی رکھتا ہے چنانچہ اسی مدینہ سے مدنیت اور تمدن مشتق ہیں لیکن جب سے پیغمبر اسلام مکہ سے ہجرت کر کے اس شہر میں پناہ گزیں ہوئے اور آخر تک وہیں رہے لفظ مدینہ کو علم کا امتیاز حاصل ہو گیا اور اب مدینہ کہیں یا مدینہ منورہ مراد وہی خاص شہر ہوتا ہے۔ یہ شرف اس لفظ کو محض پیغمبر اسلام کی قیام گاہ ہونے سے نصیب ہوا۔ اسی کو پارس کا اثر کہا گیا ہے۔ لوہا پارس پتھر سے چھو کر سونا بن جاتا ہے۔ یہ تو محض افسانوی گپ ہے مگر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک لفظ کسی ممتاز شخصیت کی قربت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

یہی حال گنگا لفظ کا ہے۔ ویدک عہد میں گنگا صرف دریا کا نام تھا۔ آریہ لوگ جب ہندوستان میں پھیلے اور ان کو عروج ہر قسم کا حاصل ہوا اور انہوں نے ایک خاص دریا کے پانی کی جانچ کی جو ہردوار کے مقام پر میدان میں داخل ہوتا ہے تو گنگا صرف اسی ایک دریا کا نام رہ گیا اور مدینہ کی طرح علم کی حیثیت اس کے حصے میں آ گئی۔

یہی حال حج اور جاترا کا ہے دونوں کے معنی تھے جانا۔ سفر کرنا۔ مگر اب یہ لفظ ایک خاص معنی کے حامل ہیں جس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ یہی کیفیت شہید، عید، دسہرہ اور پیغامبر جیسے لفظوں کی ہے۔ ابھی جو بیان ختم ہوا ہے اسے لفظوں کا ارتقاء سمجھنا چاہئے انسانوں اور قوموں کی طرح لفظوں کو بھی تنزل کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

لفظوں کا تنزل بعض لفظ اپنے عظیم الشان بلکہ مقدس مقام سے گر کر بالکل مختلف بلکہ ذلیل معنی میں استعمال ہونے لگتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

لن ترانی یہ کلمہ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ کی جانب خطاب ہوا تھا مگر اب بے جا شیخی اور ڈینگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

صلوٰۃ۔ اس لفظ کے معنی ہیں رحمت، درود اور یہ لفظ پیغمبر اسلام کے نام سے خاص تعلق رکھتا تھا اور رکھتا ہے لیکن اردو میں اس کے معنی ہوئے برا بھلا کہنا گالی گلوج

رام کہانی۔ نام تھا سری رام چندر جی کی زندگی کے حالات کا۔ اب فضول طول کلام کے معنی ہیں یہ مرکب لفظ استعمال ہوتا ہے۔

دیو۔ پہلے دیوتا یعنی غیر معمولی قوائے روحانی اور فوق البشر اوصاف رکھنے والے کو کہتے تھے اب اندر سبھا کا لال دیو اور کالا دیو آپ جانتے ہی ہیں۔ یہی حال۔ یارِ غار اور قل آعوذی، گرو گھنٹال، بگلا بھگت، چالاک، شیخی اور مشیخت وغیرہ کا ہے۔ لفظوں کے معنوی تنزّل کی اور بہت سی مثالیں ہیں یہاں اسی قدر کافی سمجھی جاتی ہیں۔

بعض الفاظ اہلِ زبان کی اعلیٰ کلچر کا ثبوت ہیں۔ بھنگی کی افادیت اور نفس کُشی ظاہر ہے۔ اس نے مہذب اور شائستہ جماعت میں مہتر، حلال خور، جمعدار اور پہلوان نام پائے۔ نہایت ناکامیاب شخص کو بختاور اور کند ذہن اور ناسمجھ کو خوش فہم کہا گیا۔ ایسے شخص کو جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ہر شخص کے تمسخر اور پھبتی کا شکار ہو نقلِ محفل کہا گیا۔ بحث یا معاملے میں فریقِ مقابل کے نامعقول عذر کو عذرِ لنگ نام دیا گیا۔ دہات کے رہنے والے کو اس کی حیثیت کی تمیز کے بغیر چودھری کہتے ہیں اور کمہار کو بھگت جی اسی نوع میں آتا ہے سنگترہ کو رنگ ترہ اور شراب کو رام رنگی کہنا۔

لفظ رسوم کا آئینہ دار۔ راجپوتوں میں رسم تھی جب کوئی سخت کام یا مہم پیش آتی تو سب سرداروں کو جمع کیا جاتا۔ وہ ایک حلقہ باندھ کر بیٹھتے۔ بیچ میں پان کا ایک بیڑا رکھ دیا جاتا۔ اس کام یا مہم کی دقتیں وغیرہ جتائی جاتیں اور دعوت دی جاتی کہ جو رضا کاری کے طور پر اس کام کا ذمہ لے وہ سامنے آئے جو شخص اس کام کا ذمہ لیتا وہ اس بیڑے کو اٹھا لیتا۔ اب بیڑا اٹھانا کے معنی قرار پائے کسی مشکل کام کے سر انجام کی ذمہ داری لینا۔ مُردے کے پھول، جوہر (جیوہر) اور ساکھا وغیرہ اسی ذیل میں آتے ہیں۔

لفظوں کا اپنی اصل چھپانا۔ بعض لفظوں کی اصل دریافت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے جس خاندان کے وہ ظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت میں اس سے نہایت مختلف الاصل ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں مقیش کو لیجیے۔ لغات میں اس کے معنی یہ دئے گئے :۔

"مقیش۔ ع۔ وہ شے جس پر چاندی یا سونے کے چپٹے اور باریک تار لپٹے ہوں چاندی کی چوڑی۔ چاندی کے تار۔

ہماری زبان میں محض چاندی یا سونے کے تاروں کو مقیش کہتے ہیں۔ یہ لفظ ٹھیٹ عربی نہیں معرّب تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی شکل و صورت عربی الفاظ کی سی ہے۔ اردو لغات میں مقیش کو اردو لکھا ہے۔ وہ اردو ہو یا عربی یا معرّب اس کی اصل چھپی ہوئی ہے۔ اس کا ماخذ اس کے وجود سے ظاہر نہیں ہوتا۔ اسی کو میں اصل چھپانا کہتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ سنسکرت میں مکیش آفتاب کا نام ہے۔ اور کیش بالوں کو کہتے ہیں دونوں لفظوں سے مرکب کے معنی ہوئے سورج کی کرن۔ جب مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر ایک طرف سے ڈورے میں گتھ دیتے ہیں اور پوشاک کے حاشیہ پر باہر کو نکلا ہوا ٹانک دیتے ہیں۔ تو مسالے کی اس چیز کو کہتے بھی کرن ہیں یہ خفا اس وقت ہوتی ہے جب ایک لفظ اپنے وطن سے باہر اور دور چلا جاتا ہے ایسا ہی ایک لفظ کُتّن ہے اہل ہند نے سب سے پہلے روئی کات کر کپڑا بنایا۔ یہ کُتّن عرب میں جا کر قُطن بنا اور یورپ میں جا کر کاٹن۔

آپ نے دیکھا کہ لفظوں کی سوانح عمری کتنی دلچسپ ہے۔ لیکن یہ تحقیق دقت طلب بھی ہے۔ اس بارے میں جس قدر دقّتِ نظر اور احتیاط سے کام لیا جائے کم ہے۔

کیفی

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ

اے کاش! نظر کبھی اِدھر جا سکتی — اے کاش! کبھی سمجھ یہ سمجھا سکتی
جو شخص بُرا بھلا نہیں گا سکتا — اُس کو کبھی شاعری نہیں آ سکتی

شاعر بننا ہے تو خوش آوازی سیکھ — اربابِ نشاط کی سی طنّازی سیکھ
اِس سے پہلے کہ شعر کہنا سیکھے — جا اور باقاعدہ گلے بازی سیکھ

میں ہی کامل نہ تم، یہ کچھ راز نہیں — دونوں صاحب کمالِ ممتاز نہیں
تم میں یہ کمی کہ شعریت سے محروم — مجھ میں یہ کمی کہ ہیں گلے باز نہیں

پوشاکِ ترنمات کڑھتی کیونکر — ندّی موسیقیت کی چڑھتی کیونکر
گر شعر و غنا بہم نہ مل کر بڑھتے — اولادِ "تان سین" بڑھتی کیونکر

جدید شاعری

اذہان دُورنگی کی طرف جانے لگے — یک رنگ لب و لہجہ سے شرمانے لگے
طبعِ شعراء کا دوغلا ہونا تھا — اشعار بھی دوغلے نظر آنے لگے

آزاد انصاری

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا رَأَیْتُ اللّٰہَ قَبْلَہٗ

بجتا ہو ستار، اور مضراب نہ ہو؟ پھیلی ہوئی چاندنی ہو، مہتاب نہ ہو؟
میں، ہیں نہیں ہو سکتا، نہ ہو تو جب تک ممکن ہی نہیں، حباب ہو، آب نہ ہو؟

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا رَأَیْتُ اللّٰہَ بَعْدَہٗ

میرے ہی مکان سے وُہ ناگہ نکلا سمجھا تھا جسے دُور، وہ ہمرہ نکلا
ہیں محو رہا نفی میں جس کی دن رات آخر ہیں وہی اِلٰہ اللّٰہ نکلا

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا رَأَیْتُ اللّٰہَ مَعَہٗ

یا مظہرِ ذات ہے شعاعِ خورشید یا نقشِ صفات ہے، شعاعِ خورشید
ہر حال میں ہے شانِ معیّت ثابت، خورشید کے سات ہے، شعاعِ خورشید

وہ پردے میں اپنا جلوہ دکھلاتا ہے تنزیہ کو تشبیہ سے سمجھاتا ہے
اس کو تنہا کسی نے دیکھا ہی نہیں، جب آتا ہے، کسی کے سات آتا ہے

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اِلَّا رَأَیْتُ اللّٰہَ

ہم نے کون و مکاں میں تجھ کو دیکھا ہر وہم ہیں، ہر گماں ہیں تجھ کو دیکھا
ذات اور صفت میں جب کوئی فرق نہیں جس کو دیکھا۔ جہاں ہیں تجھ کو دیکھا

احمد حسین امجد

جامِ حقیقت

(۱)

بیا اے بلبلِ باغِ حجازی
بگو از راہ و رسمِ عشق بازی
نوائے بر کش از نورِ حقیقت
کہ دل بگرفت از بزمِ مجازی

(۲)

بیا بر بسمِ جہانِ رنگ و بُو زن
نوا از گلشنِ اللہ ہُو زن
دلِ فرزندِ آدم سرد گردید
زعشق آتش بہ ایں بیگانہ خُو زن

(۳)

دلِ شاعر جہان اندر جہان است
چو جوئے کہکشاں روشن روان است
جہانہا روید از باغِ سخن ور
کہ ایں باغِ بہشتِ جاودان است

(۴)

چو در رفت از جہاں نغمہ طرازے
مگو ناید دگر دانائے رازے
کہ فیضِ عشق چوں جوئے روان است
بدست آرد دمادم تازہ سازے

(۵)

زفیضِ عشق دل گردوں خرام است
زفیضِ عشق جاں آتش بجام است
زفیضِ عشق می سازم بہشتے
کہ بیم و یاس و غم دراں حرام است

(۶)

زفیضِ عشق می پُرسی کہ چون است
جُنون اندر جنُون اندر جنُون است
دہد بزمِ خرد را نورِ یزداں
زشمشیرش دلِ شیطاں زبون است

(۷)

حیاتِ ما زفیضِ عشق خیزد
چو شبنم بر گلِ جہانہا بریزد
بلے از عشقِ حق دل زندہ گردد
بہ ایں شمشیر با گردُوں ستیزد

(۸)

نگاہ از عشقِ حق شمشیر گردد
جہانِ آب و گِل نخچیر گردد
بیا خود را دریں آتش بیانداز
کہ مُشتِ خاکِ تو اکسیر گردد

محمد اکبر منیر

جنوُن

افرادِ ڈراما

عثمان۔ ۲۶ سال کا ایک نوجوان
مجید۔ اس کا ۲۵ سالہ چچیرا بھائی
عورت۔ اس کی معمّر ماں
راشدہ۔ اس کی بہن
زمانہ۔ آج کل
وقت۔ سہ پہر

منظر (ایک اچھے پیمانے پر سجا ہوا گول کمرہ جس کی سامنی دیوار میں دو دروازے ہیں۔ مجید اور عثمان بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ عثمان پے در پے سگرٹ پی رہا ہے)

مجید۔ یار آزادی تو تمہیں حاصل ہے۔ نہ کھانے کا فکر نہ ملازمت کی تلاش۔ موٹر ہے جہاں چاہا چلے گئے۔ شب کو سنیما چلے جاتے ہو یا کسی ہوٹل میں کیبرے دیکھتے رہتے ہو۔ زندگی ہو تو تمہاری جیسی ہو۔

عثمان۔ (ذرا تلخ لہجے میں دھواں چھوڑتے ہوئے) دُور کے ڈھول سہانے۔

مجید۔ یہ غیر معمولی تلخی کیوں؟

عثمان۔ (سگرٹ منہ سے نکالتے ہوئے) غیر معمولی نہیں میاں! بالکل معمولی۔ بلکہ روزمرّہ کی بات ہے۔ تمہیں میرے متعلق بہت کچھ حُسنِ ظن ہے۔ جانے کیا کیا سوچتے ہو۔ مثلاً یہ کہ میں ولایت میں الف لیلہ کے افراد کی سی زندگی بسر کر کے آیا ہوں اور اب بھی کسی داستان کے ہیرو کی طرح دن عیش اور رات رومانی کیفیتوں میں بسر کرتا ہوں۔

مجید۔ اس جوش و خروش کے باوجود بھی ماننے میں نہیں آتا کہ تم ایک مصیبت زدہ اور قلاش انسان ہو۔

عثمان۔ مگر تمہاری لفاظی بھی یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ میں ایک بے فکرا اور اوباش امیرزادہ ہوں۔

مجید۔ میاں منطق مجھ سے نہ چھانٹو۔ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ شاید تم سے یہ بات بھی چھپی ہوئی نہیں کہ تم میں اپنے آپ کو ایک ڈرامائی کردار تصور کر لینے کی عادت بہت مدت سے موجود ہے۔ اب شاید اپنے آپ کو ایک شریف النفس مگر غلط فہمیوں کا شکار ہیرو تصور کر رہے ہو۔

عثمان۔ (ہنس کر) تمہاری بک بک واقعی فرحت بخش ہوتی ہے۔ کیا اچھوتا تخیّل ہے تمہارا۔ شاعر ہو شاعر۔

مجید۔ (مسکرا کر) نہ بھئی سچ بتاؤ اس بیزاری کا اصلی سبب کیا ہے؟

عثمان۔ بھائی میں دنیا سے بیزار نہیں۔ دنیا داروں سے تنگ آیا ہوں جسے تم آزادی سمجھتے ہو پابندیوں کی زنجیریں ہیں۔ میں تو روز بروز محسوس کر رہا ہوں کہ زندگی بذاتِ خود ایک مصیبت ہے جس کا علاج ممکن نہیں۔ یہ آزادی جس کی تمہیں بڑی اُمنگ ہے۔ ایک فریب ہے۔

مجید۔ واللہ کیا نازک خیالی ہے۔ اے میاں آزادی اور فریب!

عثمان۔ دکھڑا ہو جاتا ہے کیوں جان بوجھ کر بے وقوف بنتے ہو۔ میری طرف ذرا غور سے دیکھو۔ جوان ہوں۔ تعلیم یافتہ ہوں یا کم از کم کیمبرج سے بی اے کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ کوئی

ایسی اشد ضرورت نہیں کہ ملازمت اور وہ بھی ناپسندیدہ قسم کی
ملازمت اختیار کر لوں۔ مگر ہر کسی کا مجھ سے یہ گلہ ہے کہ ولایت
سے کچھ بن کر کیوں نہیں آیا اور اگر فقط پڑھ پڑھا کر ہی آنا تھا تو
آتے ہی کسی اعلیٰ درجے پر ملازم کیوں نہیں ہو گیا۔ کیوں بیکار پھر رہا
ہوں۔ اور اگر بیکار ہوں تو پشیمان کیوں نہیں۔ اور اگر شرمندہ نہیں
تو کوئی کام کیوں نہیں کرتا۔ دن رات پسینہ میں کیوں غرق نہیں
رہتا۔ اور پھر تم جانتے ہی ہو اپنی نانی اماں کو اور ہماری آپا کو بیاہی
کیا گئی ہیں اور ماں کیا بنی ہیں بس ہر معاملہ میں دخل دینا اور ہر
بات پر رائے زنی کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ اب
مجھ سے یہ گلہ ہے کہ میں ان کے تقاضوں کا جواب مبہم الفاظ
میں کیوں دیتا ہوں۔

مجید۔ تقاضے!

عثمان۔ (جوش میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھرتے
ہوئے) تقاضے ہیں بھائی تقاضے! تمہیں نہیں معلوم۔ بات
بات پر جرح، پل پل کے بعد اشارہ۔ اماں تو خیر اتنا نہیں کہتیں
مگر آپا نے تو جینا مشکل کر دیا ہے۔ اب مجھ سے یہ شکایت ہے
کہ آمدنی معقول ہے تو مرتا کیوں نہیں، شادی کیوں نہیں کرتا۔
میں کہتا ہوں ابھی آمدنی اتنی نہیں۔ اور بھائی بھی ہیں۔ انہیں
بھی شاید جنگ کے بعد ولایت بھیجنا پڑے۔ بتاؤ میں کیوں
شادی کے جھمیلوں میں پھنسوں۔ کہتی ہیں اگر آمدنی اتنی نہیں
تو ملازمت کیوں نہیں کرتے۔ غرض یہ کہ آزاد کیوں ہو۔ جس
وقت چاہو گھومنے کیوں چلے جاتے ہو۔ پھر یہ کہ میرے
دوست کیوں مجھ سے آ کر ملتے ہیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ
ولایت سے موٹر کیوں خرید لایا۔ اور اگر لے بھی آیا تو اسے اتنا
چلاتا کیوں ہوں۔ بند کیوں نہیں کر دیتا اور اگر چلاتا ہوں تو گھر
والوں کو روز سیر کیوں نہیں کراتا۔ سیر نہ سہی ان کی بڑی بوڑھی رشتہ دار
عورتیں جو انہیں روز ملنے آتی ہیں۔ انہیں رات کے نو بجے شہر
کے کسی تنگ و تاریک کوچے میں کیوں نہیں پہنچانے جاتا۔ غرض
یہ کہ جیتا کیوں ہوں اور اگر جیتا ہوں تو ایسے جینے پر لعنت کیوں
نہیں بھیجتا!

مجید۔ (اس غیر معمولی جوش سے متاثر ہو کر) یہ نئی بات سن رہا ہوں۔
نانی اماں سے تو ایسی توقع نہیں اور نہ انہوں نے کبھی تمہیں کسی
بات کے لئے تنگ ہی کیا ہے مگر آپا راشدہ مزاج کی کچھ تیز ہیں۔

عثمان (قدرے ٹھنڈا ہو کر) بھائی آپا بے چاری کا بھی اتنا قصور
نہیں۔ یہ برادری کی عورتیں جو روز کسی نہ کسی بہانے آتی رہتی
ہیں انہیں جینے نہیں دیتیں۔ ہر روز میری شادی کا سوال اُٹھا
دیتی ہیں۔ بھلا بتاؤ تمہیں خدا کی مار! تمہیں اور کوئی بات
نہیں سوجھتی۔ پرائی باتوں میں کیوں دخل دیتی ہو۔

مجید۔ عثمان یہ تو ہماری سوسائٹی میں خلوص کی علامت سمجھی
جاتی ہے۔ جب تک یہ لوگ کرید کرید کر ایک دوسرے کی خانگی
باتیں نہ پوچھیں خیال ہوتا ہے کہ رشتہ داروں میں محبت
اور ہمدردی غائب ہو گئی ہے۔

عثمان۔ (نیا سگرٹ سلگاتے ہوئے) عجب تماشا ہے۔ یہ
ہمدردی کا اظہار کرتی پھریں اور کسی کو دم لینا مشکل ہو جائے

مجید۔ مگر یار یہ سمجھ میں نہ آیا کہ تم اتنے پریشان کیوں ہوتے
ہو۔ آخر یہ باتیں تو ہر جگہ ہوتی ہی ہیں۔ کہیں کم اور کہیں زیادہ
آدمی جوان ہوا۔ معلوم ہوا کہ کھاتا پیتا ہے تو عورتوں کو ایک قسم
کی دماغی خارش شروع ہو جاتی ہے۔ جس کا علاج ایک ہی

ہے کہ کہیں ہنگامہ ہو۔ شادی رچے کسی کی ہو۔ اس سے غرض نہیں۔ ہو ضرور۔ مگر عام طور پر لوگ تمہاری طرح مرنے مارنے پر تیار نہیں نظر آتے۔

عثمان۔ نظر نہیں آتے! بھائی یہ فقط تمہاری نظر کا دھوکا ہے ورنہ اگر حقیقت معلوم ہو جائے تو ہم دیکھ لیں کہ یہاں ہر شریف متنفس بیس سال کے بعد انہی مصیبتوں میں گھرا ہوتا ہے۔

مجید۔ یہ میں نہیں مانتا۔ تم بہت مبالغہ کر رہے ہو۔ مجھے تو عام لوگ بیس سال کی عمر کے بعد جب ان کی شادی کا سوال اُٹھتا ہے، تو خوش نظر آتے ہیں۔

عثمان۔ عام لوگ تو محض گدھے اکٹھے کئے ہوتے ہیں۔

مجید۔ یہ تو کوئی جواب نہیں۔

عثمان۔ مگر سچ کہتا ہوں

مجید۔ ایسا سچ تمہارے ذاتی مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا۔ تم عقل رکھتے ہو۔ میں تمہیں بیس سال سے جانتا ہوں۔ تم نے مجھ سے کبھی پردہ نہیں رکھا۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ تمہاری اُلجھنوں کا اصلی سبب کیا ہے؟

عثمان۔ اصلی سبب اور سیدھے سادھے سبب میں کیا فرق ہوتا ہے؟

مجید۔ دیکھو کج بحثی نہ کرو۔ سچ سچ بتاؤ۔ مجھ سے کیوں چھپاتے ہو؟

عثمان۔ (ہنس کر) کوئی بات بھی ہو چھپانے کی۔

مجید۔ یہ دھوکے کسی اور کو دو۔ میں تمہیں خوب جانتا ہوں۔ یہ گھر والوں سے اُلجھنا، یہ دُنیا داروں سے نفرت! یہ دُنیا سے بیزاری بغیر کسی ذاتی علت کے نہیں۔

عثمان۔ تو اور کیا ہو سکتا ہے تمہیں بتاؤ۔

مجید۔ چہ خوب! سوال میں کروں اور جواب بھی میں ہی دوں۔

عثمان۔ تم نہ دو تو اور کون دے۔ تمہیں ہی خبط ہو رہا ہے کہ اس بیزاری کی تہ میں کوئی روگ ہے۔

مجید۔ تو نہیں بتاؤ گے کیا؟

عثمان۔ کچھ ہو تو بتاؤں۔

مجید۔ کچھ سوچ کر اور سگرٹ کے دو ایک کش لے کر) مجھے خیالی گھوڑے تو نہیں دوڑانے چاہئیں مگر جہاں تک مجھے تمہارے جذبات کا علم ہے تمہیں کسی چیز کی آرزو ہے اور وہ تمہیں حاصل نہیں ہو سکتی۔

عثمان۔ (ہنس کر) واہ وا! خوب کھوج نکالا۔ "مجھے ایک چیز کی خواہش ہے اور وُہ مجھے نہیں ملتی" بہت خوب۔ جوتشی صاحب یہ تو بتائیے کہ یہ بات کیا دنیا کے ہر فرد بشر پر صادق نہیں آتی۔

مجید۔ میاں میں تم سے منطقی بحث نہیں کرتا میں تو اس لئے تم سے پوچھ رہا ہوں کہ شاید میں کچھ تمہاری مدد کر سکوں یا تسکین ہی دے سکوں۔

عثمان۔ فضول اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے کوئی روگ نہیں۔ اچھا بھلا ہوں۔ تم بتاؤ آج کل شعر لکھنا چھوڑ دیئے ہیں کیا۔

مجید۔ مارو گولی شعروں کو!

عثمان۔ ناراض ہو گئے ہو کیا؟

مجید۔ نہیں تو۔ ناراض ہونے کی کیا بات ہے

عثمان۔ آؤ چلو تمہیں اندر لے چلیں۔ اماں کتنی خفیں تم آتے

ہو تو ان سے ملے بغیر چلے جاتے ہو۔ آپا بھی پوچھتی تھیں۔

مجید۔ (لکھاوٹ سے) آج نہیں۔ پھر کسی دن سہی۔ آج کچھ کام ہے۔ لو اب چلتا ہوں (اُٹھتا ہے)

عثمان۔ چھوڑو یار کام تو روز ہی ہوا کرتے ہیں۔ اگر تم ملے بغیر چلے گئے تو سب گھر والے مجھی پر گلہ کریں گے۔

(اتنے میں بائیں طرف کا دروازہ کھلتا ہے اور ایک پچاس برس کی عورت داخل ہوتی ہے۔ اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ہاتھ میں کچھ سلائیاں اور ایک اُون کا گولہ ہے شاید کسی بچے کا سوئیٹر بن رہی ہے۔ اس کے آنے پر مجید رُک جاتا ہے۔ سلام کرتا ہے)

عورت۔ مجید بیٹا تم دیر سے آئے ہوئے ہو کیا اندر نہیں آنا تھا۔

مجید۔ (عثمان کی طرف دیکھ کر) اب آنے ہی کو تھا۔ ان سے باتیں کرتے کچھ وقت لگ گیا۔

عورت۔ تمہاری والدہ تو اچھی ہیں؟

مجید۔ جی! ابھی پرسوں ہی ان کا خط آیا تھا۔ لکھا تھا اگر آپ سے ملوں تو ان کا سلام پہنچا دوں۔

عورت۔ میرا بھی سلام لکھ دینا۔ بڑے دنوں کی چھٹیوں میں ان کو بلاؤں گی۔

مجید۔ کوئی تقریب ہے کیا؟

عورت۔ تقریب تو کوئی ایسی نہیں۔ ننھے کی سالگرہ ہے میں چاہتی ہوں کہ اسی بہانے ہم سب اکٹھے ہو لیں۔ ابھی عثمان کے واپس آنے کی دعوت بھی نہیں دی۔ دو مہینے ہو گئے اسے آئے ہوئے۔

عثمان۔ اماں واپس آنے کی اتنی دیر بعد کیا ضیافت کرو گی جانے دو۔ اب تو پرانی بات ہو چکی۔

عورت۔ بیٹا تمہارے لئے پرانی بات ہو چکی۔ ہماری خوشی تو تمہیں دیکھ کر دن دونی ہوتی ہے۔

عثمان۔ (ہنس کر) ذرا اس خوشی کو قابو میں رکھئے نا۔

عورت۔ (مجید سے) بیٹا تم نہیں کچھ عثمان کو سمجھاتے۔ آج کل معلوم نہیں یہ کیوں اتنا بیزار رہتا ہے تمہارا تو آپس میں سگے بھائیوں کا سا پیار تھا۔

عثمان۔ اماں چھوڑو بھی میرے قصے کو۔ ہر وقت میرا ہی ذکر۔ کوئی اور بات کرو۔

عورت۔ بیٹا مجید کوئی غیر تو نہیں۔

مجید۔ تائی جان آج کل میں غیر ہی ہوں۔

عورت۔ یہ کیوں!

مجید۔ انہیں سے پوچھئے۔

(اس وقت دروازہ پھر کھلتا ہے اور ایک خوش قامت اور خوش لباس جوان عورت داخل ہوتی ہے جو اپنے آپ سے بہت خوش ہے۔ آنکھوں میں مسکراہٹ ہے۔ اس کی عمر ۲۸ سال کی ہوگی۔ مجید کے الفاظ وہ سن لیتی ہے)

راشدہ۔ کس بات کی پوچھ گچھ ہو رہی ہے

مجید۔ سلام کہتا ہوں آپا۔

راشدہ۔ (ہنس کر) بڑے بے مروت ہو تم۔ مگر کیا کریں کہنا ہی پڑتا ہے "برخوردار جیتے رہو"

مجید۔ آپ نہ بھی کہیں، میں نے تو ایک خوشگوار فرض ادا کر دیا ہے۔

راشدہ۔ (ہاہا) اب تو تم بہت لفاظ ہو گئے ہو۔

مجید۔ (مسکراتے ہوئے) آپ ہی کی دعاؤں کا اثر ہے۔ آپ بزرگ ہیں۔

راشدہ۔ میرے بھائی آج کل بزرگوں کو کون پوچھتا ہے۔ عثمان ہی سے پوچھو کہ یہ کیوں ہر ایک سے لڑتا ہے؟

عثمان۔ آپا یہ جھوٹ بولنا کب سے سیکھا ہے۔ میں تو نہ آج نہ کل کسی سے نہیں لڑتا۔ آپ ہی کی سمجھ میں کوئی فتور ہے جو ہوا کو تلواریں مارتی ہیں۔

راشدہ۔ دیکھا اماں آپ نے عثمان کی یہ عادت تو شروع ہی سے تھی کہ سوائے اپنے ہر ایک کو بے وقوف سمجھتا تھا۔ اب تو کھلم کھلا گالیاں دینے لگ گیا ہے۔

عثمان۔ اپنی عادت تو دیکھئے۔ مبالغہ کرنے میں جو کمال آپ نے حاصل کیا ہے وہ کس کو ہے۔ میں نے آپ کو کب گالیاں دی ہیں۔

راشدہ۔ دی نہیں ہیں تو دے دو گے۔ تم سے کیا بعید ہے۔

عورت۔ بیٹا! راشدہ تم سے بڑی ہے۔ تم اس طرح نہ بولا کرو۔ تمہارا مزاج ہی آج کل چڑچڑا ہو گیا۔ ہے معلوم نہیں کیا چاہتے ہو؟

عثمان۔ یہی تو بات ہے جو مجھے غصہ دلاتی ہے۔ آپ کیوں اس بات پر اصرار کرتی ہیں کہ مجھے کچھ چاہئے۔ میں کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں کہ یہ آپ کا وہم ہے۔ میں تو فقط آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ ہر وقت میرا قصہ نہ لے بیٹھا کیجئے۔ آپ کو کوئی اور بات نہیں ملتی؟

راشدہ۔ تمہاری بات نہ کریں تو اور کس کی کریں۔ اپنی طرف تو دیکھو۔ کسی سے بات تم نہیں کرتے اندر آتے ہی نہیں۔ یا باہر بیٹھے رہتے ہو یا دوستوں کے ساتھ اِدھر اُدھر فضول پھرتے رہتے ہو۔

عثمان۔ آپا تم یہ کیوں نہیں بھول جاتیں کہ اب میں بچہ نہیں ہوں۔

ماں۔ بیٹا راشدہ غلط بھی کیا کہتی ہے۔ تم تو ہم سے بولتے بھی نہیں۔

مجید۔ (جواب تک بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا) یہ آج کل کسی سے بھی نہیں بولتے۔

ماں۔ اس کی کوئی وجہ بھی ہو؟

راشدہ۔ جب ہم کہتے ہیں کہ تمہاری شادی کر دیتے ہیں تو وہ غصہ آتا ہے کہ الاماں!

عثمان۔ تمہارے لئے ہر سوال کا جواب اور ہر بات کا حل شادی ہے۔

راشدہ۔ کم ازکم یوں پریشان تو نہ پھرو گے

ماں۔ بیٹا تم کیوں نہیں ٹھنڈے دل سے سوچتے۔ آخر تمہارا دل جو اُداس رہتا ہے تو اس کا کچھ باعث بھی ہوگا۔

عثمان۔ (ذرا غصّے سے) میں کہتا ہوں آپ کو سرے سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں بالکل اُداس نہیں۔

راشدہ۔ اب کیا تم سچ بول رہے ہو۔

مجید۔ عثمان بھئی معاف کرنا۔ مجھے یا تو چلا جانا چاہئے یا پھر تائی جان سے متفق ہو کر میں ضرور کہوں گا کہ اگر تم واقعی خوش نہیں تو اس کا کچھ تدارک کرو۔

راشدہ۔ اماں میں ایک بات بتاؤں؟

عثمان۔ } اب کوئی اور بہتان مجھ پر تھوپ دو گی
اماں۔ } (ایک ساتھ) کہو

راشدہ۔ عثمان اس لئے شادی نہیں کرتا کہ یہ کسی میم سے وعدہ

کر آیا ہے۔

عثمان۔ (بے ساختہ طور پر ہنس کر) بہت خوب! آپا غضب کر دیا۔ واللہ عجیب دماغ پایا ہے تم نے (اور ہنستا ہے)

راشدہ۔ (عثمان کی اس بے ساختہ ہنسی سے کچھ کھسیانی ہو کر) میم سے نہیں تو کسی اور سے ہو گا قول تم ضرور ہار آئے ہو۔

ماں۔ (عثمان سے جو ابھی ہنس رہا ہے تشویش ناک لہجے میں) بیٹا سچ سچ بتاؤ۔ کہیں ایسا تو نہیں؟

عثمان۔ (مذاق میں مسکراتے ہوئے) شاید!

ماں۔ بیٹا سچ مچ بتاؤ۔ کہیں کسی میم سے تو نہیں وعدہ کر آئے۔ میم نگوڑی تو ہندوستان تک پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ میرا دل تو دھک دھک کرنے لگ گیا ہے۔

عثمان۔ (مسکراتے ہوئے) میں تو شاید نہ بھی کرتا مگر آپا سے ڈرتے ہوئے میں نے سوچا کہ ہندوستانی بھابی کی تو ان کے سامنے جان جائے گی۔ کوئی میم ہی کر لائیں۔ اس سے تو آپا ڈریں گی۔

راشدہ۔ میم سے ڈرتی ہے میری پیزار۔ موٹی کافر!

عثمان۔ آپا کافر نہیں، بے چاری مُشرکن ہے۔

راشدہ۔ کافر ہی ہوئی نا۔ میں ایسیوں کے منہ لگتی ہوں۔ کر ہی آئے ہو نا۔

ماں۔ (غمگین آواز میں) عثمان تمہیں میرے سر کی قسم سچ مچ بتاؤ کیا واقعی کچھ کر آئے ہو۔ اچھا بھیجا تھا تمہیں ولایت۔

مجید۔ تائی جان آپ فکر نہ کریں۔ عثمان مذاق کر رہا ہے۔ میں اس کے لہجے کو پہچانتا ہوں۔

ماں۔ (عثمان سے) کیوں بیٹا؟

عثمان۔ ٹھیک کہتا ہے اماں۔ آپا کو بہت دُور کی سوجھتی ہے میں ایسی لعنت میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ اور پھر مجھے معلوم تھا کہ کہ آپ کو یہ امر بہت ناگوار ہو گا۔

ماں۔ تو بیٹا یہیں شادی کر لو۔ ہمیں تسلی ہو جائے گی تمہیں بھی شاید چین آجائے۔ بیوی بھی ایسی بیاہ کر لاؤں کہ چاند کا ٹکڑا ہو۔

عثمان۔ اماں یہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے ابھی ضرورت نہیں۔ آپ بار بار نہ کہیئے۔

راشدہ۔ اماں اس سے کیوں اتنا پوچھتی ہو۔ کہیں دیکھ دا کھ کر کر لو۔ خود بخود مان جائے گا۔

عثمان۔ (جلدی سے) خُدا کے لئے یہ نہ کرنا۔ ورنہ آپ کو بڑی ندامت ہو گی۔ کیونکہ میں ہرگز نہیں ماننے کا۔

راشدہ۔ رہنے دو ہرگز نہیں ماننے کا۔ میں جانتی ہوں تم کو۔ تمہاری وہی بات ہے "پکا ہُوا نہیں کھانا پھینک جائے تو کھا لینا ہے"۔

عثمان۔ (لال پیلا ہو کر) آپ کا مطلب؟

راشدہ۔ صاف صاف تو کہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہاں جاتے ہو تم آج کل!

عثمان۔ کہاں؟

راشدہ۔ نہ پوچھو مجھ سے۔ میں ہمیشہ سے تمہارا پردہ رکھتی ہوں۔

ماں۔ کیا ہے بیٹیا؟

عثمان۔ (اور چیں بجبیں ہو کر) بیہودہ بکتی ہے

راشدہ۔ تم تو ہو ہی مُنہ پھٹ اور گستاخ! ورنہ بتاؤ تم چچا ذوالفقار کے ہاں دس چھوڑ بیسیوں مرتبہ انہی دنوں میں نہیں گئے؟

پنجابی مثل

عثمان - (اور سرخ ہوکر) وہاں جانا گناہ ہے؟

راشدہ - گناہ کیوں ہو؟

ماں - بیٹی میں کچھ نہیں سمجھی۔ کیا کہہ رہی ہو؟

راشدہ - یہی جو کہہ رہی ہوں اور جس پر مجھے گالیاں دینے لگا۔

عثمان - تمہارے لئے تو ہر بات گالی ہو جاتی ہے۔ چچا ذوالفقار میرے ہم عمر ہی ہیں میرا تو اُن سے بچپن کا دوستانہ ہے۔ اماں آپ ہی بتائیں وہ اصرار کر کے لے جائیں تو میں کیسے انکار کروں؟

ماں - اس میں کیا بُری بات ہے بیٹی؛ تم دونوں عجیب باتیں کرتے ہو میں تو تمہاری باتیں کبھی سمجھ نہیں سکتی (مجید سے) بیٹا تم بھی مجھے اپنے بیٹوں کے سے عزیز ہو۔ تم سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں۔ بتاؤ یہ دونوں کیسی باتیں کرتے ہیں؟

مجید - تائی جان میں کیا بتاؤں میں خود کچھ نہیں سمجھا چچا ذوالفقار تو ہیں ہی بہت ملنسار اور چچی نسیمہ بھی بہت خلیق ہیں۔ ان کا لڑکا بھی بہت پیارا ہے۔ میں ان کے ہاں خود اکثر جاتا ہوں

ماں - (راشدہ سے) تو بیٹی تم ہی بتاؤ یہ کیا پہیلی ہے؟

راشدہ - پہیلی کچھ نہیں۔ چچی نسیمہ کی چھوٹی بہن ہے نا تسنیم۔ بس اسی کے متعلق ہے۔

ماں - مگر بیٹی اس کی تو شادی ایک سال ہوا ہو چکی ہے۔ اور اسی شہر میں ہوئی ہے۔ تمہیں یاد نہیں۔ تم نہیں جا سکی تھیں۔ ننھا ہونے والا تھا۔ مگر ہم سب تو گئے تھے۔ عثمان البتہ ان دنوں ولایت تھا۔ کیوں بیٹا میں نے خط میں بھی تو لکھا تھا؟

عثمان - جی!

ماں - تو اُس کا ہم سے کیا واسطہ ہے؟

عثمان - کچھ نہیں۔ آپا کا تو دماغ چل گیا ہے۔

راشدہ - میرا دماغ تو صحیح ہے تمہاری مت ہی الٹی ہے! یہ بتاؤ تمہارے چاندی کے سگریٹ کیس میں کس کی تصویر لگی ہے؟

عثمان - (غصے میں) تم کون ہوتی ہو میری چیزیں کریدنے والی تم تو جیسا ہو جیسا! جگہ جگہ سونگھتی پھرتی ہو۔

راشدہ - (ناراض ہوکر) میں تو جاتی ہوں۔ عثمان اب بہت گستاخ ہو گیا ہے۔ یونہی دوسرے کی بے عزتی کر دیتا ہے۔ میں نہیں اس سے بات کرتی۔

(جاتی ہے)

ماں - بیٹا کیوں اتنے تلخ ہوتے ہو۔ میں تو کچھ نہیں سمجھی کہ یہ کیا باتیں کر رہے ہو۔ (مجید سے) کیوں بیٹا تم سمجھے ہو؟

مجید - جی نہیں مگر آپ فکر نہ کریں۔ کوئی بات ہوتی تو عثمان آپ سے خود کہہ دیتا۔ یا مجھی سے کہہ دیتا۔ میں سمجھتا ہوں آپا یونہی عثمان کو چھیڑ رہی تھیں۔

ماں - اچھا!

مجید - جی ہاں

ماں - (عثمان سے) کیوں بیٹا مجید ٹھیک کہہ رہا ہے؟ یونہی آپس میں چھیڑ کر رہے تھے یا کوئی بات بھی ہے؟

عثمان - (اپنے آپ پر قابو پاکر) نہیں اماں! کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔

مجید - (اُٹھ کر) تائی جان مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے کچھ کام ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔

ماں - (خود اُٹھتی ہے) نہ بیٹا تم ابھی بیٹھو چائے پی کر جانا۔ ہم تو بس باتیں ہی کرتے رہے۔ ابھی چائے بھیجتی ہوں۔

مجید۔ نہیں تائی جان۔ آج رہنے دیجئے، پھر کسی دن سہی۔ میں کوئی غیر تو نہیں، اب اجازت ہی دیجئے۔

ماں۔ (جاتے ہوئے) نہ بیٹا یہ نہیں میں مانتی۔ پانچ منٹ اور ٹھہرو۔ چائے پی کر جانا۔ (جاتی ہے)

(کچھ دیر دونوں خاموش رہتے ہیں۔ عثمان سگرٹ سلگاتا ہے اور مجید کو بھی پیش کرتا ہے۔ دونوں الگ الگ سگرٹ لگاتے ہیں اور ایک منٹ کے لئے سگرٹ پیتے رہتے ہیں۔ عثمان اِدھر اُدھر ٹہلتا ہے)

مجید۔ عثمان!

عثمان۔ (چونک کر) مجید کی طرف دیکھتا ہے) !

مجید۔ کوئی بات ضرور ہے۔ کیوں نہیں بتاتے شاید میں کچھ تمہاری مدد کر سکوں۔

عثمان۔ (ٹھہر کر) میری کوئی بھی مدد نہیں کر سکتا

مجید۔ یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟

عثمان۔ (آہستہ آہستہ) میں جانتا ہوں۔ اس لئے۔

مجید۔ پھر بھی کچھ تو کہو۔ تسنیم ہی کی بات معلوم ہوتی ہے

عثمان۔ ہُونہہ!

مجید۔ مگر تم تو کبھی اِس سے بات بھی نہیں کیا کرتے تھے ولایت جانے سے پہلے۔ تمہیں یاد ہے چچی نسیمہ ہمیں اکثر بلا بھیجتی تھیں۔ ان دنوں تسنیم کالج میں پڑھتی تھی۔ اور چچی نسیمہ کے پاس ہی رہتی تھی۔ اگر تم چاہتے تو وُہ سو دفعہ تم سے اس کی شادی کر دیتیں۔ وہ تو خود چاہتی تھیں اور تسنیم بھی!

عثمان۔ شاید

مجید۔ مگر ان دنوں تمہیں ولایت جانے کی دھن تھی۔ مجھے یاد ہے وہاں کی عورتوں کا خیال کر کے تمہیں کوئی ہندوستانی عورت پسند ہی کب آتی تھی۔

عثمان۔ بیوقوفی کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں۔

مجید۔ اور جب کبھی ہم وہاں جاتے تو تسنیم فقط تمہیں ہی دیکھا کرتی:

عثمان۔ (جیسے سُن کر تکلیف ہوتی ہے) جانے دو!

مجید۔ (جیسے عثمان کی تکلیف کا زیادہ احساس نہیں) سچ کہتا ہوں، تھی بھی بہت کامنی! یاد ہیں اس کی آنکھیں؟ واللہ ایسی روشن تھیں جیسے ان کی پتلیوں کے پیچھے شمعیں جل رہی ہوں! اور اس کی پلکیں! واللہ کتنے احمق تھے تم!

عثمان۔ (جس کے لئے مجید کی باتیں ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں) ہونہہ!

مجید۔ مگر اب کیا لکیر کو پیٹ رہے ہو۔ سانپ نکل گیا۔ اس کی شادی تو ایک سال ہوا ہو گئی خاوند بھی اس کا کوئی ایسا بُرا نہیں دو اڑھائی سو تنخواہ لیتا ہے۔ اور یوں بھی معقول آدمی ہے۔

عثمان۔ (سگرٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے) جانتا ہوں۔

مجید۔ تو پھر کیوں یہ حالت بنائی ہے۔ کہ گھر میں سب تم سے نالاں ہیں؟

عثمان۔ کیا کروں

مجید۔ عقل سے کام لو اور کیا کرو۔ جب مل سکتی تھی، تو اس کی طرف دیکھتے نہیں تھے۔ اور مجھے یقین ہے وُہ بھی تمہیں چاہتی تھی۔ یاد ہے تمہاری بکواس کس غور سے سنا کرتی تھی۔ اور جب کبھی چچی نسیمہ نے ہم دونوں کو بلایا۔ مجھے تمہارا دم چھلا سمجھ کر۔ تو جانتے ہو تسنیم کس طرح صاف سُتھری ہو کر بیٹھی ہوتی تھی جیسے دُھلی

دو دلچسپ خط

"دو دلچسپ خط" سالنامۂ ہمایوں کے لئے ارسالِ خدمتِ عالی کر رہا ہوں ان کی نسبت اس قدر عرض کرنا ہے کہ غزل کی نسبت مجھ میں اور جوش صاحب میں عرصے سے بحث چلی جا رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ غزل کو مٹا ڈالنا چاہئے، میری رائے ہے کہ صنفِ غزل ہمارے ہاں ایک مقبول ترصنف ہے ایک ایسی مقبول ترصنف کو مٹا ڈالنے کے بجائے ہمیں اس کی اصلاح کرنی چاہیئے اور اصلاح کر کے اس سے کوئی مفید تر کام لینا چاہئے، موجودہ تغزّل کی پستی کا میں بھی معترف ہوں مگر مجھ میں اور جوش صاحب میں فرق اس قدر ہے کہ میں اس کو قابلِ اصلاح سمجھ کر باقی رکھنا چاہتا ہوں اور وہ اسے ناقابلِ اصلاح سمجھ کر مٹا ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں، غزل کی بابت یہ نوک جھوک ہم دونوں میں مدت سے چلی جا رہی ہے، ایک مرتبہ انہوں نے غزل کی مذمت میں ایک نظم لکھ ڈالی، وہ نظم میرے پاس نہیں ورنہ اس کی نقل ضرور آپ کو بھیجتا۔ مگر میں نے جواباً جو رباعیاں عرض کی تھیں ان کو آپ کی دلچسپی کے لئے درجِ ذیل کرتا ہوں۔

(۱)

کہتے ہو کہ جچتی نہیں اب شانِ غزل
ممکن ہو تو ڈھا دیجئے ایوانِ غزل

سرکارِ غزل میں پل کے غزلوں سے یہ بیر
افسوس ہے۔ اے نمک حرامانِ غزل

(۲)

خورشیدِ حقائق کا اُجالا ہے غزل
دنیائے معارف کا ہمالا ہے غزل

مغرب زدہ اذہان اسے کیا سمجھیں
مغرب زدہ اذہان سے بالا ہے غزل

غرض یہ نوک جھوک ہم میں جاری ہے اور شاید ہمیشہ جاری رہے گی، مگر یہ نوک جھوک معاندانہ نہیں بلکہ طرفین کے خلوص و صداقت پر مبنی ہے، مختصر یہ کہ مرسلہ خطوط کو مذکورہ روشنی میں دیکھئے اور لطف اٹھایئے، یہ ہماری نوک جھوک بھی ایک شاعری ہے اور ایسی دلچسپ شاعری کہ بہت سی شاعریاں اس پر قربان کی جا سکتی ہیں۔ والسلام

نیازمند آزاد انصاری۔ ۴ر اکتوبر ۱۹۲۱ء

پہلا خط از شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی بنام حکیم آزاد انصاری

نظر باغ۔ لکھنؤ شریف ۳ر اگست ۱۹۲۱ء

آزاد صاحب! یہ کیسی بے مہری اور یہ کیسی سنگ دلی ہے کہ آپ کبھی اور کسی عالم میں بھی مجھے خط نہیں لکھتے۔ جواب تو میرے خط کا آپ دے دیتے ہیں، ہر چند بعض اوقات نہایت تاخیر کے ساتھ، لیکن خط میں سبقت کرنا تو آپ کی شریعت میں حرام سے بدتر معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا سخت عیب، عیبِ غزل پرستی کے دوش بدوش، آپ میں یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی آپ جاتے ہیں، بس وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس قدر کچلی کر اس سرزمین کو پکڑتے ہیں کہ چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ اس کے ساتھ ساتھ جناب والا کے شرائطِ سفر بھی انوکھے ہیں۔ یعنی آپ چاہتے ہیں اس وقت تک اپنی جگہ سے جنبش نہ کروں جب تک کہ تمام روئے زمین کے آلام سے آزاد، اور تمام گاماں پہلوانوں سے

بڑھ کر تندرست نہ ہو جاؤں ——— جس کے یہ معنی ہیں کہ نہ نو من تیل ہوگا، نہ رادھا جی ناچیں گی۔

آزاد صاحب "خدا" را فرمایئے حیدرآباد کو کب تک دبوچے رہیئے گا۔

میں آپ کو کس بُری طرح یاد، اور آپ کی غیبت کو کس شدّت کے ساتھ محسوس کرتا رہتا ہوں، آپ سے سنگدل سُنّی آدمی کو اِس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

میری کوئی ایسی رنگین صحبتِ شبینہ نہیں ہوتی جس میں "آزاد"، "آزاد" کے نعرے نہ گونجتے ہوں۔ لیکن حضرت ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ حضورِ والا کا جی ہی نہیں پسیجتا۔

اگر کرایہ نہ ہو تو لکھیئے، تاکہ روانہ کردوں، جواب میں دیر کیجیئے گا تو مفلس ہو چکا ہوں گا، اور کرایہ نہیں بھیج سکوں گا ———

آخر وہ کون سی دلچسپی ہے جو حضرۃ کو وہاں روکے ہوئے ہے۔ اور وہ کون سی رنگینیاں ہیں جو پاؤں میں زنجیر ڈالے ہوئے ہیں۔

اگر میں یہ جانتا کہ آپ "ٹل اوٹ" "پہاڑ اوٹ" والے آدمی ہیں، تو کبھی آپ سے دل نہ لگاتا ———

اربابِ دار الترجمہ کا حال لکھیئے، عارف، قُریشی، علیم پاشا، ڈاکٹر لطیف، مودودی، عمادی اور رشدی کے حالات اور نیتوں سے مطلع فرمایئے، تاکہ اِن ملاعنہ[1] کو کبھی خط لکھنے کا ارتکاب کروں۔ اختر صاحب کس رنگ میں ہیں؟ فانی کے متعلق کچھ دریافت کرنا نہیں چاہتا، وہ انسانیت کے درجے سے تو مدت ہوئی کہ خارج ہو چکا تھا، اب حیوانیت کے اسفل درجوں سے بھی گرنے والا ہے۔ کمبخت پسورنے والا، دنیا بھر سے بدگمان، سوزخوان، اُس بیوۂ عالم سے بھوپال میں مُلاقات ہوئی تھی، لکھنؤ تک میرے ساتھ آیا تھا۔ رات کو کسی ہوٹل میں اِس وعدۂ محکم کے ساتھ ٹھہرا تھا کہ پو پھٹتے تمہارے گھر آجاؤں گا، لیکن نہ آنا تھا نہ آیا۔ کمبخت بے مروّت، بے وفا، دوست کُش، اور مُشٹنڈا نواز ——— ایک مُشٹنڈا اِس سفر میں بھی اُس کے ساتھ تھا۔ خیر، لعنت بھیجئے اُس کے ذکر پر[2] ———

یہاں موسم نہایت خراب ہے، گرمی اور حبس نے ناک میں دم کر رکھا ہے، بارش کا کہیں نام و نشان نہیں، کبھی کبھی اُوچھی اور ہلکی بدلیاں آتی ہیں، دو دو ایک ایک گیلن پانی لیئے ہوئے اور سفاہت کے ساتھ مٹکتی ہوئی، بالا بالا گزر جاتی ہیں۔ پہلے جب حبس ہوتا تھا، تو پانی ضرور برستا تھا۔ گویا حبس، موسم کا وعدۂ باراں ہوا کرتا تھا، جو پُورا ہو کر رہتا تھا، لیکن اب تو ہم انسانوں کی طرح، ہماری اس دُنیا کے موسم بھی جھوٹ بولنے اور جھوٹے وعدے کرنے لگے ہیں ——— دیکھئے کیا ہونے والا ہے۔

آزاد صاحب، قبل اِس کے کہ جنگ یا سول وار ہندوستان کا دروازہ کھٹکھٹائے، برائے خدا و رسول صورت دکھا دیجیے، "خدا" معلوم کون جیئے گا، کون مرے گا۔ آیئے اور فوراً آیئے:- زاں پیشتر کہ پُر کنند پیمانۂ ما۔

آپ کا
مرحوم جوش

بیوی بچے آداب گزار ہیں۔ احسان کہاں ہیں، ہوں تو دعا کہہ دیجیے، علی اختر کو سلام۔ عبدالعزیز صاحب "گتہ دار"، میرزا بشیر علی صاحب اور عبدالحمید خاں کہاں اور کیسے ہیں۔

۱۔ کفر نہ باشد "ہمایوں"

۲۔ مرحوم پر اب خدا کی رحمت "ہمایوں"

جواب از آزاد انصاری

حیدرآباد دکن ۱۹ راگست ۱۹۴۱ء

محبِ غزل کُش! زندہ باش۔

کرم نامہ بہ صیغۂ بیرنگ شرفِ صدور لایا، یاد فرمائی کا شکریہ اور ایک مدتِ دراز تک یاد نہ فرمانے کی شکایت، مگر شکوۂ غزل دشمنی کو
ر انداز کرکے۔ آپ شکایت گزار ہیں کہ تو میرے خطوط کا جواب تو دے دیتا ہے مگر خط و کتابت میں سبقت کبھی نہیں کرتا، مجھے اقبال ہے کہ آپ کا
الزام صحیح ہے، مگر عذر صرف اس قدر ہے کہ یہ ناگوار سبق آپ ہی کے طرزِ عمل نے تو مجھے پڑھایا ہے اور صرف پڑھایا ہی نہیں بلکہ بالکل حفظ بھی کرا
یا ہے اور اتنا حفظ کہ وہ اب بھولتا ہی نہیں،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آپ کی فطرت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ جب کبھی کوئی اُمنگ آپ کے دل میں اتفاق سے خود ہی پیدا ہو تو
پ کسی کو بذریعہ تحریر یاد کرنے کی زحمت گوارا فرماتے ہیں، دوسرا کوئی بدنصیب اگر دن میں دس دس بار بھی بہ امیدِ جواب یہ کام کرے تو وہ بالاکثر حصولِ
اب میں ناکام ہی رہتا ہے، ممکن ہے کہ آپ نے اب اپنی یہ عادت بدل دی ہو، اگر ایسا ہے اور میری خوش قسمتی سے واقعی ایسا ہے تو میں روز
نامے لکھنے اور ارسالِ خدمت کرنے کو حاضر ہوں، اور انشاءاللہ بہت جلد اس پر عمل بھی شروع کردوں گا، صرف جوابِ باصواب موصول ہونے کی دیر
، آپ کی غزل دشمنی کی قسم!

آپ کی دوسری شکایت بھی غلط نہیں، بے شک میں یہ چاہتا ہوں کہ تندرست ہو جاؤں اور اس قدر تندرست کہ سینکڑوں گاماؤں کے ساتھ
دن ہٹلروں، لاکھوں مسولینیوں اور کروڑوں اسٹالینوں کو بھی ایک داؤں میں پچھاڑ سکوں، مگر آپ کو میری اس تمنا سے خوف کھانے کی ضرورت
ں اگر میں کبھی تقدیر سے اتنا تندرست ہو سکا تو یقین رکھیئے کہ سب سے زیادہ آپ ہی کے لئے کارآمد ثابت ہوں گا، یعنی یہ تندرستی حاصل کرتے
سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ آپ کے تمام مخالفین کو جن میں موافقینِ غزل بھی شامل ہیں ختم کر ڈالوں، اور پھر اس کے بعد جو احکام آپ کی سرکار سے
ر ہوتے رہیں اِن کی بھی بہ سر و چشم تعمیل کرتا ہوں، اپنی غزل دوستی کی قسم!

آپ کی تیسری شکایت بھی بالکل صحیح ہے کہ میں آپ کے بار بار طلب فرمانے کے باوجود حاضر ہونے سے قاصر رہا، مگر اس معاملے میں زیادہ دخل میری
بی کو ہے، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں آپ کی غزل دشمنی کے باوجود آپ کو بہت زیادہ دوست رکھتا ہوں اور آپ کی دلچسپ معیت میں جو وقت
ے اُسے حاصلِ حیات سمجھتا ہوں، مگر کیا کروں، مجبور ہوں، اوّل تو کبھی اِس قدر میسر ہی نہ آسکا کہ حاضرِ خدمت ہونے کا حوصلہ کرتا اور اگر کبھی
یسر بھی آسکا تو خوفِ انجام نے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں، اس واقعے کی تفصیل بہت دلگداز ہے، میں اُس کے ذکر سے آپ کی طبیعت
نغص کرنا نہیں چاہتا، لیکن بہ طورِ دفعِ دخلِ مقدر اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس معاملے کا غزل دوستی یا غزل دشمنی سے دُور کا بھی
ق نہیں، تمام غزلوں اور متغزلین کی قسم!

یہ صحیح ہے کہ اس وقت میرے پاس لکھنؤ تک کا کرایہ نہیں یہ بھی صحیح ہے کہ بالفعل کہیں سے جلد بہم پہنچنے کی بھی اُمید نہیں اور

یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر میں نے ذرا دیر کی تو آپ حسبِ عادت مفلس ہو چکے ہوں گے، مگر میں اس کے باوجود آپ کو تکلیف دیتے ہچکچاتا ہوں اس لئے نہیں کہ آپ سے دور رہنا مجھے گوارا ہے یا آپ کے حصولِ نیاز کا کچھ کم متمنی ہوں بلکہ صرف اس لئے کہ میں ایک مدتِ دراز تک آپ کے لئے بہت سی تکالیف کا باعث رہ چکا ہوں اور اب تا حدِ امکاں یہ زحمت دینی نہیں چاہتا۔ لیکن اس پر بھی اگر میرا جلد حاضرِ خدمت ہونا ضروری ہو اور آپ مجھے بہ آسانی اخراجاتِ سفر بھیج سکتے ہوں تو میں بسر و چشم تعمیلِ ارشاد کو حاضر ہوں۔ میں اس صورت میں یہ سمجھوں گا کہ میری خوش قسمتی نے مجھے میری شناسی میں میرے ارادہ کردہ اور قرار دادہ وقت سے پہلے کامیاب کر دیا ورنہ اوائل یا زیادہ سے زیادہ اواخرِ اکتوبر تو حتمی وعدۂ حاضری کرتا ہوں، یعنی میں بالیقین ختمِ اکتوبر سے پہلے حیدرآباد چھوڑ چکا ہوں گا۔ بہ لحاظِ غزل دوستی یا غزل دشمنی، تمام غزل پسندوں، تمام متغزلین دوست اصحاب کی قسم!

یہ آپ نے کیا تحریر فرمایا کہ "اگر میں یہ جانتا کہ آپ تل اوٹ پہاڑ اوٹ والے آدمی ہیں تو کبھی آپ سے دل نہ لگاتا"۔ فلسفیانہ دماغ اور شاعرانہ طبیعت کا مالک ہوتے ہوئے آپ کے قلم و زباں سے ایسے غیر فلسفیانہ اور غیر شاعرانہ خیالات کا اظہار تعجب انگیز ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تو انسان کو گوارا تعلقات اور گوارا معاملات سے دلچسپی وانہماک رکھنے کے ساتھ ساتھ سینکڑوں ناگوار باتیں بھی انگیز کرنے پر مجبور ہے اور شاعرانہ نقطۂ نظر سے دنیا کی چیز غیر مرغوب اور مکروہ ہے ہی نہیں، تمام عالم حسن ہی حسن ہے، پھر اگر آپ نے ایک اہم ہستی ہو کر ایک غیر اہم ہستی سے، ایک غزل دشمن ہو کر ایک غزل پرست سے اور جوش ہو کر آزاد سے دل لگایا اور اس کو انگیز کیا تو یہ کوئی ایسا شاذ یا غیر معمولی واقعہ نہیں کہ اس پر اظہارِ تعجب یا تاسف کرنا ضروری سمجھا جائے۔ اب رہ گیا تل اوٹ پہاڑ اوٹ ہو جانے کا معاملہ تو جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے اس معاملے میں بھی آپ کی طرف سے ہوئی، یعنی ادھر آپ لکھنؤ تشریف لے گئے ادھر میں حیدرآباد چلا آیا، بالکل اسی طرح جس طرح اس واقعے سے چند روز دریا گنج میں پردہ باغ کے قریب ایک چوراہے پر آپ مجھ کو دیکھ کر بطورِ مذاق مشرق کی طرف مڑ گئے تھے اور میں مغرب کی طرف۔ یہ ایک ایسا خاموش مذاق تھا جس پر ہم دونوں مل کر خوب ہنسے تھے، مگر اس وقت کس کو یہ معلوم تھا کہ یہی مذاق چند روز بعد سنجیدگی و اصلیت کا روپ کر دہرایا جانے والا ہے جو ایک خاصی مدت کے لئے ہم دونوں کو دور دور پھینک دے گا، چنانچہ پھر جب کچھ روز بعد یہ سنجیدگی و اصلیت کے رنگ میں دہرایا گیا تو آپ نے شمال کی راہ لی اور میں نے جنوب کی، دونوں واقعوں میں صرف سمات اور مسافتوں کی کمی و بیشی کا فرق ہے ورنہ دونوں کے خد و خال تک ایک ہیں، یہاں میں پھر آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ دونوں مرتبہ پہل آپ نے کی یعنی پہلے آپ تل اوٹ پہاڑ اوٹ ہوئے پھر میں، لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگرچہ دونوں مرتبہ پہل آپ کی طرف سے ہوئی مگر اس کی ذمہ داری بھی میری ہی محرومیٔ قسمت ہے یہ بھی ممکن ہے کہ میری غزل پرستی نے مجھ کو یہ روزِ بد دکھایا ہو یعنی آپ میری غزل پرستی سے تنگ آ کر مجھے چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہوں! بہر حال کوئی وجہ ہوئی ہو، میں ابھی تک غزل کو آپ کی طرح کشتنی و گردن زدنی نہیں سمجھتا، کیونکہ بفضلہٖ تعالیٰ غزل پھر غزل ہے۔

آپ کا سوز خواں، بسورنے والا بیوۂ عالمِ ثانی، آج کل بیمار بھی ہے اور بیکار بھی، اس کی حالت قابلِ رحم و کرم ہے، قابلِ طعن و تشنیع اور شایانِ سرزنش نہیں، کاش! آپ غزل دوستی اور غزل دشمنی سے بالا ہو کر غور فرماتے۔

فانیؔ صاحب جب مشاعرۂ بھوپال سے واپس آئے ہیں اور میں نے پوچھا کہ آپ کی واپسی میں اتنی دیر کا باعث کیا ہے تو انہوں نے فرمایا کیا کہوں، اگر سچ سچ واقعہ بیان کرتا ہوں تو تم یہ خیال کروگے یہ شخص خواہ نخواہ میرے دوست جوشؔ کو گالیاں دیتا اور اس کو بدنام کرتا ہے، واقعہ یہ ہوا کہ تمہارا دوست جوشؔ مجھ کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر بڑے اصرار سے جبراً لکھنؤ لے گیا، لکھنؤ ہم رات کے وقت پہنچے، تمہارا دوست جوشؔ مجھ کو ایک ہوٹل میں ٹھہرا کر اور یہ وعدہ کرکے چلا گیا کہ صبح آکر تم کو لے جاؤں گا، مگر اس ظالم نے چار پانچ روز تک میری کوئی خبر نہ لی، وہاں میں خرچ سے بھی تنگ ہو گیا اور سردی کھا کر بیمار بھی ہو گیا، مجبوراً بیماری ہی کی حالت میں قرض دام کرکے جس طرح بن پڑا حیدرآباد کا رُخ کیا، راستے میں بمقام جھانسی مزید سردی کھائی اور سخت بخار میں مبتلا ہو گیا، اور نیم بے ہوشی کی حالت میں خدا معلوم کیونکر حیدرآباد یا اپنے گھر تک پہنچ سکا۔ یہ ہے اس ظلم و ستم کا مختصر قصہ جس کا آپ کے دوست جوشؔ نے مجھ کو بلا وجہ تختۂ مشق بنایا" واقعی جب فانیؔ صاحب لکھنؤ سے حیدرآباد پہنچے ہیں تو شدید قسم کے بخار، زکام اور دردِ سینہ میں مبتلا تھے اور بہ مشکل سوا یا ڈیڑھ مہینے بعد صحت یاب ہو سکے، اپنی مذکورۂ بالا مصیبت کی داستان فانیؔ صاحب نے مجھ کو لکھنؤ سے واپس ہو کر بہت دردناک پیرائے میں رُک رُک کر اور کراہ کراہ کر سنائی، مگر آپ فرماتے ہیں کہ فانیؔ خود ہوٹل میں ٹھہرا اور اس وعدے کے ساتھ ٹھہرا کہ صبح کو میں خود آپ کے مکان پر آجاؤں گا، میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ ان دونوں بیانوں میں سے کون سا بیان زیادہ صحیح ہے، مگر یہاں کیا میں اتنا پوچھ سکتا ہوں کہ جب آپ انہیں اصرار کے ساتھ اپنے ہمراہ لکھنؤ لے گئے تھے تو کیوں انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر نہ لے گئے اور کیوں اُن کو ہوٹل میں ٹھہرایا یا ٹھہرنے دیا، کیا قانونِ غزل دشمنی میں ایسی ناروا سزائیں بھی محکوم ہیں۔

فانیؔ صاحب کی ملازمت جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکی ہے اب ان کی گزر اوقات زیادہ تر ریڈیو کی آمدنی پر منحصر ہے یہاں کا محکمہ ریڈیو، مہینے میں دو تین بار اُن کو بلاتا ہے اور غزل خوانی کا موقع دیتا ہے، اس سے ان کو پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار کا سہارا مل جاتا ہے، اخترؔ صاحب بھی اکثر ریڈیو پر بلائے جاتے ہیں، اُن کی غزل گوئی اور غزل دوستی آج کل زوروں پر ہے، اس لئے وہ بھی وہاں سے بالالتزام غزل خوانی کرکے پچاس ساٹھ روپے حاصل کر لیتے ہیں۔ جئے غزل اور غزل خوانوں کی!

دارالترجمہ تقریباً ختم ہو چکا ہے، عمادی صاحب، ابراہیم صاحب اور فدا علی صاحب وغیرہ پنشن پر علیحدہ کئے جا چکے ہیں، مودودی صاحب کو تھوڑا سا وظیفہ دے دیا گیا ہے، مگر ان کے لئے یہ بھی سفارش کی ہے کہ انہیں کسی محکمے میں سوا سو سے ڈیڑھ سو تک کی جگہ دی جائے، اب اس محکمے میں صرف احسان احمد، مولوی نظیر الدین صاحب اور ایک دو ڈاکٹر باقی رہ گئے ہیں، ان سب کے لئے بھی یہ حکم ہو چکا ہے کہ ہم تنخواہ ملازمتوں پر منتقل کر دیئے جائیں، مگر جب تک ہم تنخواہ ملازمتیں نہ مل سکیں مزید گوناگوں پابندیوں کے ساتھ بدستور دارالترجمے میں کام کرتے رہیں اور یہ نئی گوناگوں پابندیاں اس قدر نامعقول اور شدید ہیں کہ کوئی انسان ان کے مطابق کام نہیں کر سکتا، میری یقینی رائے ہے کہ غریب دارالترجمے پر اس وبال کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہاں کوئی غزل گو شاعر باقی نہیں رہ گیا تھا اور یہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا کہ سب سے پہلے ایک غزل دشمن شاعر وہاں سے علیحدہ کیا گیا تھا یعنی غزل دشمنی سے اس کی بربادی کی ابتدا ہوئی تھی اور پھر جب کوئی غزل گو یا غزل دوست بھی دارالترجمے

سلہ: فانیؔ صاحب مرحوم اس وقت تک بقیدِ حیات تھے۔ آزاد انصاری

یہ سارے معجزے سائنس کے ہیں — کہ قابو میں عناصر آگئے ہیں

پلٹ رہوارِ تخیّل سُبک سیر — کہاں ہیں اور کہاں یہ جنّتِ غیر
زمینِ ہند کی جانب رواں ہو — طوافِ ارضِ محسودِ جہاں ہو
یہاں کا تو خدا ہی دوسرا ہے — دیارِ ہند کا عالم جُدا ہے
جو خطّہ ہے قدامت کا ورق ہے — وہی قیس اور لیلےٰ کا سبق ہے
وہی بیہڑ وہی کہسار جنگل — وہی وادی وہی میدان چٹیل
وہی ہیں گاؤں اور ویرانیاں ہیں — وہی جہل اور وہی نادانیاں ہیں
وہی کھیتی وہی بیل اور وہی ہل — وہی ہے اوکھلی مسر اور موصل
وہی چھپّر وہی دھنّی وہی بانس — وہی کوڑا وہی کرکٹ وہی پانس
وہی کتھری وہی گُدڑی وہی ٹاٹ — وہی کونا وہی ٹوٹی ہوئی کھاٹ
جو گھر ہے نکبت و عسرت کا گھر ہے — مصیبت جان کو آٹھوں پہر ہے
وہ جاڑا ہو کہ گرمی ہو کہ برسات — مشقّت اور جانکاہی ہے دن رات
نہیں ثابت کوئی کپڑا بدن پر — نہ روٹی پیٹ بھر کر ہے مُیسّر
پسینہ اپنا جب دن بھر بہایا — تو مُٹھی بھر چبینا ہات آیا
پڑے بیمار تو ہے کون پُرساں — دوا دارو میسّر ہے نہ درماں
یونہی کچھ روز بستر پر تڑپ کے — چلے راہِ عدم کو ٹھنڈے ٹھنڈے
اُٹھے بھائی بھتیجے اور بیٹے — چلے میت کو گُدڑی میں لپیٹے
جلا دینے کا بھی ساماں نہ پایا — کسی ندی پہ لے جا کے بہایا
یہ ہے افسوس اُس دہقاں کی حالت — کہ جس کے خون سے پلتی ہے دولت

نظر شہروں پہ بھی اب ڈالئے ایک — یہاں بھی دیکھئے حالِ بد و نیک
چراغوں کی جگہ بجلی ہے روشن — ملیں دو چار ہیں دو چار انجن
بجائے چاہ ہے پائپ کا پانی — اسی کے رحم پر ہے زندگانی
مُہیا ہیں کچھ اسبابِ تماشا — کھلے ہیں تھیٹر اور کچھ سنیما
ہوئی شام اور جنٹلمین نکلے — سنیما کے لئے بے چین نکلے
سرِ بازار ڈالے ہاتھ میں ہاتھ — چلی جاتی ہیں مسٹر کے مسز ساتھ
یہی آزادیٔ ہندوستان ہے — اسی میں مست کالج کا جواں ہے

بنائیں ہیں پڑی تعلیم کی بھی — بڑے کالج ہیں یونیورسٹی بھی
نہ پوچھو کیا ہے اس تعلیم کا حال — یہاں ہے ڈھول میں بس کھال ہی کھال
لُٹائی باپ کی گاڑھی کمائی — بہت عمر اور بہت صحت گنوائی
تو ڈگری کوئی ہم کو ہات آئی — نیازیں دیں خوشی ہم نے منائی
جوانی ہی میں پیری آگئی ہے — خمیدہ ہے کمر عینک لگی ہے
لئے ڈگری چلے کالج سے بھی ہم — کہ نکلے جس طرح جنّت سے آدم
کہیں بھی پوچھتا کوئی نہیں بات — دھرے بیٹھے ہیں خالی ہات پر ہات
بہت دن جب ہوئے صرفِ تگاپو — کھُلی قسمت ہوئے دفتر کے بابو
زن و فرزند و دُختر کا لئے بار — اجل کی راہ میں ہیں گرم رفتار

ہزاروں میں ہوئے بابو جو دو چار — تو بیڑا ہندیوں کا ہو گیا پار
گلے میں ڈگریوں کا طوق ڈالے — پڑے پھرتے ہیں در در علم والے
کہیں جائیں کوئی پُرساں نہیں ہے — کہیں اس درد کا درماں نہیں ہے
ہمیں سُوئی بنانا بھی نہ آیا — ہمیں تھگلی لگانا بھی نہ آیا
ہمیں تو مانگ کھانا بھی نہ آیا — ہمیں بندر نچانا بھی نہ آیا
وہی ہم ہیں وہی بھاجی وہی ساگ — وہی ہم ہیں وہی ڈھپلی وہی راگ

جگر بریلوی

گیت

لکھے گیت ڈوبے ہوئے پریم میں اِسی آس پر
کہ شاید تمہاری نگاہیں کبھی انہیں دیکھ کر
مری دُکھ بھری یاد سے لیں اثر جو دل آئے بھر،
کہو تم کہ "یہ لوگ بھی خوب ہیں جو لکھتے ہیں گیت
سدا دل میں رکھتے ہیں اک آگ سی کہیں جس کو پیت"
لکھے گیت ڈوبے ہوئے پریم میں اسی آس پر!

پلک داہنی آنکھ کی یاد سے، پھڑکنے لگے
اسی یاد کی ایک دھڑکن سے دل دھڑکنے لگے
لئے ساتھ تارا سا آنسو کوئی دکھائے جھلک
مگر تم کہو "اس کو پلکوں تلے رکھوں کب تلک"
مگر پھر بھی آنکھیں چھپائے رہو نہ جائیں چھلک
لکھے گیت ڈوبے ہوئے پریم میں اسی آس پر!

مرے گیت کے لفظ پہچان لو چھپاؤ نہ دُکھ
اسی دُکھ کی ہلکی سی چھایا میں ہے محبّت کا سُکھ
اسی دُکھ سے بے چین ہو کر کبھی مرے گیت کو
منوہر رسیلی سی آواز میں سنانے لگو
مرے گیت ہیں ساتھ اپنے لئے یہی اِک اَثر
لکھے گیت ڈوبے ہوئے پریم میں اسی اس پر!

مقبول حسین احمد پوری

سات گونڈ لوک گیت[1]

یہ لوک گیت بد قسمت گونڈوں کے دُکھ درد کے ترجمان ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے قدیم ترین باشندوں میں سے ہیں لیکن آج کل وسطِ ہند کے جنگلوں میں آباد ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اکبر کے زمانے تک اُدھر کئی گونڈ ریاستیں بن چکی تھیں جن کی کافی طاقت تھی۔ چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں تو اب بھی موجود ہیں مگر انہوں نے "راج گونڈ" کا لقب اختیار کر کے عام غریب گونڈوں کو ایک طرح کی حقارت سے دیکھنا شروع کر رکھا ہے۔ بن باسی گونڈ کسان غریبی کی گود میں جنم لیتا ہے اور غریبی کی گود ہی میں اُسے موت آ لیتی ہے۔ گیتوں کے ترجمے میں اُن کی سادگی کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ درختوں کے درمیان میں بنسری بجاتا ہوں
لیکن کون پروا کرتا ہے اِس غریب بن باسی کی؟
نہ میری ماں ہے، نہ بھائی، نہ کوئی یار دوست دُنیا بھر میں ــــ
دن بھر میں بنسری بجاتا ہوں
درختوں کے درمیان میں بنسری بجاتا ہوں۔
میری ایک ماں ہے، بھائی بھی، اور کچھ یار دوست بھی جو میرے
ساتھ کھانے پینے میں شریک ہیں۔
لیکن اُن میں سے ایک بھی اِس غریب بن باسی کی مدد نہیں کرتا۔
ایک بیل کی چھاؤں میں کوئی بیٹھا ہے۔
اُسے بچھو کاٹتا ہے اور وہ روتا ہے۔
کون پروا کرتا ہے بن باسیوں کی؟
درختوں کے درمیان میں بنسری بجاتا ہوں۔

۲۔ ہائے! کیسے بھروں گا اِس سال اپنے بچوں کے پیٹ؟
فصل دھوکا دے گئی۔
لگان تو ادا کر ہی سکتا ہوں ہل بیچ کر، بیل بیچ کر
لیکن کیسے بھروں گا اس سال اپنے بچوں کے پیٹ؟

۳۔ باہر مینہ برستا ہے
گھر کے اندر ایک لڑکی بیٹھی رو رہی ہے،

۴۔ ہمارے گاؤں کا زمیندار بہت غریب ہو گیا ہے۔
اُس نے اپنی بہن کو بیچ دیا ہے اور ایک دھوتی خرید لی ہے....

۵۔ ماہی گیر کے گھر ایک بیٹے نے جنم لیا ہے ــــ
سر پر جال رکھے ہوئے۔
"سنگنی"، "مچھلی" "دَھر دَھر" رو رہی ہے ــــ
ہائے! میری جان کا ایک دشمن پیدا ہو گیا۔

۶۔ شیروں سے بھرپور ہے یہ جنگل، ہم کیسے بچیں گے؟
وُہ ایک شیر سے ملتا ہے اور کہتا ہے ــــ
یہی لکھا ہے میری قسمت کی پوتھی میں
کہ میں مارا جاؤں!
شیروں سے بھرپور ہے یہ جنگل، ہم کیسے بچیں گے؟
تنگ پہاڑی درے میں ــــ
درے میں، جہاں کیچڑ کی بھرمار ہے،
شیروں کے نقشِ پا دکھائی دیتے ہیں
شیروں سے بھرپور ہے جنگل، ہم کیسے بچیں گے؟

۷۔ خوشحال آدمی خوشی کا نغمہ گاتا ہے۔
مگر غمگین آدمی غم کے سُر چھیڑتا ہے۔
کیسے بتا سکتا ہوں میں اپنی زندگی کے غم
انہیں تو صرف خُدا ہی گن سکتا ہے۔
گھر سے آتی ہوئی آوازیں سُن کر تم معلوم کر سکتے ہو
کہ وہاں کوئی غم ہے یا خوشی۔

دیوندر ستیارتھی

---

[1] دیہاتی گیت کے لئے یہ لفظ گجراتی، بنگالی، ہندی اور پنجابی میں استعمال کیا جا رہا ہے اور حال ہی میں "آل انڈیا ریڈیو" نے بھی اسے قبول کر لیا ہے۔ (ستیارتھی)

H.A. Hamid

ہسپانیہ کے دو دِہاتی گیت

۱

اگر ہو سمندر ہماری دوات
جو بَن جائیں کاغذ یہ سات آسماں
وہ بدیاں جو لائی ہے عورت کی ذات
نہ پوری طرح کر سکیں ہم بیاں

(ترجمہ)

۲

اگر ہم سمندر کی لے کر دوات
لکھیں آسمانوں کے صفحات پر
تو قادر ہے جس جھوٹ پر مرد ذات
نہ ہوگا بیاں، گو لکھیں عمر بھر

(ترجمہ)

اپنے بچّے کی پیدائش پر

(گیارھویں صدی کے ایک چینی شاعر کی نظم)

کسی گھر میں پیدا ہو بچّہ کوئی — تو سب چاہتے ہیں یہ قابل بنے
مگر عمر برباد میری ہوئی — اِسی قابلیت کے اقبال سے

مرے بچّے! رہ کُندۂ نا تراش
کہ نزدیک پھٹکے نہ فکرِ معاش
حماقت میں بن اس قدر بے نظیر
کہ ہو جائے تُو سلطنت کا وزیر

(ترجمہ)

حامد علی خاں

محفلِ ادب

عورت

کیا ہوا گر تیری رنگیں رہ گذر سے دور دور　　زندگی کے راستوں میں پیچ و خم کھاتا ہوں میں
تو نہ جانے کیوں سمجھتی ہے کہ تجھ کو بھول کر　　اپنے احساسات کی دنیا میں کھو جاتا ہوں میں
میری خاموشی پہ اکثر تمتما اٹھتی ہے تو　　تیری خاموشی کا لیکن راز پا جاتا ہوں میں
چاہتی ہے مجھ سے تو نسوانیت کا احترام　　اور تری انسانیت کے زمزمے گاتا ہوں میں

آہ یہ تہذیب کا جادو تمدن کا فریب
سوچتا ہوں جس قدر اتنا ہی شرماتا ہوں میں

اس نظامِ زندگی میں جس سے رسوا ہے حیات　　تیری ہستی رقصِ عشرت کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنے ہونٹوں کی حسیں گلنار محرابوں سے پوچھ　　ان میں بوسوں کی حرارت کے سوا کچھ بھی نہیں
تیرے ابرو کے اشاروں میں ارادہ ہے نہ شوق　　تیری آنکھوں میں شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں
تیرے اعضا کی نزاکت تیرے پہلو کا گداز　　مرد کے بستر کی زینت کے سوا کچھ بھی نہیں
میں یہ کہتا ہوں محبّت زندگی کا درد ہے　　تو یہ کہتی ہے محبت اک سوا کچھ بھی نہیں
سوچتا ہوں اور اکثر سوچتا رہتا ہوں میں　　کیا تری دُنیا نزاکت کے سوا کچھ بھی نہیں
جذب کر لیتی ہے تجھ کو مرد کی جادوگری　　تو کہ اِک لمحے کی فرصت کے سوا کچھ بھی نہیں
اک نشاط آگیں کھلونا بن کے رہ جاتی ہے تو　　جیسے تو سامانِ راحت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ تکلّف یہ تصنع یہ ادب یہ احترام　　اِک ہوس پرور ریاست کے سوا کچھ بھی نہیں

جب تلک تو خود نہ توڑے گی طلسمِ رنگ و بُو
تیری قیمت ایک عورت کے سوا کچھ بھی نہیں

علی سردار جعفری　　"نیا ادب"

فلک پیما کی نظر میں عورت

فلک پیما کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک عرصہ سے اُردو پبلک اُن سے واقف ہے پچھلے بیس سال سے آپ برابر "ہمایوں" میں لکھ

رہے ہیں۔ ویسے تو ان کی تحریر میں ظرافت فلسفہ نکتہ چینیاں۔ مذہبی اور دیگر تنقیدیں۔ عشق و محبت سب ہی کچھ ایک نرالی ادا سے موجود ہے لیکن میں اس وقت فلک پیما کا مطالعہ صرف اس نظر سے کروں گی کہ وہ عورت کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود اس بات کو مانتے ہیں کہ وہ عورت کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے اور ایک جگہ اپنے ایک ملاقاتی سے کہلواتے ہیں "جناب آپ پر تو صنفِ نازک کی پرستش کا بھوت سوار ہے۔ عورت نہ ہوئی کمبخت الف لیلہ کی داستان ہو گئی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی" ہندوستان کی بے بس اور بے کس عورت کو دیکھ کر اُن کو غصہ آتا ہے اور ہندوستانی لڑکی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں "لڑکی ہندوستانی گھروں کا ایک پالتو جانور ہے۔ جسے پالنے والے عارضی نمود کی خاطر وقتاً فوقتاً ذبح کرتے ہیں۔ ذبح ہونے پر اس کی نسل بڑھتی ہے"

وہ سماج میں ہر فرد کے لئے ایسی آزادی چاہتے ہیں کہ ہر شخص اپنی زندگی اپنی مرضی سے بنائے اور خاصکر عورتوں کی پوری آزادی چاہتے ہیں وہ عورتوں کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ ان کو اپنے اوپر پورا اختیار ہو ——— ان کو اپنا پورا پورا مالک ہونا چاہئے۔ سفید کریں یا سیاہ یہ اُن کی مرضی۔ فلک پیما اُن خیر خواہ انسانوں کو جن کا پیشہ صرف عورتوں کو نصیحتیں کرنا ہے بہت بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا ایک جگہ اُن کی ایک عورت ایک خط میں یوں لکھتی ہے "صنفِ نازک کے سب سے بڑے دشمن وہ ہیں جو ہم سے نہایت رقت آمیز خلوص سے کہتے ہیں" بیویو ذرا سوچ سمجھ کر قدم بڑھاؤ۔"

فلک پیما کے دل میں ایک عورت کی اتنی عزت ہے کہ وہ اُس میں فیصلہ کی قوت پاتے ہیں اور عورتوں کو نصیحت کرنے والوں کو وہ عورت کا خیر خواہ بالکل نہیں مانتے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ عورتوں کے دماغ اور سمجھ اور فیصلہ کی سخت توہین کرتے ہیں۔ ان کو کبھی اپنی طاقت سے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا نہیں دیکھ سکتے اور ہر وقت اُن کو بچوں کی طرح اُنگلی پکڑ کر چلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ نہیں چاہتے کہ یہ عورتیں کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں اپنے کو پہچانیں اور اپنا فیصلہ خود کریں۔ لہٰذا فلک پیما کی ایک اور عورت ان لوگوں کو اس طرح مضبوطی سے جواب دیتی ہے "میں تو دل سے چاہتی ہوں کہ مجالس میں عورتوں کا ذکر شد و مد سے ہو۔ اس بات کی ہمیں ذرہ برابر بھی پروا نہیں کہ نکتہ چینیاں ہوں گی۔ کیا لوگ ابھی سے بھول گئے کہ وہ دن کچھ پُرانے نہیں ہوئے جب ہمارا ذکر ہی مفقود تھا۔ بہت کوئی کمبخت مجبور ہوتا تھا تو یوں ذکر کرتا تھا "گھر میں طبیعت اچھی نہیں" مہربانی کر کے اپنے سب دوستوں سے ضرور کہئے کہ بیباک عورتوں کی ایک فوج تیار ہو رہی ہے اور یہ بات ذرا نمک مرچ لگا کر کہئے۔ یعنی اس طرح کہ یورپ میں عورتوں نے مردوں کو وہ ناچ نہیں نچایا جو عنقریب ہندوستان میں رائج ہو گا۔"

فلک پیما ہندوستانی عورتوں میں وہی آزادی دیکھنا چاہتے ہیں۔ جیسی کہ یورپ و امریکہ کے درمیانی اور اونچے طبقہ کی عورتوں کو حاصل ہے وہ چالیس سال سے ہندوستان کے درمیانی اور اوپر کے طبقہ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور اُس میں عورت کا پردے میں رہنا۔ عورت کا پُرانی لکیر کا فقیر بن کر چلنا۔ شادی بیاہ ہر معاملہ میں اُس کی رائے کو غیر ضروری سمجھا جانا اور سب سے زیادہ نوجوانوں میں عشق اور محبت کا سرے سے ناپید ہونا اُن کو بہت ہی ناگوار ہے عورت کو وہ ان سب بندھنوں سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اُس کی شخصیت کا

بھی اظہار چاہتے ہیں اور ساتھ ہی وُہ ہندوستان کی عورتوں سے جگہ جگہ شکایت بھی کرتے ہیں کہ وُہ کیوں اپنی اتنی بے قدری کرتی ہیں خاص کر اپنے حسن کی۔ ہر عورت اُن کے خیال میں ایک چلتی پھرتی زندہ تصویر ہے اور جس طرح ایک مصور اپنی تصویر کی زیبائش میں اپنی ساری عقل اور طاقت صرف کر دیتا ہے اسی طرح عورت کو بھی اپنی عقل کو اپنے کو حسین بنانے میں خرچ کرنا چاہئے۔

ہمارے ملک میں اُن مصنّفوں کو جنہوں نے عورتوں کے بارے میں لکھا ہے تین طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا طبقہ تو وہ ہے جو عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی کو نہایت خوف زدہ نظر سے دیکھتا ہے اُس کو اس میں سوائے خرابیوں کے اچھائی تو مشکل سے نظر آتی ہے۔ یہ طبقہ اس بڑھتی ہوئی رَو کے سامنے ایک بند باندھتا ہے . . . . پُرانے زمانے کے رسم ورواج کی تعریف میں بہت کچھ لکھتا ہے اور ساتھ ہی اس ترقی کے جس کو وہ خطرناک اور زہر آلود پاتا ہے خلاف بہت کچھ لکھتا ہے۔ دوسرا طبقہ اُن مصنّفوں کا ہے جو عورتوں کو اعتدال کی چال چلنے کی تبلیغ کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو چال زمانہ چل رہا ہے اُس کو بالکل روکنا تو ناممکن ہے۔ لیکن کسی ترکیب سے زمانہ کی چال کو اِس طرح جوتنا چاہئے کہ انسان آگے بڑھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ طبقہ بھی عورتوں کی آزادی کی طرف خواہ وہ دماغی ہو یا سماجی۔ ڈرتے ڈرتے ہی دیکھتا ہے

تیسرا طبقہ مصنّفین کا وہ پایا جاتا ہے جو اس آزادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اور آگے بڑھ کر اُس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ اِس تیسرے طبقہ میں فلک پیما کا شمار ہے۔ اور وہ پہلے دو طبقوں کا مذاق اِس طرح اُڑاتا ہے۔ ایک مرد کہتا ہے "کہنے والے یوں کہہ رہے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا اگر یہ نتیجہ ہے کہ وہ آبائی طرز خیال کو چھوڑ کر دنیا کے نیک وبد کی نسبت خود شخصی رائے قائم کریں تو اِس تعلیم کو دور ہی سے سلام ہے . . . . تم سمجھیں کہ تعلیم سے قومی لیڈروں کا اصل مطلب کیا ہے؛ وہ مطلب یہ ہے کہ تعلیم تو تم پا جاؤ۔ مگر کہو وہی جو بزرگ کہتے آئے ہیں۔ پڑھو لکھو سب کچھ مگر چلو نانی دادی کے نقشِ قدم پر اور جگہ تو تعلیم حالاتِ حاضرہ سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہے۔ مگر ہمارے ہاں تعلیم اس لئے دی جارہی ہے کہ ہم زمانے کا مقابلہ کرسکیں۔ زمانہ ہمیں اگر دو قدم آگے کی طرف لے جاتا ہے تو تعلیم کے زور سے چار قدم پیچھے ہٹیں . . . ."

ہندوستان میں جو جوان عورتوں کو عشق ومحبت کی آزادی نہیں۔ اُس کا اظہار فلک پیما اپنی ایک مشہور حکایت ساڑھی اور سوٹ میں ظاہر کرتے ہیں۔ ساڑھی تو اُس کہانی میں ہندوستانی تہذیب کا ایک شرمیلا باعصمت اور حیادار نمونہ ہے اور سوٹ جو یورپ سے ہندوستان لایا گیا ہے یورپ کی زندگی کا نمائندہ ہے یہ دونوں اتفاق سے ایک جگہ مل جاتے ہیں اور بات کرنے لگتے ہیں۔ سوٹ باتوں کے دوران میں یوں کہتا ہے " میں اس ملک میں جب سے آیا ہوں۔ دراصل جلا بُھنا رہتا ہوں۔ میرے وطن میں بہت ہی ذلّت ہوتی پھر بھی یہ خوشی ضرور رہتی کہ کبھی کبھار کوئی اچھا سا فراک میری گود میں بیٹھتا۔ گاہے ماہے قہقہوں کی لہر مجھ سے فراک تک اور فراک سے مجھ تک رواں ہوتی۔ چہل پہل میں وقت گزرتا۔ مگر جس دن سے یہاں آیا ہوں میری تو مٹی خوار ہے۔ یہ سنتے سنتے کہ حد سے تجاوز نہ کرو۔ اعتدال سے کام لو۔ چلو تو سنبھل کر۔ بیٹھو تو سمٹ کر۔ دیکھو تو جھک کر۔ پاس رہو مگر دُور دُور۔ میں تو جان بلب ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو جو پھٹ پھٹا کر اس دُنیا سے چل دُوں۔

فلک پیما کو ہندوستانی عورتوں سے علاوہ اور شکایتوں کے ایک یہ بھی شکایت ہے کہ وہ خوش ہونا اور ہنسنا نہیں جانتیں۔ بلکہ ہر وقت متدبر اور خاموش رہتی ہیں۔ جس طرح کہ ساڑھی اور سوٹ میں اوپر کے پیراگراف سے ظاہر ہو گیا ہوگا۔ اور بھی کئی مضامین ہیں جن میں یہ گلہ موجود ہے مثلاً "پھوہڑ بیوی کی اکیاون لاکھ علامتیں" وغیرہ۔

فلک پیما کی تصانیف پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت قدرت کا کوئی نہایت ہی بیش بہا کرشمہ ہے۔ لہٰذا ایسی شخصیت کے لئے ایسے قانون کہ "یہ نہ کرو۔ وہ نہ کرو" بنانا بدترین گناہ ہے۔ وہ آزاد ہو لیکن آزادی کی صورت کیا ہو۔ اس سے فلک پیما کو غرض نہیں۔ یہ عورت کے اوپر وہ چھوڑ دیتے ہیں اس کا حق وہ اپنے کو بھی نہیں دیتے کہ وہ نصیحت کریں۔ اس سے بعض دفعہ خیال ہوتا ہے کہ فلک پیما کی عورت ایک نہایت خوبصورت سوسائٹی کی تتلی بن کر تو نہیں رہ جاتی؟[1]

(رشید جہاں)

ادبِ لطیف

توارد

جاپانی شاعرہ کوماچی (۸۰۵ بعد مسیح)

مکان سے میں
یہ بہانہ کر کے نکلی کہ
"ذرا کھیتوں کے گرد بانس کی کٹہری لگنے کا تماشا کرنے جا رہی ہوں"
مگر دراصل میرا مطلب تجھے دیکھنے سے تھا۔

غالب

اُنہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گُل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

مرسلہ مرزا طالب شیرازی

سالِ نو

اک سال اور بیت گیا سوزِ عشق میں
داخل جدید دور میں درد و الم ہوا
منزل اک اور ختم ہوئی رہ نورد کی
تلخابۂ حیات کا اک گھونٹ کم ہوا

مرسلہ صادق قریشی

[1] ہمایوں کے موجودہ پرچے میں "فلک پیما" کا مضمون "لاڈو" اس سلسلے میں قابلِ غور ہے۔ "ہمایوں"

مطبوعات

ظالم محبت۔ یہ ناولٹ "محترمہ حجاب امتیاز علی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ سید سجاد حیدر "یلدرم" مقدمہ میں لکھتے ہیں "عزیزہ حجاب امتیاز علی نے بزمِ اُردو میں ایسی جگہ حاصل کر لی ہے کہ شمع جس وقت اُن کے سامنے لائی جاتی ہے تو ساری محفل ہمہ تن گوش ہو جاتی ہے۔ حجاب کے تخیل نے ایک نئی دنیا خلق کی ہے جو ایک دائمی قوسِ قزح، دائمی رنگ و بو، دائمی حسن و عشق کی دُنیا ہے۔ وُہ ایک نقاش ہیں عکّاس نہیں۔ اُن کے افسانوں کے کریکٹر ایک مستقل خاندان کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ خدا کرے یہ حضرات رہتی دُنیا تک جئیں اور یہ جزیرے اور یہ پہاڑ اور یہ دریا جنہیں آپ کسی اٹلس میں تلاش نہ کیجئے گا، اس آب و گل کے کرہ سے کبھی نہ ٹکرائیں۔ روحی ان کی زندگی کے کارنامے اپنے دلکش انداز میں لکھتی رہیں" یلدرم صاحب نے اٹلس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ پورا درست نہیں۔ کتاب کے شروع میں ایک دلکش سہ رنگی تصویر ہے "نہر عطوص"۔ یہ نام تو واقعی کسی اٹلس میں نہ ملے گا مگر ایران کا ہر ملاح اور سومستان کا ہر سیاح آپ کو بتا سکے گا کہ یہ منظر کہاں جلوہ نما ہے؟ کتاب پر قیمت درج نہیں شاید مصنف کی نئی دنیا" میں ایسی دلکش چیزیں قارئین کو مفت مل جاتی ہوں۔ ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعتِ پنجاب لاہور۔ ر-ل

سی پی میں کانگرس راج۔ صوبۂ متوسط کی کانگرسی وزارت نے اپنے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کتاب میں اُسے نہایت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ چشم دید واقعات اور صحیح اعداد و شمار کا ایک عبرت انگیز مرقع ہے۔ ہر مسلمان بلکہ ہر انصاف پسند ہندوستانی کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ (۱) مرزا اسمٰعیل بیگ سکرٹری مسلم لیگ ناگپور (سی پی) (۲) دفتر کانفرنس گزٹ۔ علی گڑھ (یوپی) ر-ل

منتخبِ داغ۔ داغ کے کلام کا یہ انتخاب بڑی تقطیع کے ۴۷۷ صفحات پر شائع ہُوا ہے۔ اِس انتخاب کی خوبی کی ضمانت یہ ہے کہ اسے حضرتِ احسن مارہروی مرحوم نے مرتب کیا تھا جو داغ کے قابل ترین شاگردوں میں سے تھے۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ انتخاب حضرتِ احسن مرحوم کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اسے شائع کرنے کی سعادت حضرتِ احسن کے فرزندِ رشید جناب سعید کے حصے میں آئی ہے۔ ابتدا میں سعید صاحب نے اپنے والدِ ماجد کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ اس کے بعد حضرتِ احسن مرحوم کا فاضلانہ مقدمہ شامل ہے۔

انتخاب کے متعلق اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک اچھے شاعر کے کلام کا انتخاب ایک اچھے شاعر اور نقّاد نے کیا ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت نفیس ہے۔ حضرتِ داغ اور حضرتِ احسن کی تصویریں شامل ہیں۔ قیمت مجلد ؎۔ پتہ۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد (یوپی)

ح

تصاویر

(سمندر کے نظارے کے اوپر کی چھوٹی تصویر مدیرِ ہمایوں نے اپنے کیمرے سے لی۔ یہ کلفٹن کراچی کے کنارے مندر کا کبوتر خانہ ہے)

(قطعۂ تاریخ علامہ اقبال مرحوم نے جولائی ۱۹۱۸ء میں حضرتِ ہمایوں کی وفات پر اُن کے صاحبزادے میاں بشیر احمد کو لکھ کر بھیجا)

سید عبدالطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں "۲۴" لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

فہرست عنوہ

فہرستِ مضامین

جلد ۴۱ — نمبر ۲

"ہمایوں" بابت ماہ فروری ۱۹۴۲ء

ضروری اطلاع: جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بابت ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔ — مینیجر

چندہ سالانہ صہ۔ ششماہی سے رمع محصول

جنگ کے مصارف

ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ موجودہ زمانے کا سامانِ جنگ کس قدر گراں ہے اور مہذب حکومتیں انسان کی بہتری کے مقابلے میں اُس کی تباہی پر کس قدر زیادہ صرف کرتی ہیں

ایک ٹینک بنانے کا خرچ	۱۸۷۰۰۰ روپے
ایک مسلح کار بنانے کا خرچ	۱۲۰۰۰ روپے
ہوائی جہازوں کو گرانے والی توپ کا خرچ	۲۷۵۰۰۰ روپے
چھ انچ دہانے کی ہاؤٹزر توپ	۴۳۰۰۰ روپے
مشین گن	۱۸۰۰ روپے
رائفل	۱۰۰ روپے
بڑا بم بار ہوائی جہاز	۲۷۰۰۰۰ روپے
"لڑاکا" ہوائی جہاز	۱۴۰۰۰۰ روپے
"دیکھ بھال کرنے والا" ہوائی جہاز	۱۲۰۰۰۰ روپے
"ہوائی" بم	۲۲۰ روپے
ایک بڑا بحری جہاز	۸۴۰۰۰۰۰۰ روپے
کروزر	۳۰۸۰۰۰۰۰ روپے
طیارہ بردار جہاز	۵۳۲۰۰۰۰۰ روپے
محافظ جہاز	۵۵۰۰۰۰۰ روپے
سرنگوں سے راستہ صاف کرنے والے جہاز	۸۰۰۰۰۰ روپے
تارپیڈو کشتی	۶۰۰۰۰۰ روپے

نازی سنیما

فرانس پر جرمنوں کا اثر و رسوخ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ مقبوضہ فرانس میں نازیوں نے بہت سی سینما کمپنیاں خرید لی ہیں ایک مشترکہ فرانسیسی جرمن فلم ساز کمپنی جس کے نگراں ڈاکٹر گوئبلز بتائے جاتے ہیں، اس غرض سے قائم کی گئی ہے کہ وہ ان سینماؤں سے اپنی جدید ضروریات کے مطابق کام لے۔

اس کمپنی نے پہلے پہل جو سات سینما ہاؤس مارسیلز، کینز اور سانٹمز میں خریدے اُن کی قیمت دو لاکھ چالیس ہزار پاؤنڈ ادا کی گئی۔

گولی کی رفتار

یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ بندوق کی گولی کی رفتار کتنی ہے؟ ایک اندازے کے مطابق بندوق کی نال کو چھوڑتے وقت گولی دو ہزار پانسو فٹ فی سیکنڈ یا سترہ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔ یہ رفتار آواز کی رفتار سے تیز ہے۔ اسی لئے نشانے تک آواز اُس وقت پہنچتی ہے جب گولی اپنا کام کر چکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اندازہ کہاں تک قابلِ اعتبار ہے؟ ایک چلتی ہوئی گولی کی رفتار کس طرح معلوم ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حال میں ایک ایسی برقی مشین ایجاد ہو چکی ہے جو اُس صورت میں بھی گولی کی رفتار کی مدت کا اندازہ کر سکتی ہے جب گولی کو صرف دس فٹ کے فاصلے پر پہنچنا ہو۔ یعنی یہ مشین اُس اڑان کا بھی صحیح حساب رکھ سکتی ہے جو صرف ۱/۲۵۰ سیکنڈ جاری رہے۔

یورپ کے خبطِ برتری کی سزا

موجودہ زمانے میں قومیت کی تعمیر کے متعلق دنیا کے بڑے بڑے سیاسی مفکروں کے اصول ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں کمیونزم، فاشزم اور نازی ازم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کمیونزم کا مقصد عوام کے لئے راحت اور دولت کا حاصل کرنا ہے۔ فاشزم سے قوم کی شوکت و عظمت کا دوبالا کرنا مقصود ہے اور نازی ازم سے قوم میں نسلی برتری اور فوقیت کا خیال پیدا کرنا مطلوب ہے۔ اب تک یورپین قوموں کا یہ خیال تھا کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں سے اعلیٰ اور افضل ہیں۔ مگر اب نازیوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وُہ یورپین قوموں میں بھی سب سے افضل ہیں۔ یورپین قوموں کو اپنے خبطِ برتری کی یہ بہت دلچسپ سزا ملی ہے۔

ٹیگور اور گاندھی

ڈاکٹر سید حسین نے جو ایک مشہور ہندوستانی اخبار نویس ہیں اور اب مستقل طور پر امریکا میں رہتے ہیں اپنی ایک تقریر میں ٹیگور کی نسبت یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "وُہ صرف ہندوستان ہی کے ملک الشعرا نہیں بلکہ ساری دنیا کے شاعرِ اعظم تھے۔ وسیع النظری، جبلی شرافت، بلند خیالی اور اولوالعزمی میں ان کی ہستی عدیم النظیر تھی"۔ جب گذشتہ مرتبہ ڈاکٹر صاحب ہندوستان تشریف لائے تو انہیں کلکتہ میں ٹیگور اور مہاتما گاندھی سے ملاقات کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب قدرتی طور پر ہندوستان کی ان دو بڑی شخصیتوں کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ فرماتے ہیں ہندوستان کے ان دو بڑے آدمیوں نے اپنے اپنے حلقوں میں ایک ایسے زمانے میں جبکہ ہندوستان سیاسی غلامی اور معاشرتی پستی کی خرابیوں میں مبتلا تھا اتنا بڑا کام کیا ہے کہ بیرونی دنیا میں ہندوستان کی عزت بڑھ گئی ہے۔ اس کام میں ہندوستان کا کوئی شخص یا کوئی جماعت ان کا مقابلہ

نہیں کرسکتی۔ انہوں نے قومی تعمیر اور قومی اصلاح کے معاملے میں روحانی طاقت سے کام لیا ہے۔ گاندھی ایک درویش صفت آدمی ہے اور ٹیگور صوفی گاندھی عملی آدمی ہے اور ٹیگور شاعر۔ گاندھی خدا کی دکھ اٹھانے والی مخلوق کے رنج والم سے متاثر ہو کر اپنی باطنی طاقت حاصل کر لیتا ہے اور ٹیگور اس دکھیا سنسار کو محبت اور راحت کے راگ سناتا ہے۔ گاندھی نفس کشی اور قربانی کی شکل میں اپنا فرض ادا کرتا ہے اور ٹیگور اس کائنات کے حسین اور روح افزا مناظر میں مصیبت بھری دنیا کو زندگی کا خوش گوار پہلو دکھاتا ہے۔ دونوں نے روحانیت کے اعلیٰ تخیل کی اُن روایات کو برقرار رکھا ہے جن کی بدولت ہندوستان کا نام روشن ہے۔

کیلے کی غذائیت

کیلا بجائے خود ایک مکمل غذا ہے۔ یہ نہ صرف اپنی غذائیت کے لحاظ سے بلکہ جسم میں مدافعتِ امراض کی قابلیت پیدا کرنے کے لحاظ سے بھی بہت اہم تسلیم کیا گیا ہے۔ کیلے کی حیاتینیں اور اس کے معدنی اجزا جسم کے لئے بہت مفید ہیں۔

کیلے میں حیاتین (A) جو جسم میں متعدی امراض سے بچنے کی قوت پیدا کرتی ہے اور حیاتین B (یا G) جو ہاضمے کے لئے مفید ہے اور Pellagra[1] سے بچاتی ہے دونوں کافی مقدار میں موجود ہیں۔ اسی طرح حیاتین C کی بھی اس میں کافی مقدار ہے جو ہڈیوں اور پٹھوں کی نشوونما میں بہت مدد دیتی ہے۔

کیلے میں پوٹاسیم اور کیلسیم نمکوں کی کثرت ہے۔ یہ نمک نہایت طاقت بخش ہوتے ہیں اور چونکہ ان میں کھار ہوتا ہے اور نتیجۃً ان سے غذا کو جزو بدن بننے میں مدد ملتی ہے اس لئے کیلا بہت معتدل اور قابلِ اعتماد خوراک ہے۔ کیلا حرارتِ غریزی پیدا کرنے کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔ اس لحاظ سے چار کیلے اعلیٰ قسم کے گندم کے آدھ سیر آٹے کی روٹی کے برابر ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی آبادی

نئی مردم شماری کے مطابق یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو ہندوستان کی کل آبادی ۳۸۸۸۰۰۰۰۰ تھی۔ اس تعداد میں ۴۷۳۲۲۰۰۰۰ افراد خواندہ ہیں۔ گزشتہ مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۳۳۸۰۰۰۰۰۰ تھی۔ گویا نئی مردم شماری کے مطابق کل آبادی میں ۱۵ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔ ایک لاکھ یا اس سے زائد آبادی والے شہروں میں اضافۂ آبادی خاص طور پر نمایاں ہے۔ بڑے صوبوں میں سے صوبۂ سرحد کی آبادی میں سب سے زیادہ یعنی ۲۵ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے بعد بنگال کا درجہ ہے جہاں کل آبادی میں ۲۰ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔ بنگال میں خواندہ افراد کی تعداد سب سے زیادہ یعنی ۹۷۲۰۰۰۰۰ ہے۔ خواندگی میں مدراس دوسرے درجے پر ہے۔ جہاں خواندہ افراد کی تعداد ۴۴۲۰۰۰۰۰ ہے۔

حامد علی خاں

[1] لباردی مرض۔ اس میں جلد پھٹ جاتی ہے اور آخر میں عموماً دیوانگی نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ مرض لباردی کے علاقے میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے اس نام سے موسوم ہوا۔

مسئلۂ اخلاق اور سائنس

انسانی سماج کے ہر مرحلے میں ایک مدرون نفسی قوت انسان کو مسلسل یہ بتاتی ہے کہ اس کے لئے اخلاقاً جائز کیا ہے اور ناجائز کیا اور یہ کہ وہ کب کسی خواہش کو بجا طور پر پورا کر سکتا ہے اور کب نہیں۔ یہ ایک باطنی آواز ہے ——— ایک تحکّم پسند اور عالی شان باطنی آواز جو ہماری فطرت کی گہرائیوں سے بلند ہوتی ہے۔ اسے ضمیر کہا جاتا ہے۔ ارسطو نے اسے روح کی آنکھ کہا ہے جس کے ذریعہ کردار کے اصولوں کا ادراک ہوتا ہے۔ اس کی تعریف ابیلاردنے یہ کی ہے کہ وُہ خیر و شر میں تمیز کرنے کا ملکہ ہے (بعد میں شافٹسبری اور ہچسین نے اسی تعریف کو اختیار کیا) اور بٹلر نے یہ کہ وُہ افعال کو پسند یا ناپسند کرنے کی قوت ہے یہ ضمیر ہی ہے جو ایک متمدن نوجوان سے یہ کہتا ہے کہ جھوٹ بولنا بہت بُری بات ہے اور یہ ضمیر ہی ہے جو آسٹریلیا کے ایک غیر متمدن نوجوان سے یہ کہتا ہے کہ رسوم داخلہ کے دوران میں بے حد بھوکا ہونے اور بڑے بوڑھوں کے ذریعہ پکڑے جانے اور سزا پانے کے خوف سے آزاد ہونے پر بھی مادہ ابوسم کو کھانا نادرست ہے ضمیر کے احکام واجب ہوتے ہیں۔ اس مظہر کے بارے میں بعض کا یہ خیال ہے کہ ضمیر خدا کے احکام کی گونج ہے دوسرے جنہیں آسمان سے اتنی دل چسپی نہیں جتنی زمین سے ہے یہ کہتے ہیں کہ اخلاقی قانون انسانوں کا بنایا ہوا ہے۔ وہ بعض اغراض کے تحت بنا ہے اور اس کا نفاذ ان اغراض کے ادراک اور ان پر روایاتی یا معاشرتی اصرار کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔ یوں ضمیر انسانوں کے شخصی اور معاشرتی اغراض سے تعلق رکھتا ہے اور یہی اس کے احکام کے وجوب کی وجہ ہے اخلاقاً درست کام کرنے اور نادرست کام نہ کرنے کی قوت ارادہ کہلاتی ہے۔ وہ روایتہً آزاد ہے اور یہ "اختیار" ہی کی بدولت ہے کہ متمدن نوجوان جھوٹ بولنے سے اور غیر متمدن نوجوان مادہ ابوسم کے کھانے سے احتراز کرتا ہے۔ فاعلِ اخلاقی ضمیر کے احکام پر غور و خوض کرتا اور ان کی متابعت کر سکتا یا نہیں کر سکتا ہے۔ متابعت پر اطمینان اور نامتابعت پر شرم یا پشیمانی کا احساس ہوتا ہے۔ بالارادہ اخلاقاً درست کام کرنے یا نادرست کام نہ کرنے یعنی ضمیر کے احکام کی پابندی پر ایک باطنی محرک ہمیں اُکساتا ہے۔ وہ خواہش ہے اخلاقی کردار کے کسی پسندیدہ نتیجے کے حصول کی۔ یہ پسندیدہ نتیجہ اصطلاحاً خیر یا خیر برترین (Summum Bonum) کہلاتا ہے۔ جھوٹ بولنے اور مادہ ابوسم کے کھانے سے پرہیز کرنے کا مقصود خیر برترین کا حصول ہے۔ یہ خیر برترین کیا ہے؟ کوئی کہتا ہے خدا کی معرفت، کوئی کہتا ہے حسن سے لطف اندوزی، کوئی کہتا ہے مسرت، کوئی کہتا ہے فرض، کوئی کہتا ہے تکمیلِ نفس، وغیرہ۔ خالص فلسفیانہ دائرہ میں یونانی فلسفیوں نے بالاتفاق مسرت کو خیر برترین مانا ہے البتہ اس کی تعبیریں انہوں نے مختلف کی ہیں۔ مثلاً فضیلت (سقراط، فلاطون، ارسطو، زینو) لذت (ارسٹپس، ابی قور) وغیرہ۔ دی کارٹ اور لائب نز بھی مسرت کو خیر برترین تسلیم کرتے ہیں مگر اپنے تصور میں انہوں نے ابی قور اور زینو کو ملا دیا ہے۔ ہوبز، ہیلوتے تیوس، اسپنوزا، لاک، بنتھم، ہیوم، مل، سجوک، مُور وغیرہ افادیت کے قائل ہیں۔ فرض کو خیر برترین باور کرنے والوں میں کانٹ، کومِن، لیسنز، دنڈل بینڈ، رکرٹ، نیلسن وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں اور ہیگل، گرین، بریڈلے وغیرہ تکمیلِ نفس کو خیر برترین قرار دیتے ہیں۔ اس دبستانِ خیال میں جو "افادہ" کو اہمیت دیتا ہے اس مسئلہ پر کہ ہم مسرت کس لئے تلاش کرتے ہیں لوگ نمایاں طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں ہوبز کی طرح بہتیرے ماہرانِ اخلاق کا فتویٰ یہ ہے کہ انسان کو صرف اپنی ہی فکر ہے اپنے ذاتی فائدہ ہی کا خیال ہے۔ اور اس چیز کو وُہ حسب موقع سادہ اور درست یا پیچیدہ اور بالواسطہ

طریقوں سے حاصل کرتا ہے۔ بے لوث سے بے لوث اچھا کام بھی خود غرضی کے شائبہ سے پاک نہیں۔ منفعت اور شخصی مسرت کی خواہش ہمارے تمام افعال کی قوتِ محرکہ ہے برخلاف اس کے مخالف دبستان (جس کی نمائندگی شافتسبری، ہیوم، ایڈم اسمتھ، مِل وغیرہ کرتے ہیں) کی تعلیم یہ ہے کہ عاملِ اخلاقی کے پیشِ نظر ہر وقت دوسروں کی مسرت ہوتی ہے اپنی نہیں۔ اس طرح ہماری سرشت ہی میں یہ بات داخل ہے کہ ہم سدا دوسروں کا خیال رکھیں اور یہ اہتمام کریں کہ کہیں "ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"۔ ان احساسات سے ایک خیال تشکیل پاتا ہے جو ہمارے کردار پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن کانٹ کا پُرشکوہ فیصلہ یہ ہے کہ اپنی یا دوسروں کی بھلائی کی نیت سے جو بھی کام کیا جائے وہ اخلاقاً درست نہیں۔ اخلاقاً درست کام وہ ہے جو فرض کے احساس کے تحت انجام پائے خواہ اس سے کسی کو تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے۔

اس طرح فلسفۂ اخلاق دو اجزاء پر مشتمل ہے (۱) پہلا جزو ضابطۂ اخلاق ہے یعنی کردار کے قاعدے جو بیشتر سلبی ہوتے ہیں۔ ضمیر جو ان خارجی قاعدوں کی داخلی شکل ہے ان کی تعمیل کو کہتا ہے اور ارادہ انہیں عمل پذیر کرتا ہے اور (۲) دوسرا جزو مصداقِ خیر کا تعین ہے۔ خیر اخلاقیات کی بیخ و بن ہے۔ اخلاقی کردار اسی کو ترقی دیتا ہے لہذا پہلے اسی سے بحث کرنی چاہیئے

قدر کا تصور اور اس کی تحلیل

خیر سے وہ چیز مراد ہے جسے ہم اس کی اپنی خاطر پسند کرتے ہیں۔ اور اس کے عواقب کا لحاظ کئے بغیر پسند کرتے ہیں۔ یوں ہمارے سامنے دراصل مسئلہ قدر کا ہے جسے اگر ہم سمجھ لیں تو بہت سی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔

قدر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے ہمیں دلچسپی ہوتی ہے۔ بیشتر چیزوں کی ہم قدر اس لئے کرتے ہیں کہ وہ بعض دل پسند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں مثلاً صحت کہ وہ پسندیدہ اس لئے ہے کہ زندگی سے کما حقہٗ لطف اُٹھایا جائے یا ثروت کہ وہ مرغوب اس لئے ہے کہ آرام اور وقعت یا تحسین حاصل ہو مگر بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی ہم قدر ان کی اپنی خاطر کرتے ہیں یعنی وہ بجائے خود دل پسند مقاصد ہوتے ہیں۔ اسی لئے انہیں بنیادی اقدار کہا جاتا ہے۔

بعض قدری فلسفی (مثلاً میونسٹربرگ، وِنڈل بینڈ، رِکرٹ، میئر وغیرہ) اقدار کو حقیقت کی ترتیبی اصل اور فلسفیانہ فکر کا خاص مبحث قرار دیتے ہیں حقیقت سے اقدار کے رشتہ پر آئندہ سطروں میں نظر ڈالی جائے گی فی الوقت یہ کہنا کافی ہے کہ صرف سائنس ہی واقعات سے سروکار نہیں رکھتی فلسفہ بھی بہ حیثیت سائنسوں کا سرچشمہ ہونے کے ایک نظری علم ہے یعنی واقعات سے بحث کرتا، حق کو مقصود جانتا اور ایک حد تک سائنس ہی کے طریقے استعمال کرتا ہے وہ کبھی ان قدری نظریہ سازوں کے جھانسے میں آکر بنیادی اقدار کو بطور بدل کے قبول نہیں کرے گا۔ بلا شبہ فلسفہ سائنس کی طرح تدریجی اور تجربی نہیں (اچھا ہوتا اگر وہ ایسا ہوتا) وہ حوصلہ مند ہے اور ایک مکمل اور مربوط تصویرِ کائنات پیش کرتا ہے مگر واقعات کی تعبیریں واقعات اور مشاہدات کو خارج یا دفع نہیں کرتیں۔ لہذا شخصیت، تہذیب، اور معیار فلسفہ کا جزو ہو سکتے ہیں کل نہیں۔

وائٹ ہیڈ نے یورپی فلسفیانہ روایت کو افلاطونی فلسفہ کا حاشیہ کہا ہے اور یہ خیال اس کا قدریات (Axiology) کے بارے میں تو بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ رائس نے قدری فلسفیوں پر یہ بالکل بجا اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے اپنے پس منظر کی شاندار ادبی افلاطونی روایت

[اشارہ ہے مثالی اعیان کی طرف جس کی رو سے اشیائے محسوس یا مظاہر میں جتنی حقیقت ملتی ہے اعیان کے سبب ملتی ہے۔ یہ اعیان انسانی سعی کی منزلِ مقصود اور علم کا موضوع ہیں ان میں حق، جمال، اور خیر کے اعیان کو خاص اہمیت اور امتیاز حاصل ہے افلاطون ان کا ذکر بڑے احترام اور انتہائی صوفیانہ اور استعاری زبان میں کرتا ہے وہ ان کے علم کے لئے روح کی خاص تربیت کی ضرورت پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ روح جب ان اعیان کا — جو غیر ذہنی ہیں — مشاہدہ کرتی ہے تو "چاہئے" پیدا اور منتج ہوتا ہے] کے علی الرغم محض منطقی امکانات کو چپکے سے بنیادی واقعیت میں تبدیل کر دیا اور نتیجۂ بالکل ناروا طور پر حقیقت کو ذہن کی چالاکی سے پیدا کیا۔ پرانی افلاطونی روایت اور نئے فلسفۂ قدر میں فرق صرف کیفیت کے درجہ اور ترتیب کا ہے اور بعض قدری فلسفی خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے نظریات میں لفظ کے سوا نئی کوئی چیز نہیں اور یہ کہ وہ ایک بڑی فلسفیانہ روایت کو نئے انداز سے پیش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں بعض اہم مسائل پر سرسری طور سے نظر کرنا ضروری ہے (۱) یہ کہ اقدار کتنی اور کونسی ہیں؟ (۲) یہ کہ قدر کا ایک عام نظریہ ممکن بھی ہے؟ (۳) یہ کہ کیا قدر حقیقت کی ماہیت کی کلید ہے؛ اور (۴) یہ کہ اس کی ماہیت کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ بنیادی اقدار تین ہیں حق، جمال، اور خیر۔ مذہب کا تعلق انہیں کی بقاء سے ہے۔ اس کے لئے کسی زاید قدر "عظمت" کی کوئی ضرورت نہیں لیکن جمال اور خیر کے ساتھ حق کو جگہ دینا میں (بہتوں کی طرح) سمجھتا ہوں کہ ایک غلطی ہے۔ ارسطو کی مابعد الطبیعیات کے متعلق ریولیسن لکھتا ہے کہ وہ یہ مانتا تھا کہ "شعری اور عملی علوم اشیاء کے اس پہلو سے بحث کرتے ہیں جو ان کی اصلیت سے مختلف ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ علوم کم و بیش ہمارے ارادہ پر منحصر ہوتے ہیں اور نظری علوم اس پہلو کو لیتے ہیں جو کم سے کم اپنی بنیادوں کے اعتبار سے ضروری ہوتا ہے اور جس کو کم و بیش کرنے کا ارادے کو مطلق اختیار نہیں ہوتا" بالفاظِ دیگر یہ کہ صحیح بیان واقعہ کا بیان ہے اور واقعہ معروضی ہے نفسی حالت یا شخصی معاملہ نہیں مثل شعر یا جمال یا عملِ نیک کی طرف ہمارے ردِّ عمل کے۔ تثلیث کے ایک اقنوم کے اس طرح گر جانے کے بعد جمال اور خیر کو قدر کے تصوّر کے تحت جمع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے واضح اختلافات کی تہ میں ایک بنیادی ہے بناوٹ وحدت ہو صرف اسی وقت ایک عام نظریہ قدر کا ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بنیادی بے بناوٹ وحدت اقدار کو صفات قرار دینے سے حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اقدار ایسی صفات نہیں جو ہم سے بالکل علیحدہ خارجی طبیعی شیأ میں بالاستقلال پائی جائیں یا جو تعینات، خواہشات، جذبات، طلبات وغیرہ سے مختلف داخلی خصوصیت رکھتی ہوں۔ اگر انسان صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائے (مثلاً بڑے پیمانہ پر زہریلی گیس کے استعمال اور بمباری یا کسی فطری حادثہ سے) تو اخلاق اور فنونِ لطیفہ کا کوئی مفہوم نہ رہے گا۔ اقدار دراصل نفسیاتی خواص ہیں جنہیں فرد اپنی دلچسپی کی چیزوں کی طرف محوّل کرتا ہے اور وہ موضوعی یا ذہنی ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں صفاتِ ثانوی کو موضوعی یا ذہنی کہا جاتا ہے بلکہ صحیح معنوں میں موضوعی یا ذہنی یعنی ذہن کی اور ذہن کے لئے ہوں تبھی ایک عام نظریۂ قدر ممکن ہے۔

لیکن اگر قدر ذہن کی فعلیت ہو تو اسے کسی طرح حقیقت کی ماہیت کی کلید نہیں قرار دیا جا سکتا اور پھر یوں بھی اقدار کی معروضیت کے قائل (اگر اپنے اصولوں کے وفادار ہیں تو) اس سے انکار نہیں کریں گے کہ دنیا میں اقدار کے ساتھ ان کی اضداد (سلبی اقدار) بھی ملتی ہیں جو مساوی طور پر ایجابی ہیں۔ خیر اور جمال کی طرح شر اور قبح کو بھی اشیاء کے نظام میں ایک مستقل مقام کا ملنا ضروری ہے۔ اب یہ کہنا کہ حقیقت میں صرف جمال اور خیر کو ہی اصل ہے شر اور قبح کی گنجائش نہیں ہماری خواہشات کی ایک بے جا رعایت ہے۔ گلاب کا پھول کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو اپنے پہلو

کے کانٹے سے زیادہ حقیقی نہیں صرف پھول کو دیکھنا اور کانٹے کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا نہیں چاہئے۔ دوسرے یہ کہ گو اقدار ارتقاء کی پیداوار ہیں
عالم کی تاریخی اسکیم میں ایک منصب ایک مقام رکھتے ہیں اور مزید ترقی کی سمت اور راہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے
کہ جہاں اقدار پائی جاتی ہیں وہاں ہمیں ایک زیادہ مؤثر اور عمیق وجود ملتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہم اقدار کو یہ اہمیت دیں، دنیا کو رنگین چشموں سے دیکھیں۔

قدر واقعہ نہیں۔ لہٰذا وہ کوئی مرکزی مابعد الطبیعی تصور نہیں۔ جب ہم کسی چیز کو قابلِ قدر قرار دیتے ہیں تو ہمیں ایک ذہنی تجربہ (ایک جذبی
اور طلبی تجربہ) ہوتا ہے۔ جسے واقعہ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور جو اس اعتبار سے اِدراک سے مختلف ہے۔ اسے اصطلاحاً پسندیدگی یا تعیّن
قدر کا عمل کہا جاتا ہے۔ اس میں خواہش بطور ایک اہم اور بنیادی جزو کے شامل ہوتی ہے اور وہ لذت جو ہمیں اس کے ساتھ ملتی ہے اسی اہم اور بنیادی جزو کی تکمیل کا نتیجہ
ہے مگر یہ خواہش نفسی طور پر اندھی نہیں ہوتی۔ کسی بقائی ضرورت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ تمیز یافتہ ہوتی ہے اور شخصی ہوتی ہے۔ یوں اقدار موضوعی اور اضافی ہیں وہ حقایق یا نیم حقایق
نہیں بلکہ یکسر ذہنی مصنوعات ہیں اسی لئے ٹرویلٹش اقدار کے ایک مستقل، غیر تاریخی، اور مجرد معیار کی دریافت کو سعیٔ لاحاصل کہتا ہے اور
اسی لئے لائب مان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ "قدرِ مطلق" لغویت ہے۔ اقدار کی معروضیت اور مطلقیت کا سارا تصور ایک التباس ہے
ایک اصطلاحی غلط بیانی ہے ایک قسم کا مینڈک کا فلسفہ ہے۔

اقدار کی موضوعیت اور اضافیت کا یقین بے حد عام اور عالمگیر ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اقدار کا اختلاف خواہشات کا اختلاف ہے۔
اور خواہشات کا اختلاف ظاہر ہے کہ صحت اور خطا یعنی علم کے دائرہ سے باہر ہے یعنی ان کے بارے میں مجادلہ ہو سکتا ہے مباحثہ نہیں ہو سکتا۔
اس لئے کہ عقلی بحث شہادت کو مستلزم ہے جس کا اقدار کے بارے میں مکمل فقدان ہوتا ہے لہٰذا واحد طریق کار یہ ہے کہ لڑنے والے رنگروٹوں
کو زیادہ سے زیادہ بھرتی کریں۔

اور اس تحلیل کا انطباق جمال اور خیر پر ————

زیادہ صاف طور پر یہ کہ جمال اور خیر صفاتِ ثالثہ نہیں جیسا کہ الیگزینڈر انہیں کہتا ہے۔ وہ ہماری خواہشات کے اظہار ہیں۔ جب
ہم کسی چیز کو خوبصورت یا اچھا کہتے ہیں تو اس سے مطلب یہ نہیں ہوتا کہ خوبصورتی یا اچھائی مربعیت یا رنگ جیسی کوئی صفت ہے جس کا
ہم ادراک کرتے ہیں اور جو کوئی ذہنِ مُدرک موجود نہ ہو تب بھی بدستور یا محلِ احساس کی حیثیت میں باقی رہتی ہے۔ فہمِ عامہ صحت پر ہے
جب یہ کہتی ہے کہ نقاشی اور بت تراشی کے کارنامے خاموش رُوحانی پیغام دیتے ہیں جب کہ تصویر خانے کھلے ہوتے ہیں، اور کوئی پیغام نہیں
دیتے جب کہ یہ عمارتیں بند ہو جاتی ہیں اصل میں کسی چیز کو خوبصورت یا اچھا کہنے سے ہماری مراد بس اور صرف یہ ہوتی ہے کہ ہم اس چیز کو خوبصورت
یا اچھا پاتے ہیں یعنی تسکین بخش اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اسے ایسا ہی سمجھیں۔ اس موضوعیت کی مثالیں جمالیات اور اخلاقیات دونوں میں
بہت ملتی ہیں تصاویر سے سب یکساں لطف اندوز نہیں ہوتے۔ ایک شخص یا شے کو ایک دل کش پاتا ہے اور دوسرا اس میں کوئی جاذبیت محسوس
نہیں کرتا کلوپیٹرا کا حسن مارک انٹونی اور آگسٹس سیزر پر یکساں اثر نہیں کرتا۔ لیلیٰ کو چشمِ مجنوں سے دیکھنے کی شرط یہ ظاہر کرتی ہے کہ
دوسروں کو اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حقیقت میں کوئی حُسن "عالم آشوب" نہیں۔ ایسی ترکیبیں ایک فرد یا جماعت کی خواہشات

کو خیر دیچی عموم عطا کرنے کی کوششیں ہیں یا پھر وہ اپیلیں ہیں زیادہ کمزور پبلک سے کہ مؤخر الذکر کسی کی ذات میں وہی کشش پاتے جو کہ دلچسپی رکھنے والے پاتے ہیں۔ کانٹ تاروں بھری رات کو ایک حسین منظر خیال کرتا ہے لیکن کارلائل ایسی رات کو ایک دردناک نظارہ قرار دیتا ہے اسی طرح شام کی عظیم خاموشی اور لالہ گوں شفق میں شاعر حسنِ فطرت کا مشاہدہ کرتا اور اپنی روح میں ایک لذت ایک سُرور، ایک کیفیتِ ابتہاج پاتا ہے لیکن ہارڈی ملول اور محزون ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے قریب سے ایک پرندہ کی چیخ سنائی دیتی ہے جیسے اُلّو نے دبوچ لیا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک شخص کو ایک چیز ایک وقت حسین اور پرمعنی نظر آتی ہے اور دوسرے وقت سپاٹ اور بے معنی۔ اور اخلاقیات کے اکھاڑے میں جتنے نظریہ ساز باہم گتھم گتھا ہو رہے ہیں اتنے ہی دنیا میں خیر ہیں۔ یہ متعدد خیر اُن متعدد فلسفیوں کی خواہشوں کے عکس ہیں جو ان کی وکالت کرتے ہیں۔ جو یہ چاہتے ہیں کہ نوعِ انسان مسرور ہو انہوں نے اپنی افتادِ طبع کے مطابق فضیلت (سقراط، زینو وغیرہ)، غور و خوض (ارسطو وغیرہ)، لذت (ارسٹپس، ابی قور، ہوبز، لاک، بنتھم، ہیوم، مل، سجوک وغیرہ)، یا لذت اور حکمت کے مرکب (افلاطون وغیرہ) کو خیر قرار دیا ہے جن کی یہ دلی آرزو ہے کہ نوعِ انسان سخت کوش ہو انہوں نے ریاضت کو خیر کہا ہے (ابن ٹس تھی نز، دیوجانس کلبی وغیرہ) جنہیں یہ پسند ہے کہ نوعِ انسان نیک اور مذہب پرست ہو انہوں نے اپنے رجحان کے بموجب ایثار (شافٹسبری، ہچیسن وغیرہ) احسان (بٹلر وغیرہ)، ہمدردی (ایڈم اسمتھ وغیرہ)، معرفتِ باری (الہٰیئین)، فرض (کانٹ وغیرہ)، یا عزم للیقین (ولیم جیمز وغیرہ) کو خیر مقرر کیا ہے۔ جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ نوعِ انسان پُرسکون اور مطمئن زندگی گذارے انہوں نے شک اور بے ہمگی (پرہو وغیرہ) یا تیاگ (شوپن ہائر وغیرہ) کو خیر باور کرایا ہے جن کی یہ قوی خواہش ہے کہ نوعِ انسان جنگجو اور صحت مند ہو انہوں نے "عزم للقوت" (نطشے وغیرہ) یا اثباتِ خودی (اقبال وغیرہ) کو خیر فرمایا ہے۔ جنہیں یہ مرغوب ہے کہ نوعِ انسان مرفہ الحال ہو انہوں نے "عمل" (برگسان وغیرہ) کو خیر تجویز کیا ہے۔ اور جن کی یہ زبردست تمنا ہے کہ نوعِ انسان ہوش مند اور سربسبز ہو انہوں نے "عزم للشک" (رسل وغیرہ) کو خیر مانا ہے جب ایک مرتبہ کسی چیز کو خیر متعین کر دیا جاتا ہے۔ تو پوری اخلاقیات خود بخود منتج ہو جاتی ہے۔

یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ ہماری تمام خواہشیں یکسر شخصی نہیں ہوتیں۔ بعض زیادہ عام ہوتی ہیں یعنی ایسی جن میں ہم زیادہ اشخاص کے ساتھ شریک ہوتے ہیں یہ زیادہ عام خواہشیں کم خود مطلب ہوتی ہیں۔ یہ ایک واقعہ ایک بدیہی امر ہے جس کے بیشتر فلسفی اور نفسیات داں مُقِر ہیں اسی لئے ان خواہشوں کو لاشخصی کہا جاتا ہے ایک حسن کار اپنے "تصور" کے ذریعہ "مادہ" میں نفوذ کرتا اور اسے مُظہر، محرّکِ خیال، اور پیام دہ بناتا ہے۔ تصور کا یہ کامیاب ارتسام وہ چیز ہے جسے "عام چیزوں میں چھپی ہوئی پرمعنی شکل کو دیکھنے" یا "کسی صورت حال میں اپنے ساتھیوں سے زیادہ ادراک کرنے" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ متصورہ کسی "خواہش" کی تجسیم ہوتا ہے اور اس خواہش میں اگر ہم حسن کار کے ساتھ شریک ہوتے ہیں تو اس کے کارنامہ میں ہمیں ناگزیری، صحت، موزونی اور مانوسیت "کا احساس ہوتا ہے اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس خواہش میں اگر ہم حسن کار کے ساتھ شریک نہیں ہوتے تو اس کے کارنامہ سے غیر متاثر رہتے ہیں۔ خواہش کو جمالیاتی شکل میں پیش کرنے کے لئے ضرورت، ماحول، تربیت، مہارت، اور تخیل کی ہے۔ حسن کار کی فطرت میں کوئی چیز پراسرار یا قبل از وقت نشو و نما یافتہ نہیں ہوتی جو اسے عام سطحِ انسانی سے بلند کرے۔ اس کا نیضان اسے کسی ملکوتی قوت کے ذریعہ آسمان سے نہیں ملتا بلکہ معمولی انسانی حواس اور قوی کے ذریعہ اس کے اپنے گرد و پیش اور نفس سے ملتا ہے۔ تحسین میں ہم اس کے تصور کو پڑھتے ہیں اور اگر اس کی خواہش ہم سے اپیل کرتی

ہے یا زیادہ صحیح طور پر یہ کہ ہم میں اپنے مثل کو دریافت کرتی اور اسے پالیتی ہے تو ہم اس کے ساتھ ایک برادری بناتے ہیں۔ لیکن تصورؔ کو پڑھنے کے لئے پُر معنی علامتوں، مفاہمتوں وغیرہ سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے جمالیاتی احساس جو خواہش کی زمین پر دیگر عناصر کے بیچ سے اُبھرا ہوا کمزور پودا ہے تعلیم اور موزوں ماحول کو مستلزم ہے ذوق میں صفائی، گہرائی، اور مرتکزیت تعلیم و تربیت سے پیدا ہوتی ہے اور ماحول روح کے بروز میں مؤثر حصہ لیتا ہے ساتھی صناعوں کا طبقہ تو خیر بعد کی زندگی میں ایک ساز گار فضا، ایک قوی مہیج، اور ایک بلند معیار مہیا کرتا ہے لیکن اس سے قبل بچپن میں اگر کسی شخص کی حسین گردو پیش میں پرورش ہو تو اس کا مذاق بلند اور ستھرا ہوگا اسی کے ساتھ ممارست بے حد ضروری ہے ذوق ایک تدریجی نظام ہے جس میں بلند سے بلند تر رتبہ مسلسل آگے بڑھتے رہنے سے ملتا ہے اور پست سے پست تر درجہ میں ہم آسانی سے گر جا سکتے ہیں اگر کافی ہونے کا احساس زنجیر پا بن جائے اگر ہم رک جائیں۔

اسی طرح اخلاقیاتی فلسفی اپنی کسی قوی لیکن عام اور (اسی نسبت سے) کم خود غرض خواہش کو جو مفادِ عامہ سے متصادم نہیں ہوتی اور بنا بریں عام ناراضی یا شدید ردِ عمل سے محفوظ ہوتی ہے ہمہ گیری عطا کرنی چاہتا ہے اپنی اس کوشش میں وہ سب سے کم اس راستہ پر چل پڑتا ہے جس سے ہو کر فلاطون، کونگ فوتزے، مسارییک وغیرہ گذرے ہیں یعنی حکومت کے زور سے اپنے نصب العینوں کو صورت پذیر کرتا ہے اور سب سے زیادہ ہمارے جذبات سے اپیل کر کے ہم میں وہی خواہش پیدا یا بیدار کر لیتا ہے۔ اخلاقیاتی نظریہ کا تنوع اور فیضان مفکر کو اپنے ماحول، اپنے رجحان، اور اپنی تربیت سے ملتا ہے۔ کانٹ نے پیوری ٹنوں میں پرورش پائی اور اگرچہ ان کے مذہبی عقائد کا وہ قائل نہ تھا تاہم ان کے کٹر اخلاقی نصب العین کو مدت العمر تاروں بھرے آسمان کی طرح مؤثر، شاندار، اور دلکش یاد کرتا رہا۔

مختصر یہ کہ خیر کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے سائنس اور عقل کبھی حل نہیں کر سکتے۔ خواہشات صحیح یا غلط نہیں ہوتیں اور نہ وہ معقول یا نامعقول ہی ہوتی ہیں علم چونکہ مشاہدہ اور استقراء کے سوائے کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا لہذا ہم یہ کبھی نہیں جان سکتے کہ خیر حقیقت میں ہے کیا۔ لیکن اخلاقیات کے پہلے جز یعنی اخلاقی کردار اور اس کے متضمنات سے عقلی اور سائنسی طریقوں کے ذریعہ بحث کی جا سکتی ہے۔

اخلاق اور ٹبو

کردار کے قاعدے بیشتر سلبی ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ مت کرو وہ مت کرو وغیرہ۔ اپنی اس خصوصیت کی بدولت وہ غیر متمدنوں کے ٹبوؤں سے مؤثر طور پر مشابہ ہیں۔ لیکن یہ مشابہت سطحی اور اتفاقی نہیں۔ وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کردار کے قاعدے ٹبوؤں کی ترقی یافتہ شکل ہیں، ان کا تسلسل ہیں۔ ٹبو نام ہے ایک نظام احترازات کا جو دنیا کے جملہ وحشی اقوام اور قبائل میں پایا جاتا ہے۔ ٹبو قرار دی ہوئی ہستی، شئے، جگہ، یا حرکت کو فریزر نے بجلی کی قوت سے بھرے ہوئے تار سے تشبیہ دی ہے اور واقعی خوب تشبیہ دی ہے۔ بجلی کے ایسے تار کی طرح ٹبو قرار دی ہوئی ہستی، شئے، جگہ، یا حرکت خطرناک بھی ہوتی ہے اور فائدہ بخش بھی۔ خطرناک اس وقت جب کہ کوئی اسے چھونے یا کرنے کی جرأت کرے اور فائدہ بخش اس وقت جب کہ اس سے دور یا بازر ہے۔ ٹبو کی شکست کے خطرناک عواقب کا خوف غیر متمدن ذہن میں اتنا شدید اور عمیق ہوتا ہے کہ کوئی اس کا خیال بھی نہیں کر سکتا کم از کم نظری طور پر تو سختی سے نہیں عمل میں اگر کبھی کوئی ایسی حرکت صادر ہو تو ناپسندیدہ

عواقب سے بچنے کے لئے بعض طریقے اختیار کئے جاتے ہیں مثلاً تطہیر کی رسوم جو عموماً پانی سے دھونے پر مشتمل ہوتی ہیں نفسی تحلیلی ادب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض عصبی مریض نہایت دیانت کے ساتھ ٹیبو کے نظام کو دہراتے ہیں۔ بنا بریں ان میں اور غیر متمدنوں میں ذہنیت کی یکسانی پائی جاتی ہے مگر ایک فرق نمایاں اور اہم ہے جہاں اوّل الذکر کو اپنے ٹیبو آپ ایجاد کرنے پڑتے ہیں وہاں مؤخر الذکر کو ان کے ٹیبو تیار ملتے ہیں۔

گروہِ اوّلیں سے متعلق فرائڈ کا نظریہ ٹیبو کے ارتقاء کی سب سے معقول اور جامع توجیہ ہے جو اب تک پیش ہو سکی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اوّلیں انسانی آبا گوریلوں کی طرح چھوٹے چھوٹے خاندانی حلقوں کے مالک ہوا کرتے تھے۔ وہ اپنی بیویوں، بیٹیوں، اور دوسرے خاندانی حلقوں سے چھینی ہوئی عورتوں کو صرف اپنے لئے مخصوص رکھتے تھے غالباً انسانی بچہ کی شیر خوارگی یعنی بے بسی اور ماں باپ پر انحصار کا زمانہ ان دنوں بہت مختصر تھا۔ نتیجتہً انائے ماورائی کا وجود نہ تھا اور باپ کا اقتدار صرف اس کی موجودگی اور قوت پر موقوف تھا۔ اس کے پسِ پشت اس کے بیٹے اپنے موقعوں سے فائدہ اٹھاتے تھے لیکن اگر وہ پکڑے جاتے تو انہیں مار ڈالا جاتا، آختہ کر دیا جاتا، یا نکال دیا جاتا تھا۔ یہ معاشرتی نظام ہزارہا سال برقرار رہا۔ جلا وطن بیٹے مصیبت کے ساتھی تھے کچھ دن مل کر رہتے کم چوکس گروہوں سے عورتیں چرا لاتے، اور آپس میں لڑ کر الگ الگ خاندان آباد کرتے تھے۔ جنسی جذبہ ایک انتشار آفریں عنصر ہے وہ لوگوں کو ملاتا نہیں بلکہ جُدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اصل گروہ میں ایک نہ ایک بیٹا باپ کی جگہ لینے میں کامیاب رہتا تھا۔ وہ سب سے چھوٹا بیٹا ہوتا تھا جسے ماں کی محبت باپ کی نگاہِ گرم سے بچا لیتی تھی اور جو باپ کی موت پر گروہ کا آقا بن بیٹھتا تھا۔ اکثر قصوں میں بڑے بیٹے یا بیٹوں کے اخراج اور چھوٹے بیٹے کی سرفرازی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ لیکن یہ نظام وحشیانہ قوت پر قائم تھا اور ان بیٹوں نے جنہیں نکال دیا جاتا تھا بغاوت کی ٹھانی۔ غالباً اس وقت انسان نے بات چیت کی بنیادوں کو نشو و نما دے لی تھی یعنی اشارات و حرکات کے ساتھ جذباتی شوروں کو مؤتلف کر چکا تھا۔ باغی بیٹوں نے باہم اتحاد کر کے باپ کو معزول یا قتل کر دیا۔ اور اس کا گوشت کھا گئے۔ اس "حرکتِ عظیم" کے بعد وہ آپس میں لڑ پڑے۔ ہر ایک باپ کی جگہ لینا چاہتا تھا مگر چونکہ ان میں سے کوئی بھی کافی طاقتور نہ تھا۔ لہذا ان کی لڑائیاں بے نتیجہ تھیں جرم سے متوقع تسکین کے حاصل نہ ہونے اور باپ کو جزوِ بدن کرنے سے انائے ماورائی کی نشوونما سہل ہو گئی۔ انہوں نے رفتہ رفتہ اپنے فعل پر پشیمانی سی محسوس کی اور چاہا کہ اسے بے اثر کر دیں۔ پھر انہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ آپس کی لڑائیاں بے سود بھی ہیں اور خطرناک بھی۔ لہذا انہوں نے اوّلاً کچھ دنوں کے لئے ان عورتوں کو ترک کر دیا جو "گناہِ اوّلیں" کا سبب اور صلہ تھیں۔ کسی قوی جانور کو جس سے پہلے ڈرا جاتا تھا باپ کا بدل قرار دیا اور اس کا احترام اور تحفظ کیا (ایسا انتخاب عجیب نہیں۔ وہ خلیج جو ہم متمدن انسانوں نے حیوان کے اور اپنے درمیان حائل کر لی ہے قدیم انسانوں، وحشیوں، اور ہمارے اپنے بچوں کے لئے موجود نہیں) اور باہمی واجبات اور مساوات کو تسلیم کیا۔ مگر "گناہِ اوّلیں" کے ان عواقب کی مدت مختصر تھی بھائی بہت جلد آپس میں لڑ پڑتے اور عفریتی خاندانوں میں بٹ جاتے تھے۔ اوّلیں گروہ اور بھائیوں کے جتھے کے درمیان یہ تبادلہ ہزارہا سال جاری رہا۔ آخر میں انائے ماورائی زیادہ قوی ہو گیا اس کی رکاوٹیں باپوں کی ممانعتوں سے زیادہ سخت اور جابر بن گئیں اوّلیں گروہ کا نظام مٹ گیا۔ بھائیوں کی برادری نے پائندار شکل اختیار کر لی۔ اس نظریہ کی تصدیق زگرمن کی تحقیقات سے بھی ہوتی ہے جو اس نے بوُنوں کی حیاتِ اجتماعی کے متعلق کی اور اساطیر کی تحلیل

سے بھی جو اولیں واقعات کا عکس ہیں۔ ڈرامائی رسوم سے اساطیر پیدا ہوئے اور ڈرامائی رسوم جماعت سے ایک فرد کی لڑائی اور شکست کو پیش کرتے ہیں۔

طوطم (یعنی مرموز باپ) کو مارنے اور کھانے کی ممانعت، ایک ہی طوطمی جتھے کی عورتوں (یعنی مرموز ماؤں) کو جنسی طور پر استعمال کرنے کی ممانعت، اور آپس کے جھگڑوں کو قوت کے ذریعے طے کرنے کی ممانعت یہ چیزیں خاص اور بنیادی مثالیں ہیں ٹیبو کی۔ وہ نوعِ انسان کی بنیادی جبلتی خواہشوں (یعنی قتل، آدم خوری، اور محرمات کے ساتھ مباشرت) کی تسکین کو روکتی ہیں۔ ان غیر شعوری تہیجات کو ہر بچہ نئے طور پر اپنے ساتھ لے کر دنیا میں آتا ہے اور اخلاق اور تہذیب کی بلند عمارتیں انہیں کی ناآسودگی کی بناء پر استادہ و استوار ہیں اگر ان پر قیود اور بندشیں عائد نہ ہوں تو عمرانی زندگی ناممکن ہو جائے۔ انسیات دان کہتے ہیں کہ کسی وحشی قبیلہ میں ٹیبو کی شکست پر مجرم کو جب کوئی فوق الفطری سزا خود بخود نہیں ملتی تو اہلِ قبیلہ گہرے تردد اور تعلقِ خاطر کے ساتھ اور نہایت فیصلہ کن طریقہ پر مجرم کو کیفرِ کردار کو پہنچاتے ہیں کیونکہ اگر ٹیبو کی خلاف ورزی کرنے والا سزا سے بچ جائے تو پورے قبیلہ کی عافیت اور سلامتی کو نازک خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اگر ہم اس توہم کا سادہ زبان میں ترجمہ کریں تو یہ ہوگا: مثال متعدی ہوتی ہے اگر کوئی شخص ضبط شدہ خواہش کی تسکین حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو دوسروں کو بھی جرأت اور ترغیب ہوگی اور قبیلہ جبلتی ہواؤں کے جھونکوں میں پانی کے بلبلہ کی طرح نابود ہو جائے گا۔ فرائڈ نے ذہنی امتلاء والے عصبی فساد کے اعراض اور وحشیوں کے ٹیبوؤں میں جو موازات دریافت کی ہے اس کی بناء پر ہم بے خطر یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ضبط شدہ بنیادی خواہشیں (جو ٹیبوؤں کی مشہور خصوصیت یعنی لمس ترسی میں پائی جاتی ہیں) فنا نہیں ہوتیں اور اصلاح کی دسترس سے دور ہیں لہٰذا عدیم الشعور نے جو شیطان کی طرح بے شمار روپ بھر سکتا ہے نئے نئے نکاس ڈھونڈھ نکالے۔ یہ نئے نکاس ان نکاسوں کو مرموز کرتے تھے جنہیں روک دیا گیا لیکن ان نئے نکاسوں پر بھی احتراز حاوی ہو گیا اور پھر دوسرے نکاس ڈھونڈ لئے گئے جو اپنی باری پر پھر ممنوع قرار پائے ہر احتراز کو آئینی شکل دے دی گئی۔ ٹیبو کی نمایاں نامعقولیت کی بنیاد یہی ہے۔ طوطم نے باپ کی طرف کے انداز کی دوگرفتگی (ambivalence) کو قائم رکھا ہے اسے خاص خاص مواقع پر سب مل کر مارتے اور کھاتے ہیں اور عموماً سختی سے حرام عورتیں وقتی طور پر مباح ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان جشنوں اور ان کی لائی ہوئی بدمستیوں کے ختم ہو جانے کے بعد دوسرے اوقات میں طوطم کا احترام کیا جاتا ہے اسے بچایا جاتا ہے اور ایک ہی طوطمی جتھے کی عورتوں سے احتراز کیا جاتا ہے۔

متمدن قوموں کے اخلاقی قاعدے اور وحشی قبیلوں کے ٹیبو فی الاصل ایک ہیں۔ متمدنوں کے اسلاف کسی نہ کسی وقت تمدن ناآشنا اور ٹیبوؤں سے گرانبار تھے اور ان کے یہی ٹیبو ان کی اولاد کو وراثتہً ملے۔ اخلاق اور ٹیبو کی باہمی بنیادی اور اصلی مشابہت (دونوں ایجابی خواہشوں کی تسکین کو روکتے ہیں) کی وجہ یہی ہے۔ لیکن وحشت سے تمدن میں ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی میں بعض نئی باتیں داخل ہوئیں۔ ہر وقت جماعت میں رہنے کی بجائے تنہائی کے لیے موقعے دستیاب ہونے لگے جن میں فرد اپنی روح کے ساتھ خاموش گفتگو کر سکتا تھا۔ غول پسندی انفعال میں تبدیل ہوئی۔ تقلید نے جدت کے لئے جگہ خالی کی اور تحلیلی زبان، آزادانہ بات چیت، تحریر اور صناعی (آرٹ) نے روح کے ساتھ اس خاموش گفتگو یا غور و خوض کو ترقی دی۔ شخصیت کی نشو و نما ہوئی۔ شعوری حیات کے اعمال اہمیت اختیار کر گئے۔ نتیجۃً اخلاقی

قاعدے نرم، لچکدار اور معقول ہو گئے بلاشبہ ہمارے بہت سے اخلاقی قاعدے غیر عقلی ہیں لیکن وہ ہمارے اسلاف کے ٹیبوؤں کا معقول تر انتخاب ہیں

اختیار کا مسئلہ

یوں ٹیبو اور اخلاق میں ایک فرق ہے۔ اور ایک اہم فرق ہے لیکن وہ کسی طرح بھی بنیادی نہیں۔ برعکس اس کے ان کی یکسانی عمیق اور اساسی ہے۔ اور اسی لئے ضمیر کا مظہر دونوں میں ملتا ہے دونوں ضمیر کے احکام ہیں۔ دونوں میں ایک وجوب پایا جاتا ہے۔ دونوں کی تعمیل پر راستی کا احساس ہوتا ہے اور خلاف ورزی پر جُرم کا۔ راستی کے ساتھ تحسین اور جرم کے ساتھ سرزنش ہوتی ہے یہ تحسین یا سرزنش بجا معلوم ہوتی ہے وہ کسی چیز پر منحصر نظر نہیں آتی بلکہ بدیہی محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح ضمیر تین باتوں پر دلالت کرتا ہے (۱) اخلاقاً درست اور نادرست کے درمیان تمیز پر (۲) اوّل الذکر کے کرنے اور مؤخر الذکر سے بچنے کے وجُوب پر اور (۳) پہلی صورت میں فخر کے اور دوسری صورت میں ملامت کے احساس پر۔ لیکن ہمیں پہلے اخلاقاً درست کام کرنے اور نادرست سے بچنے کی قوّت سے بحث کرنی چاہئے۔ جو اصطلاحاً ارادہ کہلاتی ہے۔

بلاشبہ فکرِ جدید کے بعض عناصر اختیار کی تائید میں ہیں لیکن ان کی آواز کماوتی نقارخانہ کے طوطی کی صدا سے زیادہ نہیں۔ مانا کہ آج کل اس کمزور آواز کو ایک شور ایک ہنگامہ کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے مگر ایسا کرنے والوں کے خلوصِ نیت پر شبہہ کیا جا سکتا ہے یعنی وہ یا تو مذہبی اہلِ قلم ہیں جو اپنی سطوتِ رفتہ کو واپس لانا چاہتے ہیں یا پھر وہ مفکّرین جو نمایاں مذہبی اور صوفیانہ رجحان رکھتے ہیں۔ تصوّریین کی بحثوں کا دارو مدار انسانی شعور اور حقیقتِ مُطلق کے درمیان یکسانیت پر ہے زیادہ کھلے طور پر یہ کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو موجود ہے ذہنی ہے اور وجودِ مطلق شعورِ ذات کے نمونہ پر ہے لیکن جدید ثنیتی فلسفہ نے (جس کے سربرآوردہ ترجمان میناگ، مور، رسل وغیرہ ہیں) ادراک کے مسئلہ پر جو گہری تنقیدی نظر ڈالی ہے اس سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اشیاء کا وجود کسی طرح ذہنِ مُدرک پر منحصر نہیں لہٰذا ذہن کی اصطلاحوں میں کائنات کی تعبیر یکسر غلط ہے اور جب بنیاد ہی ہل جائے تو سقف و محراب کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔ یہی بات ان فلسفیانہ نظاموں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جن کی بنیاد اس پر ہے کہ حیات ایک ناقابلِ تحویل تخلیقی، اور پُر اسرار یا لا مادّی قوّت ہے اور جو انسانوں کے لئے جذباتی طور پر اطمینان بخش اور گوارا ہیں۔ کیونکہ ماہرانِ خصوصی کی آج یہ متفقہ رائے ہے کہ زندہ مادّہ کے اعمال طبیعیّات اور کیمیا میں تحویل ہو سکتے ہیں یہ کہ زندہ مادّہ اور مردہ مادّہ میں اصلاً کوئی فرق کوئی امتیاز نہیں اور یہ کہ کوئی زندہ کیمیائی جوہر نہیں کوئی خاص حیاتی عنصر نہیں جو مردہ مادّہ سے مختلف ہو اور کوئی خاص حیاتی قوّت نہیں جو کارگہِ کائنات میں مصروفِ عمل ہو اسی طرح تاجیت کے بنیادی تصوّرات پر رسل، مور، وغیرہ کی تنقیدیں انسانی تعصّبات کے لئے تباہ کن ثابت ہوئیں۔

نظریۂ مقادیر برقیات کی جدید ترقیوں کی روشنی میں ایڈنگٹن نے انسانی اختیار کو محفوظ کرنا چاہا ہے۔ لیکن اس کے اس مفروضہ پر کئی سخت اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہ جوہر کی مفروضہ آزادیٔ عمل تحقیق کے ایک دقیق ترین میدان کا ایک نہایت مبہم اور پیچیدہ مظہر ہے اور یہ کسی سائنس داں کے شایانِ شان نہیں کہ وہ تحمّل اور استقلال کو ہاتھ سے دے کر نئے قوانین کی دریافت سے ہاتھ اٹھا لے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مادّہ کے نئے تصوّرات کا موجودہ ناکافی علم بڑھے گا نہیں۔ ایسے قوانین معلوم ہو سکتے ہیں جو موجودہ بے استقلالی کی حالت کی توجیہ کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ آئن اشٹائن جیسے ممتاز ترین ماہر طبیعیات کو ایڈنگٹن کے استخراجات سے اختلاف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ تحت جوہری اختیار بڑے پیمانہ کی جبریت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ لہذا جب جواہر کے بڑے مجموعے قوانین کے پابند ہیں تو نہ تجربۃً یہ ثابت ہے کہ انسانی مُخوں کی حرکتیں برابر برابر کرنے کے اس عمل سے خالی ہیں جس کی وجہ سے اعدادیاتی قوانین بڑے اجسام کی حرکتوں پر منطبق ہوتے ہیں اور نہ عقلاً یہ قرینِ قیاس ہے کہ انسانی مُخوں اور بڑے اجسام میں فرق اور امتیاز جائز ہے۔

سببی قوانین کی دریافت سائنس کا مغز ہے۔ یعنی سائنس ایسے قاعدے معلوم اور متحقق کرتی ہے جو ایک وقت میں واقع ہونے والے حوادث کو دوسرے وقت میں واقع ہونے والے حوادث سے ملاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر سائنس کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ ایک صورتِ حال عجیب طور پر دوسری صورتِ حال کو طے کرتی اور اپنی باری پر خود ایک مقدم صورتِ حال سے طے ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ طبیعیات کی جدید ترقیوں کے باوجود میکانیت سائنس دانوں کا عدیم التغیر اسلوب ہے۔ وہ تحقیق کے ہر میدان میں قوانین کی تلاش کرتے ہیں اور جہاں انہیں وہ دریافت نہیں کر سکتے اسے اپنے دائرہ سے خارج یا دور کرتے ہیں اور اس میں وہ راستی پر ہیں۔ نتیجۃً سائنٹیفک ذہنیت جبریت پسند ہوتی ہے وہ زندگی اور ذہن کے مظاہر پر اصولِ جبریت کو مسلط کر کے عمل کی اخلاقی ذمہ داری کا مضحکہ اُڑاتی ہے۔ ہمارے رُجحانات ہماری موروثی حیاتی استعداد اور ہمارے ماحول سے طے ہوتے ہیں اور ہمارا ارادہ ہمارے انہیں رُجحانات کا معلول ہے لہذا ہم کسی کو کسی غلط کام کے کرنے پر الزام نہیں دے سکتے ملامت نہیں کر سکتے۔

جدید نفسیات (اور فعلیات بھی) اس ذہنی انداز کی تائید کرتی ہے۔

پیلاف کی تحقیق اور فرائڈ کی تحلیلِ نفسی نے نفسیات میں اصولِ علّیت کے استقرار سے اس عام خیال کی تردید کر دی کہ نفسی یا ذہنی مظاہر پر سببی قوانین حاوی نہیں۔ یعنی نفسیات میں میکانیت کو دخل نہیں۔ اور اس طرح انہوں نے انسان کو "اس کے سب سے عزیز التباس" (جیسا کہ فرائڈ نے اختیار کو کہا ہے) سے محروم کر دیا۔ پہلا نظریہ کے بموجب دماغ ایک ایسا آلہ ہے جو جسم کے ہر حصّہ سے آنے والے تہیجات کی موجوں کو وصول کرتا ہے یہ تہیجات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ۱۔ اُکسانے والے اور ۲۔ روکنے والے۔ اور ان میں باہم سدا عمل اور تصادم ہوتا رہتا ہے۔ ابتدائے حیات کے سیدھے سادے نقشہ کی جگہ بعد میں نئے خطوط یعنی غیر خلقی یا مصنوعی جوابی اعمال لے لیتے ہیں۔ یہ پورا عمل خودکار ہوتا ہے۔ ہم ان دماغی نقشوں کی تشکیل کے مطلقاً ذمہ دار نہیں نتیجۃً ہر وہ طریقہ جس کے بموجب دماغ کسی مہیج کا جواب ادا کرتا ہے خود بخود طے ہوتا ہے۔ انسانوں کے دماغ حیوانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں لہذا ان کے لئے مہیجات بے حد اور متنوع ہیں اور ان مہیجات کے جوابات بڑی تیزی اور زود حسّی سے ادا ہوتے ہیں یوں ہم میں تصنع بہت پایا جاتا ہے۔ اور ہماری روشِ حیات کی توجیہ ہمارے جوابات کی اس بناوٹ سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

فرائڈ نہایت استقلال کے ساتھ فرد کے لئے آزادانہ انتخاب کے وجود سے انکار کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی فعل، پسند اور رائے کو عدیم الشعور طے اور متاثر کرتا ہے عدیم الشعور ذہنِ انسانی کا وہ حصّہ ہے جس میں ہمارے تمام گذشتہ تجربات (نسلی اور انفرادی دونوں) جمع اور

محفوظ رہتے ہیں۔ یہ تجربات ایسے ہوتے ہیں جنہیں اخلاقی نقطۂ نظر سے ناپسند اور ضبط کر دیا جاتا ہے یہ اخلاقی معیار جو محتسب کا کام کرتا ہے۔ خود بھی بڑی حد تک غیر شعوری ہوتا ہے عدیم الشعور کا واحد فعل خواہش اور واحد اصول اصولِ مسرت ہے۔ وہ ہم میں سے ہر ایک میں شیر خوار بچہ، وحشی انسان اور جانور کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور سوائے اس وقت کے جب کہ اسے کسی فنی ذریعہ سے روشنی میں لایا جائے وہ ہمیشہ شعور سے خارج (مگر مؤثر) رہتا ہے۔ یوں وہ ہماری رسائی اور استعمال سے باہر ہے۔ وہ ہمارے مدرکات پر عمل کرتا اور انہیں بدل دیتا ہے اور یہ بدلے ہوئے مدرکات قبل شعور سے ہو کر شعور میں بطور خیالات کے داخل ہوتے اور عمل میں خارج ہوتے ہیں۔ کسی چیز کا ارتکاب یا کسی چیز سے اجتناب ہم اصولِ مسرت کے بموجب کرتے ہیں یعنی عدیم الشعور کے زیر اثر جب اس طرح عدیم الشعور ہمارے ہر فعل، ہر خیال، اور ہر انتخاب پر اثر انداز ہوتا ہے تو ہم ان میں سے کسی کے بھی ذمہ دار نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں (ایک ایسا ہی نتیجہ میکڈوگل بھی اخذ کرتا ہے اس کے نظریہ کی رو سے ہماری فطرت کی بنیادی محرک قوتیں جبلتیں ہیں۔ ارادہ اس وقت تک حرکت میں نہیں آتا جب تک کہ کوئی جبلی محرک اسے استعمال کرے نہیں۔ لہذا ارادہ بے بس ہے سوائے اس کے کہ کوئی قوت جو ہماری شعوری نگرانی سے باہر ہے ہمیں اسے حرکت میں لانے کے قابل بنائے)۔

ضمیر کی ماہیت

برخلاف اخلاقی دیانتداری کے اخلاقی ضمیر سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن اس کے بارے میں بعض امور قابلِ غور ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اس کے تجربہ میں کوئی یکسانی نہیں، اس کے احکام نہ صرف قوموں کے ساتھ بلکہ افراد کے ساتھ بھی بدلتے جاتے ہیں۔ خودکشی کو ہم مذموم سمجھتے ہیں۔ لیکن "ابھرنے والے آفتاب" کی سرزمین کا ایک فرد جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اخلاقی حس کے معاملہ میں ہم سے فروتر ہے ہارا کیری کو مستحسن جانتا ہے۔ ہیروڈوٹس کی تصدیق کے بموجب قدیم مصری اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ پرہیزگار تھے۔ مگر پیسیر و کہتا ہے کہ وہ حقیقی بھائی اور بہن کے نکاح کو "بہترین نکاح" باور کرتے تھے حالانکہ ان کی ہمعصر اور ہمسایہ قومیں اسے ایک بہت بُرا فعل خیال کرتی تھیں۔ مثلاً احرقیال یہود کو اس قسم کے تعلقات پر سخت ملامت کرتے ہیں چینی جاپانیوں کی طرح آشنائی کو جائز سمجھتے ہیں حالانکہ ہم اس پر ضمیر کی ملامت محسوس کرتے ہیں۔ مالدار کا ضمیر اشتمالی طریق کار کو بُرا ٹھہراتا ہے مگر غریبوں کو معاشی طور پر لوٹنے کے متعلق اس سے کچھ نہیں کہتا۔ اسی طرح اشتمالی کا ضمیر سرمایہ داروں کے اعمال کو ناپسند کرتا ہے مگر کولاکوں کے شکار پر اسے بُرا بھلا نہیں کہتا۔ ضمیر ایک شخص سے یہ کہتا ہے کہ حملہ آور کا مقابلہ مت کرو اور دوسرے سے یہ کہ اپنے ملک کی مدافعت کرو جہاں تک ہو سکے۔

ان حالات میں یہ باور کرنا دشوار ہے کہ ضمیر خدا کی آواز ہے۔ ایک بے وقوف بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ خدا زمین کے ساتھ ساتھ رنگ بدلے گا یا اپنے کام میں اس قدر بے سلیقہ، اناڑی، اور بے پرواہ ہو گا۔ تو پھر ضمیر کا ماخذ کیا ہے؟ اس کی فہم کچھ دشوار نہیں چھوٹے بچے اخلاق کے پابند نہیں ہوتے۔ یعنی اپنے بنیادی تہیجات کے لئے داخلی رکاوٹیں نہیں رکھتے۔ بلکہ انہیں ہر وقت آزادی سے آسودہ کرتے ہیں (اور یہ دوسرا قابلِ غور امر ہے) اس زمانہ میں بچے کے ماحول کی سب سے مقتدر اور با اثر شخصیت یعنی باپ اُس کے افعال کی دیکھ بھال کرتا، اس کی رہنمائی کرتا، اسے روکتا، اور خلاف ورزی کی صورت میں اسے سزا یا سزا کی دھمکی دیتا ہے۔ بچہ پر باپ کا اثر اس کی نسبتہً بڑی جسامت، سزا دینے

کی قوت اور رغبت کے ثبوتوں سے قائم اور مکمل ہوتا ہے۔ بچہ اس سے ڈرتا بھی ہے اور اس سے محبت بھی کرتا ہے وہ سزا یا سزا کی دھمکی کا مفہوم یہ لیتا ہے کہ باپ کو اس سے محبت نہیں رہی۔ اور یہ احساس ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ وہ ایک تردد اس میں پیدا کرتا ہے جس سے وہ ابتداء میں تو باپ کو اس کی موجودگی میں خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور غیاب میں کوئی پروا نہیں کرتا۔ لیکن پانچ سال کی عمر تک وہ باپ کو اپنے نفسی ساز و سامان کا ایک جزو بنا لیتا ہے یعنی یہ سیکھ جاتا ہے کہ باپ موجود نہ ہو تب بھی اس کی رضاجوئی مقدم ہے۔ وہ ان افعال سے بچتا ہے جو باپ کو پسند نہیں ہوتے اور وہ کام کرتا ہے جنہیں مؤخر الذکر کی پسندیدگی حاصل ہوتی ہے۔ تہیجات کی تسکین کا ترک اگرچہ تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن پسند یا محبت کئے جانے کے احساس سے اس میں ایک لذت بھی ملتی ہے جو اصلی تسکین کا بدل ہوتی ہے بالفاظِ دیگر یہ کہ ضمیر اور کردار پانچ سال کی عمر میں تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ ضمیر باپ کا فعل انجام دیتا ہے اور زندگی ہی میں اس سے جدا ہو جاتا اور سخت تر بن جاتا ہے وہ مؤخر الذکر کی طرح انا پر اقتدار صرف کرتا ہے انا اُسے خوش رکھنا چاہتا ہے اور اس کی تحسین سے آرام اور سرزنش سے تکلیف محسوس کرتا ہے پھر اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ضمیر اس سے ناراض ہو یوں باپ کے محبت نہ کرنے کا تردد داخلی اور اخلاقی تردد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ جب ضمیر کے حکم پر کسی جبلّتی تسکین کی قربانی دیتا ہے تو اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ جواب میں اس سے اور زیادہ محبت کی جائے گی۔ شایانِ محبت ہونے کا یہ شعور نکوکاری پر فخر کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ضمیر کوئی خلقی قوت نہیں وہ سراسر ایک اکتسابی چیز ہے ـــــ تعلیم، تربیت، اور تہذیب کا نتیجہ۔ ضمیر کے متعلق یہ نفسی تحلیلی تحقیق کوئی نئی اور حیرت انگیز چیز نہیں۔ وہ نفسیاتی بنیاد پر آزاد خیال اہلِ قلم کے افکار کی ایک زیادہ مضبوط، منطقی، اور تجربی تائید ہے۔ اخلاقی قانون کے بارے میں بعضوں نے یہ کہا کہ وہ معاشرتی اغراض کی پیداوار ہے بعضوں نے یہ کہ وہ ایک موجود بالذات قانون ہے جس کا ادراک وجدان کرتا ہے اور بعضوں نے یہ کہ وہ ایک ذریعہ ہے کردار کے خارجی قاعدوں سے اپیل کرنے کی ضرورت یا زحمت سے بچنے کا۔ اسی طرح اخلاقی وجوب کے متعلق کسی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ بلحاظِ ماہیت جمالیاتی ہے کسی نے یہ کہ معاشرتی احساس اس کی بنیاد ہے کسی نے یہ کہ اس کی اصل سزا کا خوف یا صلہ کی امید ہے اور کسی نے یہ کہ وہ مطلق العنان حاکم کے ارادہ کا عکس ہے چنانچہ عمومیت میں وہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔

نئے اخلاق کے مضمرات ـــــــــ

اس نئے اخلاق کے مضمرات کیا ہیں؟

(۱) ہر اخلاقی نظریہ صرف ان سے اپیل کر سکتا ہے اور کرتا ہے جو اس سے دلچسپی رکھتے ہیں یعنی انسانوں کی بڑی تعداد اس کے حلقۂ اثر سے خارج ہوتی ہے۔ انسانیت کو اس طرح متعدد اور متصادم گروہوں میں تقسیم کر کے اس کی بدحالی میں اضافہ کرنا کسی طور سے خوش آئند اور ضروری نہیں۔ لہٰذا یہ توقع کہ اخلاقیات سے انسانی فلاح ممکن ہے لغو اور لاطائل ہے ہمیں معقولیت کو اخلاق کے نعم البدل کے طور پر قبول کرنا چاہیئے۔

(۲) انسان نہ بالکل خود پرست ہے اور نہ بالکل غیر پرست۔ وہ خود غرضی اور ایثار کا ایک پیچیدہ مرکب ہے۔ جہاں ایسے افراد ملتے ہیں جو دوسروں کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ وہیں ایسے بھی نایاب نہیں جو ذاتی مصالح اور اغراض کو دوسروں کی خاطر قربان

کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ مؤخر الذکر کی تعداد نسبتہً بہت تھوڑی ہے اور بڑی اکثریت ان کی ہے جنہوں نے اپنی نظر کو اپنے نفس پر مرکوز کر کے حوالی کو دھندلا کر دیا ہے۔ معقولیت اس خود اندیشی کو معتدل بنائے گی صرف عقل ہی ہمیں یہ بتا سکتی ہے کہ اکثر و بیشتر ہمارے وقتی اور شدید رُجحانات اور تہیجات ہماری مجموعی بھلائی کے معارض ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس کے احکام کی تعمیل کر کے ہم نہ صرف اپنی مجموعی بھلائی کو محفوظ کرتے نہیں بلکہ انسانی مجموعی بھلائی کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔

(۳) گناہ کا تصور پارینہ اور بیہودہ ہے۔ اور اس کے لئے تعزیری سزا بے ضرورت۔ لہٰذا جہنم اور جیل خانے نہ صرف بیکار بلکہ مرض آفریں ادارے ہیں۔ ہمیں انسانی فطرت کی زیادہ عمیق فہم حاصل کرنی چاہئے اور ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ مدرسے اور علاج گاہیں پولیس اسٹیشنوں، عدالتوں، اور جیل خانوں سے بڑھ جائیں انہیں کچل دیں۔

(۴) ضمیر ایک غیر عقلی قوت ہے۔ وہ نوع انسان کے عہدِ طفلی کی باقیات ہے جبکہ ان تہیجات کو جنہیں مفید مطلب نہیں بنایا جا سکتا تھا ضبط کر دیا جاتا تھا۔ آج جب کہ ہم نے عقل کو تقویت دے لی ہے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بلا شبہ ہر انسانی بچہ آج کل وہی کرتا ہے جو نوع انسان نے اپنے بچپن میں کیا لیکن اگر ہم اپنے اُن اخلاقی اصولوں کو جو ہمیں اپنی طفولیت میں ماحول کی اثر آفریں ہستیوں سے ملے اس کے اثر پذیر ذہن پر مرتسم نہ کریں بلکہ اس کی عقلی طور پر تربیت کر کے اس کے فطری بروز میں مدد دیں تو اسے ضعفِ عقل اور ترغیباتِ جرم سے بچانے کے ساتھ ساتھ اس کی تکمیلِ شخصیت میں بھی حصہ لیں گے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اہم جبلتوں کو ضبط کرنے سے زندگی کو سخت نقصان پہنچتا ہے اسی طرح گنہ گار ہونے کا احساس بھی مضر ہے۔ لہٰذا نیکی اس اہمیت کی مستحق نہیں جو ہم نے اسے غلطی سے دے رکھی ہے تکالیف آلام، اور سزائیں نہ لازمی ہیں اور نہ مستحسن۔ تہذیبِ نفس کے لئے ہمیں تربیت کے صحیح اصولوں پر عمل کرنا چاہئے۔ کسی ایسی چیز کو منتخب نہیں کرنا چاہئے جس کے نقصانات اس کے فوائد سے بڑھ کر ہوں۔ ہزارہا سال کی پند و نصیحت اور دینداری کے باوجود نوعِ انسان اصلاحِ نفس سے کوسوں دور ہے۔ لاشخصی سائنسی قوتوں کو تباہ کن مقاصد کی بجائے مفید مقاصد کے لئے استعمال کرنے پر روایتی اخلاق ہمیں کبھی آمادہ نہیں کر سکتا۔ سراب کے پیچھے اس احمقانہ دوڑ کو اب ختم ہو جانا چاہیے عقل ہی ہمارے مقاصد کی تربیت کر سکتی اور ہمیں اپنے وسائل کے صحیح برتاؤ کی طرف لے جا سکتی ہے۔ وہی ہمیں انسانی وقت اور توانائی کے زیادہ کفایت پرور اور فائدہ بخش مصرف کی جانب توجہ دلا سکتی ہے اس لئے ان اسالیب کا غیر مشروط طور پر واپس لیا جانا ناگزیر ہے جنہوں نے اپنی بے سودی شک و شبہ سے پرے ثابت کر دی۔

(۵) اخلاق کا مبدء انسانی ہے آسمانی نہیں۔ زیادہ صاف طور پر یہ کہ تہذیبی قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ انسانوں کی اغراض کی تکمیل کے لئے بنائے گئے ہیں۔ عموماً اس چیز کو تسلیم نہیں کیا جاتا یعنی لوگ یہ نہیں مانتے کہ اخلاق اصلاً معاشرتی ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں خدا یا خداؤں کی منظوری حاصل ہے اسی لئے ہر مذہب اپنے پیروؤں کے لئے اخلاقی نصیحتوں اور ممانعتوں کا ایک مجموعہ رکھتا ہے لیکن تقدس کی یہ چڑھائی ہوئی کھال حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کرتی۔ تہذیبی قوانین نہ صرف باہم متصادم ہیں اور یوں ایک دوسرے کو کمزور کرتے ہیں بلکہ ان پر انسانی نقص، سہو، اور نسیان کے نقوش بھی مرتسم ہیں لہٰذا نیا اخلاق یہ اعتبار رُجحانات ملحدانہ ہے۔ وہ یہی نہیں کہتا کہ ہمیں خدا پر اپنی خواہشوں کی کاٹھی نہیں رکھنی

چاہئے بلکہ اسے سرے سے خدا کے وجود ہی سے انکار ہے اور یہ نہ حیرت انگیز ہے اور نہ افسوسناک۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ مذہب سے جدا ہو کر اخلاق ایک معاشرتی ضابطہ بن جاتا ہے ـــــ دنیوی، متغیر، اور لچکدار ـــــ جس کی تعمیل لازمی نہیں نتیجۃً بدکاری بڑھ جاتی ہے مگر یہ ایک خوابِ پریشاں ہے اور حقیقت سے قطعی مختلف۔ الحاد سے زیادہ مذہب بداخلاقی کا مؤید اور پردہ دار ہے۔ مذہبی انسان گناہ بھی مذہب کی رو سے کرتا ہے۔ شرعی حیلوں کا نظام اسے گناہ کی پوری آزادی اور تحریک عطا کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل بے دینی میں انسان تہذیبی احکام و ضوابط کے متعلق زیادہ موافق انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ انہیں توڑتے نہیں بلکہ حالات کے مطابق ان میں اصلاح کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

"غیب پر ایمان" مذہب کا مرکزی عقیدہ ہے۔ یہ وہ چول ہے جس کے گرد مذہب کی پوری مشینری حرکت کرتی ہے۔ اسے ہم بجا طور پر جان سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ جس کے بغیر مذہب ایک مردہ اور فساد پذیر جسم ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں خدا قلب و مرکز کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ بدھ مت میں بھی بانی کی ذات خدا کی قائم مقام بن گئی ہے۔ ہمارے زمانہ کا یہ سب سے بڑا انقلاب ہے کہ خدا پر یقین سائنس اور عقل کی ترقی کے متناسب زائل ہوتا جارہا ہے۔ افق سے سورج بلند ہوتا ہے تو تاریکی بتدریج دُور ہوتی جاتی ہے" ان دیکھی حقیقت" پر واقعی ایمان ہو بھی کیسے جبکہ سائنس اور عقل کا حکم ہے" جو نظر نہ آئے اسے رد کردو" بے دینی کا یہ بڑھتا ہوا سیلاب ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے۔ مذہبی مہاجنوں کے گلوں کی تنی ہوئی رگیں اس کی شاہد ہیں۔ بلاشبہہ یہ نُوری، آسمانی بادشاہت کے یہ وفادارانِ لم یزل، مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ خدا کی مملکت کو اس کے باغیوں کے وجود سے پاک کر کے ہر جگہ خدا کے نام کا بول بالا کردیں۔ وہ جاہل یا نیم تعلیم یافتہ عوام کو ہیبت زدہ یا بس میں کرنے کے لئے اپنے کم جوکس یا ان حریفوں کی سربریدہ نعشوں کو ہر گلی کوچہ میں گھسیٹتے پھرتے ہیں جن کی گھڑیاں آج سے کئی سال پہلے بند ہو چکی ہیں۔ لیکن خدا کے ان سپاہیوں کا یہ جنونِ انتقام یہ مسلسل اور جان توڑ کر لڑنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ میدان ان کے ہاتھ نہیں۔ وہ کمزور ہیں اور ایک ہاری ہوئی لڑائی میں مصروف محض اس توقع پر کہ شاید کوئی نقطہ رجعی مل جائے قسمت کوئی پلٹا کھائے۔ مگر ہماری اس دنیا میں جہاں قانونِ علّیت کا دور دورہ ہے معجزے مشکل سے وقوع پذیر ہوتے ہیں فرانس کے وزیرِ اعظم موسیو رینا ڈُ اس کی شہادت دیں گے۔ موقعِ میدان اور باقاعدہ کارروائیوں پر نظر کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے

مرزا محبوب بیگ

جب پتہ محبّت کرتا ہے تو وہ پھُول بن جاتا ہے

جب پھُول عبادت کرتا ہے تو وہ پھَل بن جاتا ہے

ہم اِس دُنیا کو سمجھتے نہیں اور پھر کہتے ہیں کہ دُنیا ہم کو دھوکا دیتی ہے

(ٹیگور) ترجمہ از منظر بشیر

خاک و افلاک

باغ میں کلیاں، چرخ پہ تارے — یہ بھی پیارے وہ بھی پیارے
اُن کا مہکنا اور چٹکنا — اِن کا چمکنا اور دمکنا
واں ہے مہر و مہ کی تگ و دو — یاں ہیں حباب و موجِ سبک رَو
جانتا ہے ہر جاننے والا — ایک ہی ہے سب زیر اور بالا
واں پہ مدار اور یاں پر مسلک — ہر جا دل چلتے ہیں دھک دھک
وہ تقدیریں، یہ تدبیریں — وہ بھی لکیریں یہ بھی لکیریں
یاں پر آنکھیں، واں پر تارے — حُسنِ ازل کے دونوں اشارے
تارے کیا ہیں، مثلِ شرر ہیں — یہ بھی چراغِ راہ گذر ہیں
وہ بھی ہیں بنتے اور بگڑتے — آپس میں ٹکراتے لڑتے
یاں بھی ہے ہفت اقلیم کی ٹکّر — تازہ اور قدیم کی ٹکّر
کل کے ستارے آج نہیں ہیں — یاں بھی پہلے تاج نہیں ہیں
ماہ میں ہے ایّام کی گردش — یاں بھی ہے ننگ و نام کی گردش
کیا ہے فلک کا نیلا گنبد — کیا انسان کا ہے نیک و بد
وہ بھی میری حدِ نظر ہے — یہ بھی مری فطرت کا اثر ہے
جن کو یہاں ہے رشکِ ملک پر — کہتے ہیں نوری سب ہیں فلک پر
واں پہ ملک لیکن ہیں کہتے — نوری سب ہیں زمیں پر رہتے
عرش فلک کا فرش ہے اُن کا — اور زمیں پر عرش ہے اُن کا
کوئی ملک جب اوج ہے پاتا — سوئے زمیں ہے اُڑ کر آتا
اپنی نظر گہ عرشِ بریں ہے — معراج اُن کی سوئے زمیں ہے
روحیں ہیں جو خاک کے اوپر — ایسی کہاں افلاک کے اوپر

خلیفہ عبدالحکیم

ٹمبکٹو سے چیچو کی ملّیاں

ٹمبکٹو اور چیچو کی ملّیاں ——— میں نے تخیّل کے موٹر میں بیٹھ کر بارہا ان دونوں شہروں کی سیر کی ہے۔ بعض لوگوں کے متعلق سنا ہے کہ وُہ ہارون الرشید کے بغداد کے خواب دیکھتے ہیں۔ اکثر کے تخیّل کی محبوب پرواز پیرس تک ہے۔ بعض تصوّر میں لندن کی کوچہ پیمائی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن مجھے بغداد، لندن یا پیرس کسی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ ٹمبکٹو کے مقابلے میں لندن مجھے بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جس طرح لاہور کے مقابلے میں ٹوبہ ٹیک سنگھ ——— ع   چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!

چیچو کی ملّیاں کا نام میں نے پہلی مرتبہ آج سے کوئی سولہ سترہ سال پہلے سُنا۔ ان دنوں میں پرائمری سکول کی دوسری یا تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ "جغرافیہ ضلع شیخوپورہ مصنفہ شیخ محمد ناظر بی۔اے بی۔ٹی" وہ منحوس کتاب ہے جسے پڑھنے کے لئے میں اور میرے تمام ہم جماعت مجبور تھے۔ سو ڈیڑھ سو صفحے کی اس خشک کتاب میں سے آج مجھے چیچو کی ملّیاں کے سوا کوئی اور لفظ یاد نہیں۔ چیچو کی ملّیاں کا ذکر مشہور سٹیشنوں کے باب میں آتا تھا۔ اس کے بعد بیسیوں مرتبہ لاہور آتے جاتے ہماری گاڑی چیچو کی ملّیاں کے اسٹیشن پر رکی مگر جہاں تک نگاہ کام کر سکتی ہے مجھے سٹیشن کے ارد گرد یا آس پاس کوئی گاؤں نظر آیا نہ قصبہ۔ سٹیشن سے باہر نکل کر میں نے کبھی چیچو کی ملّیاں کے پُراسرار شہر کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے ہمیشہ یہ ڈر رہا کہ کہیں اصل چیچو کی ملّیاں اُس چیچو کی ملّیاں سے مختلف نہ ہو جس کی تصویر میں نے سالہا سال سے اپنے ذہن کے پردوں پر کھینچ رکھی ہے۔ البتہ چیچو کی ملّیاں کے سٹیشن کا ایک ایک کونا میرا آشنا ہے۔ اور میں پلیٹ فارم کے ایک ایک روڑے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے شیخوپورہ سے سخت نفرت ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ شیخوپورہ کو جنکشن بنانے کی خاطر چیچو کی ملّیاں کو جو پہلے اس لائن کا ایک نہایت "معزز" جنکشن تھا ایک حقیر سٹیشن میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اکثر پُرانی عمارتیں گرا دی گئی ہیں۔ دوسری لائن اکھاڑ لی گئی ہے۔ ریل کے بیشتر بابو شیخوپورہ تبدیل کر دئے گئے ہیں۔ اور ایک موٹے اور خوش طبع پوریاں بیچنے والے کے سوا باقی سب دکان دار اور خوانچے والے بھی یہاں سے ہجرت کر گئے ہیں۔ یہ وفا شعار پوریاں بیچنے والا میرے نزدیک الف لیلہ کے ہارون الرشید سے کہیں زیادہ دلکش شخصیت کا مالک ہے۔

مجھے اب یاد نہیں کہ ٹمبکٹو کا نام میں نے پہلی مرتبہ کب سنا؛ لیکن ٹمبکٹو سے میری محبت کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب میں کسی موٹر کی پلیٹ پر ہندسوں سے پہلے T ٹی کا لفظ دیکھتا ہوں تو میرے دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ دوڑ کر اس موٹر کے سامنے کھڑا ہو جاؤں اور ڈرائیور سے کہوں کہ مجھے بھی اس محبوب نگری میں لے چلو۔ ورنہ میں تمہاری گاڑی کے نیچے آکر جان دیتا ہوں۔ لیکن بارہا ایسا ہوا کہ موٹر کے انجن کے سامنے کھڑے ہونے سے پہلے ہی ڈرائیور پر نظر پڑ گئی اور یہ دیکھ کر دل بیٹھ گیا کہ وہ کم بخت تو میری ہی طرح کا ایک پنجابی ہے۔ پھر میں سوچتا ہوں کہ یہ ٹی T ٹمبکٹو کا نہیں بلکہ ٹوبہ ٹیک سنگھ یا ٹوٹیکا رن کا ہوگا۔

کل سہ پہر کو میں ایک ایسی گاڑی پر سوار ہوا جو چیچو کی ملھیاں سے بھی گزرتی ہے۔ گرمی کی شدت کے باوجود میں نے رات کے سفر پر دن کے سفر کو محض اس لئے ترجیح دی کہ چیچو کی ملھیاں کے سٹیشن کو اچھی طرح دیکھ سکوں گا۔ لیکن گاڑی میں بیٹھتے ہی میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ میرے ڈبے میں میرے علاوہ صرف دو لالہ صاحبان بیٹھے تھے اور وہ چیخ چیخ کر اس موضوع پر بحث کر رہے تھے کہ لڑائی کے بعد دنیا کا نظام کیا ہوگا؟ باتوں سے اچھے خاصے تعلیمیافتہ آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی میلی کھدر کی دھوتیاں۔ گریباں چاک کرتے۔ دو دو پیسے کی ٹوپیاں اور مٹی سے اٹے ہوئے چپل دیکھ دیکھ کر میں غصہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ان کا بس چلے تو ساری دنیا کو یہی لباس پہنا دیں اور میرا بس چلے تو انہیں ایک ایک کر کے کھڑکی کی راہ سے پلیٹ فارم پر دے ماروں۔ ان کے شور کے باوجود مجھے ضمیر کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی ـــــ "تمہیں چیچو کی ملھیاں سے زیادہ محبت ہے۔ انصاف سے کام لو۔ اللہ منصف مزاجوں کا دوست ہے۔ جب تم دو شہروں سے یکساں سلوک نہیں کر سکتے تو اگر تمہیں چار شادیاں کرنی پڑ جائیں تو اپنی بیویوں میں مساوات کیسے قائم کرو گے؟ ابھی گاڑی چلنے میں کافی دیر ہے۔ اب بھی اتر جاؤ اور ٹمبکٹو پہنچنے کی کوشش کرو۔ جنگ کے شعلے لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہے ہیں۔ کیا عجب ٹمبکٹو بھی ان کی لپیٹ میں آ جائے؟ موقع کو غنیمت جانو اور فوراً ٹمبکٹو پہنچنے کی کوشش کرو۔ آج کا کام کل پر نہ ڈال .... اس کے علاوہ معلوم نہیں حضرتِ ضمیر نے اور کیا کچھ کہا لیکن سفر کے اختتام پر جب گاڑی رکی تو میں ٹمبکٹو کے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ میرے پاس ٹکٹ تو سانگلا ہل کا ہے اور میں پہنچ گیا ہوں ٹمبکٹو۔ اگر ٹکٹ کلکٹر نے پکڑ لیا تو میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں کہ جرمانہ ہی ادا کر سکوں۔ ریلوے والوں نے مقدمہ بنا دیا تو پردیس میں کوئی ضمانت بھی دینے کو تیار نہ ہوگا۔ میں اپنے آپ کو کوس ہی رہا تھا کہ بیٹھے بٹھائے ضمیر کی باتوں میں آ کر ناحق یہ مصیبت مول لی کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے خوف کے مارے جھرجھری لی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سچ مچ ریلوے کا ایک افسر میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں وہ خود ہی بڑی شائستگی سے بولا "کہاں جانا ہے آپ کو؟" میں نے کہا "بس ٹمبکٹو تک آیا ہوں۔" وہ بولا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ پہلی مرتبہ یہاں تشریف لائے ہیں" میں نے کہا "جی ہاں۔ برسوں سے ارادہ کر رہا تھا کہ کبھی اس طرف آؤں مگر فرصت اب ملی" وہ مسکرا کر بولا "اچھا تو میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے کہا "کسی اچھے اور سستے سے ہوٹل کا پتہ بتا دیجئے" اس نے مجھے بتایا کہ سٹیشن سے باہر نکلتے ہی آپ کو بس مل جائے گی۔ کنڈکٹر سے کہئے کہ آپ کو "کازموپالیٹن ہوٹل" اتار دے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سٹیشن سے باہر نکل گیا۔ میں اپنے جی میں اس حسنِ اتفاق پر بہت خوش تھا کہ اسے باتوں میں مجھ سے ٹکٹ پوچھنے کا خیال ہی نہ آیا۔

بس میں بیٹھ کر میں نے کنڈکٹر سے ٹکٹ مانگا تو اس نے کہا کہ یہ پبلک بس ہے۔ ٹکٹ وکٹ کی ضرورت نہیں۔ آپ جہاں کہیں گے آپ کو وہیں اتار دیا جائے گا۔ میں نے اپنے دل میں کہا یہ خوب انتظام ہے۔ لاہور میں تو یہ حالت ہے کہ ماڈل ٹاؤن پہنچنا چاہو تو بھی اڑھائی آنے دو اور اگر تین میل ادھر مسلم ٹاؤن میں اتر جانے کا خیال ہو تو بھی بس والا اڑھائی آنے ہی وصول کرے گا۔ بس والے نے مجھے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ بڑی خوبصورت اور صاف ستھری عمارت تھی۔ ملازم خلیق و شائستہ اور چاق و چوبند۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے "مینو" منگوایا اور چند کھانے منتخب کئے۔ لیکن ان کے سامنے دام درج نہیں تھے۔ میں ڈرا کہ مسافر آدمی ہوں۔ اگر ان ہوٹل والوں نے کھانے کے بل ہی میں مجھے لوٹ

لیا تو واپس گھر کیسے پہنچوں گا؟ میں نے ایک ملازم سے کہا کہ پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کُل بل کتنا ہوگا؟ وہ کچھ حیران سا ہو کر بولا "بل سے کیا مراد ہے آپ کی؟" میں نے کہا "کل پیسے کتنے خرچ ہوں گے؟" اب بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کہنے لگا "پیسے کا ہے کے" میں نے کہا "تو کھانا مفت کھلاؤ گے کیا؟" وہ بولا "مفت نہیں۔ آپ اپنا کارڈ دکھائیے" میں نے کہا "کیسا کارڈ؟" وہ بولا "کھانے کا کارڈ" میں نے کہا "کارڈ وارڈ تو میرے پاس کوئی نہیں۔ تم پیسے لو اور کھانا دو" اس نے کہا "پیسوں کا یہاں چلن نہیں ہے۔" اتنے میں منیجر بھی آگیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کیا بات ہے۔ میں نے اسے سارا قصہ کہہ سنایا۔ وہ کہنے لگا "افسوس ہے کہ آپ کو یہاں کھانا نہیں مل سکتا۔ اس جگہ کا دستور یہ ہے کہ ہر شخص کو حکومت کی طرف سے ایک کارڈ ملتا ہے جس پر اس کے کام اور پیشے کے اعتبار سے اس کے کھانے کی قسم، معیار اور مقدار درج ہوتی ہے۔ وہ کارڈ دکھاتا ہے اور اسے کھانا مل جاتا ہے" میں نے کہا "لیکن میں نقد پیسے دیتا ہوں" منیجر مسکرا کر کہنے لگا "یہاں پیسوں کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ حکومت ضرورت کی دوسری تمام چیزوں کے لئے بھی کارڈ جاری کرتی ہے۔ اس شہر میں روپے پیسے کا چلن نہیں۔ ہر شخص اپنی قابلیت و استعداد کے مطابق کام کرتا ہے اور حکومت اس کی قابلیت و استعداد کے مطابق اس کی تمام ضروریات مہیا کرتی ہے۔ آپ کام کیجئے آپ کو کھانا مل جائے گا۔ اور اگر آپ نے اسی طرح چاندی کے ان سکوں سے کام نکالنے کی کوشش کی تو بھوکے مر جائیں گے"

میں نے کہا "لیکن اجنبی شہر میں مجھے پہلے ہی دن کام کیسے مل جائے گا؟" وہ بولا "کیوں نہیں۔ فرمایئے آپ کیا کچھ کر سکتے ہیں؟" میں نے کہا "انگریزی سے اُردو میں اور اُردو سے انگریزی میں روانی کے ساتھ ترجمہ کر سکتا ہوں۔ دونوں زبانوں میں برے بھلے مضمون بھی لکھنے پر قادر ہوں۔ نیوز ایڈیٹر کا کام بڑی اچھی طرح کر سکتا ہوں" وہ سوچ سوچ کر بولا "تو آپ جرنلسٹ معلوم ہوتے ہیں" میں نے کہا "جرنلسٹ کا لفظ تو مجھے قطعاً پسند نہیں۔ بہرحال آج کل میں یہی کام کر رہا ہوں" اس نے کہا "آپ کے پاس لائسنس ہے" میں نے کہا "میں قلم سے مضمون لکھتا ہوں۔ پستول سے نہیں" وہ بولا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہندوستان سے آئے ہیں۔ سُنا ہے کہ اس ملک میں ہر وہ شخص جو دوسرے تمام پیشوں میں ناکام رہ چکا ہو جرنلسٹ بن جاتا ہے تعلیم اور تجربہ کی متعلق کوئی قید نہیں۔" میں نے کہا "آپ نے مجھ پر ناجائز حملہ کیا ہے۔ میں پنجاب یونیورسٹی کا ایم اے ہوں اور مجھے صحافت کا اچھا خاصا تجربہ ہے۔" منیجر بولا "آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں نے آپ کی ذات کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے تو ہندوستان کی صحافت کا ذکر کیا تھا اور گستاخی معاف وہاں کے نظامِ تعلیم کے متعلق جو تھوڑا بہت میں جانتا ہوں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اکثر لوگ ایم اے پاس کر لینے کے باوجود اَن پڑھ ہی رہتے ہیں۔ لیکن خیر اس قصہ کو چھوڑیئے۔ لائسنس کے بغیر آپ کو کسی اخبار کے دفتر میں جگہ نہ ملے گی۔ قلم پستول سے زیادہ خطرناک ہتھیار ہے اور یہاں کسی اناڑی کو قلم اُٹھانے کی اجازت نہیں" میں نے کہا "اچھا اس وقت تو کھانا کھلایئے۔ اس کے بعد جو گزرے گی سہہ لیں گے" منیجر کے لہجے میں سختی آگئی اور بولا "آپ مہذب طریقے پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ یہاں بھیک مانگنا بہت بڑا جرم ہے" اب میرے لئے اس ہوٹل میں بیٹھ کر بیکار بحث کرنا بے سود تھا۔ اس لئے اُٹھ کر باہر چلا آیا۔ لیکن حیران تھا کہ کدھر جاؤں۔ بازار میں خوب چہل پہل تھی۔ ٹمبکٹو کے لوگ وجیہہ صحت مند، بشاش اور جامہ زیب معلوم ہوتے تھے۔ دکانیں بہت شاندار تھیں۔ بازار اتنا صاف تھا کہ کہیں کوڑے کرکٹ کا نام و نشان تک نہ نظر آتا تھا۔ میں ایسے ہی اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کہ میری نظر اپنے ایک دوست تیغ جی پر جا پڑی۔ ان کا اصل نام تو کچھ اور ہے لیکن ہم انہیں پیار

سے مولوی صاحب کہا کرتے ہیں۔ مولوی صاحب لمبے تو پہلے بھی کافی تھے۔ لیکن اب وہ کچھ موٹے بھی معلوم ہوتے تھے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ اپنے مولوی صاحب ہی ہیں یا ٹمبکٹو ہی کا کوئی باشندہ ہے کہ وہ بالکل میرے قریب آگئے۔ اور مجھے لپٹتے ہوئے بولے "آپ کہاں؟" میں نے کہا "مولوی صاحب مجھے تو شامتِ اعمال یہاں لے آئی۔ یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آگئے؟"

مولوی صاحب بولے "میں تو پچھلے دو سال سے یہیں ہوں"۔

"میرا خیال تھا کہ تم ابھی تک کالج ہی میں پڑھ رہے ہو"

"کالج تو میں نے کبھی کا چھوڑ دیا۔ ڈگری لیتے ہی میں یہاں چلا آیا"۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں سول انجنیئر ہوں۔ اور آج کل اس امر کی تحقیق کر رہا ہوں کہ مسلمانوں نے کتنی قبریں مٹا کر ان پر اپنے مکان تعمیر کر لئے ہیں"

"تو یہاں مسلمان بھی بستے ہیں کیا؟"

"یہاں مسلمانوں کی بہت آبادی ہے۔ لیکن مقامی مسلمان اس قسم کی حرکتیں نہیں کرتے۔ میں عام طور پر ٹمبکٹو سے باہر ہی رہتا ہوں۔ آج ہی ایک ایسی جگہ سے واپس آیا ہوں جہاں ایک حاجی صاحب نے پورا قبرستان ہموار کر کے کوٹھیاں تعمیر کر لی ہیں اور بیچ میں ایک چھوٹی سی مسجد بنا کر اس پر "روزِ محشر کہ جاں گداز بود اولیں پرسشِ نماز بود" کا کتبہ لگا دیا تھا"

"تو کیا تمہاری حکومت اسے خان صاحب کا خطاب دینے کا ارادہ رکھتی ہے؟"

"بھائی صاحب۔ یہ پنجاب نہیں۔ ہم اس پر مقدمہ چلا رہے ہیں۔ اور اسے یہ سزا دی جائے گی کہ وہ کم از کم چودہ سال تک گورکن کا کام کرے گا۔ لیکن چلئے اب گھر چلیں۔ بازار میں اس طرح کھڑے کھڑے باتیں کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا"۔

مولوی صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ میں نے سب سے پہلے کھانے کی فرمائش کی۔ مولوی صاحب نے کہا پہلے میری بیوی سے مل لیجئے۔ ایک دُبلی پتلی، حسین و جمیل انگریز لڑکی سے میرا تعارف کرایا گیا۔ میں کھانے کے دوران میں یہی سوچتا رہا کہ یہ مولوی صاحب بڑے حضرت نکلے۔ شادی کر لی اور ہمیں اطلاع تک نہ دی۔ کھانے کے تھوڑی دیر بعد جب ان کی بیگم اپنے کمرے میں چلی گئیں تو میں نے کہا

"یار تم نے اتنی جلدی شادی کیوں کر لی؟"

"یہاں یہ قانون ہے کہ بیس سال سے پہلے کوئی شادی نہیں کر سکتا اور اٹھائیس سال کے بعد کوئی "نارمل" آدمی کنوارا نہیں رہ سکتا۔ مجھے اچھی بیوی مل گئی میں نے کہا کہ اٹھائیس سال کی عمر تک انتظار کرنا بیکار ہے۔ اس لئے میں نے فوراً شادی کر لی"

"تمہاری بیوی کچھ پڑھی لکھی بھی ہے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ان پڑھ لڑکی سے میں شادی ہی کیوں کرتا اور سچ پوچھئے تو یہاں کوئی شخص ان پڑھ نہیں۔ میٹرک

تک تعلیم لازمی اور مفت ہے"

"تمہاری بیوی کام کہاں کرتی ہے؟"

"یہیں گھر میں۔ یہاں عورتیں نوکری نہیں کرتیں۔ بلکہ گھر کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ یوں وہ میرے کام میں ہاتھ بٹاتی رہتی ہے۔ میرے مسودے صاف کر دیتی ہے میرے خط ٹائپ کرتی ہے۔ گھر کا حساب رکھتی ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ میری سکرٹری ہے"

میں نے کہا "شیعہ ہے؟"

مولوی صاحب مسکرا کر بولے "آپ سے کس نے کہا؟ وہ تو عیسائی ہے"

میں نے کہا "خوب تم تو کہتے تھے کہ شیعہ، سنی کی شادی ہی نہیں ہو سکتی اور خود ایک عیسائی لڑکی سے بیاہ رچا لیا"

"میں نے کب کہا کہ شیعہ سنی کی شادی نہیں ہو سکتی میں نے تو اس وقت بھی یہی کہا تھا کہ مجتہد اجازت دے دیں تو شیعہ سنی کی شادی ہو سکتی ہے"

"تو یہاں کس مجتہد نے اجازت دی؟"

"یہاں مجتہد، مُلّا، پادری کسی کو داخلے کی اجازت نہیں۔ اس لئے شیعہ، سُنّی، مسلم، عیسائی سب آپس میں شادیاں کر لیتے ہیں"

"تو اب تم مطمئن ہو کہ تمہاری شادی جائز ہے؟"

"فقہ میں اس کی کوئی ممانعت نہیں"

"شیعیانِ حیدرِ کرار کے پاس بھی کوئی فقہ ہے؟"

"آپ قانونِ ملک کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اس جگہ مذہبی اور فرقہ وارانہ بحث سخت ممنوع ہے۔ آپ نے حسبِ عادت شیعوں پر کوئی حملہ کیا تو میں سُنّیوں پر جوابی حملہ ضرور کروں گا۔ اور پھر ہم دونوں گرفتار کر لئے جائیں گے"

"اچھا خیر اس بحث کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اس نیک بخت سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی؟" اب جو مولوی صاحب نے ساری داستان سنائی تو مجھے یاد آیا کہ یہ نورہ مبشر حسن وہی لڑکی ہے جس کی شادی انوار مولوی صاحب سے کرانا چاہتے تھے۔ اور میں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ شادی کے موقع پر اپنی طرف سے مولوی صاحب کو ایک موٹر بطور تحفہ دوں گا۔ میں نے کہا مولوی صاحب بتائیے آپ کیسی موٹر لینا پسند کریں گے؟"

مولوی صاحب نے کہا "ایک موٹر تو میرے پاس ہے۔ دوسری موٹر میں رکھ ہی نہیں سکتا۔ حکومت کے خیال میں مجھے صرف ایک موٹر کی ضرورت ہے۔"

اتنے میں ایک سپاہی آیا اور مولوی صاحب سے کہنے لگا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب جیل آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ اگر آپ جیل دیکھنا پسند کریں تو چلتے ہیں ورنہ میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کو اپنی معذرت کہلا بھیجتا ہوں۔ میں نے کہا چلئے جیل بھی دیکھ لیتے ہیں۔ مولوی صاحب نے موٹر نکالا اور ہم دونوں جیل پہنچ گئے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے میرا تعارف کرایا گیا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے آپ کے ہاں کے اکثر قیدی میری تحویل میں ہیں۔ کہئے تو ان سے ملاقات کرا دوں؟ میں نے اشتیاق ظاہر کیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب ہم دونوں کو

ایک کوٹھری کے سامنے لے گئے۔ اس کوٹھری میں چار قیدی بند تھے۔ اور میں چاروں کو پہچانتا تھا کیونکہ یہ بھی کبھی اخبار نویسی کیا کرتے تھے۔ ان کے سامنے ردی کاغذوں کے بڑے بڑے ڈھیر پڑے تھے۔ اور یہ لوگ کاغذ پھاڑ پھاڑ کر کھا رہے تھے۔ ایک سپاہی کوڑا لئے ان کے سروں پر مسلط تھا اور جب کبھی کسی قیدی کا ہاتھ رُکتا تھا وہ زور سے ایک کوڑا اس کی پیٹھ پر جما دیتا تھا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ یہ عجیب سزا ہے۔ ان کا جرم کیا ہے؟ سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا کہ یہاں کی سب سزائیں آپ کو عجیب معلوم ہوں گی۔ ان لوگوں کا جرم یہ ہے کہ یہ قوم فروشی کرتے تھے۔ قرآن کی آیت سے مقالہ افتتاحیہ شروع کرتے تھے اور قرآن کی آیت پر ختم کرتے تھے لیکن اصل متن میں شیطان کے کارندوں کی نہایت ذلیل اور گھٹیا خوشامد کرتے تھے۔ اب ان کی سزا یہی ہے کہ اپنے اپنے اخباروں کے پرانے فائل چباتے رہیں۔ اگلی کوٹھری میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کا استرے سے مونڈن سنسکار کیا گیا ہے اور دو سپاہی اسے ایک ٹب میں غوطے دے رہے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو پہچانا کہ قیدی ایک مشہور سیاستدان ہے۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ سے اس غریب کا گناہ پوچھا تو کہنے لگے کہ اس شخص کا حافظہ بہت کمزور ہے یہ صبح ایک اخباری بیان دیتا تھا۔ دوپہر کو اسے ایک وفد ملتا تھا اور یہ اس سے اپنے اخباری بیان کے بالکل برعکس باتیں کرتا تھا۔ شام کو اخبار نویسوں کی ایک کانفرنس بلاتا تھا اور اُن سے ان دونوں مواقع سے بالکل مختلف بات چیت کرتا تھا۔ میں نے کہا آپ اسے کیا سزا دے رہے ہیں؟ کہنے لگے اس ٹب میں بادام روغن ہے دو سپاہی دس بجے صبح سے لے کر شام کے چار بجے تک تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اسے اس ٹب میں غوطے دیتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا اگر حافظہ کی کمزوری کا تدارک ہی مقصود تھا تو سر پر بادام روغن کی مالش کی ہوتی۔ فرمایا وہ علاج ہوتا سزا نہ ہوتی اور میں شفاخانہ کا انچارج نہیں بلکہ جیل خانہ کا سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ آیئے اب آپ کو آگے لے چلیں میں نے کہا شکریہ جو کچھ دیکھ لیا۔ وہی کافی ہے۔ اب مزید تاب نہیں۔" تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے رخصت لی اور مجھے اپنی کوٹھی پر لے آئے۔ کہنے لگے" آپ اب واپس جا کر کیا کریں گے؟ یہیں بس رہئے" میں نے کہا "نہیں مولوی صاحب میرے لئے مستقل طور پر ٹمبکٹو ہی کا ہو رہنا سخت مشکل ہے"

"کیوں آپ کے لاہور سے تو ہزار درجے بہتر ہے۔ ٹمبکٹو فردوس بر روئے زمین ہے فردوس بر روئے زمین ——"

"کچھ بھی ہو میں تو وہیں رہوں گا جہاں میرے بھائی بہنیں اور دوست ہیں ان کے بغیر مجھے آپ کے فردوس کی زندگی منظور نہیں"

"اچھا تو دو چار مہینے تو اب یہاں ٹھہریئے نا آپ"

"یوں تو مجھے چھ مہینے ٹھہرنے میں بھی کوئی عذر نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میرا وقت کیسے کٹے گا۔ تم تو قبریں گنتے پھرو گے۔ تمہاری بیوی تمہارے مسودے ٹائپ کرے گی۔ میں کیا تمہارے بچے کو کھلایا کروں گا؟"

"یہ کچھ اتنا ناخوشگوار کام تو نہیں۔ اچھا تو بھائی صاحب کو یہاں بلا لیں پھر تو آپ ضرور ٹھہریں گے"

"کیا اچھی تجویز ہے۔ لیکن وہ آج کل ہیں کہاں؟"

"چیچو کی ملیاں"

گاڑی چیچو کی ملیاں کے ویران سٹیشن پر کھڑی تھی۔ ایک مسافر اسی موٹے پوری بیچنے والے سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کونسا سٹیشن ہے اور وہ کہہ رہا تھا۔ چیچو کی ملیاں بابوجی! چیچو کی ملیاں۔ میری گرما گرم پوریاں کھا لیجئے کبھی یہاں جنکشن تھا بڑی رونق ہوتی تھی۔ اب تو دن میں صرف چار مرتبہ گاڑی آتی ہے۔ سب خوانچے والے شیخوپورہ بھاگ گئے۔ صرف میں اب تک یہیں ہوں۔ اور یہیں رہوں گا۔ خدا ایک مرتبہ کھا کر تو دیکھئے بابوجی! ساری عمر یاد رکھو گے چیچو کی ملیاں کی پوریاں"

حمید نظامی

نوائے شوق

جلوہ موسےٰ کو سرِ طُور دکھانے والے
مصطفےٰ کو شبِ اسرےٰ میں بُلانے والے
نارِ نمرود کو گُلزار بنانے والے
کشتیٔ نوح کو طوفاں سے بچانے والے
گُل و گلزار میں دُنیا کو رِجھانے والے
مہ و خورشید میں دیدار دکھانے والے
کھیتیاں خشک زمینوں سے اُگانے والے
پانی گھنگھور گھٹاؤں سے گرانے والے
صورتیں خاک سے کیا کیا نہ بنانے والے
اپنے ہاتھوں اُنہیں پھر آپ مٹانے والے
زلزلہ کوہ میں اور دشت میں لانے والے
بحرِ زخّار میں طوفان اُٹھانے والے
او مری جان میں اور دل میں سمانے والے
میری اُجڑی ہوئی بستی کو بسانے والے
او مرے دل میں عجب ناز سے آنے والے
او مجھے پاس مرے رہ کے جلانے والے
او مجھے نت نئے انداز دکھانے والے
او مری دل کی لگی کو نہ بجھانے والے
دید سے تیری ہے محروم یہ ناشادِ حزیں
او مرے وہم و تصوّر میں نہ آنے والے

سید نذیر حسین ناشاد

دُعا

الٰہی مجھے دردِ دل کی دوا دے۔
بڑھا دے مرا درد، حد سے بڑھا دے۔
سکھا کر مرے دل کو مشکل پسندی
مری مشکلیں ساری آساں بنا دے۔
نہ باقی رہے تلخ کامی یہ میری؛
مئے تلخ کے خُم پیاپے پلا دے۔
ابھی میرا زخمِ جگر چارہ جُو ہے؛
تو اس کو علاج آپ اپنا بتا دے۔
زباں ہے ابھی خُوگرِ شکوہ سنجی؛
اسے شیوۂ راز داری سکھا دے۔
غموں کا ہجوم آفتِ جاں ہے مجھ کو؛
وُہ غم دے مجھے جو یہ سب غم بُھلا دے۔
یہ شوریدہ سر ہے مجھے بارِ گردن؛
الٰہی تو اس سر میں سودا نیا دے۔
عطا کر مجھے عشق کی پختہ کاری؛
جنوں میری آشفتگی کو بنا دے۔

محمد ہادی حسین (انڈین سول سروس)

اصغر کی یاد میں

تھوڑا عرصہ ہوا میرے نام ایک خط آیا۔ "ایک ایسے دور افتادہ مخلص کا سلام شوق قبول فرمائیے جس نے آج تک کوئی خط لکھ کر آپ کو زحمتِ مطالعہ تو نہیں دی مگر آپ کے نام کی محبت وہ اپنے دل میں جاگزیں پاتا ہے...... اُن دو دلوں میں کشش ہوتی ہے یا ہونی چاہیئے جو ایک ہی تیر کے نشانہ ہوں ایک غم زدہ دوسرے غم زدہ کا ہمدرد ہوا کرتا ہے..... مسلسل ایک سال سے ہمایوں میری آنکھوں کو نور بخش رہا ہے لیکن اس مجلہ تاباں میں ایک تاریک باب ایسا بھی مستقل پاتا ہوں جس کے مطالعہ نے میرے غم زدہ دل کی نگاہ میں دُنیا تاریک کر دی ہے اور ایک خلش بے پناہ ہر ماہ سونپی ہے جس کا اثر ایک ایک ہفتہ دل و دماغ پر مرتسم رہا ہے۔ وہ باب ہے "اصغر کی یاد میں" بھائی! ایسی نعمت کھو جانے پر آپ کی جو حالت ہو جائے وہ کم ہے..... وہ صدا ایک حقیقی مرثیہ ہوتی ہے اُس کا ہر حرف اپنے دامن میں ہزاروں نیر و نشتر پنہاں کئے ہوتا ہے...... میرا یہ کہنا تو دیوانہ کی بڑ ہوگی کہ صبر کیجئے...... مگر تاہم اس باب میں کچھ کہنا ضرور چاہتا ہوں...... انسان کی ترکیب کچھ اس انداز سے ہوئی ہے کہ وہ خود غرض اور خائن بن کر رہ گیا ہے۔ یہ بھی میرا وہ بھی میرا یہ اُس کا نعرہ ہے لیکن اگر وہ چشمِ بصیرت سے دیکھے تو اُس کا کچھ بھی نہیں حتّٰی کہ اُس کے اعضا، اُس کے خیالات، اُس کے عزائم بھی اُس کے نہیں بلکہ اُن کی مالک کوئی دوسری ہستی ہے یا اِس مشین کو حرکت میں لانے والا پرزہ کوئی اور ہے جو صرف اپنے منشا کے مطابق اُس کو چلاتا رہتا ہے اور جس قدر کام لینا مقصود ہوتا ہے اُس کی تکمیل کے بعد یہ مشین بند کر دی جاتی ہے...... اصغر مرحوم ایک خوش رنگ پودا تھا اس باغِ جہاں کا اور اُس کی حفاظت آبپاشی نیز پیراستگی کے لئے بشیر میاں مالی مقرر کئے گئے تھے۔ مالکِ باغ کی نگاہ میں وہ پودا کثیف دُنیا کے غبار آلود گلزار میں رہنے کے قابل نہ تھا، اُس کو یہاں سے اُٹھا کر جنت الفردوس میں لگا دیا اور بشیر میاں کو اُس کی خدمات سے سبکدوش کر دیا۔ اور بشیر میاں کو ملال کا کیا حق؟ وہ ملازم سے مالک کیوں بننا چاہتے ہیں؟...... اہلِ دُنیا اِس حقیقت کو نہ سمجھے تو خدا کو اُن کی دلجوئی کے لئے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْن کا ترانہ سنانا پڑا۔ بھائی اصغر ایسے اعلیٰ مقام میں مقیم ہیں جس کے مقابلے میں یہ نجس دُنیا جس میں اُسے رکھنے کے آپ متمنی تھے ایک تاریک غار ہے پھر کیا آپ کو مطمئن نہ ہونا چاہیئے کہ آپ کا لختِ جگر ایک ممتاز عہدے پر مامور ہے اور ایسے آرام کا حامل ہے جو آپ اُسے ہرگز نہ پہنچا سکتے تھے۔ یہی تو ہے نا کہ وہ آپ کی آنکھ سے اوجھل ہے۔ آنکھ سے اوجھل تو جب بھی تھا جب آپ پنجاب میں تھے اور وہ انگلینڈ میں۔ بس آپ سمجھ لیجئے کہ مدتِ قیام کچھ اور بڑھ گئی آج نہیں کل اُس سے ملاقات ہوگی...... یہ دُنیا گزشتنی و گزاشتنی ہے دل کو دوسری جانب متوجہ کیجئے خیال بانٹئے۔ آپ کے اور میرے ساتھ کوئی نیا کام نہیں ہوا اس سے سخت سخت مثالیں دُنیا پیش کر چکی ہے۔"

(از نوادہ ـ بدایون)

ب

انگریزی کے مشہور ادیب ماورفن ستارہ بائرن

بائرن

جن دنوں پران زینی کے عجیب وغریب مقدمے کے متعلق ہر جگہ بحث ہو رہی تھی، سرکاری وکیل ایم آلیورنے ایک حیرت انگیز واقعہ سنایا،

"میں تمہیں ایک حیرت انگیز واقعہ سناتا ہوں....... اس وقت میں پبلک پراسیکیوٹر تھا اور میرا باپ پیرس کا صدر...... میرے پاس ایک عجیب مقدمہ آیا....... ایم مائرن شمالی فرانس کے ایک گاؤں میں سکول ماسٹر تھا...... وہ اپنی ذہانت اور شرافت کے باعث گردونواح میں بہت مشہور تھا....... وہ ایک نہایت کم گو انسان تھا....... اس نے بائسلن میں جہاں وہ سکول ماسٹر تھا ایک پری چہرہ لڑکی سے شادی کرلی، اس کے تین بچے پیدا ہوئے لیکن تینوں یکے بعد دیگرے تپ دق کا شکار ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے بچوں کو کھو کر اس نے اپنی تمام محبت اپنے ہونہار شاگردوں کے لئے وقف کر دی ہے، وہ اپنی جیب سے روپیہ خرچ کر کے اپنے شاگردوں کے لئے کھلونے لاتا، ان ننھے بچوں کو کھانے پر مدعو کرتا اور انہیں نہایت عمدہ کیک اور مٹھائیاں کھلاتا، گاؤں کا ہر شخص اس نیک انسان کی نرمی اور رحمدلی کی تعریف کرتا، اچانک اس کے پانچ ہونہار شاگرد کسی نامعلوم بیماری کی وجہ سے مر گئے، کافی کوشش کی گئی کہ اموات کی وجہ معلوم کی جائے لیکن بے سود! کیونکہ بیماری کی علامات ہی کچھ عجیب قسم کی تھیں، بچوں نے پیٹ میں نہایت شدید تکلیف محسوس کی اور وہ کچھ کھا پی نہ سکے اور چند دنوں میں اس دردناک عذاب میں جان دے دی۔ اس کے بعد پورے ایک سال تک کوئی موت نہ ہوئی، پھر چار دن میں مائرن کے دو عزیز ترین شاگرد فوت ہو گئے۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم کیا گیا، مردہ بچوں کے جسم کے مختلف اعضاء میں شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پائے گئے، کہا گیا کہ دونوں بچوں نے کوئی ایسی چیز کھائی ہے جس میں بے احتیاطی کی وجہ سے شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مل گئے، معاملہ یہیں ختم ہو جاتا لیکن اتفاقاً مائرن کا نوکر بھی انہیں دنوں میں اسی بیماری میں مبتلا ہو گیا، اور وہی شیشے کے ٹکڑے آپریشن کرنے سے اس کے جسم کے مختلف اعضاء میں ملے، آخر اس نے اعتراف کیا کہ اس نے اپنے آقا کی وہ مٹھائی چرا کر کھائی تھی جو مائرن اپنے شاگردوں کے لئے لاتا تھا۔ عدالت کے حکم سے سکول ماسٹر کے گھر کی تلاشی لی گئی، ایک الماری میں کچھ کھلونے اور مٹھائی ملی، تمام اشیائے خوردنی میں شیشے کے چھوٹے ٹکڑے ملے ہوئے تھے، مائرن اسی وقت گرفتار کر لیا گیا لیکن اس کے چہرے کی رنگت اور اس کے طرز تکلم سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے اس سنگین جرم کا ارتکاب نہیں کیا، جرم اتنا نمایاں تھا کہ اس کو بے گناہ تصور کرنا ایک امر محال سا معلوم ہوتا تھا لیکن جب اس کی نیکی، رحمدلی اور نرمی کے واقعات سامنے آتے تو انسان یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ایسے نیک دل انسان نے اتنے مکروہ فعل کا ارتکاب کس جذبہ کے ماتحت کیا اور اس پر طرہ یہ کہ وہی لڑکے موت کا شکار ہوئے جو اس کے نزدیک عزیز ترین تھے اور جن پر وہ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ صرف کرتا تھا،

اگر یہ مانا جائے کہ یہ اسی کا کام ہے تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ دیوانہ ہو گیا ہوگا، لیکن مائرن اتنا عقلمند اور ذہین نظر آتا تھا کہ اس کو پاگل کہنا ایک بے معنی سی بات معلوم ہوتی تھی۔

اس نے کہا کہ کسی نامعلوم دشمن نے مجھ کو پھنسانے کے لئے یہ مٹھائی وہاں رکھ دی ہوگی۔ یہ بات قرینِ قیاس تو تھی لیکن اس کو کیا کیجئے کہ اس کی میز کی خاص دراز میں جہاں وہ اپنی نقدی رکھتا تھا ایک چھوٹی سی ڈبیا شیشے کے ٹکڑوں کی بھری ہوئی ملی۔ مائرن نے اس پر بھی اقبالِ گناہ نہ کیا بلکہ یہ ظاہر کیا کہ اس کے دشمن کی اُسے پھنسانے کی آخری کوشش ہے۔ لیکن "سینٹ بارلو" کے ایک دُکاندار نے عدالت میں اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ مائرن نے اُس سے کئی دفعہ نہایت باریک سوئیاں خریدیں اور اس نے کئی ایسے گواہ بھی پیش کئے جنہوں نے مائرن کو اکثر سوئیاں وغیرہ خریدتے دیکھا تھا، کئی چھوٹے بچوں نے اس بات کی گواہی بھی دی کہ مائرن اپنے شاگردوں کو تمام مٹھائی اپنے سامنے کھلاتا تھا اور باقی ماندہ یک دم اکٹھی کر لیتا تھا،

ہر طرف سے پبلک نے یہ صدا بلند کی کہ اس جرم کی سزا سخت سے سخت ہونی چاہئے۔ آخر مائرن کی موت کا حکم سنا دیا گیا اور اس کی اپیل بھی نامنظور کی گئی۔ میرے باپ نے پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ اپیل نامنظور ہوگی،

ایک دن جبکہ میں اپنے دفتر میں کسی کام میں مصروف تھا ایک بوڑھا پادری میرے پاس آیا، وہ نہایت غمگین دکھائی دیتا تھا، چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا کہ اگر مائرن کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا تو یہ ایک بے گناہ کا قتل ہوگا اور پھر وہ بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ بوڑھے پادری کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے

"یہ ایک بے گناہ کا قتل ہوگا"

اُس نے یہ الفاظ کچھ ایسے انداز میں کہے تھے گویا وہ ایک بے گناہ کی جان بچانا چاہتا ہے۔ ایک گھنٹے کے بعد میں اپنے والدِ ماجد کے ہمراہ پیرس گیا، دوسرے دن ہم نپولین سوم شہنشاہِ فرانس کی خدمت میں حاضر ہوئے، میں نے تمام معاملہ شہنشاہ کے سامنے بیان کیا، اِس دوران میں دروازہ کھلا اور ملکہ داخل ہوئی۔ شہنشاہ نے تمام قصہ سننے کے بعد ملکہ سے مشورہ طلب کیا۔ ملکہ نے حالات سُن کر کہا "اس شخص کو ضرور معاف کرنا چاہئے..... ضرور،..... کیونکہ وہ بے گناہ معلوم ہوتا ہے" پہلے تو شہنشاہ رضامند نہ ہوا لیکن جب ملکہ نے کہا کہ "ایک گناہ گار کو بخش دینا ایک بے گناہ کے قتل سے کہیں بہتر ہے" تو شہنشاہ نے موت کا حکم منسوخ کر دیا اور قیدِ سخت کا حکم دے دیا، کچھ عرصہ بعد میں نے سُنا کہ مائرن اپنے اعلیٰ کیریکٹر کی وجہ سے سرکاری ملازمت میں لے لیا گیا ہے، پھر کافی عرصہ تک میں نے اِس شخص کے متعلق کچھ نہ سنا،

کچھ عرصہ بعد جب میں لِل میں موسمِ گرما بسر کر رہا تھا تو ایک شام مجھے ایک نوجوان پادری کا ملاقاتی کارڈ ملا۔۔۔ میں نے اسے اندر بُلایا

"آپ براہِ مہربانی تھوڑی دیر کے لئے میرے ساتھ چلئے، ایک شخص جو چند لمحوں میں موت کا شکار ہونے والا ہے، آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، جن دنوں میں منصف تھا ایسے واقعات اکثر پیش آیا کرتے تھے، میں پادری کے پیچھے پیچھے ہو لیا، وہ مجھے ایک خستہ حال مکان میں لے گیا۔ خشک گھاس پر ایک نحیف و زار جسم ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہونے کی تیاری کر رہا تھا، اس کی گہری چمکتی ہوئی آنکھوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے،

اس نے نحیف آواز میں کہا "آپ مجھے پہچانتے ہیں؟"

میں نے آہستہ سے جواب دیا "نہیں"

"میں مائرن ہوں ۔۔۔۔۔ !"

میں یہ سُن کر کانپ گیا لیکن پھر کہا ۔۔۔۔۔۔۔۔ "ہاں سکول ماسٹر!"

اس نے آہستہ سے کہا "جی ہاں"

میں نے پوچھا "آپ یہاں کیسے آئے ؟"

اس نے مشکل سے سانس لیتے ہوئے کہا ۔۔۔۔ "وقت بہت کم ہے، اور مجھے بہت کچھ اعتراف کرنا ہے، بہت کچھ کیونکہ آپ نے میری جان بچائی تھی، اپنے سوکھے ہوئے ہاتھ سے اس نے اپنے بستر کی گھاس کا ایک تنکا اٹھایا اور یوں کہنا شروع کیا :-

میں سچ سچ کہوں گا کیونکہ یہ ضروری ہے کہ یہ دُنیا چھوڑنے سے پیشتر میں اپنا راز کسی کو بتاؤں، ـــــ وہ میں ہی ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں ہی! جس نے سب بچوں کی جان لی، صرف انتقام کے لئے،

سنئے! میں ایک دیانت دار شخص تھا، بہت دیانت دار، اپنا بیشتر وقت خدا کی عبادت میں صرف کرتا ـــــ اچھے اور پیارے خدا کی عبادت میں جو حسن و پاکیزگی کی تخلیق کرتا ہے اور ہمیں درسِ محبت دیتا ہے، ـــــ جھوٹے خدا کی نہیں، جو قاتل ہے ـــ ظالم، بے رحم، سفاک اور جو زمین پر جبر و استبداد کی حکومت کرتا ہے! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا تھا اور نہ کبھی کسی کو دھوکا ہی دیا۔

جب میری شادی ہوگئی تو میرے تین بچے پیدا ہوئے، میں اُن سے محبت کرتا تھا ۔۔۔۔۔۔ اتنی ۔۔۔۔۔ جتنی آج تک کسی باپ نے اپنی اولاد سے نہ کی ہو، ـــــ میں صرف ان کے لئے زندہ تھا، آہ میں کتنا احمق تھا! آہ! وہ تینوں مجھ سے چھین لئے گئے، کیوں؟ ـــــ کیوں؟ میں نے کونسا گناہ کیا تھا۔ جس کی پاداش میں میرے پیارے بچے مجھ سے چھین لئے گئے؟ ـــــ اُس دن سے میری فطرت بدل گئی، میرا دل بدل گیا ۔۔۔۔۔۔۔

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں پہلے ایک خواب دیکھ رہا تھا اور اب اُس خوابوں کی بستی سے کوسوں دُور ہوں ۔۔۔۔۔

جناب! خُدا زندگی صرف اس لئے دیتا ہے کہ اُسے چھین لے؛ خُدا ۔۔۔۔۔۔۔ خُدا ایک قاتل ہے، ہر روز اُس کے دل بہلاؤ کے لئے کوئی نہ کوئی موت ضروری ہے، اسی لئے اس نے تمام بیماریوں کی طرح ڈالی ہے، ۔۔۔۔۔ طاعون ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیضہ ۔۔۔۔۔۔ تپ دق ۔۔۔۔۔۔۔۔ چیچک اور نہ معلوم اور کیا کیا طرزِ ستم اِس ستم ایجاد نے ایجاد کی ہے؛

لیکن یہ بھی کافی نہیں ـــــ وہ اکثر قحط اور جنگ کی صورت میں عذاب نازل کرتا ہے، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تاکہ وہ ہزار ہا انسانوں کو خون و آتش میں تڑپتا ہوا دیکھے، ۔۔۔۔۔۔۔

اس پر بھی اکتفا نہیں ـــــ اس نے ایسے انسان پیدا کئے ہیں جو دوسروں کا خون چوستے اور ان کی ہڈیاں تک چبا ڈالتے ہیں۔ لیکن خدا ان تمام چیزوں کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اُف اظلم! قہر! ۔۔۔۔ اُف

تو جناب! میں نے بھی کچھ بچوں کی جان لی۔ ان کی جان لینے والا ان کا خالق نہ تھا بلکہ میں مائرن تھا ۔۔۔۔۔۔ مائرن!

اس کے بعد میرا جُرم ثابت ہوگیا اور مجھے سزائے موت دی گئی۔ میری موت دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا لیکن ایک پادری کے سامنے میں نے جھوٹ بولا اور میں نے اپنی جان بچالی۔

اب یہ کھیل ختم ہوچکا —— اب میں اس خدا کی گرفت سے نہیں بھاگ سکتا .... لیکن اب مجھے اس کا کوئی خوف نہیں!

اب ماٹرن بڑی دقّت سے سانس لے رہا تھا اور اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ سُننا مشکل تھا ....۔ اُف اس کی صورت اس وقت کتنی بھیانک تھی!

میں نے کہا —— "کیا تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "کچھ نہیں"

میں نے کہا "الوداع!" اور نہایت جلدی سے مکان سے باہر نکل آیا!

(موپاساں)

"ناکام آرزو" بلرزا

توارد
ناگن سے خطاب

چینی

کبھی یہاں چین خاندان کے باعظمت وجبروت بادشاہوں کے عظیم الشان خوشنما محلات تھے۔

آج ان محلات سے کیا باقی بچا ہے
صرف چند ٹوٹے پھوٹے کھنڈر
جہاں جھینگر بولتے ہیں

فارسی

آں شاہے کہ خویش را بلاکو می گفت
وز کبر دمنی حرف بہ ابرو می گفت
بر کنگرۂ سرائے او فاختۂ
امروز نشستہ بود دکوکو می گفت

میرزا طالب شیرازی

غلط فہمی

اے حسینہ، یہ مرے گیت نہیں تیرے لئے۔
میں کبھی ان میں مخاطب نہیں کرتا تجھ کو۔

اپنی رعنائی پہ نازاں کیوں ہے؟
جب کتب خانے کے زینے پہ تجھے ملتا ہوں،
یا سرِ راہ گذر سامنا ہوتا ہے مرا،
کھیلتی ہیں ترے چہرے پہ شفق رنگ حیا کی لہریں
آنکھوں آنکھوں میں تجھے چوم رہا ہوں جیسے۔
نیچی نظریں کئے تیزی سے گزر جاتی ہے۔
اور پھر دُور سے منہ موڑ کے تو
دیکھتی ہے مری جانب جیسے
تجھ کو رہ رہ کے مزہ دے یہ خیال
میری نظریں ہیں ترے جسمِ حسیں پر اب تک،
اور افزائشِ لذت کے لئے دیکھے تو۔
اپنی رعنائی پہ نازاں کیوں ہے؟
تو سمجھتی ہے مجھے عشق ہوا ہے تجھ سے،
اور مرے شعر مرے دل کے ہیں پیغام۔

چہ خوب!
کتنی دلکش ہے غلط فہمی تری!
اے حسینہ، یہ مرے گیت نہیں تیرے لئے

محمد صفدر

غزل

پیارا سماں ہے پیاری رات
آؤ سناؤں دل کی بات

میں یہ سمجھا، آئے تم!
جوں ہی کھڑکا کوئی پات

چپکے چپکے روتا ہوں!
اکثر ساری ساری رات

لطف کے قابل ہیں نہ سہی
سیدھے منہ تو کیجے بات!

جی میں کیا ہے جانے کون
بول ہیں سارے قند و نبات

اشکوں کا یہ عالم ہے
جیسے آئی ہو برسات

ساقی اور بھی اک ساغر!
باقی ہے اب تھوڑی رات

بھائی بھائی سب انساں
تیری ذات نہ میری ذات

سلیمان اریب

اُردو زبان اور دکن کے غلط العام الفاظ

اُردو ہماری ملکی زبان ہے اور حیدرآباد دکن اس کے اوّلین گہواروں میں سے ہے لیکن حیدرآباد کے اکثر تعلیم یافتہ اپنی زبان کے مقامی اسقام کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ قائم نے غالباً ایسی ہی خامیوں کو پیشِ نظر رکھ کر کہا تھا ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ — اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

اب ذیل میں دکنی زبان کے متعلق چند اسقام پیش کئے جاتے ہیں:۔

(۱) اُردو میں مرہٹی کے بعض ہندسے بولے جاتے ہیں مثلاً اُنچالیس (اُنتالیس) ترتالیس (تینتالیس) چوپن (چوّن) ترتر (تہتّر) چوہتر (چوہتّر) نود (نوّے) وغیرہ

(۲) ٹھنڈ، ٹھاٹ، ٹھٹ، ٹھٹّھا وغیرہ کی بجائے تھنڈ، تھاٹ، تھیٹ، تھٹّھا وغیرہ بولنا غلط ہے۔ کیونکہ اُردو میں ٹھ سے بولا جاتا ہے یا بعد الفاظ مرہٹی بھاشا کے ہیں۔

(۳) اُس، اُن کی کتابت میں الف کے بعد واؤ زیادہ کرکے اوس، اون لکھا جاتا ہے جو متروک ہو چکا ہے لہذا بجائے واو کے الف پر پیش دینا کافی ہے مثلاً

گُل کی جو خبر سنائی اُس کو — گلشن کی ہوا سمائی اُس کو

(۴) کہا (कहा) اور کھا (खा) دو علیحدہ لفظ ہیں۔ اگرچہ ان کے تلفظ میں اختلاف ہے لیکن اس کے املا میں فرق نہیں رکھا جاتا مثلاً کھاتہ (کھاتا) ساتھہ (ساتھ) وغیرہ کو ہائے دوچشمی سے لکھنا صحیح ہے اور چُولھا (چُولہا) ننھا (ننہا) وغیرہ کو ہائے دوچشمی سے لکھنا غلط ہے لہذا ان ہردو کی کتابت میں امتیاز ضروری ہے (؟) "ہمایوں"

(۵) پاؤں، گاؤں وغیرہ بروزن جاؤں، آؤں صحیح ہیں لیکن ان کو بروزن جانوں، مانوں لکھنا غلط ہے۔

(۶) اسماء کے حرفِ آخر میں ہائے مختفی اور ہائے اصلی کے لکھنے میں امتیاز نہیں رکھا جاتا جس سے تلفظ میں غلطی ہونے کا امکان ہے۔

(ہائے مختفی) بھروسہ، دھوکہ، راجہ، ڈاکیہ وغیرہ۔

(ہائے اصلی) یہ، ہگ، منہ، مینہ، وجہ، توجہ وغیرہ

ہندی الفاظ میں ہائے مختفی کی بجائے الف لکھنا چاہئے مثلاً بھروسا، دھوکا، ڈاکیا وغیرہ یا ہائے اصلی کے لکھنے میں نمایاں فرق رکھا

(نوٹ) صاحبِ مضمون نے بعض مقامی محاورات اور اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو غلط قرار دیا ہے۔ وہ ان میں سے اکثر کو ترک کر دینے کی تلقین کرنے میں حق بجانب ہیں مگر انہیں غلط کہنے کا حق نہیں رکھتے۔ "ہمایوں"

جائے مثلاً یہہ، جگہہ وغیرہ

(۷) ماضی متعدّی معروف کے افعال، فعل لازم کے قیاس پر بولنا اور لکھنا غلط ہے مثلاً

(مرد) میں روٹی کھایا ہوں ہم رخصت لئے ہیں وہ درخواست دئے ہیں وغیرہ

(عورت) میں کھانا کھائی ہوں ہم کتابیں پڑھے ہیں وہ کاغذ دی ہے وغیرہ

اس میں فعل، فاعل کے لحاظ سے نہیں لایا جاتا بلکہ فعل کا دارو مدار مفعول پر ہُوا کرتا ہے مثلاً

(مرد ہو یا عورت) میں نے روٹی کھائی ہم نے کھانا کھایا اُس نے کتابیں پڑھی ہیں۔

حرمت میں لگایا داغ تُو نے لٹوائی بہار باغ تُو نے

ہم ان افعال کو فعل لازم کے طریقے پر استعمال کر سکتے ہیں بشرطیکہ فعل کی شکل بدل دیں مثلاً

(مرد) میں روٹی کھا چکا ہوں ہم رخصت لے چکے ہیں وہ گھڑی دے چکا ہے

(عورت) میں کھانا کھا چکی ہوں ہم کتابیں پڑھ چکے ہیں وہ مٹھائی کھا چکی ہے

رُخ دیکھ چکی ہوں اب ترا میں مُنہ دوسرے کو دکھاؤں کیا میں

نافہمی سے خوار ہو چکے ہو اَب تو سیکھو کہ کھو چکے ہو

(۸) فعل ماضی متعدی معروف کی تذکیر و تانیث مفعول کے تابع ہوتی ہے مثلاً میں نے بمبئی دیکھی۔ لیکن اگر حرف مفعول کو کا استعمال کیا گیا ہو تو پھر یہ پابندی باقی نہیں رہتی جیسے میں نے بمبئی کو دیکھا۔

(۹) جس جملہ میں فعل مجہول ہو علامت کو کا لانا خلاف محاورہ ہے مثلاً مجھے بُلایا گیا۔ ملزم کو رہا کیا گیا۔ اس کا صحیح طریقہ استعمال یوں ہے۔ میں بلایا گیا۔ مُلزم رہا کیا۔

(۱۰) عورتوں کے متعلق جو جُملے برتے جاتے ہیں وہ غیر صحیح ہوتے ہیں مثلاً بیگم صاحب یاد فرماتے ہیں۔ لڑکیاں سکول جا رہے ہیں۔ اہل دہلی و لکھنؤ یوں کہتے ہیں جیسے بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ لڑکیاں سکول جا رہی ہیں۔

جھُک جھُک کے بدن چرائی آئیں رُک رُک کے قدم بڑھاتی آئیں

بیپا را جو نہ تھا تو کھو گئیں کیوں؟ بدراہ بھی آپ ہو گئیں کیوں؟

(۱۱) دستخط کا لفظ دست اور خط سے مرکب ہے یہ دونوں لفظ مفرد کی حالت میں مذکر بولے جاتے ہیں اور مرکب کی صورت میں جمع مذکر لیکن ہمارے ہاں دستخط واحد مؤنث استعمال کیا جاتا ہے مثلاً میں نے دستخط کی۔

(۱۲) تُم کے ساتھ جو افعال لائے جاتے ہیں وہ غیر صحیح ہوتے ہیں مثلاً تُم آتے ہیں، آرہے ہیں، آئیں گے۔ آئے ہیں۔ ہوں گے۔ اس کے صحیح افعال یوں ہیں۔ تُم آتے ہو، آرہے ہو، آؤ گے، آئے ہو، ہو گے مثلاً

تُم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی ہم جوت جگاتے ہیں من کی، تم اُس کو آ کے بجھاتے ہو

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو! تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور

(۱۳) ہمیں یا ہم کو۔ مجھے یا مجھ کو۔ تمہیں یا تم کو۔ تجھے یا تجھ کو کی بجائے ہمارے کو، میرے کو، تمہارے کو، تیرے کو بولنا غلط ہے۔

(۱۴) چھونا کی بجائے چھینا بولنا غلط ہے۔

نزاکت اُس گُلِ رعنا کی دیکھیو انشا نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

(۱۵) کاچھ (دھوتی کا وہ حصہ جو پیچھے گھرسا جاتا ہے) کی بجائے مرہٹواڑی میں کاشٹا اور تلنگانہ میں لنگوٹی کہتے ہیں۔

(۱۶) پردہ کے بجائے گوشہ بولنا غیر صحیح ہے مثلاً

اُس پردہ نشیں سے کوئی کس طرح بر آئے جو خواب میں بھی آئے تو مُنہ ڈھانک کر آئے

(۱۷) کُتی، گدھی، بڑھی کو کُتیا، گدھیا، بڑھیا وغیرہ بولنا فصیح تر ہے۔

(۱۸) وہی، یہی، ہمیں، تمہیں وغیرہ کی بجائے وُہ ہی، یہہ ہی، ہم ہی، تم ہی لکھنا غلط ہے مثلاً

صورت وہی رنگِ رو وہی ہے لہجہ وہی گفتگو وہی ہے

یہی حال دُنیا میں اس قوم کا ہے بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے

اور پنجاب میں اسی کو، انہیں کو کی بجائے اس ہی کو یا اس کو ہی، ان ہی کو یا ان کو ہی لکھتے ہیں جو غلط ہے۔

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے جہاں کی وراثت اُسی کو سزا ہے

دم اُن کا ہے دُنیا میں رحمت خُدا کی انہیں کو ہے پھبتی خلافت خُدا کی

(۱۹) جس جگہ پر کوڑا ڈالا جاتا ہے اُس کو گھورا کہتے ہیں لیکن مرہٹواڑی میں اُکھنڈا اور تلنگانہ میں گمرڑ کہتے ہیں۔

(۲۰) اکثر عبارت میں چونکہ اور اگرچہ کا استعمال بے محل ہوتا ہے اس لئے ان کا صحیح استعمال یوں ہے:۔

(۱) چونکہ آپ نے بُلایا تھا اِس لئے میں آیا۔ (۲) اگرچہ میں نے رات دن محنت کی لیکن پاس نہ ہُوا۔

(۲۱) جلانے کی لکڑی کو اِیندھن کہتے ہیں لیکن اس کے معنی میں لکڑی بولنا غلط ہے مثلاً

یہ پتھر کا ایندھن ہے جلوانے والا جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا

(۲۲) انگیٹھی کو مرہٹواڑی میں سیگڑی اور تلنگانہ میں لوہے کا چُولہا بولتے ہیں جو غیر صحیح ہے مثلاً

کچھ لحافوں سے ابھی مُنہ کو نکالے ہیں پڑے لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے

(۲۳) دُودھ دوہنا بولنے کی بجائے دُودھ نچوڑنا یا نکالنا کہنا خلافِ محاورہ ہے۔

ذودھ ان کا دوہا، پیا، کھا لو　　　گوبر کے انہیں کا چوتھ پھینکو

(۲۴) جب کاتب اپنی عبارت یا مضمون میں ایک لفظ یا جملہ کا دوسرے لفظ یا جملہ سے جدا کرکے معنی واضح کرنے کے لئے ٹھیراؤ (وقفہ) کرتا ہے تو مبتدی کو عبارت کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آتا ہے اس لئے رموزِ اوقاف کا استعمال ضروری ہے مثلاً موہن، سوہن اور رام آج سکول کیوں نہیں گئے؟

(۲۵) وہ، یہ کو اُنے اِنے بولنا غلط ہے مثلاً اُنے آیا، اِنے لایا وغیرہ

(۲۶) گائے کے بچے کو بچھڑا، بچھڑی کہتے ہیں لیکن ان کو پاڑا، پاڑی بولنا غلط ہے۔

(۲۷) بعض الفاظ کا تلفظ غلط ہوا کرتا ہے مثلاً مُکَمَّل (دوسرا میم مفتوح ہے) مُسَلسَل (دوسرا سین مفتوح ہے) وغیرہ

(۲۸) پنجاب میں بعض افعال کا استعمال بے محل ہوتا ہے مثلاً پھوڑنا، پھاڑنا، توڑنا، پھوٹنا، پھٹنا، ٹوٹنا وغیرہ

پانچ چھ سال کا ذکر ہے کہ بٹالہ (پنجاب) میں شارٹ ہینڈ سیکھنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ ایک دن میرے ہم جماعت نے کہا "لکڑی پھاڑنا" میں نے کہا کہ لکڑی پھاڑنا خلافِ محاورہ ہے کیوں کہ اُردو میں لکڑی پھاڑنا نہیں کہتے بلکہ لکڑی پھوڑنا کہتے ہیں۔ پھاڑنا کپڑے کے ساتھ لایا جاتا ہے۔ مثلاً کپڑا پھاڑنا۔

(۲۹) لالٹین ایک عام فہم لفظ ہے لیکن بجائے اس کے دکن میں قندیل بولتے ہیں مثلاً

آزاد لکھتے لکھتے ہی آدھی تو ڈھل گئی　　　اور شمع لالٹین میں ساری پگھل گئی

پارسال لاہور میں مجھے ایک لالٹین لینے کی ضرورت داعی ہوئی میں نے ایک دُکان دار سے پوچھا کہ قندیل (لالٹین) کہاں بکتی ہے اُس نے متعجب ہو کر کہا کہ قندیل کیا چیز ہے؛ پھر میں نے لالٹین کا نام بتایا تب کہیں ان کی سمجھ میں آیا

اسی طرح ڈاک خانہ کو ہمارے ہاں پٹہ خانہ بولا جاتا ہے تھوڑے دن کی بات ہے کہ لاہور وغیرہ سے دو تین پارسل آئے ہوئے تھے جن پر انگریزی میں (Patta Khana) پٹہ خانہ لکھا ہوا تھا۔ وجہ یہ کہ اس لفظ سے دوسرے مانوس نہیں ہمیں چاہئے کہ عام فہم الفاظ بولا کریں تاکہ غیر صوبہ میں جانے پر تبادلہ خیالات میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ریاست حیدرآباد کے تمام دفاتر میں اُردو کا دَور دَورہ ہے لیکن تعجب اِس بات کا ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ طبقہ غلط اُردو لکھا کرتا ہے۔ پس جن لوگوں نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے، ضرور ہے کہ وہ صحیح اُردو بولنے کی فکر کریں تاکہ ہمارے دامن میں انوکھی بولی کا جو داغ لگا ہوا ہے وہ دُھل جائے اگر ہم وطن کی محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اُردو زبان سے پریم کریں اور زبان کی فصاحت اور یکسانی برقرار رکھنے کے لئے دکن کے غیر مانوس الفاظ اور غلط محاورات کو ترک کر دیں۔

جی۔ این ریڈی

چال

تُم نے کیا اپنی سہیلی سے کہا تھا؟ — بولو!
وہ سہیلی جو سرِ راہ ملی تھی تم سے
جب چلے آتے تھے ہم سیر سے واپس کل شام،
ہاں! تمہیں نے تو کہا تھا "یہ سہیلی ہیں مری"
وہی جی! سانولی سی، نیلا سا تھا جس کا لباس
دیکھ کر تم کو لپکتی ہوئی یوں آئی تھی
جیسے میں تھا ہی نہیں۔ جیسے نہیں تم تھیں وہاں، —
مسکراتے ہوئے کیا پوچھا تھا اُس نے — بولو!
مسکراتے ہوئے کیا تم نے کہا تھا — بولو!
کیوں کنکھیوں سے مجھے دیکھا تھا اُس نے سُن کر
اور پرنام کیا — کیوں مجھے پرنام کیا؟
اُس کا میں کون ہوں؟ — میں کوئی نہیں اس کے لئے
وہ تو آئی تھی لپکتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی
جیسے میں تھا ہی نہیں، جیسے نہیں تم تھیں وہاں، —
اُس نے پرنام کیا — تم نے کہا کیا تھا اُسے؟
"وہ" کسے کہتے ہیں! — میں "وہ" ہوں! — یہی بات ہے نا
خیر میں اب کے تو چپ رہتا ہوں، لیکن سُن لو
پھر اگر کوئی سہیلی ملی یوں رستے میں ......
اور پھر میرے تعارف کی کوئی بات ہوئی
میں وہیں مُہر لگا دوں گا تمہارے لب پر —
اس کا مطلب؟ — بڑی انجان ہو! — اس کا مطلب!
جیسے مطلب بھی ہوا کرتا ہے سرگوشی کا! —
اب کہو — آنکھ اُٹھا کر تو کہو — کیا مطلب! —

یوسف ظفر

غزل

جنونِ مستقل کی فتنہ سامانی نہیں جاتی
کوئی عالم ہو اپنی چاک دامانی نہیں جاتی

گھٹا چھائے، چلے آندھی، بڑھے ظلمت، اٹھے طوفاں
مگر مہرِ محبت کی درخشانی نہیں جاتی

کبھی اہلِ جنوں پر قیدِ موسم لگ نہیں سکتی
کوئی رُت ہو ہماری چاک دامانی نہیں جاتی

حسینوں میں بھی اک آزاد فطرت رہ نہیں سکتا
چمن میں نکہتِ گل کی پریشانی نہیں جاتی

بدل ڈالا ہے رُخ ہستی کا ایسا انقلابوں نے
کہ اب اختر ہماری شکل پہچانی نہیں جاتی

اختر ہوشیارپوری

بے چین مٹھو اور صیاد

پلنگ پر بیمار صیاد دراز تھا۔ اس کے بائیں جانب دوا کی شیشیاں ایک کانچ کے گلاس کے ساتھ تپائی پر رکھی ہوئی تھیں جو مرض کے خلاف ایک جوابی حملہ تھا۔ اسی طرف ایک دوسری تپائی تھی جس پر ایک پنجرہ رکھا ہوا تھا۔ پنجرہ کے اندر دو کٹوریاں آب ودانہ کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ وسط میں ایک جھولا لٹکا تھا، تاکہ کوئی بے زبان اس پر جھول سکے اور آنکھیں بند کر کے تھوڑی سی دیر کے لئے انار کی پتلی سی ڈالی کے مزے لوٹ سکے۔ تصوّر میں یہ مزے لوٹنے والا تھا ایک بدنصیب طوطا ۔۔۔ بیمار صیاد کا قیدی ۔۔۔ ایک غلام ۔۔۔

بیمار صیاد نے اپنے دربا طوطے کی طرف دیکھا جو اپنی نازک چونچ سے پنجرے کی مضبوط تیلی کو کترنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے سوکھے ہوئے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں نے ہلنا شروع کیا۔

"یہ کیا بے چینی ہے مٹھو! دھاتی تیلیوں سے یہ کیسی کشمکش"

طوطا۔ کشمکشِ آزادی صیاد۔

صیاد۔ اس سے پہلے تو کبھی آزادی کے لئے اتنا بے چین نہ ہوا تھا

طوطا۔ بے چین تو ہمیشہ ہی رہا۔ کیا تو اس سے پہلے ہر روز آزادی کے لئے میری چیخیں نہ سنتا تھا اور کیا تو میری اس آرزو کو ہمیشہ ٹالتا نہ رہا۔ لیکن آج تو بیمار ہے۔ اس لئے میری بے چینی کا زیادہ احساس ہے۔ مجھے چھوڑ دے۔ اے میرے مہربان آقا! میں تجھ سے خفا نہیں ہوں ۔۔۔ مجھے میری سُرخ ہونٹوں والی سبز پوش رفیقِ زندگی نہ معلوم کہاں کہاں ڈھونڈ چکی ہوگی ۔۔۔ اس نے ہمالیہ کی بلندیوں پر مجھ کو تلاش کیا ہوگا۔ گنگا جمنا کے میدانوں میں ڈھونڈا ہوگا۔ بندھیاچل کی گھاٹیوں میں میرا پیچھا کیا ہوگا۔ مشرقی ومغربی ساحلوں پر سیر اُسراغ لگاتی ہوئی اڑی ہوگی۔ اور اب آقا! کانٹوں سے اُلجھتے اس کی سبز پوشاک پھٹ چکی ہوگی۔ ناامیدی کے عالم میں وہ کسی سوکھے ہوئے آم کے درخت کے کھوکھلے ڈالے میں پڑی ہوئی موت کا انتظار کر رہی ہوگی۔ مجھے اس کو بچانا ہے۔ اللہ کے واسطے آزاد کر دے۔ نجات دلا دے اس غلامی سے ۔۔۔ تجھے بھی خدا اس مرض سے نجات دلا دے گا۔

صیاد۔ معصوم مٹھو! میں تجھے اب کیسے آزاد کر سکتا ہوں۔ جوڑ جوڑ میں درد ہے۔ بے پناہ تکلیف میں مبتلا ہوں۔ تو اپنی توتلی زبان سے باتیں کر کے میرا دل بہلاتا ہے۔ تیری وجہ سے میرے احساسِ درد میں کمی ہوتی ہے۔ تیری وجہ سے مجھے امید شفا ہے۔ تو میرا سہارا ہے ۔۔۔ ایک بیمار کی دوا ۔۔۔ تجھے آزاد کر دوں تو میں پھر یہ درد وکرب تنہائی میں کیسے برداشت کروں گا۔ مر نہ جاؤں گا ۔۔۔ اب مجھے مت ستا ۔۔۔ میں خود پریشان ہوں۔ ہاں وعدہ کرتا ہوں اچھا ہونے کے بعد تجھے آزاد کرنے کے متعلق غور کروں گا۔

طوطا۔ او صیاد۔ تیرے وعدے کی قیمت مجھے معلوم ہے۔ تیرے وعدے پر میں اپنی آزادی کو کیوں خطرے میں ڈالوں۔ تو آج بیمار ہے۔ کل تیرے بعد تیرے وارث تیری تمام ملکیت پر قبضہ جما لیں گے۔ میں اور میری آزادی کسی کے حصّہ میں چلی جائے گی۔ نیا مالک مجھے کیا جانے

اور میں اُسے کیا جانوں۔ میری حیثیت اس کے ورثے کا ایک جُز رہے گی ـــــ اے دور اندیش صیاد! تو نے ہی مجھے غلام بنایا۔ تو ہی مجھے آزاد کر دے۔

ایک بات اور سُن لے تو نے مجھے دنیا کے انسانوں سے روشناس کرایا۔ مجھے انسانی بولیاں سکھائیں۔ کچھ سبق دئے۔ لیکن مجھ کو بھی قربانی دینی پڑی آزادی کی ـــــ اور بھینٹ چڑھانا پڑا اپنی قوتِ پرواز کو ـــــ پھر بھی میں تیرا ممنون ہوں گڑگڑاتا ہوں کہ مجھے آزاد کر دے ـــــ وعدہ کرتا ہوں کہ تیرا دل بہلاتا رہوں گا۔ اچھا ہونے تک تیرے درد کی دوا بنا رہوں گا ـــــ لیکن اس پنجرے میں نہیں۔ بلکہ اس سامنے والی نیم کی ڈالی پر بیٹھ کر ـــــ تو اپنا پلنگ اس ڈالی کے نیچے بچھوا لینا۔ اب تو چھوڑ دے ـــــ

صیاد چپ رہا و مٹھی بھر کی جان۔ مجھی سے باتیں کرنی سیکھیں۔ اور مجھی سے یہ منطقی گفتگو۔ میں تجھے آزاد نہ کروں گا۔ سُن لے۔ تو مجھے اُلو بناتا ہے۔ تجھے میں آزاد کر دوں اور خود بے بس ہو جاؤں۔ آزاد ہو کر تو میرا غلام بنا رہے گا؟۔ اور تجھے کیا تیری رفیقِ زندگی یاد نہ آئے گی ؟

"تجھے کیا تیری رفیقِ زندگی یاد نہ آئے گی؟" طوطے کے ننھے ننھے کانوں نے سُنا ـــــ اور پھر ـــــ لگاتار "چھوڑ" "آزاد کر" کی رٹ نے صیاد کے کانوں کے پردے ہلا دیئے۔ سبز باز و ایک دم کھلے۔ ہلکا پھلکا نازک جسم ایک دم ہوا سے باتیں کرنے کیلئے اوپر اٹھا۔ تیلیوں سے ٹکر ہوئی ـــــ اور پھر جھولے سے اُلجھتا ہوا نیچے گرا ـــــ پنجرہ ہل گیا۔ اور ساتھ ہی تپائی بھی۔ مریض صیاد کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ گڑھے دار رخساروں میں کچھ جھُریاں بنیں۔ سوکھے ہوئے ہونٹ ایک دوسرے سے الگ ہوئے شائد وہ مسکراتے کو تھا۔ سُبک سبز مخملی جسم پھر اُٹھا۔ پھر ٹکرایا۔ پھر گرا۔ لگاتار اُٹھتا رہا۔ ٹکراتا رہا اور گرتا رہا۔ دونوں کٹوریاں لڑھکتی رہیں ـــــ اور پنجرے میں زلزلہ آگیا ـــــ ذرا سی دیر میں خوبصورت روئیں دار سبز پر کچھ پنجرے کی تیلیوں سے چپک گئے۔ کچھ نیچے بکھر گئے۔ اور کچھ ہوا میں اُڑ گئے۔ غلام کی بے تابی نے مالک کو بے تاب کر دیا۔ اس نے ایک ہاتھ تپائی پر اور دوسرا پلنگ کی پٹی پر رکھا۔ سہارا لے کر کمر اُٹھائی۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ ضعف کی وجہ سے سنبھل نہ سکا۔ اور دھم سے پھر بستر پر گرا۔ ہاتھ دوا کی شیشیوں کو لگا اور شیشیاں زمین پر گر کر چکنا چور ہو گئیں۔ وہ زیادہ بے تاب ہو گیا۔ اور جھٹکے سے "بغاوت مت کر" کہتا ہوا بیٹھ گیا۔ دونوں کمزور ہاتھ پنجرے پر رکھ دیئے کہ کہیں پنجرہ لے کر نہ اڑ جائے باغی طوطا اٹھتا رہا ـــــ ٹکراتا رہا ـــــ گرتا رہا ـــــ پنجرہ ہلتا رہا۔ آخری بار منہ کے بل گرا اور پھر نہ اُٹھا ـــــ پنجرہ میں ہر چیز خاموش تھی سوائے ہلتے ہوئے جھُولے کے ـــــ بیمار صیاد نے گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا۔ گردن پر کھال نکل آئی تھی ـــــ کئی جگہ سے کٹ گئی تھی ـــــ سر چونچ کے مانند سرخ بن گیا تھا ـــــ آنکھوں پر پردے تھے۔ آدھی زبان چونچ سے باہر نکلی پڑی تھی۔ پنجے کی چھوٹی چھوٹی انگلیوں پر چھوٹے چھوٹے زخم تھے۔ اور کٹوریوں پر خون کی ننھی ننھی بوندیں جم گئی تھیں ـــــ غلام اب آزاد ہو چکا تھا۔ صیاد گھنٹوں گھورتا رہا ـــــ شام ہو گئی اور اندھیرا چھا گیا ـــــ

ـــــ صبح ہوئی اور اُجالا آگیا ـــــ اب پنجرہ خالی تھا اور پلنگ بھی ـــــ

باقی کیرانوی (عثمانیہ)

چند نظمیں اور چند غزلیں

افسانۂ ما

عاشقانِ خراب ہیں ہم لوگ
آپ اپنا جواب ہیں ہم لوگ

ہوش کھو کر بھی یہ نہ بھول سکے
کہ کہاں باریاب ہیں ہم لوگ

نگہِ ناز بھی اُٹھا نہ سکی
وہ حجاب الحجاب ہیں ہم لوگ

ہم کہاں اور کہاں فریبِ سکوں
سر بسر اضطراب ہیں ہم لوگ

ہر قدم پر ہے اِک جہانِ دگر
پرچمِ انقلاب ہیں ہم لوگ

ہم ہیں آزادِ ہر طلوع و غروب
برتر از آفتاب ہیں ہم لوگ

دل شکستہ سہی مگر پھر بھی
حاصلِ انتخاب ہیں ہم لوگ

جو حریمِ ازل میں گونجی تھی
اُس صدا کا جواب ہیں ہم لوگ

حسن سے شکوۂ حجاب بھی ہے
اور خود ہی حجاب ہیں ہم لوگ

چارہ سازی کرے گی کیا دُنیا
کہ شہیدِ عتاب ہیں ہم لوگ

ہوش اُڑ اُڑ گئے ہیں ساقی کے
وہ حریفِ شراب ہیں ہم لوگ

واعظِ شہر نے دُرست کہا
قابلِ اجتناب ہیں ہم لوگ

لاکھ ناکامیاں ہیں دامن میں
اور پھر کامیاب ہیں ہم لوگ

عشق اِک خوابِ جاوداں ہے روشؔ
اور تعبیرِ خواب ہیں ہم لوگ

— روشؔ صدیقی

غزل

کچھ ضدوں کو رنگ دے کر شکلِ انساں کر دیا
دل لگی کی دل لگی۔ احساں کا احساں کر دیا

یوں اکارت مقصدِ تخلیقِ انساں کر دیا
اپنے دل کے راز کو مٹی میں پنہاں کر دیا

عبد اور معبود میں یہ فرق ہے بندہ نواز
اُس نے ہر شے کو چھپایا۔ میں نے عریاں کر دیا

اُن کو دل دے کر کشاکش مول لے لی مفت میں
زندگی کو موت سے دست و گریباں کر دیا

یہ سمجھ کر بھی کہ انساں میں ہے عزمِ جستجو
تو نے اپنا راز اپنے آپ عریاں کر دیا!

ہم کو سرخوشؔ واسطہ بھی اب نہیں اُن سے مگر
آج اس ٹھنڈی ہوا نے دل پریشاں کر دیا

— آغا سرخوشؔ قزلباش
دہلوی

تضمین
براشعارِ حضرت اقبالؒ

عشق کی تابش سے ہے دامنِ گُل چاک چاک
عشق کے جلووں سے ہے سینہ گناہوں سے پاک
عشق کے دم سے ہوئی عرش کی ہمسایہ خاک
"عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام"

عشق کے حلقے میں ہے جلوہ گہِ ہست و بُود
روز و شب و صبح و شام خاک و سپہرِ کبُود
بستہ مسائل کی ہے عشق کے دم سے کشود
"عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام"

جگن ناتھ آزاد

غزل

کیا فرشتوں کی زباں پر بھی ترا نام نہ تھا
کیوں مجھے خلق کیا مجھ سے اگر کام نہ تھا
میں ہی اس عہد میں تھا خونِ تمنا کیلئے
موسمِ گل میں کوئی اور تہِ دام نہ تھا
اُف! یہ گھڑیاں کہ ترا درد ہے عنوانِ سکوں
ہائے وہ دن کہ ترے درد میں آرام نہ تھا
بات کیا ہے کہ دگرگوں ہے جہاں کا انداز
تیرا جلوہ تو کسی رنگ میں بھی عام نہ تھا
آپ کو دردِ محبت کا یقیں کیوں آئے
وہ تو کاوش کی غزل تھی کوئی الہام نہ تھا

کاوش عثمانیہ

کیوپڈ کا پہلا تیر

یہ کس کی یاد مجھ کو آرہی ہے؟

سحر کا وقت ہے نکلا ہے سورج
سہانے گیت شاما گا رہی ہے
کرن آکاش سے گنگا نہا کر
زمیں پر سیر کرنے آ رہی ہے
چلی ہیں وہ مہابن سے ہوائیں
مرے دل پر گھٹا سی چھا رہی ہے
یہ کس کی یاد مجھ کو آرہی ہے؟

کھلونے لائے ہیں میلے سے بھیا
بہن سسرال سے وہ آ رہی ہے
پتا بھی کھیت پر اب جا رہے ہیں
وہ ماں اشنان کر کے آ رہی ہے
وہی سکھیاں ہیں اور سکھیوں کے جلسے
طبیعت کیوں مری گھبرا رہی ہے!
یہ کس کی یاد مجھ کو آرہی ہے؟

وہ پنگھٹ پر لگی ہے بھیڑ اب تک
پڑوسن لے کے گاگر جا رہی ہے
نہیں پانی دیا تلسی کو میں نے
وہ تلسی دھوپ میں مُرجھا رہی ہے
نہیں لگتا ہے جی دھندوں میں گھر کے
مری جیون کلی کملا رہی ہے

یہ کس کی یاد مجھ کو آرہی ہے؟
شفق سے ہوگئی ہے شام رنگیں.

فضا پر لال بدلی چھا رہی ہے
وہ لوٹے سبزہ زاروں سے مویشی
ہواؤں میں زندگی سی آ رہی ہے
کھرج کی دھن میں کچھ میٹھے سُروں پر
ممولا امرئی میں گا رہی ہے
یہ کس کی یاد آ رہی ہے؟
اندھیری رات ہے چھٹکے ہیں تارے
وہ زہرہ آسماں پر گا رہی ہے
فلک کے نیلگوں دریا کے اندر
وہ کشتی کہکشاں کی جا رہی ہے
وہ غمگیں راگ پھر پریوں نے چھیڑا!
یہ ظالم کیوں مجھے تڑپا رہی ہے
یہ کس کی یاد مجھ کو آ رہی ہے؟

مظفر حسین شمیم

تخیلات

دستِ قدرت

تیرہ و تار رات میں ہمدم

جب نہ قندیلِ ماہ جلتی ہو۔ اور نہ کاشانۂ فقیر میں شمع
جب پڑا ہوں میں آنکھیں ٹکٹکائے۔ پہلوئے بیکسی میں بستر پر،
میری سمت ایک ہاتھ بڑھتا ہے اس لحد کی سی گہری ظلمت میں!
بھولے بچے کی طرح جس کی طرف۔ میں بصد آرزو لپکتا ہوں!!

اکیلا

ہیں روشنی و رنگ سے معمور فضائیں۔ دلکش ہیں نظارے بڑی رونق کا ہے میلا
آوارہ نگاہوں کو تمنا ہے کسی کی۔ پھرتا ہوں میں ہنگامۂ عالم میں اکیلا

نوائے محروم

مری ہستی کا ہر ذرہ ہے مشتاق۔ کہ کوئی محرم مجھے اپنا بنا لے
نہ دل احساسِ محرومی سے پھٹ جائے۔ مجھے بھی کوئی سینے سے لگا لے

محسن انصاری

تاثرات

محبت کی جادو بیانی نہ پوچھو ۔ مرے آنسوؤں کی روانی نہ پوچھو
اذیت بمسرت بنی جا رہی ہے ۔ غمِ یار کی مہربانی نہ پوچھو
ستم اور پیہم ارے توبہ، توبہ ۔ کرم اور پھر ناگہانی نہ پوچھو
مجھے جب سے غم اس نے اپنا دیا ہے ۔ نہ پوچھو مری شادمانی نہ پوچھو
مرا دل ہوا خون، اتنا سمجھ لو ۔ بنا خون کس طرح پانی؛ نہ پوچھو
دلِ سنگ سے بھی شرارے اٹھے ہیں ۔ مرا جذبِ آتش بیانی نہ پوچھو
ہزاروں شکستیں بھی شامل ہیں جس میں ۔ وہ افسانہ کامرانی نہ پوچھو
مرے شعر جنت بہ داماں ہیں اختر
مری فکر کی گل فشانی نہ پوچھو

سیدہ اختر حیدرآبادی

غزل

مجھ کو یہ فخر صیدِ خدنگِ نظر ہوا ۔ ان کو یہ ناز عشق کا زخمی جگر ہوا
تم خود ہی منصفی سے ذرا دل میں سوچ لو ۔ کیا کیا نہ ظلم اس دلِ مجروح پر ہوا
کیا کیا ملا ہے لطفِ خلش کچھ نہ پوچھئے ۔ جب دل کے پار آپ کا تیرِ نظر ہوا
اچھا ہوا ملے مرے ارمان خاک میں ۔ اچھا ہوا کہ عشق میں برباد گھر ہوا

محمد لال خاں ادیب کڈپہ

اشعار

اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی۔ شیراز کی شادابی کشمیر کی رعنائی
ہر شے کی حضوری میں جھکوا دیا سر میرا۔ اے ذوقِ جبیں سائی اے قدرتِ رسوائی

غلام رسول نازکی کاشمیری

محفلِ ادب

غزل اور اُس کا مستقبل

"غزل" سے مراد یا تو محض "یک قافیہ" کلام ہے۔ مگر قصائد اور نظمیں بھی یک قافیہ ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔

یا "غزل" سے مراد حسن و عشق کے مضامین ہیں۔ اور یہ غزل اور نظم میں مشترک ہیں۔ یا ان دونوں کا امتزاج یعنی یک قافیہ عشقیہ کلام — یہ قصائد کی تشبیب میں اور نظموں میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور پھر مروجہ غزل میں غیر عشقیہ مضامین بھی ہوتے ہیں۔

میری رائے میں "غزل" کیلئے یکسقافیہ ہونا ضروری ہے۔ یہ فنی وصف ہے اور اس کا دوسرا بنیادی وصف یہ ہے کہ مختلف اشعار میں منطقی تسلسل نہ پایا جائے۔ اشعار متفرق ہوں۔ مضمون کے اعتبار سے — جب تسلسل ہوتا ہے تو ہم صراحت سے اسے مسلسل غزل یا قطعہ وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ گویا غزل کے لئے تسلسل غیر معمولی ہے! — غزل کی ساخت میں یگانگت (برائے بحر و قافیہ) ہوتی ہے۔ اور مضمون متفرق ہوتے ہیں!۔

کیا یہ اوصاف ہماری تمام شاعرانہ ضروریات کے منافی ہیں۔ اور لازمی طور پر فنا پذیر ہیں؟

یک قافیہ اشعار دنیا کی شاعری میں ہر دور میں کہے گئے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ یہ انتظام بے کار ہو جائے۔ حسن و عشق کے مضامین کی عالمگیری بھی مسلّمہ ہے فطرتِ انسانی حُسن و عشق سے وابستہ رہی ہے اور رہے گی۔ اشعار میں منطقی تسلسل کا ہونا بھی کسی طرح طبعِ انسانی کے منافی نہیں۔ ہمارے احساسات اور جذبات کی رو عموماً غیر مسلسل اور غیر منطقی ہوتی ہے۔ اس لئے عدمِ تسلسل عین مطابقِ فطرتِ انسانی ہے آج کل تو نثر میں بھی (بالخصوص فسانوں میں) شعورِ انسانی کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے کہ خیالات آگے پیچھے چلے آتے ہیں۔ کبھی ماضی کبھی حال کبھی مستقبل میں اُچھلتے ہوئے سے!۔ (James Joyce) اس انداز کا امام تھا اور شاید ہی کوئی جدید مصنف ہو جس پر اس کا اثر نہ ہو تو پھر یک قافیہ مگر غیر مسلسل اشعار یعنی غزل کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ صنف مٹنے والی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل مٹ نہیں رہی بلکہ جس نہج کی غزل داغ کے وقت تک مروج تھی وہ مٹ رہی ہے (داغ کے وقت تک بھی غزل کے دو واضح طریق تھے۔ نقاد دلی اور لکھنؤ سکول کا نام دے کر ان میں امتیاز کرتے ہیں)۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔

ہماری غزل درباروں کی پیداوار تھی۔ مٹے ہوئے نوابوں اور مٹے ہوئے رئیسوں کے درباروں کی! — اس میں اسی قسم کے تاثرات کا اظہار ہونا تھا جو اس فضا میں پنپ سکتے تھے۔

نواب صاحب کا دربار ہے۔ درباریوں کے جتھے ہیں جو توڑ جوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔ اور نواب کی توجہ شاعر ہو یا کوئی اور پروردۂ سرکار ہو ان لوگوں کی زندگی اور موت کا باعث ہے۔ نواب مطلق العنان ہے۔ جسے چاہا نوازا جسے چاہا ختم کر دیا۔ اور اس کے ہاں باریابی تک ایک مشکل مہم ہے۔ دروازے پر دربان ہیں!۔

یہ نواب کے دربار کا نقشہ ہماری "غزل" کا سرمایۂ حیات تھا۔ غزل کا بھی اور غزل گو کا بھی۔

چنانچہ شعراء کا معشوق بھی نواب تھا۔ وہی "رقیب" وہی "دربان" وہی مطلق العنان، متلون المزاج شخص!۔

ادب اور فن کی سرپرستی انہیں درباروں میں ممکن تھی عوام اس قابل نہ تھے کہ شعراء کی قدر کر سکیں یا ان کو زندہ رکھ سکیں۔ طباعت اور عام تعلیم کا دائرہ مختصر تھا۔ (خواندگی چند مقررہ کتابوں تک محدود تھی)

اس دربار میں شاعر کی حیثیت بہت ادنیٰ تھی۔ اس کی جنس محض تفریح کا سامان بن سکتی تھی۔ چنانچہ غزل میں شاعر ہمیشہ بدنصیب اور نامراد عاشق ہوتا تھا اور بوالہوس رقیب کامیاب!۔ ہوس، دنیاداری، افادی کاروبار ایک طرف اور عشق، ادب، رومانی تحریکات دوسری جانب!۔ ظاہر ہے کہ نواب کے دربار میں افادی قدریں زیادہ بلند مرتبہ تھیں اور ادب و فن محض تفریحی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر شاعر تفریحی دائرے سے باہر جانا چاہتا تو نامقبول ہوتا تھا۔

یہ ہلکی پھلکی تفریحی غزل کی شاعری درباری فضا میں کامیاب ہوئی۔ چلتے ہوئے فقرے۔ اچھلتے ہوئے خیالات۔ پھبتی، طعن، ہوس کاری!۔ یہ تھا درباری غزل کا سرمایہ۔

مگر جب یہ دور بدلا، جب رئیسی نظام ٹوٹنے لگا۔ تو غزل نے بھی پلٹا کھایا۔ خود رئیسوں اور نوابوں کو جان کے لالے پڑ گئے۔ ساہوکار، تاجر، کارخانہ دار، متوسط طبقہ کے لوگ، صاحب امر ہوئے اور پرانے حاکم نواب دیوالیہ ہونے لگے۔ طاقت کا توازن بدلا۔ اور اس میں کئی "دربار" الٹ گئے! نوابوں نے اپنے اخراجات کاٹ چھانٹ بنانا شروع کیا۔ اور سب سے پہلے سب سے زیادہ غیر ضروری مدیعنی شعراء اور صناع خارج ہوئے۔ درباروں کے ساتھ درباری شاعری بھی مٹنے لگی۔

اس پر ستم یہ ہوا کہ نئے فرمانروا ابدیشی تھے۔ ان کی زبان۔ ان کا ادب۔ ان کی معاشرت بالکل مختلف تھی۔ اور جب انہوں نے سیاسی استقامت کے بعد یہاں کے ادب کی طرف توجہ کی تو شاعری کے پہلے دربار میں جو لاہور میں منعقد ہوا "نظم" ظہور پذیر ہوئی۔ انگریزی شاعری کے "مضامین" اردو میں نظم ہونے لگے۔

مگر غزل مٹی نہیں۔ کیونکہ اس کی روایات بہت گہری تھیں اور اس کی بنیادیں فطرتِ انسانی میں پیوست تھیں۔

واضح رہے کہ غالب جو اس نئے دور میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ وہ درباری غزل سے طبعاً بغاوت کر چکا تھا صاف صاف کہتا تھا ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل　　کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے

غرض شاعر درباروں سے خارج ہو کر آزاد ہو گئے۔ نوابوں سے دور ہو کر وہ عام فطرتِ انسانی اور جذبات کے نزدیک آ گئے۔

چنانچہ حسرت کا تصورِ عشق نوابی نہیں — انسانی ہے!—

اس طرح "غزل" کو ایک نئی زندگی حاصل ہو گئی — مگر یہ زندگی ایک نہایت معین اور محدود دائرے میں محصور ہے۔

(ڈاکٹر تاثیر)　　"نگار"

جبری اختیار

حل ہو سکا نہ مسئلۂ جبر و اختیار
اس فکر میں ہر ایک پریشان کب سے ہے

"ہر روح امر رب ہے"　　(صغریٰ موجبہ)
ہر اک فعل امر روح　　(کبریٰ کلیہ)
ثابت ہوا کہ:—
"فعل ہر اک امر رب سے ہے"

"سب رس"　　امجد (حیدر آبادی)

مطبوعات

منتخب داغ - داغ کے کلام کا یہ انتخاب بڑی تقطیع کے ۲۷۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس انتخاب کی خوبی کی ضمانت یہ ہے کہ اسے حضرت احسن مارہروی مرحوم نے مرتب کیا تھا جو داغ کے قابل ترین شاگردوں میں سے تھے ہمیں افسوس ہے کہ یہ انتخاب حضرت احسن مرحوم کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اسے شائع کرنے کی سعادت حضرت احسن کے فرزند رشید جناب سعید کے حصے میں آئی ہے۔ ابتدا میں سعید صاحب نے اپنے والد ماجد کے حالات زندگی لکھے ہیں اس کے بعد حضرت احسن مرحوم کا فاضلانہ مقدمہ شامل ہے۔

انتخاب کے متعلق اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک اچھے شاعر کے کلام کا انتخاب ایک اچھے شاعر اور نقاد نے کیا ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت نفیس ہے۔ حضرت داغ اور حضرت احسن کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ قیمت مجلد ۵ر :- پتہ۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد (یو۔ پی)

آج کا مصر - از محمد حسن الاعظمی صاحب پروفیسر مصری یونیورسٹی قاہرہ۔ ۱۷۲ صفحے کی اس مختصر با تصویر کتاب میں مصر کی قدیم و جدید تاریخ کے بیان کے بعد موجودہ حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سرسری معلومات کے لئے کتاب بہت اچھی ہے قیمت درج نہیں۔ پتہ:- اُردو اکیڈیمی پنجاب لاہور

خرمن - یہ حیدرآباد کے نوجوان شاعر حضرت نظر کے کلام کا مجموعہ ہے۔ حضرت نظر ان نوجوان شعراء میں سے ہیں جن کا مستقبل کافی امید افزا نظر آتا ہے۔ اُن کے موجودہ کلام میں جوش اور ولولہ نمایاں ہے۔ نواب بہادر یار جنگ اور ڈاکٹر عبد اللطیف نے تعارف لکھا ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ:- مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

غالب کے سو شعر - اے ایس حامد صاحب ملتانی نے غالب کے مختصر اُردو مجموعۂ کلام میں بھی انتخاب کی گنجائش دیکھ کر یہ سو اشعار جمع کئے ہیں۔ غالب کا کلام ہر رنگ میں قابل مطالعہ ہے۔ قیمت ۲ر: پتہ:- مکتبۂ اشاعتِ اُردو (ادب) ملتان

(۱) عقائدِ اسلام (۲) پیارے نبی (۳) مصطفےٰ کمال - یہ تینوں چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی اے ایس حامد صاحب ملتانی نے لکھی ہیں۔ ان کا موضوع ان کے ناموں سے ظاہر ہے سرسری معلومات کے لئے بہت اچھی ہیں۔ تینوں کتابوں کی قیمت دو دو آنے ہے۔ پتہ۔ مکتبۂ اشاعت اُردو (ادب) ملتان

ہمارا پنجاب - از شیخ عزت اللہ صاحب۔ اس کتاب میں پنجاب کا مختصر جغرافیہ اور تاریخ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اگر خوشامد کا رنگ نمایاں نہ ہوتا اور یونینسٹ پارٹی کی جا و بے جا تعریف میں غلو سے کام نہ لیا جاتا تو شاید یہ کتاب زیادہ مفید ہوتی کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

پتہ:- فرینڈز لائبریری لاہور

"ح"

"ن"

تاریخ اسلام (حصہ دوم) از شاہ معین الدین احمد ندوی۔ یہ خاندانِ بنی امیہ کی تاریخ ہے۔ خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد خاندانِ بنی امیہ کی حکومت قائم ہوئی۔ تاریخ اسلام میں بنی امیہ کا دور جس قدر اہم ہے اُسی قدر اس کے متعلق غلط فہمیاں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ اکثر شیعہ مورخین نے بنی امیہ سے انصاف نہیں کیا۔ اور محض یزید سے تعصب کی بنا پر سارے اموی خلفاء کی خوبیوں سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ شاہ معین الدین احمد صاحب کی تاریخ اس عیب

سے پاک ہے۔ انہوں نے نہایت غیر جانبدارانہ انداز میں خاندانِ بنی امیہ کی تاریخ لکھی ہے۔ واقعات کی چھان بین میں بڑی محنت اور دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے اور جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے جا بجا ان کے حوالے دئے ہیں۔ ان کا ماخذ زیادہ تر عربی مؤرخین کی کتابیں ہیں اور اگرچہ ان میں سے بعض کتابیں اپنے مذہبی تعصب کے لئے بدنام ہیں لیکن شاہ معین الدین احمد نے ان سے صرف واقعات کی حد تک استفادہ کیا ہے اور شیعہ سنی کے جھگڑوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوئے۔ زبان سادہ اور اندازِ بیان دلکش ہے۔ کاغذ۔ کتابت طباعت عمدہ قیمت چار روپے۔ پتہ:۔ دار المصنفین اعظم گڈھ "ن"

گل و بلبل۔ یہ کتاب جنابِ صادق قریشی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان افسانوں میں کوئی نئی بات نہیں۔ وہی عشق و محبت کے پرانے قصے ہیں جو ہزار بار دہرائے جا چکے ہیں۔ صادق قریشی ایک نوجوان ادیب ہیں اور ان کے بعض تنقیدی مضامین راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ اگر وہ افسانوں کے بجائے تنقیدی ادب پر توجہ دیں تو اُردو کی زیادہ خدمت کریں گے۔ زیرِ نظر کتاب میں آٹھ افسانے ہیں۔ اور آٹھوں کا موضوع عشق ہے اور عشق بھی زیادہ تر ناکام عشق! زبان شستہ اور صاف ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ان افسانوں میں عریانی کا عیب نہیں۔ کتابت۔ طباعت عمدہ قیمت ایک روپیہ۔ پتہ
زائن دت سہگل اینڈ سنز تاجرانِ کتب لاہور "ن"

ایسٹرن ٹائمز۔ یہ ہفتہ وار اسلامی انگریزی اخبار ایک مدت تک فیروز سنز لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا رہا ہے۔ اب مولوی محبوب عالم مرحوم ایڈیٹر پیسہ اخبار کے قابل فرزند مسٹر عبد الحمید نے اس کی ملکیت اور ادارت اپنے ہاتھ میں لی ہے۔ نئے دور کے پہلے ہی پرچے سے ترتیب و مضامین میں بہت ترقی نظر آتی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ اخبار مسلم لیگ کے خیالات کی نشر و اشاعت کے لئے پنجاب میں بہت مفید کام کرے گا۔ مسلمانوں کا قومی فرض ہے کہ اس اخبار کو ہر ممکن مدد دیں تاکہ یہ جلد ایک اچھا اسلامی اخبار بن سکے۔ حجم ۱۶ صفحات چندہ ۵ؕ سالانہ۔ پتہ:۔ دفتر ایسٹرن ٹائمز لاہور "ح"

ماہنامہ اضطراب بنارس۔ یہ رسالہ مسعود اختر جمال صاحب کی ادارت میں بنارس سے نکلتا ہے۔ زیرِ نظر نمبر میں جو سالنامہ ۱۹۴۱ء ہے۔ اچھے اچھے تنقیدی مضامین۔ افسانے اور نظمیں درج ہیں۔ زیادہ تر لکھنے والے نوجوان ہیں۔ ادارہ بھی نوجوانوں پر مشتمل ہے اور جس سلیقہ سے پرچہ مرتب کیا گیا ہے اس کے لئے وہ داد کے مستحق ہیں۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی اور وہ یہ کہ تین سو صفحات کے اس سالنامہ میں اسی صفحات کے مضامین نظم و نثر پرانے ہیں اور دوسرے رسائل سے نقل کئے گئے ہیں۔ کاغذ کی گرانی کے پیشِ نظر اسی صفحات کو اس طرح ضائع کرنا نہایت بے جا اسراف ہے اور کسی طرح بھی جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ چندہ سالانہ پانچ روپے رعایتی تین روپے سالنامہ کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ پتہ:۔ دفتر اضطراب پانڈے حویلی بنارس "ن"

دیپک۔ یہ ماہوار اُردو رسالہ جناب ارجن دیو صاحب بی اے کے زیرِ ادارت لاہور سے نکلتا ہے۔ چندہ تین روپے سالانہ ہے جس میں دو خاص نمبر بھی دئے جاتے ہیں۔ مضمون مفید اور پُراز معلومات ہیں۔ زیرِ نظر پرچے میں (دسمبر ۱۹۴۱ء) راجہ نریندر ناتھ اور گوکل چند کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اگر سرورق پر نسیم ایکٹریس کی تصویر نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ کیونکہ اس سے دیپک پر کسی گھٹیا فلمی رسالے کا شبہ ہوتا ہے۔ پتہ:۔ دفتر دیپک قطب روڈ لاہور

زندگی۔ یہ ماہوار اُردو رسالہ امرتسر سے زیرِ ادارت دیودت صاحب شرما شائع ہوتا ہے۔ سیاسی اور قومی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ رسالہ قابلِ مطالعہ ہے۔ چندہ سالانہ ۱۲؍ :پتہ:۔ دفتر زندگی۔ اکالی مارکٹ امرتسر۔ "ح"

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

نمبر ۳

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء

ضروری اطلاع:۔ جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ، اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر دفترِ "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔

"بزمِ ہمایوں"

قارئینِ "ہمایوں" کے لئے یہ اطلاع باعثِ رنج ہوگی کہ "ہمایوں" کے پُرانے قلمی معاون اور مشہور قادر الکلام شاعر حضرتِ آزاد انصاری ۱۴؍ جنوری ۱۹۴۲ء کو رحلت فرما گئے۔

حضرت آزاد انصاری کا وطن سہارن پور تھا لیکن اُن کا مقامِ ولادت ناگپور ہے جہاں وہ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ اِس حساب سے انتقال کے وقت اُن کی عمر ۷۲ سال کی تھی۔ ضعف و علالت کے باعث اگرچہ اُن کے جسمانی قویٰ میں کچھ اضمحلال پیدا ہوگیا تھا لیکن اُن کی دماغی صلاحیتوں میں آخر تک کوئی فرق نہ آیا تھا چنانچہ اُن کا کلام جو جنوری ۱۹۴۲ء تک "ہمایوں" میں شائع ہوتا رہا اس بات کا گواہ ہے۔

راقم الحروف کو دہلی سے اُن کا یہ آخری خط ۱۰؍ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ملا تھا:۔

"میں ابھی دہلی میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ اور قیام کروں گا۔ اس اثنا میں سہارن پور جانے کا بھی قصد ہے خیال تھا کہ آگے لاہور تک بڑھوں اور خدمتِ والا میں حاضر ہوکر حصولِ نیاز کا لطف براہِ راست اُٹھاؤں مگر صحت بہت خراب ہے اور یہ کمبخت اِس تمنّا کی کامیابی میں مانع ہے۔ کیا کروں مجبور ہوں۔ کاش خدا مدد فرمائے کہ میں اپنی زندگی میں آپ سے ذاتی طور سے مل کر شاد کام ہوسکوں۔ والسلام

نیاز مند آزاد انصاری

مورخہ ۹؍ دسمبر ۱۹۴۱ء الیاس بلڈنگ اجمل روڈ نئی دہلی"

راقم کو اگر یہ اندازہ ہوتا کہ موت اِس قدر قریب ہے تو خود دہلی جا کر اُن سے ملاقات کی سعادت حاصل کرتا مگر افسوس کہ یہ محرومی مقدّر ہو چکی تھی اور حضرتِ آزاد سے برسوں خط وکتابت رہنے کے باوجود اُن سے بالمشافہہ ملاقات کا ایک بھی موقع نہ نکل سکا۔

حضرتِ آزاد انصاری مولانا حالیؔ مرحوم کے نامور شاگرد تھے۔ لیکن اندازِ بیان میں اُن کا رنگ بالکل منفرد تھا۔ اُن کے کلام کی ایک خاص خوبی جس پر بہت کم لوگوں کی نظر پہنچی ہوگی یہ ہے کہ وہ نظم میں تعقید سے اِس حد تک بچتے تھے کہ اُن کے شعروں میں الفاظ اُسی ترتیب سے آئے ہیں جس ترتیب سے انہیں نثر میں آنا چاہئے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اُن کے بیشتر اشعار نثر میں منتقل ہو ہی نہیں سکتے۔ خود حضرتِ حالیؔ کو جب ایک موقع پر یہ علم ہُوا کہ آزاد نے اپنے اشعار پر بعض دوسری قیود کے علاوہ یہ قید بھی لگا رکھی ہے تو وہ بہت حیران ہوئے اور فرمایا "واقعہ یہ ہے کہ تمہارا یہ کام بہت دشوار ہے تعجب ہے کہ تم اس کی مشکلات سے کیونکر عہدہ برا ہوتے ہو" پھر فرمایا "اگرچہ تمہاری یہ پابندی آسانی کے ساتھ اظہارِ خیال کو مانع ہے لیکن اگر تم اس کی دشواریوں پر اسی طرح غالب آتے رہے تو یہ تمہارا ایسا عجیب و غریب اور قابلِ قدر کارنامہ ہوگا کہ اُردو زبان اور اُردو شاعری ہمیشہ تم پر ناز کرے گی۔ جہاں تک میں غور کرسکا ہوں مجھ کو تو کلام کی اصلی ترتیب صنفِ نظم میں ناممکن نظر آتی ہے اور میری معلومات کی حد تک کسی ملک اور کسی زبان میں کوئی ایسا قادر الکلام شاعر نہیں گزرا جس نے اسے ممکن العمل بنا کے دکھایا ہو۔ دراصل یہ تمہاری شاعری کا معجزہ ہے اور سخت حیرت میں ڈالنے والا معجزہ۔"

مولانا حالی کے دل میں حضرتِ آزاد کے کلام کی جو قدر و منزلت تھی وہ ذیل کے واقعہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے جسے حضرتِ آزاد نے اپنے مجموعۂ کلام کے دیباچے میں نقل کیا ہے۔ حضرتِ آزاد مولانا حالی کو اپنی ایک غزل بغرضِ اصلاح سُنا رہے تھے" جب مولانا حالی نے یہ مقطع سُنا۔

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا توجا، اور اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

تو بے اختیار تڑپ اُٹھے اور کئی مرتبہ بہت خوب مرحبا جزاک اللہ کی تکرار کے بعد فرمایا کہ پھر پڑھو۔ ہم نے پھر پڑھا اور وہ پھر تڑپ اُٹھے اور دیر تک جھومتے اور مزے لیتے رہے کچھ دیر بعد پھر فرمایا کہ ہاں ایک بار پھر وہ شعر سنادو۔ ہم نے پھر سُنایا۔ اب ان کو یہ مقطع یاد ہوگیا تھا بہت دیر تک خود پڑھ پڑھ کر جھومنے اور مزے لینے کے بعد غالب علیہ الرحمۃ کا یہ مشہور مقطع پڑھا۔

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اور پڑھ کر گویا ہوئے کہ حقیقت یہ ہے کہ تم کو یہ مقطع حضرتِ غالب علیہ الرحمۃ کے اِس مشہور و لاجواب مقطع سے بھی کہیں بہتر و بلند تر نصیب ہُوا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ اُسی رنگ اور اُسی انداز کا۔ اگر آج غالب مرحوم زندہ ہوتے تو وہ تم پر فخر کرتے اور کیا تعجب کہ جس طرح حکیم مومن خاں مرحوم کا یہ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سُن کر فرمایا تھا کہ اگر مومن خاں مجھے اپنا یہ شعر دے دیں تو میں اس کے عوض میں اپنا سارا دیوان نذر کرنے کو تیار ہوں، اُسی طرح تمہارا یہ عجیب و غریب مقطع سُن کر وہ تمہیں بھی اپنا پورا دیوان دے ڈالنے پر آمادہ ہوجاتے۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ اگرچہ حکیم مومن خاں مرحوم کا مذکورہ شعر بھی بے مثل و نادر شعر ہے مگر پھر بھی اتنا قیمتی نہیں کہ کوئی اپنا پورا دیوان اس کے معاوضے میں دے کر بعد میں رنج و افسوس محسوس نہ کرے لیکن تمہارا مقطع بالیقین اتنا گراں بہا ہے کہ اگر کوئی اُس کو اپنا پورا دیوان

دے کر خرید لے تو وہ ہرگز خسارے میں نہیں رہ سکتا۔"

فنِ شعر میں پورا کمال حاصل کرنے کے باوجود حضرتِ آزاد اپنے آپ کو کامل نہیں سمجھتے تھے مولانا حالی سے پہلے وہ مولانا بیدل کے شاگرد تھے۔ ذیل کی رُباعی میں انہوں نے اپنے دونوں استادوں کو جس طریقے سے یاد کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخر تک اپنے آپ کو طالب علم سمجھتے رہے۔

پھر چارۂ اغلاطِ غزل ہی نہ ملا پھر رفعِ نقائص کا محل ہی نہ ملا

پھر حسرتِ اصلاح برآہی نہ سکی پھر حالی و بیدل کا بدل ہی نہ ملا

اُردو شاعری کو آزاد کے سے بے بدل استاد کی موت سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ خدا مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ذیل میں ہم حضرتِ آزاد انصاری کے کلام سے کچھ انتخابات درج کرتے ہیں۔ اُن کی یاد کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

محبّت کا دوسرا دَور

وہ پھر تیرے جنونِ شوق کا حد سے گزر جانا وہ پھر میرے سکونِ دل کا شیرازہ بکھر جانا

وہ پھر مجھ کو ترا با طلعتِ قاتل نظر آنا وہ پھر تیرا چھری لے کر مرے دل میں اُتر جانا

وہ پھر تیرا کٹاری باندھ کر سینے میں در آنا وہ پھر تیرا سناں بن کر کلیجے سے گزر جانا

وہ پھر میرا تری پہلی نظر میں تلملا اُٹھنا وہ پھر تیری نظر کا گھاؤ دل سے تا جگر جانا

وہ پھر میرے دلِ مظلوم سے شورِ بُکا اُٹھنا وہ پھر تیرا مجھے اُلٹی چھری سے ذبح کر جانا

وہ پھر تیرا ستم کرنا۔ وہ پھر تیرا غضب ڈھانا وہ پھر میرا دل و دیں چھین لینا اور مُکر جانا

وہ پھر تیرے خمِ زلفِ دوتا کا داؤں چل جانا وہ پھر میرے دلِ آزاد کی بازی کا ہر جانا

وہ پھر تیرا مری رگ رگ میں خونِ شوق دوڑانا وہ پھر میری تمنّاؤں کا رنگِ سرخ نکھر جانا

وہ پھر تیرا مری ٹوٹی ہوئی اُمید بندھوانا وہ پھر میرے دلِ خالی کا ارمانوں سے بھر جانا

وہ پھر تیرے تعشق کا مجھے دونا نشہ چڑھنا وہ پھر تیرے تعلّق کا جنوں دُونا اُبھر جانا

وہ پھر تیری محبت کا ہزاروں رنگ سے بڑھنا وہ پھر تیری تمنّا کا ہزاروں گل کتر جانا

وہ پھر تیرا مجھے اپنے کرم سے ہوش میں لانا وہ پھر میرا خمارِ بادۂ غفلت اُتر جانا

وہ پھر تیرا مرے جذباتِ الفت جوش میں لانا وہ پھر تیرا مری مُردہ طبیعت زندہ کر جانا

وہ پھر تیرا مجھے اک خاص بے تابی عطا کرنا وہ پھر میرے دلِ بے حس کی حالت کا سُدھر جانا

وہ پھر تیرا مجھے مامونِ خوفِ ماسوا کرنا وہ پھر میری طبیعت کا سکوں پا نا ٹھہر جانا

وُہ پھر آزاد کو ہر قید سے آزادیاں ملنا

وہ پھر آزاد کے بگڑے نصیبوں کا سنور جانا

قربانِ عشق بندۂ جاناں بنا دیا فرمانروائے عالمِ امکاں بنا دیا

اِک ناسزا کو سلطنتِ دردِ سوز دی اِک بینوا کو غیرتِ سلطاں بنا دیا

اِک بے بصر کو طاقتِ دیدار بخش دی اِک بے خبر کو صاحبِ عرفاں بنا دیا

قطرے کو رتبۂ یمِ زخّار دے دیا ذرّے کو آفتابِ درخشاں بنا دیا

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے اُمید تو نہیں ہے مگر ہاں خُدا کرے

تا کہہ صبر ٹھیک، اگر تابِ صبر ہو تعمیلِ حکم فرض، مگر کوئی کیا کرے

اے کاش اضطرابِ محبت بنا ہے اے کاش دردِ حقِ رفاقت ادا کرے

چل وہ ملی کے لئے شکایت بیدادِ دوست چل کب تک کوئی کسی کی مروت کیا کرے

سخت مشکل ہے کہ اُس کا جاننا ممکن نہیں ۔۔۔ اور بے جانے ہمارا ماننا ممکن نہیں
زندگی بھر جاننے کی کوششیں کرنے کے بعد ۔۔۔ صرف یہ جانا یہاں کچھ جاننا ممکن نہیں
وہ یہ کہتے ہیں ہمیں پہچاننے کی سعی کر ۔۔۔ اور یہاں اپنے کو بھی پہچاننا ممکن نہیں
وحدتِ بے لوث ہاتھ آئے تو کیونکر ہاتھ لائے ۔۔۔ کثرتیں اتنی ہیں جن کا چھاننا ممکن نہیں

مری ناکامئ جاوید تیرا مدعا کیوں ہو ۔۔۔ تری اُمید کا آزارِ دردِ لادوا کیوں ہو
وہ دل جس سے ابھی دونوں جہاں کی کام لینے ہیں ۔۔۔ اِک اُمیدِ وفا پر پائمالِ صد جفا کیوں ہو
مری تقدیر بھی تیری طرح کیوں مجھ سے پھر جائے ۔۔۔ مری قسمت سے ہر اِک سازِ تیرا ہم نوا کیوں ہو
کسی کلفت زدہ کا دل دُکھا کر کیا بھلا ہو گا ۔۔۔ تری پاکیزہ عادت کا یہی اِک مقتضا کیوں ہو
مجھے یہ ضد کہ تجھ سے خستگی کی داد چاہوں گا ۔۔۔ تجھے یہ ہٹ کہ اِک برگشتہ قسمت کا بھلا کیوں ہو
تجھے مجھ پر خدا ناخواستہ کیوں رحم آ جاتا ۔۔۔ ترے دل میں نصیبِ دشمناں خوفِ خدا کیوں ہو
مری تقدیر بھی میرے ڈبو دینے کو کافی ہے ۔۔۔ مری ٹوٹی سی کشتی کے لئے طوفاں بپا کیوں ہو

ترا آزاد پابندِ علائق رہ نہیں سکتا
وُہ آزادی کا عاشق ہے گرفتارِ بلا کیوں ہو

ستم پروردِ محبت پر ستم ڈھانے سے کیا حاصل ۔۔۔ سرِ اُمید بے دردانہ ٹھکرانے سے کیا حاصل
مسلسل واقعاتِ درد دہرانے سے کیا حاصل ۔۔۔ کہاں تک ہ معرضِ اظہار میں لانے سے کیا حاصل
اگر دل لے کے دلداری میں کسرِ شاں سمجھتے ہو ۔۔۔ تو اتنے دلبری کے جال پھیلانے سے کیا حاصل
یہاں تک میں بھی قائل ہوں کہ سمجھانا ضروری ہے ۔۔۔ مگر یہ بھی تو سمجھا دو کہ سمجھانے سے کیا حاصل
اگر ارشادِ عالی ہو تو میں مایوس ہو جاؤں ۔۔۔ بہت اغماض کی تکلیف فرمانے سے کیا حاصل

اِک ترے شوق نے وارفتہ بنا رکھا ہے ۔۔۔ اِک تری یاد نے دُنیا کو بُھلا رکھا ہے
دل کو بے تابئ پیہم تو زباں پر نا لے ۔۔۔ اِک مزا ہے کہ محبت نے چکھا رکھا ہے

اے کاش! تم یکایک مجھ کو نہ بُھول جاتے ۔۔۔ اے کاش! یہ اچانک مجھ پر ستم نہ ڈھاتے
اے کاش دن کی آہیں یوں بے اثر نہ رہتیں ۔۔۔ اے کاش! شب کے نالے یوں رائیگاں نہ جاتے
سابق کرم کا صدقہ، اتنا تو سوچئے گا ۔۔۔ اتنا نہیں ستاتے اتنا نہیں جلاتے
لا علم جرم رکھ کر تعزیر کب روا ہے ۔۔۔ مانا، مری خطا تھی۔ لیکن مجھے جتاتے
قبل از ثبوتِ کافی حکمِ سزا نہ دیتے ۔۔۔ تحقیقِ جرم کر کے کچھ فیصلہ سناتے
الزام کو سمجھ کر انصاف کو پہنچتے ۔۔۔ انصاف کو پہنچ کر توفیقِ خیر پاتے
احسان تو یہی تھا تم مجھ کو بخش دیتے ۔۔۔ ارمان تو یہی تھا تم مجھ پہ رحم کھاتے
لیکن اگر سراسر ظلموں کی ٹھان لی تھی ۔۔۔ اظہارِ وجہ کر کے دل کی خلش مٹاتے
تم خضر سے بھی بڑھ کر ضدی مزاج نکلے ۔۔۔ کشتی ڈبو کے بھی تو باعث نہیں بتاتے

رفیقۂ حیات کے نوحے کے اقتباسات

ہمدم و ہمرازِ جانی! الوداع ۔۔۔ محرمِ رازِ نہانی! الوداع
آرزوئے مہربانی ہو چکی ۔۔۔ اے سراپا مہربانی! الوداع
انتہائے قدردانی ہو چکی ۔۔۔ اے مجسم قدردانی! الوداع
الفراق اے یارِ ناشاد! الفراق
الفراق اے جانِ آزاد! الفراق

میں ہوں اور آہ و فغاں واحسرتا ۔۔۔ تو ہے اور کچھ ہوں نہ ہاں واحسرتا
کون میری ناز برداری کرے ۔۔۔ اے انیسِ مہرباں واحسرتا
کون میرے ناروا شکوے سُنے ۔۔۔ اے جلیسِ قدرداں واحسرتا
کس سے دل کی حسرتوں کی داد لوں ۔۔۔ اے رفیقِ ہمزباں واحسرتا
کس کو حالِ دل سنا کر شاد ہوں ۔۔۔ اے شفیقِ رازداں واحسرتا

"خطبۂ بہار" سے چند اقتباسات

بہار آئی ہے عیش اُڑانے کے دن ہیں — گھٹا چھائی ہے کیف اُٹھانے کے دن ہیں
یہ بادل یہ بارش یہ ٹھنڈی ہوائیں — مے و جام سے لَو لگانے کے دن ہیں
یہ رنگیں بہاریں یہ رنگیں فضائیں — گل و مل کا سکّہ چلانے کے دن ہیں
سمن رُو نگاروں کو ہمراہ لے کر — گلستاں میں چکّر لگانے کے دن ہیں
مے آشام یاروں کو ہمراہ لے کر — چمن پر تسلّط بٹھانے کے دن ہیں
چلو چل کے باغوں میں دھومیں مچائیں — کہ باغوں میں دھومیں مچانے کے دن ہیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں — کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

اے کاش ذوقِ دردِ محبّت فنا نہ ہو — اے کاش اس ابتدا کی کبھی انتہا نہ ہو
ہم اور یہ طلب کہ تمہاری خوشی کریں — تم اور یہ غضب کہ ہمارا بھلا نہ ہو
ترکِ تعلقات کی تجویز برمحل — لیکن جو اس علاج سے بھی فائدہ نہ ہو
اندھیر ہے مقدمۂ جرمِ شوق کا — اجلاسِ لطفِ دوست میں بھی فیصلہ نہ ہو
جی بھر کے ظلم کر مگر اس شرطِ خاص پر — جب لطف ہو تو لطف کی بھی انتہا نہ ہو
آزاد اب اُٹھ اور اُٹھ کے پیاپے صدا لگا — افسوس ہے کہ پرسشِ حالِ گدا نہ ہو

حقِ الفت ادا کریں گے آپ؟ — آپ پاس وفا کریں گے، آپ؟
ہم فریبِ نگاہ کیوں کھاتے — کیا خبر تھی دغا کریں گے آپ؟

آؤ پھر موقع ہے پھر اسرار کی باتیں کریں — صورتِ منصور بہکیں دار کی باتیں کریں
آؤ پھر عہدِ وصالِ یار کی باتیں کریں — داستانِ لطف چھیڑیں پیار کی باتیں کریں

ذرّات کی چمک پر کب تک مٹا رہے گا — اُٹھ اور اُٹھ کے اِک دم ہاتھ آفتاب پر ڈال

رُباعیات

اللہ کا نام لے کے روٹی نہ کماؤ — اللہ کے نام کی جلالت نہ گھٹاؤ
اللہ کو پُجواؤ بھئی پُوجو بھی مگر — اللہ کو اسبابِ تجارت نہ بناؤ

اسرارِ جہاں سے نہ ہم آگاہ نہ تم — اخبارِ نہاں سے نہ ہم آگاہ نہ تم
ہر ذرّہ یہاں گرمِ سخن ہے لیکن — قدرت کی زباں سے نہ ہم آگاہ نہ تم

حامد علی خاں

جہاں نما

تہذیب[1] کیا ہے

تہذیب کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ کہا گیا ہے اور بہت سے لوگوں نے تہذیب کی تعریف بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ لفظ زندگی کے اتنے پہلوؤں پر حاوی ہے کہ کوئی ایک تعریف قابلِ اطمینان نہیں کی جا سکتی۔

"تھیاسوفسٹ" میں مسٹر سی جینراج داس کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اِس بعید الفہم چیز (تہذیب) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اِس کی تخلیق محض دماغی عمل سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں دل کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> جب ہم مختلف ممالک کے مختلف نسلی روایات رکھنے والے مہذّب لوگوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ تہذیب کی اصل ایک دلی کیفیت ہے جس سے دماغ ایک خاص طرزِ عمل کی ہدایت پاتا ہے۔ ایک مہذّب مرد یا مہذّب عورت کی اس دلی اور نتیجۃً دماغی کیفیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ تنقیص کے مقابلے میں تحسین پر آمادہ رہتے ہیں۔ ایک مہذّب آدمی بدی کو گوارا نہیں کرتا نہ نقائص کی طرف سے آنکھیں بند رکھتا ہے لیکن کسی نہ کسی طرح گویا فطرۃً اُس کی توجہ پہلے اشخاص واشیاء کے قابلِ تحسین پہلو پر منعطف ہوتی ہے۔ تنقیص یعنی اُس کی تنقید کی باری بعد میں آتی ہے۔

خواہ کالج کا طالب علم ہو یا اَن پڑھ کسان، دونوں میں تہذیب کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب اُن کا دل کسی نئی چیز کو دیکھ کر یہ کہنے کے قابل ہو جائے

"کس قدر خوبصورت ہے"

> حُسن کی یہی پہچان، خواہ حسن کس قدر کم ہو اور اُس کی پہچان کس قدر دشوار، تہذیب کی بنیاد ہے۔ دنیا کی چیزوں کے حُسن اور واقعات کے اچھے پہلو کی طرف عام رُجحان تہذیب کی ترقی کی علامت ہے۔ اِسی صورت میں دماغ زندگی کی جدوجہد میں دل کا بہترین مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

پُرانے یونانی "تہذیب" کے متعلق بحث نہیں کیا کرتے تھے۔

> ہر یونانی فطری طور پر مہذّب تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی زندگی خوبصورت پیکروں اور بالخصوص خوبصورت مجسّموں اور قدیم شعراء کے نفیس اشعار کے درمیان بسر ہوتی تھی۔ یونانی نوجوان ہر چیز میں آرٹ ــــ حسن وخوبی، اظہارِ کمال اور پاکیزگی، کی تلاش کرتے تھے۔ اُن کا منصوبہ "مذہبیت" کے بجائے راست بازی کا حصول تھا۔ عام زندگی میں راست بازانہ طرزِ عمل یونانیوں کے نزدیک اس بات کا اظہار تھا کہ وہ اُلوہیت کو خیر، صدق، اور جمال کا سرچشمہ تسلیم کرتے ہیں۔ نہ صرف یونانی بلکہ دنیا کی تمام مہذّب قومیں اسی لئے کامیاب ہوئیں کہ کسی شخص یا چیز کو دیکھنے پر اُن کا اوّلین تاثر اِن جملوں سے ظاہر ہوتا تھا "کس قدر حسین ہے، کس قدر شاندار، کس قدر دلکش!"

گاندھی جی اور جھاجی

وہ حضرات جو زبان کے معاملے میں اپنے آپ کو غیر جانب دار ظاہر کرنا چاہتے ہیں جب کبھی اُردو اور ہندی کی مفاہمت کا ذکر

---

[1] یہاں تہذیب کا لفظ Culture (شائستگی) کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے Civilization کے لئے تمدن کا لفظ بہتر ہے۔ تہذیب وتمدن کے اس مفہوم کے پیشِ نظر جو لسانی اعتبار سے زیادہ مناسب بھی ہے کلچر کے لئے ثقافت کے غیر مانوس لفظ کے استعمال کی ضرورت نہیں رہتی۔ راقم

کرتے ہیں تو یہ ضرور کہتے ہیں کہ ہندی والوں کی یہ تحریک کہ زبان میں زیادہ سے زیادہ غیر مانوس سنسکرت الفاظ داخل ہو جائیں اور اُردو والوں کی یہ تحریک کہ زبان میں زیادہ سے زیادہ غیر مانوس عربی و فارسی الفاظ داخل ہو جائیں دونوں رد کرنے کے قابل ہیں۔" جہاں تک ہمیں علم ہے اُردو میں ایسی کوئی تحریک نہیں کہ اُردو میں غیر مانوس عربی و فارسی الفاظ داخل کئے جائیں بلکہ اس کے برعکس اُردو میں یہ تحریک ضرور ہے کہ زبان آسان سے آسان اور سب کے لئے قابلِ فہم بنائی جائے۔ چنانچہ اُردو کے تمام مسلّمہ ادیب (ایک آدھ کو چھوڑ کر) بہت سادہ زبان لکھتے رہے ہیں اور لکھتے ہیں۔ یہی حال اخبارات و رسائل کا ہے۔ "غیر جانب دار" اور مفاہمت خواہ اصحاب کا دوسرا قول البتہ ضرور صداقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہندی کے حلقوں میں سے جب کبھی کوئی آواز اُٹھتی ہے خواہ وہ شری سمپورجی کی ہو یا شری جھا جی کی ہمیشہ یہی مطالبہ سنائی دیتا ہے کہ "ہندی کو زیادہ سے زیادہ سنسکرت الفاظ سے بھردو تاکہ اسے ہر شخص سمجھ سکے۔" اس قول کے آخری حصّے میں جس ستم ظریفی سے کام لیا جاتا ہے اُس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

سمپورجی کا منوہر دیا گیان تو کافی شہرت پا چکا ہے اب پروفیسر امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کی "کتھا" سنئے:۔

میرے نزدیک ہندی اور اُردو دو مختلف زبانیں ہیں۔ دونوں کا رسم الخط، محاورات، عروض، تخیل، اور ماحول مختلف ہے۔ جو شخص ان دونوں زبانوں کو ایک سمجھتا ہے اُس کی خود فریبی کی صلاحیت یقیناً حیرت انگیز ہو گی۔ ان دونوں زبانوں کے اتحاد کی کوشش کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسی مصنوعی زبان بنائی جائے جو دونوں زبانوں کے شیدائیوں کے لئے ناگوار ہو گی اور جس سے دونوں زبانیں اور اُن کا ادب درہم برہم ہو جائے گا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا:۔

صرف وہی زبان کُل ہندوستان کی زبان بن سکتی ہے جس کا سرچشمہ سنسکرت ہو اور جس میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہو۔

شری جھا صاحب کے یہ آخری الفاظ شری سمپورصاحب کے الفاظ کی ٹھیک صدائے بازگشت ہیں۔ دونوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کی عام فہم زبان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں سنسکرت کے ناقابلِ فہم الفاظ کی بھرتی کثرت سے ہو

مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ حال ہی میں مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار "ہریجن" میں ملک کی عام زبان کے متعلق جو مضمون لکھا ہے اُس میں اُنہوں نے بالکل مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہندی اور اردو کو تقریباً ایک زبان سمجھتے ہیں اور دونوں زبانوں کی عام فہم صورت کو ہندوستانی کا نام دیتے ہیں۔ رسم الخط کے متعلق اُن کا قول ہے کہ جو رسم الخط زیادہ ہر دل عزیز ہے اور جسے ہندو اور مسلمان عوام زیادہ سمجھتے ہیں وہی سارے ہندوستان کا رسم الخط ہو گا۔ اُن کی خواہش یہ بھی ہے کہ لوگ دونوں رسم الخط سیکھیں۔

اگر ہندی کے دوسرے سرپرست بھی مہاتما گاندھی کے معقول خیالات کی پیروی کریں تو زبان کا جھگڑا ختم ہو سکتا ہے۔

بنارس یونیورسٹی میں مہاتما گاندھی کا خطبہ

مہاتما گاندھی نے بنارس یونیورسٹی میں تقسیم اسناد کے موقع پر جو تقریر کی اُس میں انہوں نے یونیورسٹی کے کارکنوں پر یہ بجا اعتراض کیا کہ انہوں نے انگریزی زبان کو ذریعۂ اظہارِ خیالات بنا رکھا ہے۔ مہاتما صاحب نے فرمایا:۔

"مجھے بالکل اطمینان ہوتا اگر آپ اس موقع پر ہندی، ہندوستانی، اردو سنسکرت یا کوئی اور ہندوستانی زبان استعمال کرتے۔ اس حالت میں کہ ہم خود انگریزوں کی زبان سے ایک غلامانہ شیفتگی کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں ہم انگریزوں کو ہندوستانیوں سے اُن کے حاکمانہ سلوک میں متہم نہیں کر سکتے۔ ہماری ذلت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب کوئی انگریز ہم میں سے کسی کو انگریزی زبان کے صحیح استعمال کی داد دیتا ہے تو ہم خوشی سے پھولے نہیں سماتے حالانکہ پنڈت مالویہ اور سر رادھا کرشنا کی طرح اس کے صحیح تلفظ کے اہل بھی شاذ ہیں۔"

مہاتما صاحب کا مذکورۂ بالا ارشاد بالکل بجا ہے لیکن اس میں ذرا سی ترمیم کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی زبان اچھی طرح جانتا ہو اور پھر وہ کسی دوسری زبان میں بھی ایسی مہارت حاصل کرلے کہ اہلِ زبان اُس کی داد دیں تو ہماری رائے میں اُس شخص کا فخر محسوس کرنا بے جا ہے نہ قابلِ ملامت۔ مہاتما صاحب کا منشا دراصل یہ ہے کہ ہم ناجائز طور پر اپنی زبان کی قربانی دے کر ایک غیر زبان کو سیکھتے ہیں اور پھر اس پر نازاں ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ غلامانہ ذہنیت اور پستی کی انتہا ہے کہ ہم اپنی زبان کی ناواقفیت اور اُس کے غلط استعمال پر مطلق شرمسار نہیں ہوتے لیکن اگر ہماری انگریزی زبان کی کوئی غلطی کھل جائے تو بلاوجہ ہمارے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں حالانکہ ایک چھ ہزار میل دُور سمندر پار کی بولی کا حدِ کمال تک اپنا نا ہمارے فطری فرائض میں داخل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز خواہ کہیں کا گورنر ہی کیوں نہ ہو "ہم کھانے مانگتا" قسم کی ہندوستانی بول کر کبھی منفعل نہیں ہوتا۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

مملکتِ نظام اور اُردو زبان

بعض بدبیں انجمنوں نے ممالکِ محروسۂ نظام میں اُردو زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے پر اعتراضات کئے تھے۔ حکومتِ سرکارِ عالی نے حال ہی میں اِن اعتراضات کا یہ معقول جواب شائع کیا ہے :-

"مدارسِ ثانویہ میں اُردو زبان کا ذریعۂ تعلیم ہونا نہ صرف اس لئے بجا ہے کہ یہ یہاں کی سرکاری عدالتی اور دفتری زبان ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ ایک بہت عام فہم ہندوستانی زبان ہے۔ اس زبان کی نشو و نما ہی ہندو مسلم اتحاد سے ہوئی تھی اور دونوں فرقوں نے اِس کی ترقی میں برابر کا حصّہ لیا ہے۔"

اس جواب کے بعد کوئی نیک نیت شخص جس کے ہوش و حواس بجا ہوں حکومتِ نظام کے طرزِ عمل پر معترض نہیں ہوسکتا۔ جو حضرات زبان کے ڈکٹیٹر بننا چاہتے ہیں انہیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اُن کی یہ کوشش بالکل بےسود ہے۔ زبان ہمیشہ جمہور کی تخلیق رہی ہے اور اس پر ہمیشہ جمہور ہی کا اقتدار رہے گا۔

جراثیم کے متعلق نیا نظریہ

اب تک یہ عام خیال ہے کہ مختلف امراض کا باعث بعض خرد بینی جراثیم ہوتے ہیں اور ان جراثیم کی ہلاکت ہی سے مرض کا دفعیہ ہوسکتا ہے۔ حال میں بعض ڈاکٹروں نے یہ نیا نظریہ پیش کیا ہے کہ بیماریوں کے جراثیم مریض کے دشمن نہیں دوست ہوتے ہیں۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ جراثیم مرض کا سبب نہیں نتیجہ ہیں۔ پہلے جسمِ انسانی میں فاسد مادّے جمع ہوتے ہیں۔ پھر جیسے گدھ وغیرہ مُردار کو کھانے کے لئے نازل ہوتے ہیں اُسی طرح یہ جراثیم جسم کے اُن فاسد مادّوں کا صفایا کرنے کے لئے پیدا ہوجاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مرض کا اصل سبب فاسد مادّے ہوتے ہیں، اگر انسانی جسم اِن سے بچا رہے تو جراثیم پیدا ہی نہیں ہوتے۔

طلبہ اور سیاسیات

جھانسی کالج کے جلسۂ تقسیمِ انعامات کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر امرناتھ جھا وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ کو سیاسیات میں حصہ نہیں لینا چاہئے۔ انہوں نے فرمایا :-

"اگر کالج سیاسی مقاصد کے لئے میدانِ کارزار میں تبدیل ہوگئے تو یہ ہماری قومی تاریخ کا بہت افسوسناک واقعہ ہوگا۔

"طلبہ کا فرض تعلیم حاصل کرنا ہے۔ سیاسیات کے متعلق ابتدائی معلومات تک حاصل کئے بغیر اُن کا اس میدان میں قلابازیاں لگانا بہت خطرناک نتائج پیدا کرے گا۔ طلبہ کا مقصد نیکی، صداقت اور حسن و خوبی کی تلاش ہونا چاہئے۔ اُن کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ علم صحت اور دولت حاصل کریں۔"

حامد علی خاں

حکیم آزاد انصاری

ابھی گزشتہ ہی اکتوبر کی بات ہے جب حضرتِ جوش ملیح آبادی لاہور تشریف لائے تھے اور میں اُن سے ملنے گیا۔ ملاقات کے دوران میں حضرتِ آزاد انصاری کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔

شاعرِ انقلاب نے فرمایا: "آزاد فاتحِ ماہ و سال ہیں۔ اُن کا کیا کہنا ہے۔ اس سن اور اس عالم میں بھی ظالم بچپن کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ آج کل قدرے علیل ہیں۔ روز سوچتا ہوں کہ اُنہیں خط لکھوں لیکن فرصت نہیں ملتی۔ عجیب بچہ ہے۔ اب تو اُس کے بغیر کوئی محفل بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ لکھنؤ پہنچ لوں فوراً بلا لوں گا۔ میں نے لکھا بھی تھا کہ کرایہ بھیج دیتا ہوں چلے آؤ۔ اُس کا دم ہمارے لئے غنیمت ہے۔ چاہتا ہوں کہ اب وہ میرے ہی پاس رہے۔ اُس کے علم و فضل کے کیا کہنے ہیں صاحب! بات بات میں بات پیدا کرتا ہے .... بھئی بہت ہی پیارا آدمی ہے۔ وہی ایک شخص ہے جس سے مجھے آج تک کبھی تکلیف نہیں پہنچی۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "ظفر! تم تو اُسے جانتے ہو نا۔" میں نے عرض کیا "جی ہاں! دہلی میں آپ کے ہاں اکثر اُن کے نیاز حاصل کرتا رہا ہوں۔ پچھلے دنوں اُن کی نظمیں جو میں نے پڑھی ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ اُن کا کلام بڑھاپے کے ساتھ ساتھ جوان ہوتا چلا جا رہا ہے۔" جنابِ جوش مسکرا دیئے۔

'ہمایوں' کے سالگرہ نمبر میں "دو دلچسپ خط" میری نظر سے گزرے۔ دوسروں کی نظر سے اُن پر دلچسپ ہونے کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ البتہ میرے لئے ضرور دلچسپ تھے۔ میری نظر میں دریا گنج دہلی کی وہ راتیں لوٹ آئیں جن میں شاعرِ انقلاب اور حکیم صاحب کیفِ سخن سے سرشار دھومیں مچایا کرتے تھے۔ وہ حضرات جو حضرتِ جوش اور حکیم صاحب کے تعلقات سے ناواقف ہیں میرے خیال میں ان خطوط کی دلچسپی کی تہ تک پہنچنے سے قاصر رہیں گے۔ تاہم یہ خط دلچسپ ہیں۔ حکیم صاحب کی تحریر میں جس قدر ذکاوت، طنز، شدتِ احساس، عالی نظری اور وضاحت ہے وہ ان کا خاص حصہ تھا۔ جہاں تک میں اُن کی ذات کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ اُن کی زندگی اور تحریرِ نظم و نثر میں ذرہ بھر فرق نہ تھا۔

'ہمایوں' کا سالگرہ نمبر ابھی میلا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ موت نے یہ 'فاتحِ مہ و سال' ہم سے چھین لیا —— مجھے یقین ہے کہ وہ شخص جو زندگی بھر زندہ رہا، مر کے بھی "زندہ" رہے گا۔ جسے اپنے بڑھاپے پر جوانی کا گمان تھا، جس نے وقت پر حکمرانی کی، وہ موت پر بھی حکمران رہے گا —— 'فاتحِ مہ و سال'!

۳۰ر جنوری ۱۹۴۲ء کے 'ایسٹرن ٹائمز' کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میری نظر 'حکیم آزاد انصاری' کی سرخی پر پڑی۔ عبارت ملاحظہ: "حکیم آزاد انصاری —— شاعر، جو ریاست رام پور کی طرف سے مدعو ہونے پر حیدر آباد سے رام پور جا رہے تھے، دہلی میں نمونیا سے بیمار پڑے۔ آپ وہاں سے حیدر آباد واپس لے جائے گئے جہاں آپ نے ۱۴ر جنوری کو انتقال فرمایا۔" —— مجھے یقین نہیں آتا —— فاتحِ مہ و سال —— موت! کس قدر تضاد ہے دونوں میں —— لیکن دونوں میں کس قدر صداقت ہے!

—— ۲ ——

حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات دہلی میں حضرتِ جوش کے مکان پر ہوئی۔ ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ میں ماہنامہ 'کلیم' (جواب 'نیا ادب' میں مدغم ہو چکا ہے) کا مینیجر تھا۔ سردی کے دن تھے۔ شام کو میں حسبِ دستور وہیں تھا کہ ایک منحنی سا بوڑھا آدمی، کمبل میں لپٹا، چھڑی ٹیکتا آیا۔ میں آداب بجا لایا۔ مونڈھا آگے سرکا دیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ ابھی میں تعریف پوچھنے بھی نہ پایا تھا کہ حضرتِ جوش تشریف لے آئے۔ آپ نے دیکھتے ہی اپنے دونوں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے فرمایا: "آہاہ! آزاد صاحب" اور یہ کہتے ہوئے آکر لپٹ گئے۔ حکیم صاحب کی تصویر کہیں اس سے پہلے بھی میں دیکھ چکا تھا۔ لیکن تصویر نے میری رہنمائی نہ کی۔ اب وہ تصویر ذہن میں جاگ اُٹھی۔ میں سراپا شوق بن گیا۔ میں حیران تھا کہ یہی وہ شاعر ہے جس نے لکھا تھا ؎

"چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں — کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں"

جس کی نظم میں اس قدر انفرادیت ہوتی ہے کہ اُس کا تتبع ناممکن ہے۔ جو اپنی تحریر میں اس قدر سادہ، پختہ اور واضح ہے کہ اُس کی نظیر ہماری

شاعری میں مشکل سے ملتی ہے۔ میں دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا یہاں تک کہ آج بھی حکیم صاحب کو اُسی مونڈھے پر اُسی طرح پھرتی سے باتیں کرتا ہُوا اپنے سامنے پاتا ہوں۔ وہی چھریرا تیلا دُبلا بدن، سوکھے سے اُترے ہوئے چہرے پر فراست اور شعریت کے واضح نقوش چھوٹی سی خشخشی داڑھی ٹھوڑی پر ذرا زیادہ گھنی ہنس مکھ مچلتی ہوئی آنکھیں عینک میں سے جھانکتی ہوئی ---- وہ نکتہ رس آنکھیں! ---- کیا کہوں؟ کیسے لکھوں کہ وہ شخص جس نے اپنی پہلی ہی ملاقات سے مجھے اس قدر متاثر کر دیا تھا آج دنیا میں نہیں ---- میں اُسے پھر کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ اُس کے خاص انداز میں کون لکھے گا؟ کون کہے گا

جہاں آزاد اب میرا نیازِ عشق فائز ہے
وہاں کوئی غرورِ دلربائی کر نہیں سکتا
آزاد انصاری

اُنہیں دنوں کی بات ہے کہ حکیم صاحب، جوش صاحب اور چند اور حضرات محفلِ شبینہ جمائے بیٹھے تھے۔ میں بھی موجود تھا۔ ہال میں قالین پر چاندنی بچھی ہوئی تھی شعر و سخن کا دور ہو رہا تھا۔ جاڑا اپنے جوبن پر تھا۔ ہم لوگ دروازہ بند کئے، انگیٹھی رکھے، لحاف اوڑھے بیٹھے تھے۔ ابتدا حضرت جوش نے کی۔ آپ نے چند رباعیات سنائیں جو اُنہیں دنوں آپ کے مجموعے "جنون و حکمت" میں شائع ہو رہی تھیں

حکیم صاحب داد دے رہے تھے۔ گردن جھٹکا کے واہ، کہنے کے بعد ذرا سا رکتے، اس وقفے میں آپ جوش صاحب کی طرف دیکھتے اور پھر گردن جھٹکا کر دوبارہ واہ کہتے۔ اس واہ میں اس قدر شدت تھی کہ معلوم ہوتا تھا حکیم صاحب کے دل سے آواز آ رہی ہے۔ اس کے بعد آپ کی باری تھی چنانچہ آپ نے تمہید باندھنی شروع کی۔ فرمایا "بھئی آپ لوگ غزل کے دشمن ٹھہرے اور مجھے نظم یاد نہیں رہتی۔ کہو تو غزل سنا دوں" سب نے پُرزور اصرار کیا۔ آپ نے غزل سنانی شروع کی۔ میں آپ کا کلام پہلی مرتبہ آپ کے مُنہ سے سن رہا تھا۔ زمین تھی "کہیں سے، جبیں سے"۔ ابھی آپ نے دوسرا شعر ہی سنایا ہو گا کہ چوکھٹ بجی، دروازہ کھلا اور ایک سر نے اندر جھانک کر کہا "میں آ سکتا ہوں" ---- یہ حضرت خیر آبادی تھے جو اُن دنوں اس محفلِ رنداں کے ایک سرگرم رکن تھے۔ حکیم صاحب نے دیکھتے ہی ہاتھ اُٹھا کر کہا ؎

ستم گر میں تجھے پہچانتا ہوں وہیں سے بات کر نالس وہیں سے

ہنستے ہنستے ہم لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ کتنا برمحل تھا شعر، یہ کچھ ہمیں لوگ جانتے تھے ---- جب محفل میں کچھ سکون ہُوا تو آپ نے فرمایا "مجھے آج علم ہُوا ہے کہ اس شعر کا کچھ اور بھی مفہوم ہے"۔

دوسرا واقعہ جو اس وقت میرے ذہن میں گھوم رہا ہے اُنہیں دنوں کا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا "کلیم" کے دفتر میں حکیم صاحب، جوش صاحب اور جناب اسرائیل احمد خاں صاحب (جو کلیم کے مستقل مضمون نگار تھے اور حضرت جوش کے بہت بڑے پرستار ہیں) بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ حضرت جوش نے پان کی ڈبیا اور بٹوہ پیش کرتے ہوئے فرمایا "لیجئے آزاد صاحب!" "حکیم صاحب آداب عرض کہتے ہوئے لپکے۔ لیکن اس پھرتی سے کہ آپ کے پاؤں جسم کا ساتھ نہ دے سکے۔ آپ پھسلے اور سینے کے بل پٹ گرے۔ اسرائیل احمد خاں صاحب نے لپک کر تھاما۔ ہم سب نے بڑی مشکل سے آپ کی بزرگی کے پیشِ نظر ہنسی کو ضبط کیا۔ حکیم صاحب اُٹھے اور مسکراتے ہوئے آپ نے پھر وہی "آداب عرض" کی رٹ لگا دی اور گفتگو کا سلسلہ ویسے ہی جاری رکھا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔

مشاعروں سے آپ کو بے طرح محبت تھی۔ کوئی عالم ہو۔ کچھ ہو، سردی ہو یا گرمی، صحت ہو یا علالت کہیں مشاعرہ ہُوا اور آپ جھٹ پہنچے۔ دسمبر ۱۹۳۷ء کے بڑے دنوں میں کوئینز گارڈن دہلی کی کسی کلب کے زیرِ اہتمام پروفیسر اکبر حیدری مرحوم نے ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کرایا۔ مقامی اور بیرونجات کے نامور شعرا مدعو تھے حکیم صاحب ایک شدید علالت سے ابھی اُٹھے ہی تھے۔ حضرت جوش نے اور آپ نے فیصلہ کیا کہ ہرچہ باداباد مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گے۔ چنانچہ مشاعرے کی رات آپ نے ملازم کو ہدایت کر دی کہ کوئی بھی ملنے کو آئے کہہ دو گھر پر نہیں، اور آپ نے حکیم صاحب کو اندر ایک کمرے میں ٹھہرا دیا اور خود زنانخانے میں تشریف لے گئے۔ حکیم صاحب اپنے وعدے پر مستعدی سے کاربند ہونے کے لئے کپڑے اتار کر پلنگ پر دراز ہو گئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی ہو گی کہ سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون مدیر ریاست دہلی اور چند اور حضرات آن موجود ہوئے۔ ملازم حسبِ حکم کہہ ہی رہا تھا کہ دونوں مکان پر نہیں کہ حکیم صاحب اندر سے پکار پکار کر کہنے لگے۔ ارے بھئی آیا! ---- بھئی آیا! ---- ذرا ٹھہرو ---- شیروانی تو پہن لوں"۔ اور یہ کہتے اور بٹن بند کرتے ہوئے

آپ دن سے باہر آن موجود ہوئے۔ چنانچہ چار و ناچار حضرتِ جوش کو بھی ہمراہ جانا پڑا۔ واپسی پر جوش صاحب نے ناراضی سے پوچھا "حضرت! یہ کیا حرکت تھی؟" حکیم صاحب نہایت متانت سے فرمانے لگے: "میاں! ان لوگوں نے آواز جو دی تھی میں کیا کرتا۔ گھر پر آئے ہوئے لوگوں کو دھتکار دینا میرے بس کی بات نہیں۔"

حکیم آزاد انصاری مولانا حالی مرحوم کے تلمیذ تھے اور عمر بھر اُنہیں کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ یہیں تک نہیں بلکہ اُن کی سادگی اور اسلوبِ بیان کو اپنی انفرادیت کے قالب میں اس طرح ڈھالا کہ اُسے اپنا کر چھوڑا۔ اِس ضمن میں مجھے یاد آیا کہ حضرتِ جوش ایک مرتبہ روحوں کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں آپ نے فرمایا کہ "حیدر آباد میں ایک مرتبہ میں نے پلانچٹ پر کچھ ایسی مہارت حاصل کر لی تھی کہ میرے بیٹھنے کی دیر ہوتی کہ وہ حرکت کرنے لگتا۔ ایک دن فانی بدایونی، آزاد انصاری اور میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا کہ آج غالب مرحوم کی روح کو بلایا جائے چنانچہ پلانچٹ پر حضرت غالب کو آنے کی زحمت دی گئی۔ سب سے پہلے میں نے پوچھا 'حضرت! فرمایئے۔ کمرے میں کون کون ہیں؟' جواب ملا "ایک تو فقیر کے ہمنوا ہیں۔ ایک فقیر کے پوتے اور ایک تم۔" میں حیران تھا کہ فانی تو خیر ہمنوا ہیں۔ آزاد پوتے کس اعتبار سے ہوئے۔ یہ حضرت سہارن پوری وہ ٹھہرے اکبر آبادی ثم الدہلوی۔ اِن میں یہ رشتہ کہاں سے آ ٹپکا؟ میں نے آزاد صاحب سے کہا "آزاد صاحب! اس گتھی کو سلجھایئے۔" آزاد صاحب بولے "اے بھائی! مولانا حالی کی نسبت سے مجھے پوتا ہونے کا شرف حاصل ہے۔" میں چونکا۔ "حضرت جوش نے فرمایا" واللہ یہ بات میرے ذہن میں بھی نہ تھی۔"

آزاد مرحوم نے اپنے روحانی باپ اور دادا کی روایات کو جس انداز سے برقرار رکھا، وہ کچھ اُنہیں کا حصہ تھا۔ فلسفہ کی گہرائی، بندشوں کی چُستی، اور اندازِ بیان اُنہیں غالب سے ملا تھا۔ سلاست، روانی اور شگفتگیٔ اسلوب اُنہیں حالی سے ہاتھ آیا۔ چنانچہ اس دور میں جب مشرق و مغرب کی ٹکر نے پُرانی عمارتوں کو اس بُری طرح متزلزل کر دیا ہے کہ روایات کی تمام دیواروں میں بڑے بڑے شگاف رونما ہو گئے ہیں۔ ایک ہی معمار ایسا تھا جس کی جدّتِ طبع اور حکیمانہ نقطہ آفرینی نے مشرق و مغرب کے متضاد نظریوں کو یکجا کر رکھا تھا۔ جو دو نوں دنیاؤں کا بادشاہ تھا۔ جس کے کلام کو پُرانے خیالات کے بزرگ اور نئی روشنی کے نوجوان ایک ہی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ آج کی شاعری اور شاعروں کا طبعی رجحان 'گریز' کے لفظ میں مرکوز ہے۔ وہ موجودہ زندگی اور ماحول کے مصائب سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ 'مزدور' اور 'انقلاب زندہ باد' اسی گریز کے دو پہلو ہیں۔ عورت اور اُس کی ہر ادا پر فنا ہونے والے نوجوان بھی اسی سے متاثر ہیں۔ غرض کہ آج کی تمام تر شاعری پر اگر کوئی ایک لفظ حاوی ہو سکتا ہے۔ تو وہ 'گریز' یا 'فرار' کا لفظ ہے۔ لیکن آزاد کے قدم اس سیلاب سے ڈگمگا نہ سکے۔ وہ زمانے کے حوادث سے بھاگنا نہیں جانتے تھے۔ زندگی میں اُنہوں نے طرح طرح کی مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا تھا۔ اُن کی طبیعت میں اضطرار مفقود تھا۔ بلکہ وہ ہر مصیبت کو راحت میں بدلنے کا حکم رکھتی تھی۔ اُن کی شاعری بھی اُن کی زندگی کی خصوصیات کی حامل تھی۔ جدید ترین ثقیل موضوعات اور صدیوں کے کرم خوردہ فلسفیانہ عنوانات اُن کے قلم سے شگفتہ اور خوشگوار بن جاتے۔ حال ہی میں ہمایوں میں اُن کی نظم 'جنگ' شائع ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس نظم کا شاعر عنقریب موت کی گہرائیوں میں ڈوب جائے گا۔ اُن کا حقائق آفریں تخیل سنجیدگی میں لطافت پیدا کرتا۔ اُن کی بلند نظری تمام بلند و پست پر چھا جاتی۔ اُن کی طبع رسا ہر موضوع کو شاعری کے سانچے میں ڈھال دیتی۔ لیکن میں یہاں اُن کی شاعری کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد تو فقط یہ ہے کہ وہ چند ملاقاتیں جو مجھے خوش قسمتی سے دہلی میں حکیم صاحب سے میسر آئیں۔ مجھی تک محدود نہ رہیں۔ بلکہ وہ حضرات جن کے دل میں اِس بزرگوار ہستی سے ملنے کی ہوس تھی، میری آنکھوں سے اُس کی عظمت کو دیکھ سکیں اور میری طرح اُس سے متاثر ہو سکیں۔

اُنہیں ایام میں کسی مشاعرے کے لئے میں نے ایک غزل کہی۔ میں بیشتر اپنی نظمیں اور غزلیں حضرت جوش کو دکھالیا کرتا۔ اتفاق سے وہ وہاں تھے نہیں۔ میں نے سوچا، حکیم صاحب سے مشورہ لے لیا جائے۔ چنانچہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اُن دنوں خاں صاحب حکیم محمود علی خاں ماہر اکبر آبادی کے یہاں اقامت پذیر تھے۔ یہ غزل دہلی نے مجھ سے چھین تو لی۔ لیکن ذہن نے آج تک تین شعر محفوظ رکھے۔ وہی عرض کئے دیتا ہوں۔ ؎

وہ حوصلہ جو محبت کی رسم و راہ میں تھا　　جبھی تو تھا کہ میں کچھ آپ کی نگاہ میں تھا

گلے لگالیا دہا تھ بڑھ کے دامن کے — وہ دل کا خون جو اُمڈا ہُوا نگاہ میں تھا

ترے کرم کے تصدق مگر کرم میں ترے — کہاں وہ لطف جو فرقت کی آہ میں تھا

یوسف ظفر

مجھے یاد ہے کہ حکیم صاحب مکان کے باہر کرسی پر تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں جھک کر آداب بجالایا۔ فرمانے لگے "کہیے! کیسے آنا ہوا؟" میں نے عرض کیا کہ "ایک غزل دکھانے لایا ہوں"۔ آپ نے غزل مجھ سے لے کر پڑھنی شروع کی۔ مطلع میں "جبھی تو تھا" کی بجائے کچھ اور تھا۔ یاد نہیں پڑتا کیا تھا۔ یہ اصلاح حکیم صاحب نے فرمائی۔ میرا خیال ہے کہ اس "جبھی تو تھا" کے ٹکڑے نے مطلع میں جان ڈال دی ہے۔ اور اس سے بہتر کوئی اور اصلاح ممکن نہیں۔ آپ نے ایک اور شعر میں بھی اصلاح فرمائی تھی۔ لیکن نہ تو وہ شعر ہی یاد ہے اور نہ وہ اصلاح۔ اصلاح کے بعد آپ نے فرمایا "ماشاء اللہ! آپ غزل خوب کہتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ایسی اچھی غزل کہتے ہیں۔ میں نے آپ سے ہمیشہ نظمیں ہی سنی ہیں — یہ سن اور یہ غزل سبحان اللہ" میں نے عرض کی کہ میں زیادہ تر غزلیں ہی کہتا رہا ہوں۔ حضرت جوش کے ارشاد پر نظموں کی طرف آیا ہوں۔ آپ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور جوش آزاد نوک جھونک جس کے آئینہ دار وہ دو خطوط ہیں جن کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں چند اور حضرات بھی تشریف لے آئے اور ہم سب لوگ اندر بیٹھک میں چلے گئے۔ میں نے اجازت چاہی تو حکیم صاحب نے روک دیا۔ میں پھر بیٹھ گیا۔ آپ نے چہار مینار کے سگرٹ نکالے۔ ایک خود سلگایا اور دوسرا مجھے عنایت فرمایا۔ باقی حضرات سے آپ نے پوچھنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائی۔ میں نے سب پر نظر دوڑائی وہ خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد آپ نے وہی غزل اور نظم کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ اور وہ رُباعیات جو "ہمایوں" کے سالگرہ نمبر میں آپ کے خط میں درج ہیں ارشاد فرمائیں۔

کتنے ہو کہ جچتی نہیں اب شانِ غزل — ممکن ہو تو ڈھا دیجئے ایوانِ غزل

سرکارِ غزل میں پل کے غزلوں سے یہ بیر؟ — افسوس ہے اے نمک حرامانِ غزل

اور ساتھ ہی شانِ نزول کے متعلق بھی ارشاد فرمایا۔ جب میں اجازت لے کر باہر آیا۔ تو اُن میں سے ایک صاحب میرے ساتھ ہو لئے۔ راستے میں مجھ سے کہنے لگے صاحب! ہم تو حکیم صاحب کو حیدر آباد سے جانتے ہیں۔ ہمیں تو حیرت ہوئی کہ اُنہوں نے آپ کو سگرٹ پیش کیا۔ ورنہ وہ خود تو پیتے رہتے ہیں اور جب دوسرا کوئی اپنا سگرٹ نکال کر پینے لگتا ہے تو فرماتے ہیں "اچھا! آپ کے پاس بھی سگرٹ ہیں۔ لائیے! میں لئے لیتا ہوں" اور یہ کہہ کر وہ سگرٹ لے کر بجائے پینے کے جیب میں ڈال لیتے ہیں"۔ مجھے حکیم صاحب کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ دوسری ملاقات میں جب میں نے سگرٹ پیش کرتے ہوئے حکیم صاحب سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا "نہیں بھئی! یہ بات نہیں! میں ہر ایک کو پیش کر کے سگرٹ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ موزوں اور غیر موزوں کی تمیز ضروری ہے" ہاں! — موزوں اور غیر موزوں کی تمیز۔ یہ بات اُن کی ذات تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ اُن کی شاعری کا بھی یہی انداز تھا — اُن کی الفاظ کی موزونیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ آزاد کی شاعری کے ایک نہایت محتاط فن کار تھے — اور اُن کی زندگی بھی اس کیفیت کی علمبردار تھی۔

حضرت جوش کے صاحبزادے سجاد حیدر صاحب نے "موت" پر ایک چھوٹا سا افسانہ لکھ کر مجھے دکھایا۔ میں نے نفسِ مضمون میں تھوڑی سی ترمیم کر دی اور رائے دی کہ حکیم صاحب کو دکھا لینا چاہیئے۔ حکیم صاحب دوسرے کمرے میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے افسانہ پڑھنے کے بعد فرمایا "میاں سجاد! تمہیں جوانی میں موت کی سوجھتی ہے۔ ارے بھئی مجھے تو بڑھاپے میں بھی اس کا ذکر بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ ایسی چیزیں مت لکھا کرو — اللہ اکبر! وہ شخص جو بڑھاپے میں بھی موت کا ذکر نہ سن سکتا تھا اور جسے شاعرِ انقلاب نے فاتحِ ماہ وسال کہا، آخر موت کی دستبرد سے نہ بچ سکا — ۴ اجنوری — نمونیا — رام پور — دہلی — حیدر آباد — موت — حکیم الطاف احمد آزاد انصاری — فاتحِ ماہ وسال — اِنّا للہِ واِنّا الیہِ راجعون۔

یوسف ظفر

تنہائی

ہم بغل ہے موجِ دریا موج سے
لپٹی جاتی ہے ہوا کیا موج سے

نجمِ گردوں نجم کا ہے ہمنشیں
اک حسین کے ساتھ ہے اور اک حسیں

رات دن ملتے ہیں کیسے شوق سے
اس کو پوچھے کوئی اہلِ ذوق سے

چاندنی ہے رات کے آغوش میں
آہ کیا رکھا ہے عقل و ہوش میں

گل سے بلبل باغ میں محوِ نیاز
شمع پروانے سے ہے سرگرمِ ناز

ندیاں نالوں سے ہم آغوش ہیں
اپنی کیفیت میں سب مدہوش ہیں

اس بھری محفل میں تنہا ہوں تو میں
اپنے ہمدم کو ترستا ہوں تو میں

روز و شب آہ و فغاں سی کام ہے
میری ہستی موردِ آلام ہے

مجھ کو کیا فردوس ہو وہ یا نعیم
میری فطرت چاہتی ہے اک ندیم

جو مرا ہمراز ہو دمساز ہو
مجھ کو اُس پر اُس کو مجھ پر ناز ہو

سید نذیر حسین ناشاد

غزل

جب دشتِ عدم میں تھے، تو اب راہ گزر میں
ہم جب سے چلے ہیں مُتواتر ہیں سفر میں

ناوک ترا دل سے اُتر آیا ہے جگر میں
محفوظ ہے دولت مرے گھر کی مرے گھر میں

آنکھوں کو ذرا جلوہ گہِ طور بنا لوں
بس جاؤں نگاہوں میں سما جاؤں نظر میں

پھونکا مجھے، افلاک سے آئی جو پلٹ کر
فریاد دبی تھی مری دامانِ اثر میں

میں نے شکن آلودہ جبیں دیکھی ہے اُن کی
تحریرِ مقدر کی عبارت ہے نظر میں

ٹھہری ہوئی ہے لب پہ فغاں دل سی اُمنڈ کر
پچھتاؤ گے پھر بات ابھی گھر کی ہے گھر میں

اب کون کرے گا شبِ فرقت کی شکایت
نیند آ گئی بیمار کو آغوشِ سحر میں

آپ آئے تسلی کو جدائی میں نہ اب تک
اور آ گیا سینہ کا لہو دیدۂ تر میں

کچھ بھی ہو، ہمیں کرنی ہے طے راہِ محبت
چھالے ہیں اگر پاؤں میں طاقت تو ہے سر میں

جھک جاتا ہے بے عزم جہاں خود سرِ پرود
پڑتے ہیں مقام ایسے بھی اُس راہ گزر میں

دُنیا کے غم و عیش بدلتے رہے لیکن
جو چوٹ جگر میں تھی وہ اب تک ہی جگر میں

جن کی صفِ محشر میں سنگاہیں نہیں اُٹھتیں
یہ وہ ہیں، کسی کو جو نہ لاتے تھے نظر میں

سمجھاتا ہے کیوں ابرؔ جنوں میں مجھے سب گھر
دیوانوں نے کیوں ڈالے ہیں ڈیرے مرے گھر میں

ابر احسنی گنوری

جامِ حقیقت

(۱)

زعشقِ حق اگر دیوانہ گردی
بجانِ عاشقاں فرزانہ گردی
بیای دعاشق آں جانِ جان شو
بجانِ تو کہ خود جانانہ گردی

(۲)

محبت، ہمت مردانہ دارد
محبت فطرتِ پروانہ دارد
چہ می پُرسی زصہبائے محبت
دلِ ہر قطرہ صد میخانہ دارد

(۳)

بدہ ساقی مے از خمخانۂ عشق
کہ آرم نغمۂ مستانۂ عشق
زفیضِ آتشِ سیالِ "ہو حق"
جہانے را کنم دیوانۂ عشق

(۴)

زمطرب آتشِ سیال خواہم
نوائے رُومی و اقبال خواہم
سرایم نغمۂ عشقِ دل افروز
جہانے را بوجد و حال خواہم

(۵)

چگویم از نوائے عاشقانہ
نوائے عشق باشد جاودانہ
چہ پُرسی از سرُودِ عندلیبے
کہ باشد عرش اُو را آشیانہ

(۶)

بدل اندر فروغِ مشرقین است
زفیضِ خواجۂ بدر و حنین است
تو پُرسی گرمئ اسرودم از چیست؟
سرودم گرم از خونِ حسینؓ است

(۷)

زمن پُرسی حیاتِ ایں جہاں چیست؟
زمن پُرسی بہشتِ جاوداں چیست؟
زحُسنِ دوست روشن بزمِ جان است
نمیدانم کہ جز عشق ایں و آں چیست

(۸)

زعشق آتش بہ مُشتِ خاک دارم
دلِ بیباک و چشمِ پاک دارم
بیا ساغر کش از میخانۂ من
کہ من ایں مے زشاخِ تاک دارم

محمد اکبر مُنیر

گُم شدگی

سُو رہی تھیں ندیاں اور جُھک گئے تھے برگ و بار
بجھ گیا تھا خاک کی نبضوں میں ہستی کا شرار
چاندنی مدّھم سی تھی دریا کی لہریں تھیں خموش
بے خودی کی بزم میں ٹوٹے پڑے تھے سازِ ہوش
بھینی بھینی بوئے گل رقصِ ہوا، کچھ بھی نہ تھا
صحنِ گلشن میں اُداسی کے سوا کچھ بھی نہ تھا
اِک حجابِ تیرگی تھا دیدۂ بیدار پر
کچھ دھواں سا چھا رہا تھا حُسن کے انوار پر
اس دھوئیں میں رُوح کی تابندگی کھوتے ہوئے
میں نے دیکھا نوعِ اِنسانی کو گُم ہوتے ہوئے

جوہر فریادی

ہماری شاعری

ہمارے ملک میں شاعری کا اتنا چرچا ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے ملک میں ہو۔ مگر جہاں اتنا چرچا ہے وہاں شاعری کے متعلق مختلف اور متضاد خیالات بھی ہیں۔ بعض اصحاب شاعری کو صرف معروف غزل تک محدود سمجھتے ہیں۔ بعض صرف قومیات کو اس کا مفہوم قرار دیتے ہیں۔ بعض اس کو صرف صوفیانہ خیالات یا اخلاقیات تک محدود کرتے ہیں۔ بعض شاعر قدرت کی شاعری کو ہی شاعری خیال کرتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ شاعری کو کسی اصلاحی پیغام کا حامل ہونا چاہئے۔ ہماری برائے ناقص میں شاعری صرف جذباتِ انسانی کی تصویر کشی کا نام ہے اور جذبات میں حسن و عشق، مظاہر قدرت، تصوف و اخلاق اور قومیات سب آجاتے ہیں۔ ایک اور شکل بھی شاعری کی ہے جس میں کسی قصے یا واقعے کا بیان ہوتا ہے۔ یہ قصہ یا واقعہ عموماً ایسا ہوتا ہے جس میں جذباتِ انسانی میں سے کسی ایک یا زائد جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے اور واقعہ نگاری اور مرقع نگاری اس میں ضمناً آجاتی ہے۔ اس کی مثالیں ہماری مثنویاں اور مرثیے ہیں۔ بعض اوقات یہ شاعری محض واقعہ نگاری ہی ہوتی ہے مگر اُس میں کوئی نہ کوئی جذبہ ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ جو اشارۃً اور کنایتہً مفہوم ہوتا ہے۔

جذبات کی دُنیا کو صرف ایک جذبہ حسن و عشق یا جذبہ اخلاقیات یا جذبہ قلبیہ یا جذبہ تلاشِ معرفت تک محدود کرنا زبردستی کی بات ہے۔ جذبات کی مختلف قسمیں بمقابلہ یک دیگر چاہے کچھ بھی قدر و قیمت رکھتی ہوں اور ادنےٰ و اعلےٰ سمجھی جاسکتی ہوں، شاعری میں اُن سب کے لئے گنجائش ہے۔

اِس رائے سے اتفاق کرنے کے بعد جملہ شعرائے متقدمین و متاخرین اور اُن کے بے شمار تابعین کی شاعری بھی شاعری ہے۔ آزاد اور حالی کی شاعری بھی شاعری ہے۔ داغ، امیر، غالب، اکبر اور اقبال کی شاعری بھی شاعری ہے۔ میر حسن اور نواب مرزا شوق لکھنوی کی شاعری بھی شاعری ہے اور انیس و دبیر کی شاعری بھی شاعری۔ بلکہ ٹھمری دادرے اور دھرپد کی شاعری بھی شاعری ہے اگرچہ زمانۂ حال کی نئی ہندی میں نہ کی گئی ہو۔ شرط صرف اتنی ہے کہ اِس شاعری میں تصنع اور بناوٹ نہ ہو بلکہ حقیقت اور واقعیت نظر آئے۔ تصوف و معرفت، اخلاقیات و قومیات بلاشبہ ایسے مسائل ہیں جن کو کہنے اور عمل میں لانے کی توفیق خدا سب کو دے۔ مگر اس کے ساتھ ہی حسن و عشق کی واردات بھی کم نگاہی یا نظرِ حقارت سے دیکھنے کے لائق نہیں اس لئے کہ دُنیا کا کارخانہ بہت بڑی حد تک اسی عظیم الشان جذبہ کے ماتحت چل رہا ہے اور آئندہ چلتا رہے گا۔ یہ جذبہ کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتا، نہ اس میں کوئی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ اِس جذبہ میں جہاں ساز ہے وہاں سوز بھی ہے۔ جہاں قہقہے ہیں وہاں نالہ و آہ بھی ہے بعض طبیعتیں ساز کو پسند کرتی ہیں اس لئے کہ اُنہیں چلنے لگانے نے غم والم سے نا آشنا کیا ہے۔ بعض طبیعتیں سوز کو پسند کرتی ہیں اس لئے کہ اُن دُکھیا طبیعتوں کو غم والم ہی سے مناسبت ہوتی ہے۔ حسن و عشق کے معاملات میں ایک بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ اِن معاملات کو ہر حال میں زوجین ہی سے متعلق نہ سمجھ لینا چاہئے۔ اِن معاملات میں علاوہ زوجین کے تعلقات کے اور انسانی تعلقات اور عبد و معبود کے تعلقات بھی شامل ہیں۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ، شراب و کباب، صیاد و باغباں سب استعارے ہیں۔ اِن سے حقیقی معنی مراد لینا غلطی کی بات ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ مگر گفتگو میں کام   چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو   بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر

رہی یہ بات کہ یہ استعارے پہلے سے چلے آتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے استعارے وضع کئے جائیں تو یہ ہمارے نئے شعرا کی ہمت پر موقوف ہے۔ وہ اگر نئے نئے صنائع پیدا کر سکتے ہوں تو کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ہمارے پاس جس قدر سرمایہ خیالات اور الفاظ اور محاورات اور اسلوب بیان کا ہے وہ بجنسہٖ وہی ہے جو پہلے لوگوں کے پاس تھا۔ حسن و عشق بھی پُرانا ہے۔ اخلاقیات و قومیات بھی پُرانے اور تصوف و معرفت اُن سے بھی زیادہ پُرانے۔ وہی انسان ہے اور وہی اُس کی فطرت۔ وہی خیالات ہیں اور وہی جذبات۔ ہاں اندازِ بیان ہر شخص کا جدا جدا ہے اور اُسی کی ساری سحر کاریاں ہیں۔ یہی عطیۂ قدرت ہے۔ اسی کا نام کہیں فصاحت ہے کہیں بلاغت، کہیں سادہ گوئی اور کہیں رنگین بیانی۔ حسن و عشق کے معاملات زیادہ تر اُسی معروف صورت میں جس کو غزل کہتے ہیں بیان کئے جاتے ہیں اس لئے کہ یہ تمام اصنافِ سخن میں

سب سے زیادہ آسان ہے۔ مگر باوجود آسان ہونے کے بہت کم ایسے لوگ ہیں جو غالب میر یا داغ کی سی غزل کہہ سکیں۔ نظم کی یہ صنف خاص جو دراصل قصیدے کی مختصر شکل ہے ابتداءً صرف حسن و عشق کے لئے مخصوص اور موضوع کی گئی تھی۔ مگر بعد کو شعرا نے اس شکل میں دیگر مضامین بھی بیان کئے۔ اب غزل کی شکلِ ظاہری کو چھوڑ کر اور اس کے لغوی معنی کا خیال کر کے یہ قرار دینا کہ غزل صرف معاملات حسن و عشق سے ہی متعلق ہونی چاہئے، صحیح نہیں۔ حسن و عشق کے معاملات کے علاوہ ہر طرح کے جذبات کی کھپت اس میں پہلے سے ہوتی آئی ہے اور یہی طریقہ آئندہ بھی جاری رہنا چاہئے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ غزل کی صورت میں جو جذبات بیان کئے جائیں وہ باہم کوئی میل رکھتے ہوں، اَنمل بے جوڑ نہ ہوں۔ یعنی اُن پر یہ اعتراض نہ کیا جاسکتا ہو کہ ایک بات زمین کی کہی گئی تو دوسری آسمان کی۔ ایک مشرق کی تو دوسری مغرب کی۔ اس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ غزل میں ایک ہی جذبہ کا مسلسل بیان لازمی نہیں ہے۔ اس میں مختلف جذبات بھی بیان کئے جاسکتے ہیں۔ مگر ان کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ اَنمل بے جوڑ نہ ہوں۔ یعنی اگر حسن و عشق کا بیان ہو تو تمام معاملات اسی کے ہوں۔ اگر تصوّف و اخلاق ہو تو سب باتیں انہیں کے متعلق۔

غزل میں ضلع جگت اور صنعتِ ایہام کے متعلق پہلے اتنا لکھا جاچکا ہے کہ اس میں زیادہ لکھنے کی گنجائش اب باقی نہیں رہی۔ یہ رنگ اب اس زمانے میں مطبوعِ خاص و عام بھی نہیں۔ بعض اصحاب غالب، مومن اور بیدل کی شاعری کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ اور کسی رنگ کو پسند نہیں کرتے۔ اُن میں سے بعض کا یہ مقولہ ہے کہ شعر میں کوئی "بات" ہونی چاہئے۔ اس سے ان کی مُراد یہ ہوتی ہے کہ کوئی بات ایسی کہی جائے جس کی طرف سامع کا ذہن فوراً منتقل نہ ہو۔ یہ اندازِ بیان کی ایک خوبی ضرور ہے، مگر اس کے لئے یہ شرط ہے کہ سامع کو شعر کا مطلب سمجھنے کے لئے زیادہ فکر نہ کرنی پڑے۔ اور جو مطلب نکلے وہ پُرلطف بھی ہو۔ کوئی عمدہ اور دل لگتی ہوئی بات اگر بے ساختگی کے ساتھ سادہ زبان ہی میں کہہ دی جائے تو قابلِ تعریف ہوتی ہے اس لئے کہ بیان کی خوبی چیستاں گوئی میں نہیں ہے بلکہ مضمون کی خوبی میں ہے۔ سادہ بیانی کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ صرف محاورہ اور روزمرّہ ہی نہ ہو بلکہ اُس سے کوئی مضمون بھی پیدا ہوتا ہو۔

غزل کی زمین کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن قصیدہ مثنوی وغیرہ میں بھی اس قسم کی کوئی قید نہیں، نہ ہونی چاہئے کہ فلاں مضمون فلاں زمین میں ہی لازمی طور سے بیان کیا جائے۔ کہنے والے کو جس زمین میں مضمون ادا کرنے کی سہولت معلوم ہو وہی زمین اختیار کی جاسکتی ہے۔ البتہ بحروں کے متعلق یہ امر ملحوظ رکھنے کے لائق ہے کہ بعض بحریں سنجیدہ اور باوقار ہوتی ہیں اور بعض چنچل۔ سنجیدہ بحروں میں سنجیدہ مضامین اور چلتی ہوئی بحروں میں دیگر مضامین جو سنجیدہ نہ ہوں لائے جائیں تو مناسب ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ ایسی زمینیں نفسِ مضمون کی دشمن ہیں۔ فارسی ترکیبیں اُردو زبان کا زیور ہیں۔ مگر ان کے استعمال کے لئے سلیقے اور اعتدال کی شرط ہے۔ ان ترکیبوں کو استعمال کرتے وقت یہ احتیاط رکھنی چاہئے کہ اُردو زبان فارسی زبان نہ بن جائے۔ اور ترکیبوں کی بندش بھی ایسی ہو کہ مضمون سمجھنے میں دقت واقع نہ ہو۔ جو لوگ رنگیں بیانی کو پسند کرتے ہیں اُن کے لئے فارسی ترکیبوں کا استعمال کرنا ناگزیر ہے کیونکہ جو بات تشبیہ و استعارہ اور اضافت کے التزام کے ساتھ کہی جاسکتی ہے وہ سادہ زبان میں بلا طوالتِ غیر ضروری کہی نہیں جاسکتی۔ سادگی پسند شعرا کے لئے میر اور داغ کی شاعری شمعِ ہدایت ہے اور رنگیں بیانوں کے لئے غالب اور اقبال کی شاعری دلیلِ راہ۔ بشرطیکہ اس طرزِ ادا میں مضمون مغلق اور ادق نہ ہو جائے۔

اب تک جو بیان ہُوا وہ شاعری کی رُوح یعنی اُس کے بطون سے متعلق تھا۔ صورتِ ظاہری کے اعتبار سے شاعری کی مختلف شکلیں ہیں۔ قصیدہ، غزل، مثنوی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، رباعی، مستزاد، ترکیب بند، ترجیع بند۔ پھر ان سے متعلق ایک بڑی تعداد بحروں کی ہے۔ جس میں سے ہر بحر بجائے خود پُرلطف ہے۔ یہ بحریں اور یہ اصنافِ سخن اتنی مقدار میں ہیں اور اُن میں قافیہ و ردیف کا التزام اس تنوع کے ساتھ ہے کہ دوسرے اصنافِ سخن یا دوسری بحور کا اختراع کرنا یا بجائے اُن کے غیر اقوام کے ادنےٰ علم عروض سے بعض بے لطف باتیں مستعار لینا نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ بلحاظِ نتیجہ سعیِ لاحاصل۔ انگریزی شاعری کی تقلید میں پہلے مصرعے کے قافیہ کا التزام تیسرے مصرعے سے اور دوسرے کا چوتھے سے کوئی لطف پیدا نہیں کرتا۔ ہماری شاعری میں ذوقافیتین اور مستزاد کی صورتیں ایسی موجود ہیں جو پُرلطف ہیں۔ سانیٹ کی ترکیب اوّل الذکر ترکیب سے زیادہ بےلطف اور بے معنی ہے۔ اس سے صرف ایک دماغی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کو اگر جائز سمجھا جائے تو صنعتِ توشیح اور صنعتِ معکوس بھی ہمارے علمِ عروض کی ایسی ترکیبیں ہیں جو اختیار کرنے کے لائق ہیں حالانکہ یہ اب بے معنی ہونے کی وجہ سے متروک ہوچکی ہیں۔ بڑا معیار ایسی ترکیبوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ ترکیبیں ایسی ہونی چاہئیں کہ وہ ترنم کے ساتھ گانے میں لطف پیدا کرسکیں۔

کیونکہ شاعری دراصل ترنم ہی ہے۔ سانیٹ وغیرہ کے قافیے گاتے ہیں۔ ہمارے سامعہ پر کوئی پُر لطف اثر پیدا نہیں کرتے۔

ہماری شاعری میں قافیہ اور بعض اوقات ردیف کی پابندی لازمی ہے۔ مگر شعر اسی پابندی اور اسی زیور اور اسی جھنکار کے ساتھ شعر اور حسین شعر ہوتا ہے۔ اور یہ بات شاعری کے لئے ہی مخصوص نہیں مصوری سنگ تراشی اور فنِ تعمیر میں بھی جو منجملہ فنونِ لطیفہ ہیں، علاوہ تناسب وترتیب کے کونوں کا تقابل، سوال وجواب، متناسب اور کھپتے ہوئے رنگوں کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ شاہانِ مغلیہ کی بعض مشہور اور حسین عمارات کو دیکھئے۔ وہ نہ صرف عمارتیں ہیں بلکہ اشعار اور نظمیں ہیں جو پتھر اور چونے سے صفحۂ زمین پر لکھی گئی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ حسین شعر اور نظم لکھنے کے لئے محنت دماغ سوزی، جگر کاوی اور مذاقِ سلیم کی بڑی ضرورت ہے۔ مگر آرٹ اِن کے بغیر آرٹ ہی نہیں ہوتا۔ سادہ کاری بجائے خود قابلِ قدر ہے مگر مرصع کاری زیادہ جاذبِ نظر ہوتی ہے۔

انگریزی زبان میں غیر مقفےٰ نظم بھی ایک طرح کی نظم ہوتی ہے۔ یہ نظم ہماری زبان میں ممکن نہیں اور ممکن بھی ہو تو آج تک کوئی شاعر ایسا ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوا جس نے نظم غیر مقفےٰ صحیح طور سے لکھ کر دکھائی ہو۔ وجہ اس کی جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں یہ ہے کہ انگریزی غیر مقفےٰ نظم میں ابیات مسلسل ہوتی ہیں۔ یعنی وہاں مطلب پورا کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا نہ اچھا سمجھا جاتا ہے کہ مطلب لازمی طور سے ایک ہی مصرعے یا ایک ہی شعر کے اختتام تک پورا ہوتا چلا جائے اور اُس کا سلسلہ دوسرے مصرعے تک نہ پہنچے (جیسا ہماری شاعری میں عموماً دیکھنے میں آتا ہے)؛ اس شاعری کی صورت حقیقت میں بالکل نثر کی سی ہے صرف وزن کا فرق ہوتا ہے اور الفاظ کی بندش اور تقدیم وتاخیر از روئے قواعد صرف ونحو ومحاورہ قریب قریب وہی ہوتی ہے جو نثر میں ہوتی ہے۔ یہ بندش اگر نثر کی سی نہ ہو اور ضرورتِ شعری کے خیال سے اسے الٹ پلٹ کر دیا جائے تو نظم غیر مقفےٰ نظم نہ رہے گی، کوئی اور چیز ہو جائے گی جو نہ نثر ہوگی نہ نظم۔ بس اُردو میں اگر کوئی صاحب نظم غیر مقفےٰ لکھنا چاہیں تو اُن پر بھی یہی پابندی لازم آئے گی اور اُردو نظم غیر مقفےٰ کو ایسی صورت میں لکھنا پڑے گا کہ گویا باقاعدہ اور با محاورہ موزوں نثر لکھ رہے ہیں۔ اِس اصول کی پابندی نظمِ غیر مقفےٰ ہی میں نہیں بلکہ نظم مقفےٰ میں بھی مستحسن خیال کی جاتی ہے اور اس کی عدم موجودگی سے تعقید اور خلافِ محاورہ ہونے کے عیوب پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ نظمِ غیر مقفےٰ اُردو میں لکھنا محال ہے۔ اُردو شاعری کو جو کچھ سیکھنا تھا وہ حالی اور آزاد سے سیکھ چکی۔ اور اقبال نے تو تعلیم کی حد ہی کر دی۔ اب کسی نئے پروفیسر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہے کہ فنِ شاعری ایک فطری شے ہے۔ شاعر بڑی حد تک پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا۔ فنِ شاعری میں اکتساب کو صرف اتنا دخل ہے کہ قواعدِ علمِ عروض وعلمِ معانی وبیان حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ مگر مذاقِ سلیم اور جذبات حاصل کرنے کی چیزیں نہیں۔ شاعر کے لئے اوّل یہ ضروری ہے کہ اُسے زبان پر پوری پوری قدرت حاصل ہو یعنی وہ اپنے خیالات کا اظہار موقع ومحل کے لحاظ سے بہتر سے بہتر الفاظ میں کر سکتا ہو اور ردیف وقافیہ کی پابندیاں اُس کے لئے مشکلات ثابت نہ ہوں۔ پھر اُس کو الفاظ کی بندش اور اُن کی مترنم ترتیب میں مہارت ہو۔ اُس کو فطرتِ انسانی کا ذاتی تجربہ ہو۔ اُس کے دل میں ہمدردیٔ انسانی کا جذبہ موجود ہو۔ اور زندگی کے حقائق دریافت کرنے کا شوق اور سوز وگداز اُس کی طبیعت میں ہو۔

سید نذیر حسین ناشاد

شبنم

تمام رات
چاند کے خوبصورت دریچے سے سر نکال کر
کسی ناکام نے رو رو کر
اپنے لاتعداد آنسوؤں کو گلشن کی پتی پتی پر بکھیر دیا ہے

خالد

ایک سوال

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

کڑکتی ہوئی بجلیوں کا زمانہ زمانے کی نیرنگیوں کا زمانہ
حقائق کی ناپرسیوں کا زمانہ دل و دیں کی بے چینیوں کا زمانہ

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

تمدن کی رعنائیاں مٹ رہی ہیں تصور کی رنگینیاں مٹ رہی ہیں
وہ دانش کی خود بینیاں مٹ رہی ہیں وہ نیندیں وہ بیہوشیاں مٹ رہی ہیں

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

وہ حسن و لطافت کے آئینہ خانے وہ بکھرے ہوئے رنگ و بو کے خزانے
مہکتی بہاریں، مہکتے زمانے مگر یہ بساط اب اُلٹ دی ہوا نے

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

شکن ہی عیاں زلزلوں کی جبیں پر برستی ہیں ویرانیاں ماوطیں پر
دھواں سا ہے کچھ قصرِ علم و یقیں پر قیامت بپا ہو رہی ہے زمیں پر

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

علَم نامرادی کے لہرا رہے ہیں فسانے، حقائق کو ٹھکرا رہے ہیں
چمن عقل و دانش کے مرجھا رہے ہیں تباہی کے لشکر چڑھے آ رہے ہیں

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

کڑکتی ہے بجلی، گرجتے ہیں بادل لرزتے ہیں طوفان کی زد میں جل تھل
کسی کو نہیں چین ملتا کسی کل قیامت کی ہے بطنِ گیتی میں ہل چل

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

حیاتِ ابنِ آدم کو خود ڈس رہی ہے خیالوں میں شوریدگی بس رہی ہے
تباہی کی دیوی کمر کس رہی ہے رہی ہے جو کچھ، آہ بیکس رہی ہے

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

سُنا تھا کہ تہذیبِ رفتہ کی ہر لے وہ نغمے، وہ جلوے وہ جام اور وہ مے
نہ تھی خونفشانی سے خالی کوئی شے مگر اب تو وہ دورِ ظلمت نہیں ہے!!

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

گھٹائیں فلک پر چلی آ رہی ہیں نئی بجلیاں ہیں کہ لہرا رہی ہیں
فضاؤں میں تاریکیاں چھا رہی ہیں خداوندیاں ٹھوکریں کھا رہی ہیں

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

یہ اے عہدِ بیدار کیا ہو رہا ہے غرورِ تمدن کہاں سو رہا ہے
چمن اپنی رعنائیاں کھو رہا ہے ہر اک پھول تقدیر کو رو رہا ہے

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

یہ کیسی ہے مے، گردشِ جام کیا ہے یہ تہذیبِ حاضر کا انعام کیا ہے
بتائے کوئی وضعِ ایام کیا ہے اس آغازِ رنگیں کا انجام کیا ہے

نہ جانے زمانہ کدھر جا رہا ہے

علی اختر

پروازِ تخیل

اوڑھتی ہے رات جب زریں نقاب
جگمگاتا ہے فلک پر ماہتاب
چاندنی میں پھول کلیاں دیکھ کر
دل میں ہو جاتا ہے پیدا اضطراب
سوچتی ہوں یہ گلِ لالہ کہیں
سینۂ سوزاں کا شعلہ تو نہیں

جب نکل آتا ہے سورج شرق سے
مسکرا اُٹھتی ہے ساری کائنات
شبنمیں کلیوں کو ہنستے دیکھ کر
لے کے ٹھنڈی سانس ڈھل جاتی ہے رات
سوچتی ہوں اوس کے قطرے کہیں
اشکِ بیمارِ محبت تو نہیں

شام کو جب ڈوبتا ہے آفتاب
پھیل جاتی ہے اُداسی چار سُو
اور شفق کی نرم و نازک گود میں
اونگھنے لگتی ہے موجِ آبجو
سوچتی ہوں چرخ کی سرخی کہیں
عکسِ خونِ دلِ شکستہ تو نہیں

جب خزاں کے بعد آتی ہے بہار
گیت گاتے ہیں طیورِ نغمہ زن
بلبلوں کے گیت اور بھونروں کا شور
سُن کے ہو جاتی ہوں میں غرقِ محن
سوچتی ہوں نغمۂ بلبل کہیں
بختِ خوابیدہ کا نالہ تو نہیں

نجمہ رحمت اللہ بی اے

خربوزے!

وہ تھکا ماندہ روتا بسورتا سو گیا۔ اور سوتے ہی اُس نے ایک خواب دیکھا کہ آسمان کے ستارے ہولے ہولے خربوزوں کی شکل اختیار کر رہے ہیں اور یہ آسمانی خربوزے جھم جھم کرتے اُس کی جھولی میں آ گرتے ہیں۔ خود کٹ جاتے ہیں۔ بیج خود ہی الگ ہو جاتے ہیں۔ خود اُس کے مُنہ میں اپنا گُودا تراش کر ڈال دیتے ہیں اور چھلکے اُچھل کر خود ہی پرے جا گرتے ہیں! اور اس کی ماں جس نے شام سے اِس وقت تک چیخنے چلاّنے کے باوجود اُسے ایک خربوزے کے لئے دو پیسے نہیں دیئے تھے، کواڑ کا سہارا لئے بیٹھی مسکرا رہی ہے!۔ اور اُس کے ہمجولی پست دیوار پر سے اپنے گرد آلود سَر اُٹھا کر اُسے تعجب اور رشک سے دیکھ رہے ہیں کہ اچانک ایک خربوزہ اُس کے سر پر آن گرا اور وُہ بلبلا کر اُٹھ بیٹھا —— "ہائے ماں —— خربوزہ!" —— اور اُس کی ماں اچانک نیند سے چونک کر پکاری "تیرے دشمنوں کو موت بلائے تُو کیا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے! یہ اللہ مارے خربوزے کیا آئے میرے لئے آفت آ گئی —— چند روز ہوئے تجھے ایک گول گول پیلا پیلا خربوزہ نہیں خرید دیا تھا؟ سو جا!" —— اور اُس نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر آنکھیں جھپکا کر آسمانی خربوزے دیکھنا چاہے مگر بوڑھی بکری کے مدھم دھبے اور کُبڑے نیم کے چپ چاپ سائے کے سوا اُسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس پر اُسے خربوزے کا گمان ہو سکتا!

ساری رات اُسے خربوزوں بھرے خواب نظر آتے رہے اور جب صبح کو اُٹھا تو آنکھیں ملتا اپنی ماں کے پاس جا بیٹھا اور اُس کے اُٹھے ہوئے گھٹنے پر اپنی ننھی سی ٹھوڑی رکھ کر مسکین آواز میں بولا "ماں"

اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی "کیا؟"

"خربوزہ" اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور اُس کی حقیقی ماں کی آنکھیں سوتیلی ماؤں کی آنکھوں کی طرح چمک اُٹھیں۔ اُس نے ہونٹ کاٹ کر ننھے کے گال پر اُلٹے ہاتھ سے اِس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ لڑھک کر چولھے کے پاس جا گرا۔ زار و قطار روتا وہ اپنے گھر سے باہر نکل گیا اور سوچنے لگا "اس دنیا میں پہلے سے ہی میرا باپ نہیں تھا۔ اب میری ماں بھی کوئی نہیں۔ میں تو کوئی آوارہ بھکاری چھوکرا ہوں جس گلی میں جاتا ہوں کتے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور جس سے بات کرتا ہوں وہ تیوری چڑھا لیتا ہے، بس اب آج کے بعد میں گھر نہیں جاؤں گا۔ اِن کھیتوں سے نکل کر بہت دور چلا جاؤں گا۔ وہ جہاں اُڑتی ہوئی کونجیں چڑیاں سی نظر آ رہی ہیں۔ جہاں ریلیں اور لاریاں چلتی ہیں۔ بس وہاں —— نہ کسی سے کچھ مانگوں گا نہ کسی کی چوری کروں گا۔ دن کو چلتے چلتے تھک جاؤں گا تو شیشموں تلے لیٹ رہوں گا۔ رات کو تھکوں گا تو نرم گھاس کے قطعوں پر سو رہوں گا۔ ماں کہا کرتی ہے کہ ہم سب کو رزق دینے والا خدا ہے۔ بس اُسی سے مانگوں گا۔ وہی میرا پیٹ بھرے گا اور وہی —— وہی خربوزے بھی لا دے گا!" —— اور خربوزوں کا خیال آتے ہی وُہ رُک گیا۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مل کر اُس نے ہاتھ بلند کئے اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا "اے میرے اچھے خدا۔ میں تجھے بہت یاد کیا کرتا ہوں۔ پرسوں مولوی جی سے میں نے نماز کا سبق بھی لیا تھا۔ اور مجھے کلمہ بھی آتا ہے اور میں بہت اچھا ہوں اچھے خدا۔ اور تو یوں کر کہ مجھے آج اچھے اچھے پیلے پیلے خربوزے لا دے کہیں سے، اور نہیں تو یہ سامنے بخشو کا کھیت ہے! یہیں سے سہی۔ لیکن خربوزے لا دے ضرور۔ میں آج ساری رات کلمہ پڑھتا رہوں گا اور پھر کبھی خربوزے نہ مانگوں گا۔ —اے میرے اچھے خدا، اب میں آنکھیں بند کرتا ہوں۔ تو میرے سامنے خربوزے رکھ جا۔"

اور اُس نے وہیں کھڑے کھڑے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اُس کے لبوں کے گوشے کانپنے لگے۔ نتھنے پھڑک گئے اور وہ مسکرانے لگا۔ اسے محسوس ہُوا کہ اللہ میاں اُس کے لئے خربوزوں کی گٹھڑی باندھے آ رہے ہیں۔ قدموں کی چاپ نہایت تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ اُس کے ذہن پر اللہ میاں کا پاکیزہ ہیولیٰ اُبھرا۔ سفید لباس۔ سفید بال۔ نورانی چہرہ۔ ایک سفید کپڑے میں پیلے پیلے خربوزوں کا ایک انبار باندھے وہ اُس کے قریب آئے اور پھر —— اور پھر تڑاخے کی آواز آئی۔ اُس کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ دھب سے نکیلے پتھروں پر گر گیا۔ سکتہ چھا گیا بے چارے پر۔ پلٹ کر دیکھا تو اللہ میاں کی جگہ سفید لباس پہنے سفید ریش بخشو کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور پریشانی میں وہ اپنی داڑھی کو بار بار کھجلاتا تھا۔ گرج کر بولا "شیطان کہیں کا۔ مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر کے یوں چپ چاپ

کھڑا ہو گیا جیسے اسے کچھ خبر ہی نہیں۔ یوں کھیت میں گھسا چلا آرہا تھا جیسے اپنے باپ کی ریاست میں اینڈتا پھر رہا ہے۔ شیطان کہیں کا!"

ننھا، جو خدا اور بخشو کے اِس ہولناک تصادم سے گھبرا سا گیا تھا۔ رونی صورت بنا کر بولا "میں تو خربوزوں کی ——"

اور بخشو اُس کی بات کاٹ کر کہنے لگا "اور میں کب کہتا ہوں کہ تُو یہاں نماز پڑھنے آیا۔ خربوزوں کی تلاش ہی تو تجھے یہاں کھینچ لائی گزشتہ چند دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ وہ چور کون ہے جس نے میرے کھیت کا پورب کا گوشہ تباہ کر ڈالا ہے۔ اب معلوم ہُوا کہ یہ حضرت ہیں"

اور وہ روتا ہُوا بولا "میں تو آج ہی ——"

"اور کل؟ اور پرسوں؟" بخشو نے اپنا سر دائیں کاندھے پر جھکا کر کہا "کل پرسوں میں نے تجھے نہیں دیکھا، اس لئے؟ اُٹھ۔ بھاگ جا یہاں سے۔ آج کے بعد اگر تو پھر اِدھر آیا تو ٹنگ جاؤں گا تجھے۔ بڑا آیا خربوزوں کا رسیا۔ اتنا شوق ہے تو ماں سے دو پیسے لے اور خرید لے جا خربوزہ"

ننھا اُٹھا۔ اُٹھتے ہوئے اس کی نظریں سامنے سارے کھیت میں گھوم گئیں۔ اور بے شمار پیلے پیلے دھبے اُس کے سامنے تیرتے ہوئے کہیں کھو گئے، سر جھکائے وہ پلٹا اور بہت دور جا کر ایک ننھی سی بیری کے تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اِس دُنیا میں نہ تو اس کا کوئی باپ ہے اور نہ ماں۔ اور نہ —— اور نہ خدا! —— اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور دو سسکیاں بھرتا ہُوا وہیں سو گیا۔

بہت دیر تک وہ خربوزوں بھرے خواب دیکھتا رہا مگر اچانک جیسے اُس کے مُنہ پر اللہ میاں نے طمانچہ مار دیا۔ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا۔ دیکھا تو ماں کھڑی ہانپ رہی ہے۔ بڑی بڑی لال لال آنکھیں۔ پسینے سے شرابور چہرہ۔ پاؤں پر گرد جمی ہوئی۔ ہاتھ دوسرے طمانچے کے لئے تلا ہُوا "لگاؤں دوسرا؟" وہ پکاری "لگاؤں یا گھر چلے گا؟ ارے اُچکے۔ تو بخشو کا کھیت اجاڑتا رہا ہے اور پھر بھی ہر وقت خربوزہ خربوزہ کی رٹ لگائے رکھتا ہے اے چوٹے۔ تجھے شرم نہ آئی؟ اللہ بخشے تیرے باپ کو تو ایک روز پانچ روپے کا ایک نوٹ گلی میں پڑا ملا تھا۔ بھاگا بھاگا چوپال پر گیا۔ پوچھ گچھ کی۔ اور جس کا نوٹ تھا اُسے دے دیا۔ ایک کوڑی تک نہ لی۔ گھر لے آتا تو بھیڑ بکری خرید لی جاتی۔ لیکن اُس کے من میں کھوٹ نہ تھا۔ اور تو ایسا ناخلف ایسا کپوت کہ خربوزے چراتا پھر رہا ہے، زبان کا چسکا پورا کرنے کے لئے خاندان بھر کے نام کو بٹہ لگا رہا ہے! بخشو ابھی ابھی میرے ہاں گیا اور اتنی عورتوں کے سامنے میری ناک کاٹ کر وہ پھینکی ——"

ماں کی کف آلود ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری رہا لیکن ماں کی ناک کٹ جانے کی خبر سُن کر اُس نے گھبرا کر نظریں اُٹھائیں۔ ماں کی ناک اُسی طرح قائم تھی۔ اُسی طرح لمبی اور جھکی ہوئی اور پھر اُسے وہ سوراخ بھی نظر آگیا جو شاید بچپن میں بلاق ڈالنے کے لئے نکالا گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اُس کی ماں بھی عجیب ہے، اُس پر ایک جھوٹا الزام دھر رہی ہے اور خود اتنا بڑا جھوٹ بول رہی ہے!

"ارے چلتا ہے گھر یا ——" ماں کا ہاتھ اور بلند ہو کر تن گیا۔ انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں۔ وہ اُٹھا اور ہولے سے بولا۔

"چلتا ہوں"

"چل میرے آگے" ماں نے اُس کی گردن کو اپنے پنجے میں جکڑ لیا۔ اور جب وہ بخشو کے کھیت کے قریب سے گزرا تو اُس کی آنکھوں کے سامنے پیلے پیلے تارے سے تیرنے لگے جو آہستہ آہستہ رنگ بدلتے گئے اور جب وہ گھر پہنچا تو وہ تارے صحن میں پڑے ہوئے کنکروں میں تبدیل ہو گئے!

گھر آ کر ماں نے اُسے دلاسا دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے نون مرچ کے علاوہ اُس کے سامنے گڑ بھی تھا۔ ماں اُسے پنکھا بھی جھلتی رہی اور یہ بھی کہا "تو تو میرا سب کچھ ہے، تو ہی میرا دھن دولت ہے، تجھی کے سہارے تو میں جی رہی ہوں ورنہ کب کی کسی کھائی میں چھلانگ لگا گئی ہوتی۔ تو بڑا ہوگا۔ نوکر ہو جائے گا فوج میں ——"

"میں تھانے میں سپاہی بنوں گا" اُس نے لقمہ چباتے ہوئے ہونٹ لٹکا کر کہا۔

"ہاں ہاں"۔ ماں مسکرا کر بولی "میرا ننھا تھانے کا سپاہی بنے گا۔ سر پر لال پگڑی۔ ہاتھ میں ننھی سی چھڑی۔ پاؤں میں کالے کالے بوٹ۔ جدھر جائے گا لوگ زمین پر بچھتے جائیں گے۔ اور پھر میرا لال چھٹی پر آئے گا تو میرے لئے اچھی اچھی چیزیں لائے گا۔ ریشمی کپڑے اور مٹھائیاں اور ——"

"اور خربوزے بھی ——!" اُس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ماں کے چہرے کی جھرّیاں گہری ہو گئیں اور پھر وہ بولی "ہاں خربوزے بھی!"

اور ان باتوں کے دوران میں ننّھا سوچتا رہا کہ ماں اس وقت بہت مہربان معلوم ہوتی ہے، اب میری ماں سچی ماں کے روپ میں ہے، کیوں نہ میں اسے ایک خربوزہ لانے کے لئے کہہ دوں۔ لیکن اُس کی نظریں اچانک اپنی ماں کے سوکھے ہوئے ہاتھ پر جا پڑیں جس کی انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں ــــــ تھوک نگل کر چپکا ہو رہا!

لیکن خربوزوں کا بھوت اُس کے سر پر اُسی طرح سوار رہا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ ماں کو ایک خربوزے کے لئے کہہ دے۔ پرسوں ذیلدار جی کے گھر کی چکی پیس کر ایک آنہ لائی ہے، کیا اُن چار پیسوں میں سے وہ ایک پیسے کا بھی حق دار نہیں۔ آخر اُس کا پیسا ہُوا آٹا اُٹھا کر وہی تو ذیلدار جی کی بیٹی کو دے آتا تھا۔ اور اگر یوں نہیں تو کیوں نہ وہ بخشو والے جھوٹے الزام کو سچ کر دکھائے، چپکے سے گھس جائے کھیت میں اور اتنے خربوزے کھائے کہ ساری عمر اُسے خربوزوں ہی کی ڈکاریں آتی رہیں۔ لیکن یہ سب کچھ سوچنے کے بعد اچانک اُس کے دماغ میں ماں کا اکڑا ہُوا ہاتھ کلبلانے لگتا اور اُس کے سارے ارادے ننّھے ننّھے ذرّے سے بن کر ہواؤں میں کھو جاتے،

ایک روز وہ ایک گلی میں خربوزوں کے چھلکے دیکھتا گزر رہا تھا کہ اُسے ذیلدار جی کی آواز سنائی دی "اے ننّھے۔ اِدھر آ!" اُس نے پلٹ کر دیکھا تو اُس کے کئی ہم عمر چوپال پر اکٹھے تھے۔ آنکھیں جھپکاتا وہ ذیلدار جی کے پلنگ تک گیا اور بولا "جی!"

ذیلدار جی بولے "ہمارا بھوسا آیا ہے آج۔ اُس کو ٹھے میں پڑا ہے، تم سب لڑکے اِسے اچھی طرح لتاڑ دو گے تا کہ وہ نیچے بیٹھ جائے اور بھوسے کا ایک اور بورا بھی کوٹھے میں آ سکے، دو دو پیسے ملیں گے تم سب کو۔ لتاڑو گے؟"

"لتاڑوں گا" ننّھا بولا۔ اور ہر طرف خربوزوں کا موسلا دھار مینہ برسنے لگا!

سب لڑکے اندھیرے کوٹھے میں گھس کر بھوسے پر چڑھ گئے۔ بہت دیر تک کودتے ناچتے رہے، بھوسے میں سے مہین دُھول نکل کر اُن کے بالوں۔ کانوں۔ آنکھوں۔ ناک اور منہ میں گھستی رہی مگر دو پیسوں کا جادو اُنہیں اُسی شدت سے نچاتا رہا۔ کسی کو ریوڑیاں یاد آ رہی تھیں تو کسی کو پیپرمنٹ، کوئی مصالحہ دار گڑ کے خواب دیکھ رہا تھا تو کوئی رنگ برنگے تِنکوں کے۔ لیکن صرف ایک دماغ میں خربوزے لڑھک رہے تھے، قدموں کی ہر دھمک کے ساتھ کوئی اُس کے کان میں کہتا "خربوزہ"۔

اور وہ جی ہی جی میں خوش ہو کر جی ہی جی میں کہتا "خربوزہ نہیں تو کیا ریوڑیاں۔ دانت ٹوٹ جاتے ہیں چباتے چباتے۔ اور پیپرمنٹوں سے کچی کچی بدبو آتی ہے۔ اور مصالحہ دار گڑ میں مصالح کی جگہ مکوڑے پڑے ہوتے ہیں۔ اور پتنگ ایک جھٹکے سے کٹ جاتے ہیں کمبخت۔ ہم تو خربوزہ خریدیں گے۔ باہر سے پیلا اور اندر سے سبز۔ ایک ایک پھانک میں لاکھ لاکھ مزے!"

بہت دیر تک وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ کودتا رہا۔ ناچتا رہا۔ اور مہین دُھول اُس کی آنکھوں اور نتھنوں اور گلے میں گھستی رہی اور آخر جب ذیلدار جی مطمئن ہو گئے کہ بھوسا اس سے زیادہ اور نہ دب سکے گا تو سب ننّھے ننّھے بھتنوں کی طرح باہر نکلے۔ دو دو پیسے سب کی ہتھیلیوں پر رکھے جانے لگے۔ ننّھا سب سے آخر میں تھا۔ وہ جونہی ہاتھ پھیلائے ذیلدار جی کے قریب آیا اور انہوں نے جیب سے ہاتھ نکالا تو وہ مٹھی بند کر کے کلیلیں بھرتا چوپال سے بھاگ نکلا۔ "اے ننّھے۔ پیسے تو لیتا جا" ذیلدار جی ہنستے ہوئے بولے۔ اُس نے رُک کر مٹھی کھولی تو وہ خالی تھی۔ اُسے ذیلدار جی بڑے سُست اور نالائق معلوم ہونے لگے جنہوں نے دو پیسے نکال کر ہتھیلی پر رکھنے میں تین گھنٹے لگا دئے تھے!

واپس آ کر اُس نے ذیلدار جی سے پیسے لئے مگر اُس کا ہاتھ کانپ گیا اور پیسے نیچے گھوڑے کی لید میں گر گئے۔ نہایت پھرتی سے اُس نے لید سے پیسے اُٹھائے اور ڈھلوان پر سے لڑھکتے ہوئے کھلونے کی طرح خربوزوں والے شاموں کی دُکان کی طرف لپکا!

دور سے شاموں کو پکارا "چچا شاموں۔ ایک خربوزہ۔ دو پیسے کا ایک اچھا سا بڑا سا پیلا سا خربوزہ!"

اور جب وہ چچا شاموں کے قریب پہنچا تو خربوزہ منتخب ہو چکا تھا۔ دو پیسے شاموں کے آگے پھینک کر وہ خربوزے کو بغل میں دبائے گھر کی طرف دوڑا۔ ایک جگہ اُس نے ٹھوکر بھی کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ حلق پر جمی ہوئی دھول تیز تیز سانس لینے کی وجہ سے "چیں چاں" بجنے لگی۔ گھر کے صحن میں قدم دھرتے ہی پکارا "ماں!ــــــ خربوزہ" اور اس کا حلق فرطِ مسرت سے گھٹ گیا!

اندر سے آواز آئی "پھر وہی خربوزہ؟ تیرا باپ دے گیا ہے مجھے خربوزے کہ تو ــــــ ارے! خربوزہ!"

اور ماں نے بڑھ کر خربوزہ اپنے ہاتھوں میں اُٹھا کر گھمایا "کہاں سے لایا؟"

ننھے نے جب ماں کو سارا حال کہہ سنایا تو وہ بولی "پیسے گھر لے آتا تو اچار خرید لیتے جو دس دن تک چلا جاتا۔ مگر خیر تجھے شوق تھا۔ شکر ہے تیرے من کی آگ تو ٹھنڈی ہوئی۔ لے ذری چھری اُٹھا لا —— چولہے کے پاس پڑی ہوگی"

ننھا کودتا پھاندتا چولہے کے پاس گیا۔ چھری کے دھوکے میں دست پناہ اُٹھا لایا۔ رستے میں پلٹ کر دست پناہ وہ پھینکا اور چھری اُٹھالی۔ ماں کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چھری خربوزے پر جھکی اور جب اُس کی نوک خربوزے کے کلیجے میں داخل ہونے لگی تو ماں بولی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اور جی ہی جی میں ننھے نے بھی تین بار بسم اللہ شریف پڑھی۔ اور پھر ——!

پھر دونوں ٹکڑے الگ ہو گئے اور پانی کی ایک ندی سی فرش پر بہنے لگی۔ بدبو سے دونوں کے دماغ پھٹنے لگے۔ خربوزے کا سارا گودا پانی بن چکا تھا اور بیج کالے رنگ کے ہو گئے تھے اور چھلکے پر لمبے لمبے سفید رنگ کے کیڑے بل کھا رہے تھے۔ خربوزے کو فرش پر پٹخ کر ماں نے انگلیوں کی پانچ سلاخوں سے ننھے کے گال پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ لڑھکتا لڑھکتا دیوار کے قریب جا رُکا۔ چھلکے بوڑھی بکری نے بھی قبول نہ کئے!

وہ روتا بلکتا سو گیا۔ اور جب صبح کو اُٹھا تو اُس کے گلے میں "چیں چاں" سی ہو رہی تھی اور اُس کے بدن سے آگ کے شعلے سے اُٹھ رہے تھے۔

اور خربوزے کے چھلکے سے کالے کالے لمٹنگے چیونٹے چمٹ رہے تھے اور بخشو کے کھیت میں ——! ہر طرف پیلے پیلے دھبے سے ناچنے لگے اور وہ چیخ مار کر تڑپا اور کھٹولے سے نیچے آ رہا!

احمد ندیم قاسمی

زبان

زبان گوشت کا ایک کمزور اور چھوٹا سا لوتھڑا ہے لیکن کچلنے اور مار ڈالنے کی طاقت رکھتا ہے۔ (یونانی)

زبان کو تلوار سے زیادہ بربادی کی قدرت ہے۔ (ترکی)

زبان درازی عمر کو کوتاہ کرتی ہے۔ زبان کو یہ موقع نہ دو کہ تمہارا سر کاٹ پھینکے۔ (فارسی)

جو الفاظ زبان سے نکلتے ہیں ان کی رفتار گھوڑے کی رفتار سے بھی تیز ہوتی ہے۔ (چینی)

پاؤں پھسل جائیں تو پھسل جائیں لیکن اپنی زبان کو کبھی پھسلنے نہ دو۔ (عبرانی)

جو اپنی زبان کی نگہبانی کرتا ہے اپنی جان کو مصیبتوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ (مسیحی)

نور ماہی

شکایت

سازِ دل زخمۂ مژگاں سے بجایا کیوں تھا
عشق کو حُسن کا ہمراز بنایا کیوں تھا

میری خاموش محبّت کو زباں کیوں دی تھی
میری خوابیدہ تمنّا کو جگایا کیوں تھا

گیت گایا تھا جو بچپن کی جواں راتوں میں
یاد آ کے مجھے یاد دلایا کیوں تھا

اپنی خلوت کے دریچے کے حسیں پردے کو
دیکھ کر مجھ کو شرارت سے ہلایا کیوں تھا

گوشۂ چشمِ فسوں ساز میں لرزش کیوں تھی
چھپ کے اک روز اشارے سے بلایا کیوں تھا

دیکھ کر مجھ کو پریشاں پسِ چلمن آ کر۔
میری ہی لَے میں مرا شعر سنایا کیوں تھا

ایک شب نام جو پوچھا تھا اشارے سے کبھی
چاند کی سمت نظر کر کے بتایا کیوں تھا

اپنے ماتھے پہ شکن ڈال کے لے ماہ جبیں
رُوٹھ جانے کا سا انداز دکھایا کیوں تھا

اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں سے دلاسے دے کر۔
راہ پر دل کو محبّت کی لگایا کیوں تھا

لے کے انگڑائی سرِ شام لبِ بام آ کر۔
میرے جذبات میں طوفان اُٹھایا کیوں تھا

اپنے دزدیدہ تبسّم کا اشارہ دے کر۔
میری حالت پہ زمانے کو ہنسایا کیوں تھا

اپنی جانب نگراں دیکھ کے اُس دن تم نے!
اپنا مُنہ چُپٹی آنچل سے چھپایا کیوں تھا

اپنی غمّاز نگاہی سے تو پوچھو للّٰلہ
عشق کا راز نگاہوں سے بتایا کیوں تھا

سچ کہو تم کو جوانی کی بہاروں کی قسم۔
میری اُجڑی ہوئی دُنیا کو بسایا کیوں تھا

تم کو معلوم تھا ہم مل نہیں سکتے تا حشر۔
جان کر پھر مجھے دیوانہ بنایا کیوں تھا

تم نے اک کھیل سمجھ کر مجھے برباد کیا
طائرِ عشق کو پر نوچ کے آزاد کیا

جمیل احمد نقوی

بانسری

(۱)

گیت رقصاں ہیں آبشاروں پر
چاندنی سی ہے، کوہساروں پر

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آئی ہیں
اُودی اُودی گھٹائیں چھائی ہیں

چرخ سے ہے صباحتوں کا نزول
چاندنی میں کھلے ہوئے ہیں پھول

جھومتی آ رہی ہے، مست گھٹا
گیت جنگل میں گا رہی ہے ہوا

اک طرف جوشِ بادوباراں ہے
اک طرف چاندنی کا طوفاں ہے

اُس طرف ہیں گھٹائیں محوِ خروش
اِس طرف ہیں ہوائیں نغمہ بدوش

(۲)

ہنس کے پھر ساز دے رہا ہے مجھے
اِذنِ پرواز دے رہا ہے مجھے

بانسری بج رہی ہے جنگل میں
"کون آواز دے رہا ہے مجھے"!!

جلال ملیح آبادی

دق کا علاج

(پہلا خط)

یکے بعد دیگرے تمہارے تینوں محبت نامے ملے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ آج سے پہلے ایک کا بھی جواب نہ لکھ سکا۔ تم یقیناً بہت برافروختہ ہو رہے ہو گے لیکن دوست جب تمہیں میرے خط نہ لکھنے کی وجہ معلوم ہو گی تو ناراض ہونے کی بجائے تم مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگو گے۔

سُنو پچھلے ایک مہینے سے مجھے بخار ہے اور بخار کے ساتھ کھانسی بھی ہے۔ اس ایک مہینے میں جلد جلد دو حکیم اور دو ڈاکٹر بدل ڈالے لیکن افاقہ نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ اس سے پہلے بھی بخار آتا تھا مگر اس طرح مسلسل نہیں۔ دو چار دن بخار آیا چار پانچ دن طبیعت درست رہی پھر بخار ہو گیا۔ پہلے ایک حکیم سے علاج کراتا رہا پھر ڈاکٹر سے اور جب سے بخار متواتر ہے کئی معالج بدل لئے۔ اور اب ڈاکٹروں نے فیصلہ دے دیا ہے کہ مجھے دق ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا کرامت۔ موت بہر حال آنی ہے آج نہیں، کل، کل نہیں، پھر کسی اور دن لیکن میری ان آرزوؤں کا کیا ہو گا۔ میرے ارمان بھی کیا میری طرح دق کا شکار ہو جائیں گے۔ میری حسرتیں بھی کیا دم توڑ توڑ کر مر جائیں گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری بہترین خواہش کیا تھی۔ تم جانتے ہو کہ میں کس آرزو کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ لیکن جب میری آرزو پوری ہونے کا وقت آیا تو یہ مصیبت آپڑی۔ اگر دق کو ہونا ہی تھا تو دو ایک سال پہلے ہو جاتی۔ اُس وقت مجھے اپنی بیماری کا اتنا غم ہرگز نہ ہوتا جتنا اب ہو رہا ہے۔ لیکن کرامت وہ موت ہی کیا جس سے

مرنے والے کی حسرتوں کا دم نہ گھٹ جائے۔ ہاں وہ موت ہی کیا جس سے مرنے والے کو اپنی بے بسی کا پورا پورا احساس نہ ہو۔ تمہیں خبر ہے کہ میں کالج میں کتنی محنت کرتا تھا۔ ابھی پچھلے ہی سال تو تم بی۔ اے کر کے گئے ہو تمہارے جانے کے بعد میں نے اور زیادہ محنت شروع کر دی تھی۔ میں نہ صرف یونیورسٹی میں اول آنا چاہتا تھا بلکہ ایک ریکارڈ بھی قائم کرنا چاہتا تھا ایسا ریکارڈ جسے کوئی نہ توڑ سکے۔ اور اب جب امتحان میں صرف ایک مہینہ باقی ہے مجھے دق ہو گئی ہے۔ یہ ہے میری محنت کا ثمر یہ ہے میری مشقت کا نتیجہ یہ ہے میری آرزو کا انجام۔ تم مجھے ضرور الزام دو گے کہ میں نے اپنی طاقت سے زیادہ محنت کی۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے۔ خود اباجی کا بھی یہی خیال ہے لیکن کرامت جب انسان ایک نصب العین بنا لیتا ہے، جب انسان ایک منزل مقرر کر لیتا ہے اور پھر اُس منزل پر پہنچنا بھی ہو مقررہ وقت میں تو اگر وہ دوڑنے لگے کیونکہ ظاہر ہے کہ آہستہ چل کر وہ وقت پر نہیں پہنچ سکتا تو کیا اُسے موردِ الزام ٹھہرانے والے راستی پر ہوتے ہیں یہ سچ ہے کہ دوڑنے والے کو اپنی طاقت کا اپنی زندگی کا بھی خیال رکھنا چاہئے لیکن —— چھوڑو ان باتوں کو۔ اب اس بحث سے حاصل؟ میں قصوروار ہوں کہ نہیں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب تو مجھے دق ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہو گا وہ مجھے بھگتنا پڑے گا۔

(دوسرا خط)

کرامت میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں کہ تمہارے یقین دلانے سے کہ دق نہیں مجھے یقین آجائے گا۔ جس بات کو ایک یا دو نہیں پورے چار ڈاکٹروں نے فیصلہ کر کے بتایا ہو میں اُسے کیسے جھوٹ سمجھ لوں۔ کیا ایک مرض کے متعلق یہ خیال کر لینے سے کہ یہ نہیں کوئی اور مرض ہے اس کی شدت

ہیں یا اُس کے اثرات میں کمی آجائے گی۔ یا اگر موت ہی قسمت میں لکھی ہے تو یہ سمجھ لینے سے کہ دق نہیں بلکہ بگڑا ہوا زکام ہے موت ٹل جائے گی؟
میں نے پہلے خط میں بھی لکھا تھا کہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ اگر رنج ہے تو اس بات کا کہ میری سب سے بڑی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ میں کالج چھوڑ کر اپنے وطن چلا آیا ہوں۔ اب تو اگر زندہ رہا تو دیکھا جائے گا ورنہ ایم اے کی ڈگری کس کام کی؟

ایک دلچسپ بات سنو۔ یہاں ایک بہت بوڑھے حکیم ہیں اور ہیں بھی بہت قابل۔ میں اُن کے پاس گیا تھا والد صاحب کے بہت گہرے دوست ہیں۔ نبض دیکھ کر اور حال سُن کر فرمانے لگے" دق کے اثرات تو ظاہر ہیں لیکن ابھی پہلا درجہ ہے اور تم ماشاء اللہ جوان ہو۔ اس لئے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ ابھی اس بیماری کا مقابلہ کرنے کی تمہارے جسم میں بہت طاقت موجود ہے" تھوڑے سے توقف کے بعد پھر فرمایا" اگر تم میری بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرو تو انشاء اللہ ضرور بالضرور صحتیاب ہو جاؤ گے"

اُن کی تسلی دلانے سے مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ میں نے عرض کیا" بھلا کوئی بدنصیب بیمار ایسا بھی ہو گا جو معالج کی ہدایات پر عمل نہ کرے اور جب کہ اُسے یہ بھی خبر ہو کہ صحت حاصل کرنے کا صرف ایک یہی راستہ ہے۔"

وہ بزرگانہ شان سے مسکرائے اور فرمانے لگے" دق کے لئے دوا کوئی نہیں۔ یونانی اور انگریزی طب دونوں کی دونوں یہاں بے بس ہیں لیکن ایک طریقہ ہے جس سے تمہیں صحت ہو سکتی ہے"

میں نے کہا" قبلہ مجھے صحت چاہئے۔ وُہ کسی دوا سے حاصل ہو یا کسی اور طریقہ سے مجھے اس سے غرض نہیں"

پوچھنے لگے" کبھی کسی سے محبّت کی ہے؟"

"کبھی نہیں"

"میں اسے بالکل سچ مان لوں یعنی تم شرم کے مارے اصل بات تو مجھ سے نہیں چھپا رہے ہو۔ دیکھو معالج سے کوئی بات نہیں چھپانی چاہیئے"

"جی میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں۔ یونیورسٹی میں اوّل آنے کی خواہش نے کبھی کسی سے محبت کرنے کی مہلت ہی نہیں دی"

"تو بس وہ علاج یہی ہے کہ اب کسی لڑکی سے محبت کرنے لگو۔ لیکن سچ مچ محبّت میں گرفتار نہ ہو جانا۔ کسی لڑکی کو اپنے لئے انتخاب کر لو۔ اس پر اپنی محبّت کا اظہار کرو۔ اُس سے لمبی لمبی ملاقاتیں کرو۔ تنہائی میں جتنا زیادہ وقت مل سکے اُس کے ساتھ گزارو۔ لیکن دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا۔ ایک تو یہ کہ کوئی ناجائز بات نہ کرنا اور دوسرے حقیقت میں محبت نہ کرنے لگ جانا"

ان کی گفتگو سے مجھے کچھ شرم سی آگئی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ والد صاحب کے گہرے دوست ہیں اس لئے میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں اور ادب بھی۔ میں نے عرض کیا" میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ مذاق کر رہے ہیں لیکن کوئی دوا بتانی ہے تو بتایئے ورنہ صاف جواب دے دیجئے کہ یہ مرض لا دوا ہے"

وہ پھر مسکرائے اور کہنے لگے" دوا تو اس کے لئے واقعی کوئی نہیں لیکن علاج ضرور ہے اور وہ علاج یہی ہے۔ ویسے تم اگر چاہو تو میں تمہیں دوا بھی دے دیتا ہوں"

انہوں نے ایک سفید سا سفوف پڑیا میں بند کر کے دیا اور فرمایا "ہر صبح دودھ سے یہ سفوف تین رتی کھا لیا کرنا۔ لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ مرض اُسی علاج سے جائے گا۔ دوا تو برائے نام ہی ہے۔ اِس سے کوئی خاص اثر ہونے کی اُمید نہیں"

میرے دل میں حکیم صاحب کی جو عزت تھی وہ ان کی باتوں سے ساری ختم ہو گئی۔ میں یہ سمجھ کر واپس چلا کہ بوڑھے ہونے کی وجہ سے ان کے دماغ میں شاید فرق آ گیا ہے۔

جو کچھ تم کہتے ہو وہی ڈاکٹروں نے بھی کہا تھا کھلی ہوا میں رہو کسی گاؤں میں چلے جاؤ تو بہت اچھا ہے۔ جتنا زیادہ تازہ مکھن اور پھل کھا سکتے ہو کھاؤ۔ خوش و خرم رہو۔ کسی بات کا غم نہ کرو۔ ہلکی ہلکی ورزش شروع کر دو۔ تو میں عنقریب اپنی ننھیال چلا جاؤں گا۔ اُن کا گاؤں دوسرے دیہات سے زیادہ صاف ستھرا اور ترقی یافتہ ہے۔

(تیسرا خط)

کتنے مہینے گذر گئے جب میں نے تمہیں خط لکھا تھا۔ کرامت تمہاری بے چینی، اضطراب اور فکر بجا ہے۔ آخر تمہیں بھی اگر میری بیماری سے اضطراب نہ ہوگا تو اور کسے ہوگا۔ والدین اور دوسرے قریبی رشتہ دار اپنی جگہ ہیں۔ انہیں اضطراب تو شاید تم سے بھی زیادہ ہو لیکن وہ اس کا اس شدت سے اظہار نہیں کر سکتے جس شدت سے ایک دوست کر سکتا ہے۔ تو تم سہمے ہوئے دل سے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ کوئی تمہیں میرے چل بسنے کی خبر لکھ بھیجے گا اور یہ خبر سننے کے لئے تم تیار نہ تھے۔ لیکن شاید میں اب اُس منزل سے گذر چکا ہوں اور لطف یہ ہے کہ اب میں بھی جینا چاہتا ہوں کرامت۔ یونیورسٹی میں اوّل آنے کے لئے نہیں۔ اب ایم اے کا امتحان امتیازی شان سے پاس کرنے کی خواہش خود بخود مٹ گئی۔ اُس ڈگری کو کوئی کیا کرے جو زندگی جیسی چیز دے کر حاصل ہو۔ دُنیا میں یہی کچھ نہیں تھا جو میں سمجھے بیٹھا تھا۔ دُنیا میں اس سے بھی زیادہ بہت کچھ ہے۔ یونیورسٹی میں اوّل آنا بُرا نہیں بشرطیکہ اس کے ساتھ آدمی کی صحت ناقابلِ علاج حد تک نہ بگڑ جائے اور ممکن تھا کہ میں ریکارڈ بھی قائم کر لیتا لیکن اُدھر نتیجہ نکلتا اور اِدھر ریکارڈ قائم کرنے والے کا جنازہ۔ تو اس صورت میں یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ ابتدا ہی میں مرض کی تشخیص ٹھیک ٹھیک ہو گئی اور میں کالج چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔

یہ گاؤں ایک چھوٹی سی جنت ہے۔ نہر کے کنارے آباد ہے۔ اس لئے پانی کی کمی نہیں اور اسی لئے فصلیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ جدھر دیکھئے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ جنت میں بھی تو باغ ہوں گے۔ نہریں ہوں گی۔ فرشتے ہوں گے اور حوریں ہوں گی۔ تو یہاں بھی یہ سب کچھ ہے۔ بڑی نہر سے کاٹ کر بہت سی چھوٹی چھوٹی نہریں بنائی گئی ہیں جنہیں یہ لوگ "سوئے" کہتے ہیں۔ البتہ یہاں دودھ کی نہریں نہیں لیکن دودھ اس افراط سے مل جاتا ہے کہ نہر کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ فرشتے ہیں حوریں ہیں لیکن یہاں فرشتے اور حوریں جوان بھی ہیں اور بوڑھی بھی اور کم سن بھی۔ کہتے ہیں کہ وہاں سب جوان ہی جوان ہوں گے کیا فرشتے کیا حوریں اور کیا آدمی۔ لیکن ان لوگوں کے دل ایسے صاف ہیں کہ میں تو اب یہ سمجھنے لگا ہوں کہ اصلی انسان گاؤں ہی میں بستے ہیں۔ شہروں میں تو صرف نقلی انسان رہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں خلوص درد، تپاک اور حق پرستی اتنی زیادہ ہے کہ ان کے مقابلے میں شہر کے باشندے خود غرض لالچی، مکار اور جھوٹے نظر آتے ہیں۔ معاف کرنا کرامت جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں تمہاری یا تمہارے شہر کی توہین کر رہا ہوں۔ یہ ایک حساس دل کے احساسات ہیں جو میں نے قلمبند کر دئے ہیں ورنہ میں بھی تمہاری طرح ایک شہری ہی ہوں اور مجھ میں شاید تم سے زیادہ وہ سب باتیں

موجود ہیں جو ایک شہری میں ہوتی ہیں یا جو ایک شہری میں ہونی چاہئیں۔ خیر۔

اب سنو بیماری اور اُس کے علاج کے متعلق۔ یہاں رہتے ہوئے پندرہ بیس دن گذر گئے تھے لیکن گاؤں اپنی تمام رعنائی اور دلکشی کے باوجود مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔ اور میں پندرہ بیس دن ہی میں یہاں سے اکتا گیا تھا۔ کہاں کالج کی فضا اور کہاں گاؤں کی" دلفریبی"۔ لیکن زندگی اور صحت حاصل کرنے کی تمنا میں ٹھہرا رہا۔ پھر ایک انقلاب آیا اور اب اس گاؤں کا ذرہ ذرہ مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اب میں خواہ یہاں برسوں رہتا رہوں لیکن کبھی اُداس نہ ہوں گا۔ مختصر یہ کہ جس چیز سے میں نے اب تک اپنے آپ کو بچائے رکھا تھا اب اُسی کے آگے سر جھکا دینا پڑا۔ حکیم صاحب نے یہی تو علاج بتایا تھا۔ لیکن اُنہوں نے تاکید کی تھی کہ صرف کھیل کھیلنا حقیقتہً گرفتار نہ ہو جانا۔ حکیم صاحب کو شاید اس کا تجربہ نہیں کہ صرف کھیل کھیلنا کتنا مشکل ہے اور اگر انہوں نے کبھی جوانی میں تجربہ کیا بھی تھا تو اب یقیناً بھول گئے ہوں گے۔

(چوتھا خط)

تم ایسے بے قرار ہو گئے کرامت کہ اتنا زبردست تقاضا لکھ بھیجا اور دو ایک دفعہ نہیں کئی مرتبہ تاکید کی کہ میں تمہیں اپنے متعلق مفصل حالات لکھوں۔ اگر تمہارا خط نہ بھی آتا تو بھی میں تمہیں پانچ چھ دن میں یہ تمام واقعہ لکھ کر بھیج دیتا۔

یہاں آئے ہوئے ابھی آٹھ دس دن ہی ہوئے تھے کہ طبیعت اُچاٹ ہو گئی حکیم صاحب کا دیا ہوا اسفوف ہر روز صبح کو دودھ کے ساتھ کھا لیتا تھا لیکن فائدے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ یوں بھی یہاں جی نہ لگتا تھا۔ پچھلے خط میں جو میں نے تمہیں یہاں کی رعنائیوں کے متعلق لکھا تھا تو شروع میں ان رعنائیوں میں بھی مجھے کوئی کشش معلوم نہ ہوتی تھی۔ اُس وقت تو مجھے ہر دم کالج کا ہوسٹل اور کورس کی کتابیں یاد آتی رہتی تھیں۔ پھر بھی زندگی اور صحت حاصل کرنے کی تمنا میں پڑا رہا۔ ایک رات طبیعت زیادہ پریشان تھی۔ کئی طرح کی کوشش کرنے کے باوجود نیند نہ آئی۔ میں اور میرا ماموں زاد بھائی گلی میں سوتے تھے اور اندر صحن میں نانی اور ایک ہمسائی جن کا مکان ہمارے بالکل بالمقابل ہے۔ حامد میرا ماموں زاد بھائی بھی میرا دل بہلاتے بہلاتے آخر سو گیا۔ لیکن مجھے نیند نہ آنی تھی اور نہ آئی۔ چاندنی کھِل رہی۔ طبیعت میں عجیب عجیب قسم کے خیالات آ رہے تھے۔ کبھی دکھائی دیتا تھا کہ موت کا اژدہا اپنا پورا منہ کھولے پوری تیزی کے ساتھ میری طرف بھاگا آ رہا ہے۔ کبھی نظر آتا کہ ایک سمت سے نورانی صورت والا مسیحا آتا ہے اور آناً فاناً مجھے تندرست و توانا کر دیتا ہے۔ انہی خیالوں کے درمیان اچانک مجھے نوراں کا خیال آیا۔ سامنے اُن کا مکان تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ مکان میں ہے بھی اکیلی۔ اُس کی والدہ ہمارے یہاں نانی کے پاس سوتی تھیں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو میرے نہ ماموں ہے نہ ممانی۔ صرف نانی ہیں اور ماموں اور ممانی کی نشانی حامد ہے۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں حامد میرے پاس باہر سوتا ہے اور نانی کے پاس نوراں کی ماں۔ اُس کے والد کھیتوں میں سوتے ہیں کیونکہ وہیں اُن کے مویشی بھینسیں اور بیل وغیرہ باندھے جاتے ہیں۔ خدا جانے میرے دل میں کیا وحشت سمائی کہ ایک دم اُٹھ کر نوراں کے یہاں چلا گیا۔ گاؤں میں دروازوں کے کواڑ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پنکھے کی ڈنڈی سے میں نے دروازے کی اندر کی کنڈی کھول لی۔ جا کر دیکھا وہ بے سُدھ پڑی سو رہی تھی۔ اُس کے لمبے لمبے سانسوں کے ساتھ اُس کے سینے کا اُتار اور چڑھاؤ عجیب دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔ لیکن کرامت میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور سارے جسم پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ پہلے تو خیال آیا کہ فوراً واپس چلا آؤں لیکن پھر سوچا کہ جب اتنا مشکل کام کر ہی لیا تو اب ناکام لوٹ جانا بہت بُرا ہے۔ لہذا میں نے

کانپتی ہوئی مگر ہلکی آواز میں اُس کا نام لے کر پکارا۔ قریب ہی اُس کی چھوٹی بہن سو رہی تھی اُسکے جاگ اٹھنے کا بھی ڈر تھا جب آوازوں سے کچھ اثر نہ ہُوا تو میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اُس کے پیر کا انگوٹھا پکڑ کر ہلایا۔ جوانی کی نیند تھی۔ اُس نے ذرا کروٹ لی اور پھر سو گئی۔ پھر میں نے اُس کا پیر پکڑ کر زور سے ہلا دیا۔ اس مرتبہ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور مجھے دیکھ کر اور زیادہ گھبرا گئی سہمے ہوئے لہجہ میں بولی "تو اس وقت یہاں کیوں آیا ہے؟"

میں نے کہا "یونہی"

"یونہی کیوں؟"

مجھے کچھ جواب بن نہ پڑا

بولی "جلدی بتا یا واپس چلا جا نہیں تو میں شور مچاتی ہوں"

میں نے کہا "میں تجھے کیا کہتا ہوں جو شور مچانے کی دھمکی دیتی ہے۔ میں بہت دیر سے سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نیند نہ آتی تھی پھر پیاس بھی لگ گئی میں نے سوچا کہ تمہارے یہاں پانی ٹھنڈا ہوگا"

وہ ایک دم اُٹھی پانی کا کٹورا بھر کر لائی اور بولی "لے پانی پی اور اُلٹے پاؤں واپس چلا جا"

میں نے غٹرغٹر سارا پانی پی لیا۔ پانی پی کر میرے دل کو کچھ سکون سا ہو گیا اور میں اُس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے ناراض ہو کر کہا "تو جاتا ہے کہ میں شور مچاؤں"

"میں تجھے کیا کہہ رہا ہوں"

"رات کے وقت تیرا یہاں ہونا ہی بُرا ہے"

وُہ زیادہ سے زیادہ ناراض ہوتی رہی اور میں تھوڑی دیر کے بعد واپس چلا آیا۔

کرامت یہ لڑکی سارے گاؤں کا انتخاب ہے اور صرف گاؤں ہی کیا دور دور اس کا جواب نہیں۔ پھر سب لڑکیوں سے زیادہ عقلمند بھی ہے اور پڑھی لکھی بھی۔ یہاں جب ہم کسی کے متعلق پڑھی لکھی یا پڑھا لکھا کہتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اُس نے چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے کیونکہ یہاں ایک عدد پرائمری سکول ہے اور یہاں کے لوگوں کا شوق یہیں تک محدود ہے لیکن مجھے نہ اُس کے خوبصورت ہونے سے غرض تھی نہ پڑھے لکھے ہونے سے مطلب۔ میں تو غیر شعوری طور پر اپنے مرض کی دوا تلاش کر رہا تھا اور چونکہ یہ سب سے زیادہ نزدیک تھی اس لئے میں نے اسی پر مشق کرنا مناسب سمجھا۔

دوسری رات میں ان کے یہاں پھر جا پہنچا تو وہ پہلی رات سے بھی زیادہ ناراض ہوئی۔ پھر تھوڑی سی دیر بیٹھ کر چلا آیا۔ تیسری رات گیا تو صحن میں اُس کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ بڑی حیرت ہوئی کہ کہاں چلی گئی۔ اچانک خیال آیا کہ کمرے میں نہ سو رہی ہو۔ کمرے کی طرف دیکھا تو اندر ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ لیکن کمرے کے دروازے کی کُنڈی آسانی سے نہ کھل سکی۔ اتفاق سے اُن کے صحن میں سے تار کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ اُس سے کُنڈی کھولنے میں بڑی مدد ملی۔ وہ جاگ رہی تھی اور پسینے میں تر بتر تھی۔ جونہی میں نے اندر قدم رکھا اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی "تو نے یہاں

بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آخر تُو مجھے تنگ کیوں کرتا ہے؟"

میں نے پھر وہی پہلا جواب دیا "میں تجھے کیا کہتا ہوں"

"تو یہاں آتا ہی کیوں ہے؟"

"رات کو جب مجھے نیند نہیں آتی اور دل گھبراتا ہے تو مجھے بس یہی خیال آتا ہے کہ یہاں آکر تجھ سے دل بہلاؤں"

"تُو یہاں نہ آیا کر ورنہ میں اپنی ماں سے کہہ دوں گی"

"کہہ دے میں کیا اُن سے ڈرتا ہوں اور ڈروں تو جب اگر تجھے کچھ کہتا ہوں"

"تیرا یہاں آنا ہی بُرا ہے"

اگلے دن میں خوف کے مارے نہ گیا کہ کہیں اُس نے سچ مچ اپنی ماں سے نہ کہہ دیا ہو۔ اُس سے اگلے دن بھی نہ جا سکا۔ پھر جو جانے لگا تو دہلیز کے دروازے کی کُنڈی نہ کھل سکی۔ معلوم ہوا کہ اُس نے تالا لگا رکھا ہے لیکن گاؤں کے دروازے ہوتے ہی کیسے ہیں۔ میں نے کواڑ کے نیچے ہاتھ دے کر چُولا اتار لیا اور پھر اُسے جا اُٹھایا

"بولی" تو اب بھی باز نہیں آیا"

"میں باز آ ہی نہیں سکتا"

آہستہ آہستہ اُس کا غصہ اور حجاب کم ہوتا رہا اور میری جُرأت اور حوصلہ بڑھتا رہا۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ میں ہر رات اُن کے یہاں چلا جاتا اور ہم دونوں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ جس رات میں نہ پہنچتا یا مجھے دیر ہو جاتی وہ میرے انتظار میں پڑی جاگتی رہتی۔ ایک رات حسبِ معمول باتیں کرکے جو میں واپس آنے لگا تو معلوم ہُوا کہ دہلیز کے کِواڑوں کی باہر سے کسی نے سنگل لگا دی ہے۔ ہم دونوں ایک دم بہت زیادہ گھبرا گئے۔ میں نے کہا کہ میں دیوار پر چڑھ کر باہر کود جاتا ہوں بولی "دیوار اُونچی ہے چوٹ لگ جائے گی" اور واقعی دیوار کافی بلند ہے۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموش کھڑے رہے۔ جب باہر سے کسی کے بولنے یا بات کرنے کی آواز نہ آئی تو ہم نے باری باری کواڑوں کی درزوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ باہر گلی میں بالکل سنّاٹا تھا۔ ایک ہی تدبیر سمجھ میں آئی۔ چولا اُتارا اور باہر نکلتے ہی تیزی سے جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ جلدی اور گھبراہٹ میں کواڑ کا چولا ٹھیک کرنا یاد ہی نہ رہا۔ پڑا تھا کہ اُس کی ہلکی سی آواز آئی "کیسا بے فکر جا کر لیٹ گیا، کواڑ تو ٹھیک کر جا" اُس کی آواز پر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہُوا۔ اُٹھا اور جا کر کواڑ کا چُولا درست کر دیا۔ پھر آکر لیٹ گیا اور سوچتا رہا کہ دروازے کی زنجیر باہر سے کس نے لگائی تھی۔ پھر پھرا کر حامد ہی پر خیال جاتا تھا۔ میں نے اُس کی چارپائی کی طرف دیکھا وہ اطمینان سے پڑا سو رہا تھا۔ سمجھا کہ شاید یہ بن رہا ہے۔ اُٹھ کر اُس کی چارپائی کے قریب گیا مگر پھر بھی اُس کی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہو سکا کہ وہ جاگ رہا ہے لیکن دراصل یہ حرکت اُسی نے کی تھی۔ دوسرے دن اُس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے صاف صاف بتا دیا۔ کہنے لگا "تُو ہمیں بدنام کرے گا" میں نے کہا "اس میں تمہاری بدنامی کا ہے کی ہے" وہ میرا ہم عمر ہی ہے۔ میں نے اُس کی کچھ خوشامد کی، کچھ گاؤں سے چلے جانے کی دھمکی دی اور کچھ اپنی محبت کا واسطہ دیا اور اُس نے وعدہ کر لیا کہ وہ کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرے گا۔

کچھ دن تو اُس نے اپنا وعدہ نبھایا لیکن آخر نوراں کی ماں کو بتا دیا۔ وہ اُسی دن سے اپنے یہاں سونے لگیں۔ کچھ عرصہ ہماری رات کی ملاقاتیں بند رہیں۔ میں ساری ساری رات پڑا جاگتا رہتا۔ مجھے خود بخود اُس سے ایک قسم کی محبت ہو گئی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اُس کے پاس بیٹھ کر اُس سے باتیں کرتا رہوں۔ آخر ایک رات ہمت کر کے میں اُن کے یہاں پہنچ ہی گیا۔ نوراں کا میں نے ذرا ہاتھ ہلایا تھا، کہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی جیسا کہ پہلے سے جاگ رہی تھی۔ ہم دونوں جا کر اُن کے گھر کے اندر بیٹھ گئے اور باتیں کرتے رہے۔ اس طرح ہماری ملاقاتیں دوبارہ شروع ہو گئیں۔ لیکن اب میں ہر روز نہ جاتا تھا، ایک دن ناغہ کر کے جاتا۔ بدقسمتی سے ایک رات اُس کی ماں کی آنکھ کھل گئی لیکن کھُلی اُس وقت جب نوراں مجھ سے باتیں کرنے کے بعد جا کر اپنی چارپائی پر لیٹی اور انہیں شُبہ ہو گیا۔ دوسرے دن موقع پا کر نوراں نے مجھے اُن کی آنکھ کھلنے اور شبہے کے متعلق بتا دیا۔ کئی راتیں اور کئی دن پھر بے چینی میں گذرے۔ اُس کے بعد ایک رات میں پھر جا پہنچا۔ وہ تینوں نوراں اُس کی ماں اور بہن کمرے کے اندر سو رہی تھیں اُس رات تار سے زنجیر کھولنی مناسب نہ تھی۔ لہٰذا نہایت آہستہ سے آواز دی۔ اندر سے کسی کے چارپائی پر سے اُٹھنے اور دروازے تک آنے کی آواز آئی یا یہ کہوں کہ مجھے ایسا محسوس ہوا میں جلدی سے ایک طرف چھپ گیا۔ خوف تھا کہ کہیں اُس کی ماں نہ ہو لیکن وہ نوراں تھی۔ اُس نے نہایت آہستہ سے کُنڈی کھولی اور باہر نکل آئی لیکن شومئی تقدیر سے اُس کی ماں بھی جاگ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اُٹھیں۔ اُن کے اُٹھنے سے جو آواز پیدا ہوئی تو میں دوڑ کر ایک دم باہر چلا آیا اور آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

اب مجھ میں زیادہ لکھنے کی ہمت نہیں کرامت اور خط طویل بھی بہت ہو گیا ہے اس لئے معافی چاہتا ہوں۔

(پانچواں خط)

خُدا کے بندے کچھ دن تو صبر کیا ہوتا۔ یہ کیا کہ جس دن میرا خط پہنچا اُسی دن جواب لکھ مارا اور فرمائش کر دی کہ فوراً سارے حالات لکھ کر بھیج دو۔ لیکن میں حسبِ معمول کوئی تین ہفتوں کی تاخیر کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے ضرور بُرا بھلا کہہ رہے ہو گے لیکن میں تو ہمیشہ تمہیں اچھے ناموں سے اور نیک دُعا کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔ اس مرتبہ دیر میں خط لکھنے کا مجھے واقعی بہت افسوس ہے کرامت کیونکہ میں تمہیں تین ہفتوں کی دیر کے بعد مبارکباد بھیج رہا ہوں۔ بڑا اچھا ہوا کہ تم ضلعداری کے انتخاب میں کامیاب رہے لیکن ملازمت پھر ملازمت ہے۔ خواہ وُہ ضلعداری ہو خواہ کلکٹری۔ تم جیسا عالی دماغ آدمی خود کو چند عدد نوٹوں کے بدلے میں بیچ دے۔ سچ پوچھو تو خوش ہونے کی بجائے مجھے تو اُلٹا افسوس ہوتا ہے۔ لیکن جس ملک میں تعلیم کا مقصد ہی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرنا ہو اُس میں اگر ضلعداری ملنے پر تمہیں یا تمہارے رشتہ داروں کو خوشی حاصل ہوئی تو اس میں تمہارا یا اُن کا کیا قصور ہے۔ خیر دوست خدا کرے کہ تم خوب ترقی کرو تم کہو گے کہ یونہی باتیں بنا رہا ہے اور مطلب کی بات نہیں لکھتا۔ تو لو سُنو!

اگلے دن نوراں کے باپ نے اُسے بہت پیٹا۔ اُس کی ماں اب تک یہ ساری باتیں اپنے شوہر سے چھپاتی رہی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ بہت غصیلا اور بہت سخت دل ہے کہیں غصّہ میں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ ساری عمر پچھتانا پڑے لیکن جب پانی سر سے گذرتے دیکھا تو کہنا پڑا اور اس کا نتیجہ فوراً ہی ظاہر بھی ہو گیا۔ اب تک ہمارے اس طرح چوری چوری ملنے کی بات گاؤں والوں سے چھپی تھی لیکن نوراں کے پیٹے جانے پر سارے گاؤں میں مشہور ہو گئی اور شام سے پہلے پہلے ہر جگہ ہمارا ہی چرچا ہونے لگا۔ اُس کے باپ نے کمال بیوقوفی کا ثبوت دیا کہ خود ہی اپنی بدنامی کا باعث بنا۔

اُس دن کے بعد سے اُس پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ صبح کی ملاقاتیں بھی بند ہو گئیں۔ میں نے شاید ابھی تک صبح کی ملاقاتوں

کا ذکر نہیں کیا۔ وہ صبح ہی صبح اُٹھتی تھی ضروریات سے فارغ ہوئی اور مُنہ ہاتھ دھو کر بھینسوں کا دودھ دوہنے چلی گئی۔ میں اُس سے بھی پہلے اُٹھتا اور نہر پر چلا جاتا۔ سیر سے فارغ ہو کر مسواک کرتا نہاتا اور پھر ایک ایسی جگہ کھڑا ہو جاتا کہ نوراں مجھے دودھ لے جاتی ہوئی نظر آ سکے۔ جونہی وہ نظر آتی میں دوڑ کر اُس کے پاس پہنچ جاتا پہلے دن جب میں اُس سے ملا تو میں نے کہا "گاؤں والے کیسے خشک ہوتے ہیں کہ مہمانوں کو دودھ کو بھی نہیں پوچھتے۔" اُس نے دودھ کی بالٹی اُوپر اٹھاتے ہوئے کہا "پی لے اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" اور پھر اُس نے بالٹی میرے مُنہ سے لگا دی اور میں نے بھی جتنا دودھ مجھ سے پیا گیا پی لیا۔ پھر ہر روز کا یہی معمول ہو گیا۔ وہ آتے ہی بالٹی میرے مُنہ کے قریب کر دیتی اور میں جتنا دودھ مجھ سے پیا جاتا پی لیتا۔ کوئی خاص بات ہوئی تو ہم جلدی سے ایک دوسرے سے کہتے نہیں تو جُدا ہو جاتے۔ راستہ میں درختوں کا ایک جُھنڈ تھا اکثر یہ مختصر سی ملاقاتیں وہیں ہوتیں۔ پھر بھی کبھی کبھی کوئی گاؤں والا اُدھر سے گزرتا ہوا ہمیں دیکھ ہی لیتا۔ لیکن یہ لوگ کتنے سادہ لوح ہوتے ہیں کرامت کہ کبھی اُنہوں نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ہاں تو اُس دن کے بعد اُس کا دودھ دوہنے جانا بھی بند کر دیا گیا۔

اب میں نے محسوس کیا کہ مجھے اُس سے بہت زیادہ محبت ہو گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا کہ مجھ میں نئی زندگی آ گئی ہے۔ ہڈیاں نکلے ہوئے جسم پر گوشت چڑھ گیا تھا چہرے پر سُرخی دوڑنے لگی ویسے بھی مجھ کو اپنے بدن میں طاقت اور جوانی معلوم ہونے لگی۔

مگر معاملات بہت زیادہ خراب ہوتے گئے۔ دو ایک جگہ پنچایتوں میں اُس کے باپ سے مَیں مَیں تُو تُو بھی ہو گئی۔ ایک دفعہ وہ کھیتوں میں سے آتا ہوا اکیلا مل گیا تو کہنے لگا "بیٹا خیریت اسی میں ہے کہ اب اس گاؤں سے چلا جا اور پھر کبھی واپس نہ آنا۔" میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا ہم ملتے ضرور تھے لیکن ہم نے کبھی کوئی نامناسب بات نہیں کی ایسی بات نہیں کی جس سے کہ ہم خدا کے سامنے شرمسار ہوں۔ اُس جاہل کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کہنے لگا بس خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے چلا جا ورنہ تین ٹکڑے کر کے کہیں دبا دوں گا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ جسم میں جان بھی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے کہا "تو آجا ابھی دیکھ لیں کہ میں تیرے تین ٹکڑے کرتا ہوں کہ تُو میرے۔ پیچھے سے اور لوگ آ رہے تھے اُنہوں نے بیچ بچاؤ کر دیا نہیں تو اُس دن خدا جانے کیا ہوتا۔

حامد بھی ضد کر رہا ہے کہ میں واپس چلا جاؤں خواہ دو تین ہفتوں ہی کے لئے سہی۔ معاملات کو اس حد تک خراب کرنے میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ گو یہ میرا بھائی ہے لیکن اسے بھی نوراں سے محبت تھی۔ اس بات کا اعتراف اس نے ابھی پچھلے دنوں کیا ہے مگر اب وہ میرے حق میں دستبردار ہو گیا ہے۔ مجھے بھی یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ واپس ہی چلا جاؤں۔ ابھی ان لوگوں کے جذبات مشتعل ہو رہے ہیں اس لئے ابھی کوئی کارروائی کرنی مناسب نہیں۔ جب کچھ عرصہ میں یہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے قابل ہو جائیں گے تو کوئی سلسلہ جنبانی شروع کروں گا لیکن مشکل یہ ہے کرامت کہ ان کے اور ہمارے خاندان میں پُرانی دشمنی چلی آتی ہے۔ یہ بات تین چار دن ہوئے نانی نے بتائی ہے ورنہ مجھے بالکل خبر نہ تھی اور شاید نوراں کو بھی خبر نہ ہو۔ انہوں نے بتایا کہ میرے دادا کے بھائی ان کے خاندان کی کسی عورت کو بھگا لے گئے تھے۔ کتنی بُری بات ہے کرامت کہ جب ان بیچاروں کے زخم مندمل ہونے والے تھے تو میں نے تازہ زخم پیدا کر دیئے۔ کوئی ہندو ہوتا تو کہتا کہ میرے دادا کے بھائی کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے اور نوراں میں اُس کی رشتہ کی دادی کی روح آ گئی ہے۔

(چھٹا خط)

کرامت تم یہ پڑھ کر کتنے خوش ہوگے کہ میں پھر آکر کالج میں داخل ہو گیا ہوں۔ اگر نوراں کا فکر نہ ہوتا تو میں یقیناً خود کو خوش قسمت لکھتا لیکن اُس گاؤں سے آکر میں بالکل ایسا سمجھ رہا ہوں جیسے جنت سے نکال دیا گیا ہوں۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ ہر وقت دل سے حکیم صاحب کو بددعائیں نکلتی ہیں کہ اُنہوں نے مجھے مفت میں ایسی مصیبت میں اگر یہ واقعی مصیبت ہے گرفتار کرا دیا۔ اور لُطف کی بات سُنو۔ جب میں گاؤں سے اپنے وطن واپس گیا تو حکیم صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا تھا۔ نبض دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فرمانے لگے اب تم بالکل تندرست ہو اُس موذی مرض کا کوسوں پتا نہیں۔ پھر ذرا رازدارانہ لہجہ میں فرمایا "میں خوش ہوں کہ تم نے میرے کہنے پر عمل کیا۔" میں نے عرض کیا "جس موذی مرض کے متعلق آپ فرماتے ہیں کا کوسوں پتا نہیں یہ پھر مجھ پر حملہ کرنے والا ہے اور اس مرتبہ اس کا حملہ بہت سخت ہوگا۔" ذرا حیران سے ہو کر بولے "ایسی باتیں نہ سوچو۔ خوش رہو اور خوب کھاؤ پیو ــــ اور ہاں تم نے کسی سے محبت کی تھی؟" میں نے نیچی نظر کر کے کہا "محبت ہی تو آپ کے اس مرض کو بلائے گی" فرمانے لگے "تم نے بہت اچھا کیا کہ محبت کی تمہارے مرض کا بس ایک یہی علاج تھا لیکن اب اُسے بھول جاؤ میں نے شروع میں بھی کہا تھا کہ سچ مچ محبت نہ کرنے لگ جانا" میں نے کہا "اب تو اُس کی یاد زندگی کے آخری دم تک رہے گی" کہنے لگے "یہ غضب نہ کر بیٹھنا ایسی باتیں سوچنی ہی نہیں چاہئیں۔ میں تمہیں اُس کے بھولنے کا بھی طریقہ بتاتا ہوں۔ ہر وقت کھیل کود میں اور یار دوستوں سے خوش گپیوں میں مشغول رہو کسی وقت خالی نہ بیٹھو اور سوچ لو کہ وہ جو کوئی بھی ہے تمہارے لئے نہیں ہے۔ تم اُس سے بہت بلند ہو۔ اور اگر ایسا کرنے پر بھی کامیاب نہ ہو تو کسی اور لڑکی سے دل لگانے کی کوشش کرو" میں نے کہا "قبلہ بس معاف کیجئے!" اُنہوں نے فرمایا "میں تو یہی کہوں گا اور بزور کہوں گا کہ اگر اپنی زندگی اور صحت پیاری ہے تو اُسے بھول جاؤ۔"

کچھ دن گھر ٹھہر اگر حامد نے نوراں کے متعلق کوئی خاص اطلاع نہیں دی۔ اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کالج میں داخل ہو جاؤں ابا جی یہ سال بھی ضائع کرنے کو کہتے تھے لیکن میں نے کہا اب اتنی زیادہ محنت نہ کروں گا کہ میری صحت پر اثر انداز ہو۔ اور آج کل میں واقعی کچھ بھی محنت نہیں کر رہا ہوں۔ نوراں کا خیال محنت کرنے ہی نہیں دیتا۔

یہاں بیس بیس دن کے وقفہ کے بعد حامد کے دو خط ملے۔ دونوں میں نوراں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا ذکر تھا اور اُس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا ذکر پڑھ کر مجھ پر جو کچھ اثر ہُوا ظاہر ہے۔ رہ رہ کر حکیم صاحب پر غصّہ آتا ہے کہ اُنہوں نے مجھے یہ علاج کیوں بتایا۔ اگر وہ یہ طریقہ علاج نہ بتاتے اور پھر اس پر اتنا زور نہ دیتے تو میں ہرگز ہرگز نوراں سے محبت نہ کرتا اور اُس بیچاری پر بھی یہ مصیبت نہ آتی۔ کرامت مجھے اپنی تو فکر نہیں اگر مجھے دوبارہ دق ہوتی ہے تو ہو جائے لیکن مجھے تو اُس کا خیال آتا ہے کہیں خدا نہ کرے اُس کو دق نہ ہو جائے۔ میں تو تمہیں خط لکھ کر یا کسی اور دوست کو قصۂ غم سُنا کر اپنے دل کا بخار نکال لیتا ہوں لیکن وہ غریب کیا کرتی ہوگی۔ پھر میں تو دن بھر کالج کے لڑکوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ ہنستا بولتا بھی ہوں کھیلتا کودتا بھی ہوں۔ اسی طرح دن گذر جاتا ہے۔ وہ بیچاری تو نہ کسی سے کچھ کہہ سکتی ہے اور نہ ہنس بول سکتی ہے۔ گھر کی چار دیواریں ہیں اور وہ ہے۔ کس سے ہنسے بولے اور کس سے اپنا دُکھ کہے۔ کرامت دبی ہوئی آرزو سے بُرا انسان کا کوئی ساتھی نہیں۔ میں تو ہر وقت یہی سوچتا

رہتا ہوں کہ کہیں اُسے بخار نہ رہنے لگے۔ دق ہونے کی وجہ یہی تو بتائی جاتی ہے کہ اگر کوئی نہ ہنسے نہ بولے اور اُسے کسی بات کا رنج بھی بہت ہو تو غم اندر ہی اندر اُسے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ یہاں ایک لڑکا میرا نیا دوست بنا ہے وہ کہتا ہے کہ تو نے گاؤں کی ایک بیوقوف لڑکی کی خاطر کیوں اپنی جان کو روگ لگا رکھا ہے۔ یہ لاہور ہے یہاں ایک سے ایک اچھی لڑکی تمہیں شادی کرنے کے لئے مل سکتی ہے۔ نوراں گاؤں کی ایک بیوقوف لڑکی ہی سہی لیکن وہ شہر کی کالج میں پڑھی ہوئی لڑکیوں سے ہزار درجے اچھی ہے۔ کرامت میں نے اُس لڑکے سے تو کچھ نہیں کہا لیکن تم بتاؤ کیا گاؤں کی ہر لڑکی ان سکولوں اور کالجوں کی لڑکیوں سے اچھی نہیں ہوتی۔ خیر

ہاں ایک بات تو رہ ہی گئی۔ جب میں وہاں سے آنے لگا تو رات کو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اُس سے ملنے گیا تھا۔ اور گو یہ ایک بہت ذلیل بات تھی لیکن میں نے اُس سے کہا "نوراں یہ لوگ یوں ہمیں جینے نہ دیں گے اگر تم راضی ہو تو ہم کہیں بھاگ چلیں"

"اُس نے خشکی سے جواب دیا" یہ کبھی نہیں ہوگا کہ میں ماں باپ کی مرضی کے خلاف کسی کے ساتھ چلی جاؤں"

"تمہارے ماں باپ تو تمہیں میرے ساتھ کبھی بھی نہ بھیجیں گے"

"تو وہ مجھے کسی اور کے ساتھ بھی نہیں بھیج سکتے"

"اور اگر میں زبردستی تمہیں لے جانا چاہوں"

"مجھے نہیں میری لاش کو لے جا سکتے ہو"

"مایوس ہو کر چلا آیا اور کیا کرتا آخر؟"

(ساتواں خط)

اب تو کافی عرصے سے تم نے بھی دوسرا خط نہیں لکھا۔ کیا ملازمت کی مصروفیت نے یار دوستوں کو جلد جلد خط لکھنے کی خوبی بھی تم سے چھین لی۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ تم آج کل ہو کہاں۔ بہر حال گھر کے پتے پر خط لکھ رہا ہوں جہاں کہیں بھی ہو گے مل ہی جائے گا۔ اس سلسلہ کا شاید یہ آخری خط ہے۔ پچھلا خط جو میں نے تمہیں لکھا تھا تو اُس کے لکھنے کے دوسرے دن ہی ابا جی کا والا نامہ ملا جس میں اُنہوں نے سخت غصہ میں مجھ سے گاؤں کے واقعات کے متعلق استفسار کیا تھا۔ میں نے اُنہیں سچ سچ سارا قصہ لکھ بھیجا۔ اور اس کا اثر اُن پر یہ ہُوا کہ انہیں میری شادی کی فکر پڑ گئی۔ اس سے پہلے دو ایک جگہ سے رشتے آچکے تھے جو مسترد کر دئے گئے تھے۔ دو ایک جگہ خود اُنہوں نے سلسلہ جنبانی کی تھی تو وہاں بات نہ بنی تھی۔ اب ایک جگہ سے رشتہ آیا۔ لڑکی اپنے ماں باپ کی اکلوتی بچی، اُس کے والدین بہت امیر سینکڑوں بیگھے زمین کے مالک اور بارسوخ۔ ابا جی نے مجھے لکھا اور لکھا کیا اپنا منشاء ظاہر کر دیا کہ وہ میری نسبت وہاں کر رہے ہیں لڑکی اُردو مڈل پاس ہے اور شکل صورت کی بھی اچھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ خاندان بھی بہت اچھا ہے۔ اُن کا خط پڑھ کر میری آرزوؤں پر بجلی سی گر پڑی۔ اُنہیں تو کیا انکار لکھتا یہ تو کبھی ساری عمر میں جرأت نہ ہوئی۔ البتہ اوپر ہی اوپر کوشش شروع کر دی کہ لڑکی والے رشتہ نامنظور کر دیں۔ اُنہیں فرضی ناموں سے خط لکھے کہ لڑکا آوارہ ہے اور اُسے تو دق ہو رہی ہے جبھی تو کالج چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ اور ایک جاننے والے کی معرفت گاؤں والا واقعہ بھی اُن کے کانوں سے گذار دیا نتیجہ حسب خواہش نکلا۔ والد صاحب کی

خواہش پوری نہ ہو سکی۔ لڑکی والوں نے صاف جواب تو نہ دیا لیکن دبے الفاظ میں انکار کر دیا۔

دن گذرتے گئے مگر اُمید کی کرن تک بھی کہیں دکھائی نہ دی۔ اور میں سوچنے لگا کہ وہ رشتہ بھی بیکار ہی کھویا۔

پھر ایک دن والد صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب چل بسے۔ مجھے اُن کی موت سے افسوس تو ہوا لیکن یونہی معمولی سا۔ کرامت مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کوشش کے باوجود بھی میرے دل سے اُن کے لئے دعا نہ نکلی۔ خبر نہیں کیوں میں اُنہیں ہی قصور وار ٹھہراتا رہا اور اگر دل سے کچھ صدا نکلی تو یہ کہ حکیم صاحب آپ کو مرنے کے بعد بھی چین نہ آئے۔ مجھے اپنا تو خیال نہ آتا تھا نوراں کی تکلیفوں کے خیال سے میں اُن سے اتنا ناراض تھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں نوراں اُس نامراد بیماری کا شکار نہ ہو جائے جس کے علاج کو حکیم صاحب کے کہنے سے میں نے اُسے تختۂ مشق بنایا تھا۔

آخر تقدیر نے پلٹا کھایا۔ نوراں کے ماں باپ اُس کی شادی کہیں اور کرنے لگے تو اُس نے اپنی ماں سے بہ صد گریہ و زاری کہہ دیا کہ شادی ہوگی تو بس اُسی سے ورنہ میں زہر کھا کر سو رہوں گی۔ وہ باتیں پُرانی ہو چکی تھیں۔ اس لئے اُس کی ماں نے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیا اور کچھ لڑکی کی بے بسی پر اُسے رحم آ گیا۔ اُس نے شوہر سے کہا۔ پہلے تو وہ حضرت بہت بگڑے جس کے تین ٹکڑے کرکے کہیں دبانے کو کہتے تھے اُسے ہی داماد بنانا پڑتا تھا لیکن بیوی کے کئی دن کے سمجھانے سے آخر راضی ہو ہی گئے۔ اُنہوں نے قبلۂ والد صاحب کو اس رشتہ کے لئے لکھوایا۔ اس مرتبہ حامد نے بڑا نیک کام کیا ورنہ درمیان میں اُس نے بہت دنوں تک مجھے کوئی خط نہ لکھا تھا۔ شاید اب اُسے بھی نوراں پر رحم آ گیا تھا۔ اُس نے مجھے یہ ساری بات لکھ بھیجی اور تاکید کی کہ میں والد صاحب کو اس رشتہ کو منظور کر لینے کے لئے لکھوں۔ لہٰذا میں نے اُسی دن ایک خط ابا جی کو لکھ دیا اور ایک نوراں کے والد کو۔ ابا جی نے بہت سخت جواب دیا۔ اتنا سخت کہ میں ایک دفعہ پھر مایوس ہو گیا۔ ابھی میری قسمت میں اور رنج لکھا تھا۔ لیکن میرا دوسرا خط رنگ لایا اور ایک مہینے کے بعد اس ایک مہینے میں میں نے ابا جی کو کوئی خط نہیں لکھا تھا، ابا جی نے لکھا کہ نوراں کے والد کے ایک دوسرے کے بعد پورے تین خط آ چکے ہیں اور میرے سامنے تمہارا خط بھی ہے اس لئے میں آج اُنہیں اس رشتے کی منظوری کے متعلق لکھ رہا ہوں اور شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے متعلق بھی۔ اب تو تم اپنے باپ سے ناراض نہ رہو گے؟

کرامت کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ یہ خط پڑھ کر مجھے کتنی خوشی حاصل ہوئی ہوگی۔ نہیں تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر اس خوشی کا دنیا میں کوئی صحیح اندازہ کر سکتا ہے تو وہ نوراں ہے جس کا دل میری طرح محبت سے لبریز تھا اور جو میری طرح مایوس تھی۔ ہاں ایک اور عجیب بات سنو۔ ابا جی کا خط پڑھ کر یکایک مجھے حکیم صاحب کا خیال آیا اور میرے دل سے خود بخود اُن کے لئے دعائیں نکلنے لگیں۔ وہ کتنے قابل حکیم تھے کرامت یہ بات مجھ پر اب کھلی۔ خدا اُنہیں کروٹ کروٹ بہشت نصیب کرے۔ شادی کے بعد میں نوراں کو لے کر اُن کی قبر پر پھول چڑھانے جاؤں گا۔

دیکھو شادی میں ضرور آنا ہوگا۔ میں چھٹی نہ ملنے کا یا کوئی اور بہانہ ہرگز نہ سنوں گا اور یہ خوشخبری سنانے کی مٹھائی کب کھلاؤ گے؟ اچھا خوش رہو!

ظفر واسطی

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نطشے محبِ قوم اور محبِ وطن تھا اور وہ جرمن قوم کا غلبہ چاہتا تھا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اس کے ہاں وطن اور قومی تعصب کا نام نشان تک نہیں۔ اس کی مخاطب اور اس کا موضوع تمام نوع انسان ہے۔ وہ ایک جگہ کہتا ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کا یورپین وطن پرست یا قوم پرست نہیں ہو سکتا، قومیت اور وطنیت کے حدود بالکل مہمل ہیں۔ لیکن یہ دوسری بات ہے کہ اس کشمکش سے ضمنی طور پر کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہو۔

ایک اور بات جو نطشے کو اکثر دیگر ارتقائیین سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ افادیت، لذت طلبی یا مسرت کوشی کا قائل نہیں۔ اکثر قائلین ارتقا جن میں ہربرٹ اسپنسر کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے اخلاقیات کے اندر فرقۂ لذتیہ میں داخل ہیں۔ اسپنسر زندگی کو اس لئے خیر سمجھتا ہے کہ وہ لذت آفریں ہے اور اس کا خیال تھا کہ زندگی جیسے جیسے بہتر اور بلند ہوتی جائے گی اس کی لذت میں اضافہ ہوتا جائے گا لیکن نطشے اس تعلیم کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے۔ زندگی کی شراب تلخ تر ہو جائے تو اس کو اور گوارا معلوم ہوتی ہے۔ اعلیٰ درجے کا انسان زندگی کے ہر پہلو کے لئے تیار رہتا ہے۔ وہ تقدیر کا عاشق ہوتا ہے۔ اسے جو کچھ ملے وہ قبول کرتا ہے نہ غصہ کھاتا ہے اور نہ ناک بھوں چڑھاتا ہے اور نہ لذت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور نہ اپنے اعمال کی کامیابی یا ناکامی کو لذت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خطرے کی الم انگیزی سے لطف اٹھاتا ہے اور زندگی کا اس بنا پر مداح ہے جس بنا پر کہ عرفی غم کی تعریف کرتا ہے۔

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ — گوہرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

وہ زندگی کے جہنم کو بھی ھل من مزید کہتا ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اس کو اکثر شدید دانت کا درد ہوتا تھا اور وہ قوتِ ارادی سے اس پر غالب آنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی ذاتی تجربے کو پھیلا کر اس نے لذت والم کا فلسفہ بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم — "سیاست"

آیاتِ غبات

اُٹھ اور توفیقِ خودسری پیدا کر — اُٹھ اور تقدیرِ سروری پیدا کر
اُٹھ اور احساسِ کمتری کے بدلے — کامل احساسِ برتری پیدا کر

باقی یہ ہزار شان رہ سکتے ہیں — مٹنے سے بَرا جہان رہ سکتے ہیں
ہمت کو جوان رکھنے والے افراد — تا روزِ جزا جوان رہ سکتے ہیں

تو اب بھی صحیح حرف کہلاتا ہے — اور ثقل سے برکراں نظر آتا ہے
حرفِ علت نہ بن کہ حرفِ علت — اکثر ساقط بھی کر دیا جاتا ہے

قدرت تجھے پھر جِلائے، ناممکن ہے — دنیا میں دوبارہ لائے، ناممکن ہے
جو کچھ کرنا ہے، اس جنم میں کر لے — ہٹ ہٹ کے حیات پائے ناممکن ہے

پھر طالبِ لیلائے توانائی بن — پھر عاشقِ شیدائے توانائی بن
پھر کوششِ احیائے توانائی کر — پھر مالکِ دنیائے توانائی بن

سامانِ قیامِ زندگی لایا ہوں — مضبوط نظامِ زندگی لایا ہوں
اے ملکِ اجل گرفتہ! اے کشورِ ہند — خوش ہو کہ پیامِ زندگی لایا ہوں

حکیم آزاد انصاری — "ساقی"

مطبوعات

محشرِ خیال: یہ کتاب سجاد انصاری مرحوم کے مضامینِ نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ اس میں ادبِ لطیف کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ مرحوم کا اندازِ تحریر نہایت بے باکانہ ہے اس میں جرأت ہمت اور ندرت تینوں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے اکثر خیالات سے راقم کو اختلاف ہے کیونکہ انہوں نے مذہب اخلاق اور سوسائٹی پر بعض جگہ جو نکتہ چینی کی ہے اسے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تاہم ان کی تحریر میں خلوص ہے۔ اس سے انکار نہیں۔ اگرچہ سجاد صاحب ادب برائے ادب کے نظریہ کے قائل ہیں لیکن وہ زندگی سے گریز نہیں کرتے۔ اس مجموعہ میں ان کا ایک ڈراما "روزِ جزا" بھی شامل ہے۔ اس ڈرامے میں قیامت کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے جس میں آدم و حوا۔ فرشتے اور شیطان۔ زاہد اور صوفی خوبصورت مرد اور خوبصورت عورت سب کے ان کے اعمال کا حساب لیا جاتا ہے۔ اور پھر ہر ایک کے عمل کے مطابق اُسے انعام ملتا ہے یا سزا دی جاتی ہے۔ اس ڈرامے میں مصنّف نے نہایت بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت عمدہ قیمت بے جلد دو روپے مجلد دو روپے آٹھ آنے پتا۔ خان الیاس احمد مجیبی قرول باغ دہلی

"ن"

شمع: اے۔ آر خاتون صاحبہ کا یہ دلچسپ ناول ہندوستانی معاشرت کی بہت اچھی تصویر ہے۔ "شمع" میں محض تصویر کا ایک رُخ ہی نہیں بلکہ سبھی رُخ دکھائے گئے ہیں۔ مصنّفہ نے نئے اور پرانے رسم و رواج دونوں کا موازنہ بھی کیا ہے اور خوبی یہ ہے کہ ساری کتاب میں کہیں تعصب سے کام نہیں لیا۔ اس ناول کے کردار مافوق البشر انسان نہیں بلکہ ہماری طرح کے مرد عورتیں ہیں جن میں خوبیاں بھی ہیں اور کمزوریاں بھی۔ وہ نہ فرشتے ہیں نہ شیطان۔ اور وہ غم و مسرت دونوں قسم کے جذبات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس ناول کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مکالمات کی زبان بالکل قدرتی ہے اور اس میں قطعاً کوئی تصنّع نہیں۔ بقول مرزا محمد سعید "اس میں نہ تو محاورات کی وہ بھرمار ہے جو ہمارے پرانے افسانہ نگاروں کو مرغوب تھی اور نہ وہ عبارت آرائی کا تکلف اور تصنّع ہے جو ہمارے نئے افسانہ نویسوں کا شیوہ ہے۔" کاغذ۔ کتابت طباعت عمدہ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ پتا۔ اے۔ آر۔ خاتون صاحبہ جلال منزل کوچہ پنڈت دہلی۔

"ن"

انوار: حضرتِ علی اختر حیدر آبادی اُن شعراء میں سے ہیں جو زیادہ تر اپنی نظم گوئی کے لئے مشہور ہیں۔ شاید یہ علم بہت کم اصحاب کو ہوگا کہ اختر صاحب کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا اور وہ ایک عرصے تک غزلیں ہی لکھتے رہے۔ انوار حضرتِ اختر کے مجموعۂ غزلیات کا نام ہے جو حال ہی میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدر آباد دکن نے شائع کیا ہے۔ ۱۶۰ صفحات غزلوں کے لئے وقف ہیں اس کے بعد چند رباعیات بھی درج ہیں۔ حضرتِ اختر کا کلام بہ لحاظِ تخیل اور بہ لحاظِ شگفتگیٔ زبان بے حد قابلِ قدر ہے۔ ہمارے بہت کم نئے شاعر فنِ شعر میں اختر صاحب کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

اگر رازِ جنوں کو سطح بیں دُنیا سمجھ سکتی — مری آشفتگی سرنامۂ علم و یقیں ہوتی

بے پردہ وہ بے جلوہ نہاں بھی ہو عیاں بھی — چھپنے کی طرح تم سے چھپا بھی نہیں جاتا

درد کو جادو دل کیا حسن کو دی ستم کی خُو — لذّتِ غم سے کیا ملا ذوقِ نظر نے کیا کیا

قیمت مجلد عیر۔ پتا۔ سب رس کتاب گھر۔ حیدر آباد دکن

"ح"

سید عبد اللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۳۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ اپریل ۱۹۴۲ء

جلد ۴۱ — نمبر ۴

ضروری اطلاع:- جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر دفترِ ہمایوں خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔

چندہ سالانہ ؁ ۔ ششماہی ؁ (مع محصول) قیمت فی پرچہ

جہاں نما

ایشیا کا افلاس

پانچوں برّاعظموں میں ایشیا کی نمایاں ترین خصوصیت اس کا افلاس ہے۔ علاوہ دوسرے اسباب کے اس افلاس کا سب سے بڑا سبب ایشیائی ممالک کی غلامی ہے۔ ترکی، افغانستان، (شاید) سعودی عرب اور جاپان کو چھوڑ کر ایشیا کی کوئی قوم اُن معنوں میں آزاد نہیں ہے جن معنوں میں موجودہ جنگ سے قبل یورپی ممالک آزاد تھے۔ ایشیا کے تقریباً ہر خطّے پر یورپ کا کوئی نہ کوئی ملک مسلّط ہے۔ بعض اَور برّاعظم بھی یورپی نسلوں کی دراز دستیوں کا شکار ہوئے لیکن وہاں اِن نسلوں نے آخر اپنا وطن بنالیا اَور وہاں کی دولت یورپ میں پہنچنے کے بجائے وہیں صرف ہوئی۔ لیکن ایشیا میں مغربیوں کا طریق کار الگ رہا ہے۔ ایشیا کے کسی ملک کو یورپ کی کسی قوم نے اپنی نوآبادی نہیں بنایا اَور اِس برّاعظم کا خزانہ مسلسل لُٹ کر باہر جاتا رہا ہے۔

ایشیا کے افلاس کا ایک اَور بڑا سبب اِس برّاعظم کی کثیر آبادی ہے۔ سوویٹ روس کی آبادی کو خارج کرنے کے بعد ایشیا کی کُل آبادی ۱۱۳۴۰۰۰۰۰۰ ہے۔ یہ تعداد دُنیا بھر کی آبادی سے ۵۳ فی صدی کی نسبت رکھتی ہے۔ اِس میں سے ۳۶۸۰۰۰۰۰۰ افراد برطانی قبضے میں ہیں اَور ۶۸۰۰۰۰۰۰ پر ہالینڈ مسلّط ہے۔ جاپان کے ماتحت ۳۲۰۰۰۰۰۰ غیر جاپانی ایشیائی ہیں۔ فرانس ۲۴۰۰۰۰۰۰ ایشیائیوں پر حکمران ہے۔ ۱۰۰۰۰۰۰ پر پُرتگال کا قبضہ ہے۔ ۵۰۰۰۰۰۰ باشندے یورپی حکم برداریوں میں ہیں۔ چین کی آبادی ۴۵۰۰۰۰۰۰۰ ہے لیکن سیاسی آزادی کے لحاظ سے وہ بھی بہت بدحال ہے۔

غلامی سے قطع نظر بھی یہ آبادی بجائے خود ایشیا کے رقبے کے لئے دوسرے برّاعظموں کی نسبت سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ جیسا اس سے پہلے کہا جاچکا ہے روس کو چھوڑ کر ایشیا کی آبادی دنیا کی کُل آبادی کا ۵۳ فی صدی ہے۔ اِس ۵۳ فی صدی آبادی کو رہنے کے لئے دنیا کے رقبے میں سے صرف بیس فی صدی حصّہ ملا ہے۔ اتنی آبادی کے لئے یہ زمین دنیا کے دوسرے خطّوں کے معیار کے پیشِ نظر بہت کم ہے۔ مثلاً آسٹریلیا ہی کو لیجئے۔ اِس کی آبادی صرف ۱۱۰۰۰۰۰ ہے مگر اِس کا رقبہ ہندوستان سے جس کی آبادی ۴۰۰۰۰۰۰۰۰ ہے دُگنا ہے۔ کینیڈا کی آبادی بھی صرف ۱۱۰۰۰۰۰۰ ہے لیکن اِس کا رقبہ ہندوستان کے مقابلے میں دُگنے سے بھی زیادہ ہے۔ جاپان کی آبادی ۷۳۰۰۰۰۰۰ ہے لیکن جس رقبے میں جاپانی محدود ہیں وہ آسٹریلیا اَور کینیڈا کے $\frac{1}{20}$ ویں حصّے سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

لطف یہ ہے کہ آسٹریلیا اور امریکا کے برّاعظموں میں اَور بعض دوسرے ایسے ملکوں میں جہاں آبادی کم اور زمین نسبتہً بہت زیادہ ہے ایشیائیوں کو داخلے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ باقی دنیا کے مقابلے میں ایشیا گنجان آبادی کا شکار ہوگیا ہے۔ آبادی کی اِس کثرت کی وجہ سے یہاں کا معیارِ زندگی پست ہوجانا اگرچہ قدرتی ہے مگر یہ افلاس ایشیائیوں کی فردِ جرائم میں شامل کیا جاتا ہے۔

غلامی، کثرتِ آبادی اَور قلّتِ رقبہ کے علاوہ دنیا کی خام پیداوار اور دھاتوں میں ایشیا کا نسبتہً قلیل حصّہ بھی اِس برّاعظم کے افلاس کا ایک بڑا سبب ہے۔ ذیل کے نقشے سے اِس حقیقت کی وضاحت ہوگی۔

پیداوار	ایشیا کا حصّہ فی صدی
چاول	۹۰
گیہوں	۹
جَو	۱۳
مکئی	۷
شکر	۲۳
چائے	۹۶
تمباکو	۳۲
روئی	۲۳

اون	۸
ریشم	۹۰
مصنوعی ریشم	۲۰
ربڑ	۹۸
لکڑی کا گوندا	۳
پٹرولیم	۹
پتھر کا کوئلہ	۹
منگنیز	۲۰
لوہا	۵
فولاد	۶
تانبا	۵
سیسا	۷
جست	۴
ٹین	۶۲
ایلومینیم	۴
کرومیم	۱۱
چاندی	۹
سونا	۹

ربڑ کے متعلق یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اس میں سے ۵۴ فی صدی برطانی ایشیا میں ہے اور ۳۷ فی صدی ولندیزی ایشیا میں۔ یہی دونوں یورپی ملک ایشیا کے مُبین کے جزدِاعظم کے بھی حصہ دار ہیں۔ جہاں تک غیر ملکی تجارت کا تعلق ہے ایشیا کا درآمد و برآمد دونوں میں صرف ۱۵ فی صدی حصہ ہے۔

ایشیا میں سیاسی غلامی کے علاوہ آبادی کی کثرت اور خام پیداوار اور اشیائے خوردنی کی جو قلت آپ نے دیکھی ہے اُس کی موجودگی میں ایشیا کے افلاس پر کوئی تعجب نہیں ہو سکتا۔ یہ حالت یاس انگیز ہے اور یہ اُس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک اِس برِاعظم کے سیاسی اور اقتصادی حالات میں انقلاب پیدا نہ ہو۔

دنیا کی بڑی بڑی کتابوں کا ترکی میں ترجمہ

آج کل جب تمام دنیا ایک خوفناک جنگ کی آگ میں جل رہی ہے ترکی تدبر کسی نہ کسی طرح اپنے ملک کو جنگ کے ہمہ گیر شعلوں کی لپیٹ سے بچائے چلا آرہا ہے اور مصطفیٰ کمال مرحوم کے عہد میں ترکی نے ترقی کی طرف جو قدم بڑھائے تھے وہ برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔

یہ اطلاع باعثِ مسرت ہے کہ ترکی حکومت نے حال میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی کتابوں کا ترکی زبان میں ترجمہ کرایا جائے۔ وزارتِ تعلیم نے ایسی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے جن کا ترکی میں ترجمہ کرایا جائے گا۔ اِن کتابوں میں ہومر، گوئٹے، بالزاک، سفوکلیز، ایراسمس، بکیشیو، شیکسپئر، مولیئر اور دوسرے بڑے بڑے مصنفوں کی تصنیفات شامل ہیں۔

اِسی سلسلے میں بعض نسبتہً زیادہ عام پسند کتابوں کے ترجمے بھی کرائے جائیں گے اور بہترین ترجموں کے لئے انعام دیئے جائیں گے۔ ایسی کتابوں میں "پرائیڈ اینڈ پریجوڈس"، "وُدرنگ ہائٹس"، "ٹام جونز" اور "ہلکبری فن" بھی شامل ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۹ء سے پہلے ترکی زبان میں یورپ کی کسی ادبی کتاب کا ترجمہ نہ ہُوا تھا۔ اور اُس کے بعد ایک ایسا زمانہ بھی رہا جب ترکی زبان میں تنہا مغربی کتاب "رابنسن کروسو" تھی۔

حامد علی خاں

یہ کشمیر ہے

'سلام' اک پونسہ بخشیش۔ سلام، اک پونسہ بخشیش۔ سلام ......

بیگم نے کہا 'ایسا معلوم ہوتا ہے ہم کشمیر آ پہنچے ہیں'

شوفر بولا 'جناب یہ سری نگر کا سب سے پُر رونق حصہ امیرا کدل یعنی فرسٹ برج ہے'

موٹر میں مسلسل تیرہ گھنٹے سفر کرنے سے جسم کے ساتھ دماغ بھی مضمحل ہو چکا تھا، اور ناہید کو تو کئی بار ہلا کر ہوش میں لانا پڑا۔ گرتے پڑتے موٹر سے اُترے۔ سامان اُتروایا اور چیزیں گننے بھی نہ پائے تھے کہ ایک بے پناہ ہجوم نے گھیر لیا۔ بے تاب اور حریص آوازوں نے ہمارے رہے سہے حواس بھی مختل کر دیئے ۔

'صابھ ہوٹل میں ٹھہرے گا؟'

'نہیں صابھ ہوس بوٹ دیکھئے'

'صابھ ہمارا ہوس بوٹ بہوت عمدہ ہے'

'کراچی مسلم ہوٹل چل کر ٹھہریئے۔ پھر جہاں آپ کا جی چاہے جایئے'

'میجسٹک ہوٹل کے کمرے بہت اچھے ہیں۔ صابھ'

'سامان اُٹھائیں صابھ ؟'

اور ایسی ہی لاتعداد آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بیگم جھلا کر کہنے لگیں :۔

'آپ اِن کو جواب کیوں نہیں دیتے۔ آپ سے ڈاکٹر سعید اللہ نے کہا تو تھا کہ میجسٹک ہوٹل میں ٹھہرنا۔ پھر یہ شور سننے سے فائدہ؟'

میں خاموش اور بہوت صرف ایک طرف دیکھ رہا تھا۔ امیرا کدل میں موٹر کے رُکنے کے وقت سے لے کر اب تک ایک صدا مسلسل سنائی دے رہی تھی:

'سلام، اک پونسہ بخشیش۔ سلام' ....'

ہاؤس بوٹوں اور ہوٹلوں کے ہولناک کارندوں کے مجمع کے باہر ایک کشمیری فقیر اَن تھک کوشش سے ایک پیسہ مانگنے میں مصروف تھا۔ اُسے اِس سے غرض نہ تھی کہ ہم مسافر تھے اور سری نگر پہنچنے کے بعد ہمیں سب سے پہلے اپنے قیام و طعام کی فکر تھی۔ اُسے اِس سے بھی واسطہ نہ تھا کہ ہوٹلوں اور ہاؤس بوٹوں کی تجارت ہم سے متعلق تھی اُسے صرف ایک پیسہ مانگنا مطلوب تھا اور اس کے لئے وُہ ہمہ تن التجا بنا ہوا ہماری طرف دیکھ کر "اک پونسہ" کی صدا لگا رہا تھا۔ امیرا کدل کا چوک برقی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ سامنے ہندوستانی سنیما گھر سے بلند اور تیز آواز سے سہگل اور رفیق غزنوی کے ریکارڈ باری باری منتشر کئے جا رہے تھے ساری فضا ایک تھکا دینے والے شور سے معمور تھی اور میرے سامنے ایک کشمیری سارے کشمیر کی غربت کو برسوں کی مَیلی عبا کے دامن میں لپیٹے ہوئے کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اِس کا چہرہ پانی سے آشنا ہی نہیں۔ لیکن مَیل کی جمی ہوئی تہوں کے نیچے سے بھی اُس کی کھنچی ہوئی سفید جلد اور اُبھری اُبھری نیلی رگیں اُس کے اُن فاقوں کا اشتہار دے رہی تھیں جن سے اِس کشمیری کو روزِ پیدائش سے لے کر آج تک دوچار رہنا پڑا تھا۔ ڈاڑھی کے میلے بال اُس کی جوانی کے ایام میں چہرے پر بڑھتے رہے ہوں گے لیکن اب اُن کے سرے اِس طرح مُڑے ہوئے تھے جیسے یہ بال اپنی نشو و نما سے اُکتا گئے تھے اور لمبے ہونے کی بجائے پھر کشمیری کے چہرے ہی پر پھیل جانا چاہتے تھے۔ اُس کی اندر دھنسی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں "اک پونسہ" کی صدا لگاتے ہوئے کبھی کبھی دُھندلا جاتیں تو وہ جِلد سے چمٹی ہوئی اُنگلیوں کی ہڈی ابروؤں اور آنکھوں پر پھیر لیتا اور پھر نسبتہً زیادہ تیقن کے ساتھ ہماری طرف دیکھنے لگتا۔ میرا سامان قلیوں کو اُٹھاتے دیکھ کر اُس نے اپنا ہاتھ ہماری طرف بڑھا دیا۔ مَیں نے ایک پیسہ اُس کی ہتھیلی پر رکھا تو وہ کشمیری میں کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

ہوٹل میں نسبتہً خاموشی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد لیٹے تو عجیب پُرلطف سا سکون اور آسودگی محسوس کی۔ معاً لاہور یاد آ گیا۔ چند لمحوں میں ذہن تمام دنیا کی سیر کر گیا۔ لاہور کی گرمی، خاکساروں کے مظاہرے، حکومت کے اعلانات، انسانی زندگی پر پابندیاں، یورپ کی جنگ، انسانوں کی ہلاکت، انسان اور درندوں کا فرق، لاہور کی گلیوں میں خون کی ارزانی، مسجدوں کے ٹوٹے ہوئے دروازے، ہٹلر کی فتوحات اور نہ جانے کون کون سے خیالات بے ربطی سے دماغ میں چکر لگاتے رہے اور پھر سلسلۂ خیالات منقطع ہونے لگا تو امیر اکدل کے فقیر کی صدا کانوں میں گونجنے لگی اور یہ سوچتے سوچتے سونے لگا

کیا یہی کشمیر ہے ؟

دوسرے دن اُٹھے ہمیں پہلگام جانا تھا۔ رختِ سفر باندھا۔ قریب ہی بس کا اڈا تھا۔ بس پر سوار ہوئے اور چند میل پہاڑی مسافت طے کر کے پہلگام پہنچ گئے۔ خیمہ اور ضروری سامان کرائے پر لے کر لاری پورے کے ایک زمیندار کی زمین میں اخروٹوں کے درختوں کے نیچے خیمہ نصب کر دیا۔ گھومنے نکلے تو معلوم ہوا کہ لاہور کے کالجوں کے پروفیسر بیشتر یہاں آباد ہیں۔ چلتے چلتے مرزا حمید مل گئے۔ کہنے لگے ٹلین چلو گے۔ میں نے پوچھا وہ کیا بلا ہے۔ کہنے لگے۔ غالباً بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک جھیل ہے۔ CLIMBING کرنے کا شوق ہو تو میرے ساتھ کل ٹلین چلو۔ وہاں HANGING GLACIERS (لٹکتے ہوئے گلیشیر) بھی ہیں۔ یہ دعوت سُن کر میرے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ سوئٹزرلینڈ، ایلپس اور موں بلانک (MOUNT BLONC) یاد آ گئے۔ پھر مرزا حمید جیسے شیر افگن کی معیت تو حد درجہ دلکش تھی۔ وعدہ کر لیا۔ علی الصّباح کچھ پھل، دودھ میں پکی ہوئی روٹیاں اور شہد کے سینڈوچ تھیلے میں باندھ کر حمید کے خیمے میں جا پہنچا۔ حمید نے خیمہ بائی سرن کو جانے والے راستے کے سرے پر لگا رکھا تھا۔ بائی سرن سے آگے ایک پگڈنڈی ٹلین کے پہاڑ کے دامن تک جا رہی تھی۔ دو چار اور طالب علم شریک ہو گئے اور ایک کشمیری قلی بارہ آنے کے عوض ہماری برساتیاں، سامانِ خورد و نوش اور کیمرے اُٹھانے پر رضامند ہو گیا۔ مختصر سا قافلہ صبح سات بجے بائی سرن کو روانہ ہوا۔ بعض دوست تو چند فرلانگ ہی چل کر ہانپنے لگے۔ چیل اور دیودار کی گھنی چھاؤں اور سرد ہوا کے باوجود دشوار گذار چڑھائی نے ہموار میدانوں میں چلنے والوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ حمید سب سے آگے سب کی ہمت بندھا رہا تھا۔ ہر دو ہزار فٹ کی بلندی پر ایک وسیع میدان ملتا جہاں بیٹھ کر ہم دم لے لیتے۔ ورنہ باقی علاقہ سبزے اور درختوں سے اٹے ہوئے پہاڑوں پر مشتمل تھا۔ اکثر پسینہ پسینہ ہو جاتے لیکن چند منٹ کے لئے رُکتے تو اس قدر تازہ دم ہو جاتے جیسے برسوں آرام کیا ہو۔ ساڑھے بارہ کے قریب پہاڑ کے اُس دامن تک پہنچ گئے جہاں سے آگے سارا راستہ صرف پتھر ہی پتھر تھے اور ایک انچ کے محیط سے لے کر سو سو گز کے محیط کے چھوٹے بڑے مختلف شکلوں کے پتھر ٹلین جھیل اور ہمارے درمیان حائل تھے۔ اِن پتھروں پر سے ایک پُرشور نالہ پہاڑ کے دامن میں آ کر گر رہا تھا۔ اور یہاں قدرت نے مختلف رنگوں کے پھول اُگا کر پہاڑ کو صحنِ چمن بنا رکھا تھا۔ قریب ہی نہایت شیریں پانی کے دو ایک چشمے تھے۔ سفر کی آخری اور کٹھن منزل طے کرنے سے پیشتر ہم نے کچھ پھل کھایا اور پانی پینے کے بعد مرزا حمید سے پتھروں پر CLIMBING کرنے کے لئے ہدایات لیں اور قلی کو ساتھ لے کر چڑھائی شروع کر دی۔ یہ راستہ نہایت خطرناک تھا۔ نالے کا شور اور پتھروں کی پھسلن پر سیدھی چڑھائی مستزاد تھی۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں پر پاؤں کسی نہ کسی طرح جما لیتے۔ لیکن بڑے بڑے پتھروں پر قدم رکھتے ہوئے یہ خوف لاحق رہتا کہ یہ پتھر پھسل کر اپنے اوپر نہ آ پڑے یا اپنے ساتھ ہمیں دُور نیچے کسی گھاٹی میں نہ لے جائے۔ خدا خدا کر کے آدھا راستہ طے کیا تو برف کے ایک گلیشیر تک پہنچ گئے۔ پیاس سے دم نکل رہا تھا۔ گلیشیر پر بیٹھ کر پیاس بجھانے کے لئے برف توڑ توڑ کر کھائی۔ پھر اُوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ اب چڑھائی تقریباً سیدھی دیوار کی طرح تھی۔ حمید تو ہرن کی طرح پھلانگیں بھرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ہم رینگتے ہوئے پیچھے پیچھے چڑھ رہے تھے قلی سب سے پیچھے تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو قلی ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا میں نے دو تین دفعہ اُس کا نام لے کر پکارا لیکن صدائے برنخاست۔ آخر کچھ ناراضی کا اظہار بھی کیا لیکن قلی اپنی جگہ سے ہلتا ہی نہ تھا۔ میں سمجھا شاید اُس کے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے۔ اس لئے میں نے پھر نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ بیس گز فاصلہ رہ جانے پر قلی کی نیم وا آنکھوں کی چمک سے اُس کے زندہ ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔

لہ۔ یہ مضمون ۶ جولائی سنہ ۱۹۴۱ء کو وصول ہوا۔ "ہمایوں"

اِس لئے وہیں رک گیا معلوم ہُوا کہ بے چارہ بے دم ہو کر پہاڑ پر پڑا ہُوا تھا۔ میرے لئے اب مزید نیچے اُترنا دشوار ہو گیا کیونکہ یہاں ہر ایک اِنچ کی چڑھائی حد درجہ تکلیف دہ تھی اور جتنا زیادہ میں نیچے اُترتا اُتنی ہی زیادہ دقّت سے پھر مجھے اوپر چڑھنا تھا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک تجویز آئی۔ میں نے قلی کو پکارا اور کہا تم مجھ تک پہنچ جاؤ تو میں ضروری سامان لے کر آگے بڑھ جاؤں گا۔ اِس پُکار نے قلی پر جادو کا اثر کیا اور وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہُوا۔ کچھ دیر کے بعد وہ میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے کیمرے اُس سے لے لئے اور باقی سامان اُس کے پاس چھوڑ کر پھر پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ ساتھی دور نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ گرتا پڑتا میں بھی اُن کے پاس جا پہنچا۔ وُہ سب ٹلین جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر اونچی اونچی پہاڑیوں کی فصیل کے درمیان شفاف نیلگوں پانی کی ایک جھیل تھی۔ جس میں لٹکتے ہوئے گلیشیروں پر سفید براق عکس پڑ رہا تھا۔ گلیشیروں اور جھیل پر نظر پڑتے ہی سارے راستے کی تھکان رفع ہو گئی۔ جھیل کے گرد گھومتے ہوئے کچھ دُور گلیشیروں کے قریب پہنچنے کی بھی کوشش کی لیکن برف پر چڑھنے کا مناسب سامان پاس نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے زیادہ اوپر چڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کچھ تصویریں لے کر واپس چلے آئے۔

راستے میں قلی بدستور اُسی حالت میں لیٹا ہُوا تھا جس حالت میں مَیں اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔ پارٹی کے لوگ اُسے دیکھ کر ناراض ہونے لگے کہ اُس نے جو دام چکائے تھے اُن کے عوض میں اس نے پورا کام نہیں کیا۔ کیونکہ یہ ٹھیک ٹلین تک ساتھ نہیں پہنچا تھا۔ کچھ لوگوں کی یہ رائے تھی کہ اُسے بارہ آنے کے بجائے صرف آٹھ آنے دیئے جائیں۔ اِسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہم پتھروں والے پہاڑ کے دامن تک پہنچ گئے۔ یہاں چشموں کے پاس سبزہ زار میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پاس ہی ایک گوجر کا جھونپڑا تھا۔ گجریوں نے لذیذ دودھ گرم کر کے دیا۔ چھاچھ اور مکھن سے تواضع کی اور واپسی پر ہمیں نہایت کم قیمت پر مُرغیاں اور انڈے دے دیئے۔ گجریوں سے خرید و فروخت کر کے ہم نے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ اب کے حمید نے نئے کرتب دکھائے چیل اور دیودار کے درختوں کے نیچے پہاڑ کی ڈھلان پر چیل اور دیودار کے سوکھے پتوں کا فرش بچھ رہا تھا۔ ہم اِس پر بمشکل چل سکتے تھے لیکن حمید نے اِن پر بیٹھ کر پھسلنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بطخ پانی پر تیر رہی ہے۔ وہ ہر ایک ڈھلان کی چوٹی پر بیٹھ جاتا اور آن کی آن میں درختوں سے بچتا بچاتا پہاڑ کے دامن تک پہنچ جاتا۔ ایک دو اور حضرات نے بھی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن ایک تو سر ایک درخت سے ٹکراتے ٹکراتے بمشکل بچا اور جب یہ حضرات گیند کی طرح لوٹتے پوٹتے نیچے پہنچے تو دیکھنے والے ہنس ہنس کر زمین پر لوٹ رہے تھے۔ خیریت یہ گذری کہ کسی کے چوٹ نہ آئی۔ ورنہ CLIMBING کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ واپسی پر چار گھنٹے کی مسافت پینتالیس منٹ میں طے ہوئی۔ حمید کے خیمے پر پہنچ کر قلی کی اُجرت پر پھر بحث شروع ہو گئی۔ زیادہ لوگوں کی رائے تھی کہ اُس کی اُجرت میں سے کچھ وضع کر لیا جائے۔ اُدھر قلی کا بخشیش کے لئے تقاضا تھا۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ بخشیش کے بغیر اُس کی پوری اُجرت دے دی جائے۔ میں نے کہا۔

'آپ اِس کو تمام دن کی اُجرت بارہ آنے دینے سے ہچکچا رہے ہیں۔ لیکن غور کیجئے کہ ایلپس کی چڑھائی اِس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لیکن وہاں ایک گائیڈ محض آپ کے ساتھ رہنے کے عوض ایک پونڈ روز کا آپ سے وصول کرتا ہے۔ اور اِس بے چارے نے تو گدھے کا بوجھ اُٹھا رکھا تھا'

ایک صاحب بولے 'قبلہ آپ ایلپس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات نہیں چلتی'

میں نے کہا 'کیوں۔ یہاں کے مزدور انسان نہیں'

انہوں نے جواب دیا 'مزدور انسان تو ہیں لیکن یہ کشمیر ہے'!

میں خاموش ہو گیا۔ رات کو خیمے میں لیٹے ہوئے مجھے کئی دفعہ قلی ایک بڑے پتھر کے ساتھ بے جان ہو کر لیٹا ہُوا نظر آیا۔ اُس کی نیم وا آنکھوں کے سامنے بارہ آنے ناچتے اور وہ بوجھ کی زیادتی کے سبب ایک قدم بھی اوپر نہ چڑھ سکتا اور اُسے ایسے محسوس ہوتا جیسے یہ بارہ آنے کبھی اُس کے ہاتھ نہ آئیں گے۔ ناامیدی سے پھر اُس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور اُس کا بوجھ اُس کے سر کو سینے پر نہوڑا دیتا۔ یکایک ایک کرخت آواز یہ کہہ کر اُسے آگے بڑھنے پر مجبور کرتی۔

"مزدور تم انسان تو ہو لیکن کشمیری ہو"!

پہلگام میں شدید اور مسلسل بارشوں نے جب ناک میں دم کر دیا تو بیگم کی تجویز پر ہم سری نگر اُتر آئے۔ دو چار دن ہاؤس بوٹ میں دریائے جہلم کے اوپر گذارے۔ پھر نشاط کے قریب ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ جمعہ کا دن تھا۔ ہمارا کشمیری ملازم لسانئے کپڑے پہن کر آیا۔ اُس کے گذشتہ سال کے کپڑے اُتار نے پر ہم نے اظہارِ تعجب کیا تو اُس نے بتایا کہ اُس روز "حضرت بل" کا میلہ تھا اور وہاں جانے کے لئے اُس نے لباس تبدیل کیا تھا۔ مزید پوچھنے پر معلوم ہؤا کہ ہمارے مکان کے سامنے ڈل کے اُس طرف ایک گاؤں 'حضرت بل' کے نام سے مشہور تھا جہاں یہ میلہ ہر سال لگتا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم بھی شکارے میں بیٹھ کر 'حضرت بل' جا اُترے۔ حضرت بل میں راستے کے دونوں طرف کھانے پینے کی چیزوں کی دُکانیں تھیں۔ پھل اور مٹھائیاں نئی نئی قسم کی نظر آئیں۔ راستے میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ مرد، عورتیں بچے کیڑوں کی طرح چل رہے تھے۔ شکارے سے اُترتے ہی ہم نے بھی اپنے آپ کو ہجوم میں گھسیٹر دیا۔ خیال یہ تھا کہ اِس طرح ہم بھی وہاں پہنچ جائیں گے جہاں یہ ہجوم جا رہا تھا۔ لاہور اور اِسی نوع کے دیگر شہروں کے مہذب ترین اور متمدن سے متمدن ہجوم میں بیوی اور بچی کو اِس طمانیتِ قلب سے داخل کرنے کی جرات کبھی نہ ہوتی جس اطمینان سے ہم اس ہجوم میں گھس گئے تھے۔ کشمیری بوسیدہ اور بودار کپڑوں میں ملبوس تھے لیکن بچوں، جوانوں، بوڑھوں اور عورتوں کے اِس بے پناہ ہجوم میں کیا مجال جو کوئی آدمی کسی کے ساتھ چھو بھی جائے۔ لاہوری بابوؤں اور کالجیئیوں کی ہاؤ ہو سے یہ ہنگامہ سراسر خالی تھا۔ سارے میلے کے اژدہام پر ایک مقدس فضا چھائی ہوئی تھی۔ چلتے چلتے ہم ایک وسیع میدان میں پہنچ گئے۔ یہاں نسبتاً زیادہ آسانی سے حرکت کی جا سکتی تھی اور یہیں آ کر اس میلے کی غایت بھی معلوم ہوئی۔

اِس وسیع میدان کے ایک طرف ایک مقبرہ سا بنا ہؤا تھا اور اس مقبرے کے سامنے ایک کشمیری پیر عبا پہنے ہوئے ایک منبر کے سب سے اونچے زینے پر کھڑا تھا۔ اُس کے اردگرد دو تین اور حواری تھے اور ان کے سامنے صحن میں کشمیری مردوں کا بے پناہ ہجوم دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے ہوئے زار زار رو رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی منبر پر سے ایک عبا پوش دوڑتا ہؤا ہماری طرف آیا اور ہمیں کشاں کشاں مقبرے کے ایک تاریک دروازے کی طرف لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے مجھے روک دیا اور بیگم اور ناہید کو جوتے اُتار کر آگے بڑھنے کے لئے کہا۔ دونوں خواتین آگے بڑھنے کے لئے تو تیار تھیں لیکن جوتے اُتار کر غلیظ فرش پر چلنے کے لئے آمادہ نہ ہو سکیں۔ اِس لئے اندر جھانک کر واپس مُڑنے لگیں تو پیر نے کہا:۔

'ابھی تھوڑی دیر میں حضرت بل یہیں آئے گی۔ عورتیں یہیں دیدار کرے گا'

میں نے پوچھا 'اور حضرت بل باہر بھی جائے گی'

کشمیری بولا 'ابھی باہر جائے گی۔ مردوں کے پاس۔ عورتیں یہیں دیکھے گا۔ مرد باہر دیکھیں گی۔ تم بی بی جی کو اندر جانے دو۔ اور خود باہر چلو'

میں نے "بی بی جی" سے بہتیرا کہا لیکن بی بی جی تو ایک طرف ناہید بھی اپنے موزوں کو گندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اِس لئے ہم اِس دروازے سے لوٹ کر پھر صحن میں مردوں کے مجمع میں جا کھڑے ہوئے۔ کشمیریوں کی آہ و بُکا دفعتہً بند ہو گئی اور سناٹے کے بعد ہجوم نے منبر کی طرف یورش کر دی۔ ہم بے تابی سے 'حضرت بل' کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے تھے اور کوشش کرنے کے باوجود یہ اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ 'حضرت بل' کسی پیر کا نام ہے یا کسی متبرک بلّی کو کہتے ہیں۔ اتنے میں منبر پر کھڑے ہوئے پیر نے ہاتھ اُوپر اُٹھایا اور ایک شیشے کی نلی اُس کے ہاتھ میں نظر آئی۔ اِس نلی کا اُوپر کا سرا بند تھا اور نیچے کی طرف چاندی کا ایک روپے کے برابر گول سٹینڈ لگا ہؤا تھا۔ قریب ہونے سے نظر آیا کہ شیشے کی نلی میں تین انچ کے قریب ایک لمبا بال محفوظ ہے اور سارے کشمیر کو۔ یہاں جمع کرنے کا موجب یہی بال ہے۔ جو روایتہً حضرت محمدؐ کا بال ہے۔ اور اِسی بال کے نام پر گاؤں کا نام 'حضرت بل' ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہؤا کہ اِس بال کو سال میں صرف ایک مرتبہ ایک بند کمرے سے نکالا جاتا ہے اور اُس روز یہ میلہ منعقد ہوتا ہے۔ کشمیری عوام کشمیر کے ہر کونے سے اِس بال کی زیارت کرنے کے لئے آتے ہیں اور اِس سعادت کو اپنے سال بھر کے گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہیں۔ پیر نے نلی کو ہوا میں بلند کیا تو ہر طرف سے

یا نبی! یا رسول!

کی صدا بلند ہوئی۔ اور سب لوگوں نے اپنی جیبیں ٹٹولنی شروع کر دیں۔ منبر کے قریب جو لوگ تھے انہوں نے فوراً پیر کے ہاتھ میں چاندی کے سکّے دینے شروع کئے اور پیر ہر ایک سکّہ دینے والے گاہک کی آنکھوں پر نلی کا پیندا لگاتا۔ پیندے کو آنکھوں سے چھونے کے بعد لوگ پیچھے ہٹنے شروع ہوئے۔ چاندی کے سکّے والوں کے بعد تانبے کے سکّے والوں کی باری آئی۔ جو لوگ زیادہ سکّے دیتے اُن کی آنکھوں پر بار بار نلی لگائی جاتی۔ جو لوگ پیسہ یا دھیلا دیتے اُن کو صرف ایک بار لمس کا شرف بخشا جاتا۔ جب مردوں سے فراغت ہو گئی تو نلی اندر عورتوں کے لئے بھیج دی گئی۔ لیکن عورتوں کو ناپاک سمجھ کر نلی کو چھونے کی اجازت نہ دی جاتی۔ وُہ چاندی یا تانبا دے کر صرف قریب سے نلی کو دیکھ سکنے کی مجاز تھیں۔ ہم دُور کھڑے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ منبر کے پیر کے ایک گماشتے نے ہماری دلچسپی کو بھانپ کر ہمارے پاس آ کر کہا :۔

"آپ بال نہیں دیکھی۔ زیارت کرو گی ؟"

ہم نے کہا "ہم نے زیارت کر لی ہے"

ایسا معلوم ہوتا تھا پیر کا گماشتہ بال دکھانے کے لئے ہمارے ساتھ سودا کرنا چاہتا تھا۔ سادہ لوح کشمیریوں کی عقیدت اور ایک بال کے لئے یہ احترام دیکھ کر اقبال مرحوم یاد آ گئے۔ ؎

شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ مانند بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن

پھر خیال آیا کہ بت شکن مسلمانوں کے ایسے بت ساری دُنیا میں موجود ہیں۔ اقبال مرحوم نے شاید صرف ہندوستان کے حالات سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کو قلمبند کیا تھا لیکن مجھے دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ایسی مثالیں کثرت سے نظر آئیں۔ بغداد میں رہتے ہوئے ایک دن کاظمین جانے کا اتفاق ہوا۔ کاظمین عراق کے چار اہم متبرک مقامات میں سے ایک ہے اور بغداد سے بس میں دو فلس (پیسے) میں کاظمین پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں دو امام (غالباً امام موسیٰ اور امام محمد تقی) پہلو بہ پہلو مدفون ہیں۔ میں کاظمین کے عالی شان مقبرہ کا طواف کر رہا تھا کہ ایک سبز پوش میرے پیچھے پڑ گیا۔ وُہ ٹوٹی پھوٹی اُردو بول سکتا تھا اور میری رہنمائی پر مصر تھا۔ مَیں نے اُسے بتیرا کہا کہ یہاں فارسی اور عربی میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وُہ مَیں پڑھ سکتا ہوں اور سمجھ سکتا ہوں۔ علاوہ ازیں میرے پاس رہنمائی کی مستند کتابیں ہیں لیکن وُہ کسی طرح نہ ٹلا اور رہنمائی کا خیال ترک کرنے پر جب وُہ یہ اصرار کرنے لگا کہ میں اماموں کے تعویذوں کے بوسیدہ غلاف کا ایک ٹکڑا اُس سے خرید لوں تو میں نے اپنی نجات اسی میں سمجھی کہ میں فاتحہ پڑھنے لگوں۔ چنانچہ میں ایک دروازے کے پاس بیٹھ کر فاتحہ پڑھنے لگا۔ یہ بلائے بے درماں بھی میرے ساتھ گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد جب میں اُٹھنے لگا۔ تو سبز پوش نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے پھر بٹھا لیا اور کہنے لگا۔

"مَیں نے تمہیں فاتحہ پڑھایا ہے۔ اِس لئے میری اُجرت ملنی چاہئے"

میں نے کہا "فاتحہ تو میں نے خود پڑھا ہے۔ تم نے تو نہیں پڑھایا۔ البتہ مَیں اس طرح تم سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا اور اُس میں مَیں کامیاب نہیں ہوا۔ اب تمہیں اُجرت کاہے کی دوں"

سبز پوش بولا "امام کے مزار پر خالی ہاتھ نہیں آنا چاہئے۔ اگر مجھے کچھ نہیں دیتے تو امام کی نذر تو دو"

بے بسی کے عالم میں مَیں نے جیب سے دس فلس کا سکّہ نکالا۔ لیکن سبز پوش نے فوراً میرا ہاتھ جیب میں یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا۔

"امام کی نذر چاندی کا سکّہ ہونا چاہئے۔ دس فلس سے کام نہیں چلے گا"

میں نے ایک لحظہ تامل کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ چاندی کا سب سے چھوٹا سکّہ میرے پاس پچاس فلس کا تھا اور اس ساڑھے بارہ آنے کی رقم کو خواہ مخواہ کیوں ضایع کیا جائے۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں راہِ فرار ملے تو بھاگ نکلوں لیکن ایک تو میرے بوٹ دربان کے پاس رکھے ہوئے تھے دوسرے میں نے ابھی تک محرابوں کی عبارت کو نقل نہیں کیا تھا اور تصویریں بھی نہیں لی تھیں۔ اِس لئے جبراً و قہراً پچاس فلس کا سکّہ جیب سے نکالا اور مقفل دروازے کے اندر اماموں کے تعویذوں کے اوپر لڑھکا دیا۔ سبز پوش میرا مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ تعویذوں کا دروازہ ایک معین وقت پر روز کھلتا ہے اور ابھی اِس دروازے کے کھُلنے میں پندرہ منٹ

باقی تھے۔ سکّہ کھن سے جو گرا تو تعویذوں کا نگہبان جو مقفّل دروازے کے اندر سنگِ مرمر کے فرش پر سو رہا تھا، سکّے کی جھنکار سے جاگ کر بھوکے شیر کی طرح سکّے کی طرف لپکا۔ اُس کا سکّے کو پکڑنا تھا کہ میرا ناخواندہ سبز پوش رہنما کف در دہاں ہو گیا۔ سکّے پر تو تو مَیں مَیں ہونے لگی لیکن سبز پوش کے لئے مصیبت یہ تھی کہ وہ مقفّل دروازے کے اندر نہ جا سکتا تھا۔ نگہبان کا نظریہ یہ تھا کہ سکّہ اُسے خدا نے اماموں کی وساطت سے بھیجا تھا اس لئے وہ اُس کا واحد مالک تھا لیکن رہنما بار بار میری طرف اشارہ کر کے اس سے کہہ رہا تھا کہ یہ سکّہ مجھے فاتحہ پڑھانے کے عوض اُسے دیا گیا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلنے کا وقت ہو گیا۔ نگہبان نے اندر سے دروازہ کھولا۔ مَیں نے تعویذوں کی زیارت کی اور باہر نکلا تو دیکھا کہ نگہبان اور رہنما دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ دونوں نے مجھ سے انصاف کی درخواست کی۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ اس طرح بیکار جھگڑا کرنے کی بجائے یہ بہتر ہو گا کہ وہ دونوں سکّے کو برابر برابر تقسیم کر لیں۔ لیکن وُہ اس پر رضا مند نہ ہوئے۔ دفعتہً مجھے کچھ خیال آیا اور مَیں نے نگہبان سے کہا کہ وہ سکّہ مجھے دے دے اور مَیں انصاف کر دوں گا۔ جُوں ہی نگہبان نے سکّہ میرے ہاتھ پر رکھا مَیں نے سکّے کو جیب میں ڈال لیا۔ وُہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو کر حیرت سے میری طرف تکنے لگے۔ مَیں نے کہا۔

"یہ سکّہ مَیں نے نہ تو فاتحہ پڑھانے کے عوض دیا ہے اور نہ خدا نے اِس سکّے کو بھیجا ہے۔ مَیں نے یہ سکّہ اماموں کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے انہوں نے اسے قبول نہیں کیا جو یہ تم جیسے جھگڑالو آدمیوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ لہٰذا مَیں اپنی پیشکش کو واپس لیتا ہوں"

یہ کہہ کر مَیں آگے بڑھنے لگا تو دونوں چلّانے لگے کہ انہیں میرا پہلا فیصلہ منظور ہے۔ یعنی وہ دونوں پچیس پچیس فلس لینے کے لئے تیار ہیں۔ مَیں نے خود ہی دونوں کو پچیس پچیس فلس دے دیئے۔ اور رہنما نگہبان کو گھورتا اور کچھ بڑبڑاتا چلا گیا۔ مَیں یہ سوچتا ہُوا روضہ سے باہر نکل آیا کہ اِن رہنماؤں اور نگہبانوں کی حیثیت چیلوں اور گِدھوں سے کچھ ہی مختلف ہے۔

اُسی طرح کا ایک منظر اس وقت کشمیر میں میرے سامنے تھا اور مَیں نے مندرجہ بالا واقعہ بیگم کے سامنے دہرایا۔ بیگم کہنے لگیں۔

"کاظمین میں کم از کم آپ کو یہ تو یقینی طور پر معلوم تھا کہ وہاں دو امام مدفون ہیں۔ لیکن نلی میں یہ جو تین انچ لمبا بال آپ کو نظر آ رہا ہے اس کی صحت کے متعلق آپ کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ حضرت صاحب کی ریشِ مبارک کا یہ بال اِن عبا پوش "مہوسوں" کے قبضے میں آ گیا ہے؟"

مَیں نے کہا "یہ مت پوچھئے۔ یہ کشمیر ہے!"

اور ہم روتے ہوئے مردوں اور عورتوں کو چھوڑ کر شکارے میں بیٹھ کر واپس آ گئے۔

تعطیلات ختم ہونے کو آ گئیں۔ سری نگر اچھا خاصا سرد ہو گیا تھا۔ کشمیریوں نے اپنی کانگڑیاں پیٹ کو گرم رکھنے کے لئے سنبھال لی تھیں۔ شالی کی فصل کٹ جانے سے زمین اُجڑی اُجڑی سی نظر آتی تھی۔ بیگم نے کہا۔ ہم اگلے اتوار کو یہاں نہیں ہوں گے۔ اِس اتوار کو نشاط اور شالامار کو آخری بار ایک مرتبہ ضرور دیکھنا چاہئے۔ نشاط اور شالامار میں ہر اتوار کو میلہ لگتا ہے لیکن یہ میلہ حضرت بل والے لوگوں کا نہیں۔ یہ اُن لوگوں کا میلہ ہوتا ہے جن کی امارت کشمیر کی غربت کا مُنہ چڑانے کے لئے ہر سال بیرونِ کشمیر سے آ کر کشمیر کی پھٹی ہوئی گدڑیوں اور چیتھڑوں والے لباسوں کے سامنے اپنی نمائش زرق برق معطّر ساریوں اور سوٹوں کی شکل میں کرتی ہے۔ ہم مکان سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے نشاط تک پہنچ گئے۔ راستہ موٹروں، تانگوں اور بسوں سے پٹا پڑا تھا۔ ان کے علاوہ باغ کے شائقین ڈل کے راستے شکاروں اور ہاؤس بوٹوں میں بیٹھ کر آ رہے تھے۔ نشاط اور شالامار کشمیر میں باغ پسند مغلوں کی یادگار۔ دونوں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ نشاط کے عین سامنے جھیل ڈل اپنی محدود لیکن خوشنما وسعت کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔ نشاط کے سات تختے ہیں اور ہر تختہ دوسرے تختے سے نسبتہً بلند ہے۔ باغ کے عین وسط میں ایک نہر جاری ہے جو ساتوں تختوں کو سیراب کرنے کے علاوہ اُن فواروں کو بھی چلاتی ہے۔ جو اِس نہر کی گذرگاہ کے بیچوں بیچ لگائے گئے ہیں۔ نہر کے دونوں جانب پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ جہاں روئے زمین کے خوبصورت ترین پھول کشمیری باغبانوں نے نہایت قرینے سے لگا رکھے ہیں۔ موسم موافق ہونے

کی وجہ سے اپریل سے ستمبر کے آخر تک یہ پھول باغ کو رشکِ جنت بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھولوں کی کیاریوں سے پرے دونوں طرف باغ میں سیب، ناشپاتی، آلوچہ، آلو بخارا اور کئی طرح کے پھلوں کے درخت ہیں۔ بہار اور اواخر بہار تک یہ درخت پھلوں سے لدے کھڑے رہتے ہیں۔ اور کشمیر کا بہترین پھل انہی درختوں سے حاصل ہوتا ہے۔ فواروں اور نہر کی روانی سے لذت اندوز ہوتے ہوئے ہم نے تمام تختوں کی سیر کی۔ نہر کے دونوں طرف متمول غلام ابنِ "نصف بہتروں" کے ساتھ اُن روشوں پر آ جا رہے تھے جہاں کسی زمانے میں صرف شہنشاہوں اور اُن کی بیگمات کے قدم ہی پڑتے تھے۔ رعایا اور پھر غلام رعایا کی یہ سربلندی مضحکہ خیز سی تھی۔ ایک قدیم سنگین مدور نشست سے ایک ساری پوش کا پاؤں پھسلا تو فرطِ غیظ سے جھنجلا کر میاں سے بولیں۔

"دیکھئے یہ کتنے بدتمیز تھے اس کے بنانے والے۔ یہ نہیں سوچا کہ اس قدر صاف جگہ پر کوئی چل کیسے سکتا ہے۔ آخر جو یہاں آکر بیٹھتا ہوگا وُہ چل کر ہی تو آتا ہوگا"

میاں نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بیگم آپ کا خیال کسی حد تک درست ہے۔ لیکن میرا خیال ہے آپ کے پھسلنے کی اصلی وجہ آپ کا اونچی ایڑی کا جوتا ہے۔ میں نے کہا نہیں تھا آپ ہائی ہیل پہن کر نہ چلیں"

میرے جی میں ایک دفعہ تو آئی کہ آگے بڑھ کر کہہ دوں 'حضور اِس کے بنانے والے اتنے بدتمیز نہیں تھے جتنے آپ ہیں۔ یہ نشستیں بیگمات کے لئے تھیں کہ وہ یہاں بیٹھ کر باغ اور ڈل کا نظارہ کر سکیں اور جب وہ اِن نشستوں پر بیٹھنے کے لئے آتی تھیں اُس وقت ان کے لئے روشوں پر کمخاب بچھائی جاتی تھی اور نشستوں پر قالین۔ پھر اُن کے جوتے پاؤں کو کبڑا کر دینے والے نہیں ہوتے تھے جس سے وُہ آسانی سے چل بھی نہ سکتی ہوں اور نہ فرنگی کی نقل کا انہیں اس قدر شوق تھا کہ وہ اپنے خوبصورت جوتوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے گاہ دبیگاہ اونچی ایڑی کے جوتے استعمال کرتیں۔ اگر فرنگی کی نقل ہی کرنا ہے تو سیر کے لئے چھوٹی ایڑی کے جوتے پہنا کیجئے۔ اور گھر سے دری اِن نشستوں پر بچھانے کے لئے اٹھا لایا کیجئے کیونکہ مغلئی قالین تو اب آپ اپنے پاس رکھنے سے رہے'

لیکن بیگم نے روک دیا۔ کہنے لگیں "آپ بے طلب مشورہ دے کر مفت میں پٹ جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ اپنی رائے اپنے آپ تک محفوظ رکھئے۔ یہ آزاد لوگوں کی تعمیرات ہیں۔ غلاموں کا شعور اِن تعمیرات کے صحیح استعمال تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ آپ کیوں سر کھپاتے ہیں"

میں چپ رہا۔ نشاط سے فارغ ہو کر ہم گھومتے ہوئے شالامار پہنچ گئے۔ یہاں بھی نمائشی افراد کا وہی اژدہام تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ شالامار کی بارہ دری کے سامنے تمام فوارے چھوٹ رہے تھے اور ان فواروں سے بجلی کی رنگین روشنی سے مختلف رنگوں کا جو پانی اوپر اُچھلتا اُس سے قوس قزح کا سماں بندھ جاتا۔ شالامار میں پھولوں کی وُہ کثرت اور زیبائش نہیں جو نشاط میں ہے لیکن وسطی نہر اور فواروں کا منظر بدرجہا زیادہ خوشنما ہے۔ ہم شام تک شالامار میں گھومتے رہے اور وہاں سے سیدھے سرینگر کی نمائش کو چلے گئے۔ یہ نمائش سری نگر میں ستمبر کے وسط یا اواخر میں ہر سال لگتی ہے اور یہاں صرف کشمیر کی مصنوعات رکھی جاتی ہیں۔ نمائش ایک محدود سے میدان میں لگتی ہے لیکن اِس قدر خوبصورت انتظام شاذونادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ دُکانیں نہایت قرینے سے سجائی جاتی ہیں اور خالی جگہ گہرے رنگ کے سبزے اور پھولوں سے سجا دی جاتی ہے۔ نمائش میں گھومنے پر چاندی، لکڑی، بید، کپڑے، اون، پتھر اور کاغذ کا بنا ہُوا جو سامان دیکھا تو کشمیریوں کی دستکاری دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ تمام چیزیں اتنی دلکش اور اس قدر نفاست سے تیار کی گئی تھیں کہ ہر ایک چیز کو دیکھ کر داد دینی پڑتی تھی۔ تمام چیزوں کی تفصیل دینا ناممکن ہوگا لیکن سری کرن فیکٹری کی [illegible] چھ سو روپے کی ایک اونی شال اور اسی کارخانے کے ایک قالین کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں ایک انچ میں تین ہزار سے کچھ زائد STITCH تھے۔ نفیس قالینوں کے بننے میں ایران تمام دنیا سے سبقت لے گیا ہے لیکن یہاں اِس وقت ہمارے سامنے کشمیری اُس قالین کو بن رہے تھے جو ایران کے نفیس ترین قالین سے زیادہ نفیس تھا۔ اِس قالین کا بنا ایک گز تھا اور تین کاریگروں کی روزانہ بُنت کی رفتار ڈیڑھ انچ کے قریب

تھی۔ یعنی یہ قالین دو سوا دو سال میں ختم ہونا تھا۔ بیگم نے کہا۔

یہ پھٹے ہوئے کپڑوں والے کشمیری کتنے ہوشیار ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود یہ اپنی غربت اور جُودوں سے نجات نہیں پاسکتے۔ میں نے کہا تم سُن نہیں رہی تھیں وہ زمیندار اُس دن کیا کہہ رہا تھا کہ اکبر نے جس علاقے کی زمین کا مالیہ معاف کر دیا تھا وہاں کے لوگوں کو اب اس قدر مالیہ دینا پڑتا ہے کہ وہ بے چارے اپنی زمین مفت چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ خدا جانے یہ درست ہے یا نہیں۔ زمیندار کا تو بیان تھا کہ آئینِ اکبری میں یہ واقعہ درج ہے کہ اکبر نے جب اس علاقے کی پتھریلی زمین کو دیکھا تو اُس نے کہہ دیا کہ یہاں اگر میری رعایا میں سے اگر کوئی بسے تو وہ میرا ویران ملک آباد کرتا ہے۔ لہٰذا اُس سے مالیہ نہیں لینا چاہئے۔ پھر یہ لوگ مفلس نہ ہوں تو کیا ہوں۔ آخر کشمیر میں بستے ہیں'

ہم سامانِ سفر باندھ کر امیرا کدل سے راولپنڈی کے لئے بس میں سوار ہوئے۔ کشمیر اپنی تمام دلکشیوں اور رعنائیوں سمیت ہماری نظروں سے آہستہ آہستہ اوجھل ہونا شروع ہو گیا۔ شام کے قریب ہم کوہالہ پہنچ گئے۔ یہ کشمیر کی سرحد تھی۔ بس والے نے موٹر میں پانی ڈالا۔ سواریوں نے بھی ہاتھ مُنہ دھویا۔ بس اب تیز رفتاری سے راولپنڈی کی طرف بڑھنے لگی۔ دو زرد رو کشمیری بچے مَیلی کچیلی شلواریں پہنے ہوئے قمیص کے بغیر، بس کو چلتا دیکھ کر بس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ وہ دونوں چلا رہے تھے۔

"سلام، اِک پونسہ بخشیش۔ سلام، اِک پونسہ بخشیش۔ سلام . . . . ."

بس آگے بڑھتی گئی اور معصوم آوازیں انجن کے شور میں جذب ہو کر خاموش ہو گئیں۔ بچے چند قدم دوڑ کر رُک گئے۔ تھکے ہوئے مسافر سوچ رہے تھے۔

کیا یہی کشمیر ہے؟

محمد باقر

اشارات

آگئی کچھ وقت سے پہلے ہی شام
اور یہ طوفانِ ابر و باد یہ کالی گھٹا
دیکھتے ہی دیکھتے ہر سو اندھیرا چھا گیا
ہو رہا ہے روزِ روشن کا تہ و بالا نظام
کون جانے اب سحر ہو یا نہ ہو
کیا خبر وہ دور جو اُٹھتا ہے دھندلا اور مبہم سا غبار
پیش خیمہ ہے نئے طوفان کا
یا اُسی جا ختم ہو جائے گا یہ طوفان بھی
حشر برپا ہے مرے دل میں امید و بیم کا
بن گئی ہے اک عذابِ مستقل اب زندگی
ہو چکا ساری تمناؤں کا خوں
پھر بھی تیرا انتظار
آج کی شب تو کروں گا میں ضرور

م۔ ا۔ کلیم

آئینِ حیات

جب ہجومِ درد و عبرت میں زمانہ ہو تباہ   نوعِ انسانی کا جب اِک کھیل ہو جرم و گناہ
نکبتوں سے جب جبینِ زندگانی ہو سیاہ   عیب و عصیاں کے دھوئیں میں دب کے رہ جائے نگاہ

ہر نفس جب زہرِ نادانی سے یوں مسموم ہو
زندگی خود زندگی کا مضحکہ معلوم ہو

جب دلوں پر ہو گراں آسائشِ سعی و عمل   بجھ رہے ہوں جب گراں خوابی سے عقلوں کے کنول
چھا رہا ہو روحِ انسانی پہ جب خوابِ اجل   دست و بازو زندگی کی جہد میں ہو جائیں شل

ولولے ہوں سوزِ ناکامی کے ٹھکرائے ہوئے
ہر طرف محرومیوں کے ابر ہوں چھائے ہوئے

درد سے ہو جائے خالی سینۂ اہلِ زمیں   آنسوؤں کے جب سرِ مژگاں نہ ہوں درِ ثمیں
جب شکن آلود، ذہنی الجھنوں سے ہو جبیں   جب نہ عشرت کا تصوّر ہو نہ عبرت کا یقیں

زندگانی کی سحر بھی جب حریفِ شام ہو
عقل جب ہمت شکن گمراہیوں کا نام ہو

موجِ ہستی پر ہو جب ذوقِ سبک سیری گراں   چھا رہا ہو ہر طرف خوابِ اسیری کا سماں
کانپتی ہو جب ہواؤں میں غلامی کی فغاں   زندگی ہو وحشت و نکبت کی چادر میں نہاں

ولولہ سینے میں جو نکلے بھی تو شرماتا ہوا
جس طرح طائر کوئی، کمرے میں منڈلاتا ہوا

ذرّے ذرّے میں ہو جب احساسِ خود بینی کا جوش   قطرے قطرے میں ہو طوفانِ معاصی کا خروش
جب بدل جائے اصولِ خواب سے آئینِ ہوش   نیش کو نادانیاں کر لیں گوارا مثلِ نوش

جب درندے قتل و غارت کے ہوں منہ کھولے ہوئے
امن کے طائر نظر آتے ہوں پَر تولے ہوئے

جب اسی انداز سے طے ہو رہے ہوں ماہ و سال   ٹھوکریں کھاتی ہو جب حُرّیتِ فکر و خیال
جب انہیں اجزا سے ہو تعمیرِ آغاز و مآل   یہ بساط آخر الٹ دیتا ہے فطرت کا جلال

دہر میں اُٹھتا ہے طوفاں پیچ و خم کھاتا ہوا
ٹھوس پتھریلی چٹانوں تک سے ٹکراتا ہوا

جانتے ہیں یہ حقیقت محرمِ رازِ نہاں   چھیڑتی ہے اک نیا افسانہ قدرت کی زباں
تازہ تر جلووں سے پڑتی ہے بنائے گلستاں   جس میں صدیوں تک کبھی آتی نہیں فصلِ خزاں

پھر یہی عالم ہے ہستی کی جبیں سے آشکار
ہوشیار اب اے اسیرِ دامِ غفلت ہوشیار!

علی اختر

ایک چھوٹی سی بات

مرغوب حسبِ معمول نو بجے کھانا کھا کر دفتر جانے کے لئے گھر سے چل پڑا۔ پیدل جانے کے لئے اسے فقط بیس منٹ درکار تھے مگر اس کا راستہ کچھ عرصے سے ایسا طویل ہو گیا تھا کہ وُہ دس بجنے میں پانچ منٹ ہی پر دفتر پہنچ سکتا۔ نہ اس سے کوئی پوچھتا کہ وہ راستہ کاٹ کر ایسی سڑک سے کیوں گذرتا ہے جس پر لڑکیوں کے دو ہائی اسکول واقع ہیں، نہ اس نے خود کسی کو یہ بتانا ضروری سمجھا تھا۔ یہ اس کا اپنا راز تھا جسے وُہ دل کے کانپتے ہوئے پردوں میں چھپائے رکھتا۔ بیس منٹ کے لئے ہر روز مرغوب اس سڑک پر سے آہستہ آہستہ دل کو تھام تھام کر گذرتا۔ اس کے لئے یہ سڑک اِک کم و بیش ہموار خطۂ خاک نہ تھی جس پر تانگوں، موٹروں اور سائیکل والوں کا ہجوم ہو، اس کے لئے سوگز کا یہ قطعہ اس کی اپنی غربت، اس کی ماں کی مسلسل بیماری اس کی بہن کی شادی کے مصارف کے سلسلے میں پریشانی، اس کے چھوٹے بھائی کی فیس ادا کرنے کی مشکلات کا نعم البدل تھا۔

اس سڑک پر وہ کبھی تانگے والوں کا شور نہ سنتا، اس کے کان اکثر موٹروں کے ہارن سے بے خبر ہوتے۔ اسے یہاں کبھی کوئی میٹھا مترنم قہقہہ، کوئی بے ربط جملہ یوں سنائی دیتا جیسے کسی پازیب کی جھنکار! ایک آدھ غلط انداز نظر، دو ایک متحرک شعلے، کوئی تیز چھلتی ہوئی نظر یا کوئی موہوم سا در دیہاں اسے ہر روز نصیب ہو جاتا جس کا اثر وہ دن بھر اپنے بدن کے ریشے ریشے میں سرایت کرتا ہوا محسوس کرتا۔ ورنہ سارا دن لفافوں پر پتے لکھتے رہنا یا ڈاک درج کرتے رہنا کس کی خوشی کا باعث ہو سکتا ہے؟ چنانچہ اس سے غلطیاں بھی ہوتیں، ہیڈ کلرک صاحب اس سے خفا بھی ہو لیتے، مگر اس کے دماغ میں صبح کی جاں بخش آوازیں اور اس کے دل میں کسی کے ہنستے ہوئے ہونٹ محفوظ ہوتے اور اس بخیل کی طرح جو اپنی پونجی کو کھول کر ایک ایک روپیہ بھر سے گن کر صندوقچی میں روز بند کرتا ہو، وہ ایسی باتوں کی سلگتی ہوئی یاد دن میں کئی بار تازہ کر لیتا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے تخیل میں کچھ شعریت ہے بھی کہ نہیں۔ اس کی تعلیم بھی ایسی زیادہ نہ تھی انٹرنس پاس کرتے ہی ملازمت کی تلاش میں رات دن ایسے سرگرداں رہنا پڑا تھا کہ اسے جوانی کے طویل خیالات کا زیادہ تجربہ ہی نہ ہوا تھا۔ اور نہ اسے اوّل اوّل فرصت ہی ہوتی تھی کہ وہ اپنے جذبات کا تجزیہ کرنے یا اپنی تھکن کو کسی روحانی تسکین سے دور کرنے کی کوشش کرے۔ جسے یہ معلوم نہ ہو کہ شام کو جب وہ جگہ جگہ پھر کر مایوس گھر واپس آئے گا تو اسے پیٹ بھر کھانا بھی نصیب ہو گا یا نہیں۔ اسے دماغی آسائش کا خیال کم آتا ہے۔ اگرچہ وہ دن اب دُور رہ گئے تھے مگر ان کا اثر اس کے احساسات میں ابھی تک موجود تھا۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ دنیا کی نعمتوں میں اس کا بھی حصّہ ہے۔ اسے یہی ڈر ہوتا کہ کہیں کسی ناگہانی حادثے کی وجہ سے اس کی ملازمت نہ چھن جائے۔ کہیں یہ ۵۴ روپے جو پانچ سال کی ترقیوں کے بعد اسے اب ملتے تھے یک لخت اس سے لے نہ لئے جائیں۔ ان پانچ برسوں میں اسے ایک ہی خواب کئی بار بعینہٖ ایک ہی صورت میں دکھائی دیا تھا کہ وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہے اور اس کا ہیڈ کلرک جو کبھی اس سے نرمی کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا، رحم کی نظر سے اسے دیکھ رہا ہے اور دوسرے کلرک بھی کبھی کبھی اس کی طرف ہمدردانہ نگاہ ڈال لیتے ہیں۔ اس کے سامنے میز پر کاغذ کا ایک ورق پڑا ہے جس پر دو تین سطریں ٹائپ کی ہوئی ہیں اور اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اس کے کندھوں پر منوں بوجھ پڑا ہے اور اس کا دماغ سوچنے سے عاری ہے۔

اس کی عمر اب چوبیس سال کی تھی۔ چھ سال ہوئے اس کا باپ تپِ محرقہ سے مر گیا تھا تو اُس بے چارگی کی حالت میں اس کے چچا نے ان کے لئے دو سال تک ۱۵ روپے ماہانہ مقرر کر دیا تھا۔ اسی چچا کی ایک لڑکی سے اس کی ماں نے مرغوب کی منگنی دو سال ہوئے کر دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ زینب کے سانولے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں اور اسی چیچک کی وجہ سے ایک آنکھ میں کچھ نقص بھی واقع ہو گیا ہے مگر اسی چچا نے مصیبت کے وقت ان کے خاندان کی مدد کی تھی۔ زینب کی عمر اب اٹھارہ سال کی تھی اور دو ایک دفعہ زینب کی ماں نے اشارۃً کہہ بھی دیا تھا کہ لڑکی اب جوان ہو گئی ہے

اس خیال کے آتے ہی خدا جانے کیوں مرغوب کو صبح کے وہ بیس منٹ بہت عزیز معلوم ہوتے!

اس کی آرزو یہ ہوتی کہ کسی دن کوئی سائیکل والی اس بھیڑ میں ایسی گھر جائے کہ اسے مدد کی ضرورت پڑے۔ اس وقت کوئی راہی اگر اس حسینہ کی مدد کرے تو کیا وہ شکریہ کا مستحق نہیں ہو سکتا؟ یہ کہ شکریہ کی شکل کیا ہوگی، اور اس سے اسے کیا حاصل ہوگا، یہ بات یہیں ختم ہو جائے گی یا اس کا کوئی انجام بھی ہوگا، اس لمبے چوڑے سوچ بچار میں وہ کبھی نہیں پڑا تھا۔ وہ ایسے کسی واقعہ کا منتظر فقط اس لئے تھا کہ اِس 'خدمت' سے لاہور میں کم از کم ایک عورت کو تو یہ احساس ہو جائے گا کہ مرغوب بھی اس دنیا میں موجود ہے، ورنہ بیسیوں جوان نگاہیں، بیسیوں سڈول جسم، بیسیوں ہی بجلیاں اسکی آنکھوں کے سامنے کوندجاتیں، مگر بے پروا، ناواقف، مغرور جیسے وہ کوئی مٹی کا ڈھیر ہے یا کوئی پرچھائیں۔ کبھی وہ یہ بھی سوچتا کہ کیا دنیا کی لذتوں میں اس کا اتنا بھی حصہ نہیں کہ کوئی ایک منٹ کے لئے اسے ایک ذی روح انسان جان کر اس کی طرف توجہ سے دیکھ لے۔ مانا وہ غریب ہے، وہ سوٹ نہیں پہن سکتا، وہ شکل صورت کے لحاظ سے بھی کچھ ایسا ممتاز نہیں، معمولی نوجوان ہی سہی مگر کیا معمولی نوجوانوں کا زندگی پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ کیا وہ اس لائق بھی نہیں کہ کوئی آوارہ نگاہ اسے ایک بار ہی غور سے، دلچسپی سے دیکھ لے۔ بس ایک بار کوئی رس بھری مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں سما جائے۔ ایک دفعہ ہی کوئی اسے 'شکریہ' کہہ کر مسحور کر دے۔ کیونکہ مرغوب کی اب یہ حالت تھی کہ ہر جوان لڑکی اس کے لئے جاذبِ نظر اور ہر ہنسی اس کے لئے برق پاش تھی۔ بعض دفعہ تو وہ صبح ساڑھے نو بجے کی تجلیات سے اتنا متاثر ہو کر آتا کہ سارا دن اس کا دماغ شل سا رہتا۔

مگر یہ عجیب بات تھی کہ جب بھی وہ ان بھرے ہوئے گول گو[illegible]ں کو لچکتا اور ان سفید یا گندمی ٹخنوں کو چمکتا دیکھتا تو اسے یہ خیال نہ آتا کہ یہ جوان لڑکیاں اَور عورتوں کی طرح گوشت پوست کی بنی ہوئی ہیں، اوروں کی طرح کھاتی پیتی ہیں، اور اپنے گھروں میں معمولی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتی ہیں۔ اس نے کسی نوجوان غیر عورت سے ابھی تک بات ہی نہ کی تھی۔ اس کے لئے وہ ایک نئی مخلوق تھیں اور اک نئی دنیا میں رہتی تھیں جس کا تصوّر اس کے قیاس کی بات نہ تھا۔ کیا ایسے سینوں میں کوئی کسک بھی پیدا ہو سکتی ہے، کیا یہ مطمئن حسین چہرے کسی درد سے بے تاب بھی ہو سکتے ہیں، یہ مسئلہ نہ اس کے ذہن میں آیا نہ اُس نے اس کے کسی پہلو پر کبھی غور ہی کیا تھا۔ اسے اپنی امیدوں اور آرزوؤں کی صحیح غایت بھی معلوم نہ تھی۔ ہر وقت اک موہوم سا ہیجان، ایک جذباتی دھند بن کر اس کے دماغ پر چھایا رہتا تھا اور اسی دھند میں اپنے تخیل کی مدد سے وہ کچھ سنہری اور ارغوانی نقوش قائم کرتا رہتا۔

جب کبھی اسے اپنی ماں کی علالت کا شدید احساس ہوتا تو وہ باہر نکل جاتا اور اِدھر اُدھر گھوم کر واپس گھر آ جاتا۔ وہ چاہتا کہ قرض لے کر ہی اپنی ماں کا علاج کسی اچھے ڈاکٹر سے کرائے مگر اس کی ماں کبھی رضامند نہ ہوتی۔ اسے ڈاکٹروں پر اعتماد نہ تھا۔ اگرچہ مرغوب کو یہ کبھی یقین نہ آیا کہ اس کی ماں واقعی ڈاکٹری علاج کو بُرا سمجھتی ہے کیونکہ بچوں کی بیماری میں اس کی ماں ہمیشہ ہسپتال کی دوا استعمال کر لیتی۔

اس کی بہن ہر وقت کچھ سیتی پروتی رہتی۔ ان کے پاس ایک پُرانی مشین تھی اور اس کی بہن نے محلے والیوں کے کپڑے سی سی کر اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی بہن محلے والیوں کے کپڑے اُجرت پر سیتی ہے اگرچہ اس کی ماں نے اِس بات کو مرغوب سے ہمیشہ چھپانے ہی کی کوشش کی۔ اب اسی بہن کی شادی کا سوال درپیش تھا، چیزیں اس قدر مہنگی تھیں، سونا غریب پہن ہی نہیں سکتے تھے، پھر بھی برات کا خرچ تھوڑا بہت جہیز، معلوم نہیں کتنا روپیہ خرچ ہوگا۔ الہٰی! یہ روپیہ کہاں سے آئے گا! اسے یہ بھی شبہہ تھا کہ اس کی ماں انہی فکروں سے ماندی رہتی ہے۔

جب بھی وہ گھر سے نکلتا، انہیں خیالات کو لئے نکلتا۔ مگر دس منٹ چلنے کے بعد جب وہ اس سڑک پر پہنچتا تو ایک ایک کر کے گھر کے تمام افکار اس کے دماغ سے اُتر جاتے۔ کبھی وہ اس فروگذاشت سے پشیمان بھی ہوتا اور اکثر ارادہ کرتا کہ اس بے فائدہ تفریح کو ترک کر دوں گا مگر نہ جانے کیوں دوسرے ہی دن اس کے قدم غیر شعوری طور پر اسی جانب پلٹ جاتے۔ اور وہ پھر ہر روز کی سی اک نئی امنگ، ایک نئی تڑپ، اک نئی شکست سے دوچار ہو جاتا۔

سہ پہر کو جب وہ پانچ بجے دفتر سے نکلتا تو اور کلرکوں کے ہمراہ رسمی گفتگو کرتا واپس گھر چلا آتا۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا، نہ کسی نے کبھی اس سے دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ اور نہ وہ خود ہی کسی سے خلوص کا متوقع ہوتا۔ سیاسی مسئلوں سے اسے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ لڑائی کی خبریں البتہ وہ ضرور غور سے سُن لیتا اور اگر کوئی اس سے رائے طلب کرتا تو انکسار کے

ساتھ وہ اپنی رائے بھی دے دیتا مگر اکثر وہ لوگوں سے اتفاق ہی کرلیتا۔ اس لئے باقی کلرک اس کے ساتھ مربیانہ برتاؤ رکھتے۔

مرغوب کو کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا کہ اس جیسے اور بھی کئی نوجوان ہوں گے جن کے دلوں میں ویسی ہی خواہشات موجود ہوں گی مگر چونکہ اس کے دل میں اس خیال سے اپنی بے بضاعتی کا احساس اور تیز ہو جاتا، اس لئے وہ کبھی دیر تک اس طرف توجہ نہ کرتا۔ مگر جب موٹروں میں بیٹھے، رعونت سے ٹھوڑی اوپر کئے، امیرانہ لباس پہنے وہ اپنی عمر کے اور نوجوانوں کو دیکھتا جو نہایت بے تعلقی سے اپنے طبقے کی نوجوان عورتوں سے ہنستے باتیں کرتے گذر جاتے تو وہ اپنے آپ میں سمٹ جاتا۔ اسے یہ محسوس ہوتا کہ ایسی لڑکیاں مرغوب جیسے لوگوں کی حقیقت برسات کے کیڑے پتنگوں سے زیادہ نہیں سمجھتیں۔ مگر آہ! ان کے لباس! یوں ان کے جسموں سے لپٹے ہوتے جیسے وہ کچھ پہنے ہی ہوئے نہیں۔ اور وہ روئے زمین پر کسی چنگیز یا تیمور کی بیٹی کی طرح ہر چیز کو روندتی ہر چیز پر اپنا قبضہ جماتی، نظروں سے کائنات کی ہر چیز کو مسخر کرتی، دنیا کے دُکھ کو، دلوں کی دھڑکن کو، غریب جسموں کی پکار کو ہیچ اور بے حقیقت سمجھتی اپنی ہنسی کی رنگین فضا میں گھری کسی اور ہی دنیا کی طرف گذر جاتیں۔

اور آخر کار اس کی آرزو بھی پوری ہوگئی۔ اسے بھی موقع مل گیا کہ وہ کسی حسینہ کے نرم ہونٹوں سے شکریئے کے لفظ سن سکے اور جادو کی دو سیاہ پتلیاں اس کے دل میں اُتر جائیں۔ اسی سڑک پر۔ اور اُس دن وہ خود بھی اُجلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس کا چہرہ بھی صاف تھا، کوٹ بھی اس کا کافی نیا تھا۔ ہوا میں اک جان پرور خنکی بھی موجود تھی اور اس کے دل میں نئی نئی اُمنگیں اُٹھ رہی تھیں۔ کیا وہ خوش قسمت تھا! ایک سائیکل سوار لڑکی واقعی ایک تیزی سے جھپٹتے ہوئے ٹانگے کی زد میں آتے آتے جو بچی تو سنبھل نہ سکی اور سائیکل سے گر پڑی۔ اور لڑکی بھی کون! جسے وہ کئی دفعہ نظر بھر کر دیکھ چکا تھا، جس کا جسم سائیکل کی گدی پر سے بھی ہمیشہ گداز اور گول دکھائی دیتا تھا اور جس کی بے پروا نظر کئی دفعہ اس سے دوچار ہوئی تھی۔ مگر یہ حادثہ اس قدر اچانک واقع ہوا کہ وہ لپکا بھی، خیال ہی خیال میں اس نے ہاتھ پھیلا کر لڑکی کو بازو سے پکڑ کر سہارا بھی دیا۔ اس کا سائیکل بھی اُٹھایا، ہمدردانہ لہجے میں اس سے یہ بھی پوچھا "کہ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی" اس کے کانوں نے ایک سُریلی آواز میں شکریئے کے الفاظ بھی سن لئے مگر بیشتر اس کے کہ وہ قدم اٹھاتا ایک خوش پوش نوجوان نے اس پر ایک بھسم کر دینے والی نظر ڈالتے ہوئے کہا "ہٹو جی! کیوں راستہ روکے کھڑے ہو؟ اندھے ہو گیا؟" اور ساتھ ہی اس غارت گر ہوش کو سہارا دے کر اُٹھا دیا اور کہا "آپ کو چوٹ تو نہیں آئی، یہ لال بجھکڑ راستہ روکے کھڑا تھا، ورنہ شاید آپ گرتیں ہی نہیں" اور وہ راجہ کی بیٹی مرغوب کی طرف دیکھے بغیر اس خوش وضع نوجوان کا شکریہ ادا کرکے چل دی۔ مرغوب کو یوں محسوس ہوا گویا بیک وقت سو سے زیادہ گھنی پلکوں والی سیاہ آنکھیں اسے سر سے پاؤں تک اوپر نیچے دیکھ کر حقارت سے مُسکرا رہی ہیں۔ اس نے اپنی نظریں نیچی کرلیں اور اس نے دیکھا کہ اس کے کپڑے معمولی اور غریبانہ ہیں اور اس کی وضع کسی فقیر سے بہتر نہیں۔ اس کا چہرہ ندامت سے سُرخ ہوگیا۔

اس چھوٹے سے واقعے کے بعد وہ کئی دن تک اُس طرف نہ گیا۔

سید فیاض محمود

داد طلبی

میری ہمت اور استقلال کی داد دو کہ تمہاری مدد کے بغیر تم تک پہنچنے میں
کامیاب ہو رہا ہوں۔

ہما ہرنالوی

والمیک

مصنفِ رامائن

اے والمیک شاعرِ عہدِ قدیمِ ہند روشن ہے تیرے فکر سے اب تک حریمِ ہند
تیری نوا میں گم ہے بہشتِ نعیمِ ہند تیرے نفس سے عطرفشاں ہے نسیمِ ہند
افکار کو ثبات ہے تن بے ثبات ہے
تو خاک میں بھی مل کے بقیدِ حیات ہے

صدہا برس ولادتِ عیسٰی سے پیشتر تھے اہلِ بزم تیری زیارت سے بہرہ ور
صدیاں ہوئیں کہ تو نے جہاں سے کیا سفر موجود آج تک ترے اشعار ہیں مگر
تیرے چمن کا رنگ بھی اب تک ہے بو بھی ہے
مثلِ مسیح زندۂ جاوید تو بھی ہے

لکھی ہے تو نے رام کی رودادِ زندگی قائم ہے جس پہ ہند کی بنیادِ زندگی
آباد جس سے ہے شہرِ آبادِ زندگی جس سے نشاط گیر ہیں ناشادِ زندگی
گر رام بے نظیر ہے تو بے عدیل ہے
رامائن اس بہشت کی حورِ جمیل ہے

اسلوب دلفریب ہے بندش ہے شاندار اشعار کا شمار ہے اک لاکھ دس ہزار
تیرا قلم ہے یا ہے کلیدِ درِ بہار گم ہیں تری نواؤں میں صحرا و کوہسار
ہندوستاں کا بلبلِ شیریں سخن ہے تو
ہومر کی طرح شاعرِ عصرِ کہن ہے تو

تو گل فروشِ ہند کے عہدِ بہار کا میں داستاں سرا ستمِ روزگار کا
تو گوہرِ منیرِ یمِ بے کنار کا میں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار کا
آزاد تھی فضائے چمن تیرے عہد میں
آنکھیں مری کھلی ہیں غلامی کے عہد میں

تھا لالہ زارِ ہند میں دورِ مئے طرب آلامِ روزگار سے ناآشنا تھے سب
عشرت کی صبح و شامِ مسرت کے روز و شب واقف نہیں تھے نامِ غلامی سے تیرے لب
میں منزلِ نشاط سے بیگانہ ہوں ہنوز
پابندِ راہ و رسمِ غلامانہ ہوں ہنوز

پاتا ہوں ہر نگاہ سے فرمانِ دور باش ضربِ الم سے شیشۂ خاطر ہے پاش پاش
ہر ایک رگ میں نشترِ حسرت کی ہے خراش پھر بھی ہے تیرے نقشِ قدم کی مجھے تلاش
میری زباں میں زور نہ بندش میں زور ہے
فریاد کی پکار ہے نالوں کا شور ہے

اس حال میں یہ شوق ہے اے بحرِ بیکراں اردو میں تیری نظم کا مفہوم ہو بیاں
بے بال و پر ہے فکر تو بے کیف ہو زباں منظور ہے مجھے دلِ مردہ کا امتحاں
خونِ جگر سے پریم کا بوٹا ہرا کروں
اپنے وطن کا حقِ محبت ادا کروں

اصغر حسین خاں نظیر

"دیکھئے صفحہ فلاں"

آرام کرسی پر بیٹھ کر دبلکہ لیٹ کر) کوئی دلچسپ افسانہ پڑھا جا رہا ہے، کچھ معلوم نہیں چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ کمرے میں جو آہٹ ہے تو قالین پر کتا پھر رہا ہے یا بلی، یا کہیں وہ کمبخت مالی کی بکری ہی تو نہیں۔

یہ بھی معلوم نہیں کہ اب کیا بجا ہے، اور کتنے بجے سے کالج کا گھنٹہ شروع ہوگا دیا کب سے شروع ہو چکا ہے) اور ابھی ابھی جو جلتا ہوا سگرٹ پھینکا تھا وہ کہیں قالین ہی پر تو نہیں رہ گیا۔ آنکھیں کچھ مُندی مُندی سی ہیں، پڑھ رہے ہیں، کچھ خواب سے دیکھے جا رہے ہیں۔ ایک داستانِ محبت ہے کہ سامنے کھلی ہوئی ہے۔ دل میں یہ شبہ یقین میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے کہ واقعی دُنیا میں محبت بھی کوئی بڑی شدید قسم کا جذبہ ہے اور جسے کسی سے محبت ہو جائے اُس جیسا خوش قسمت آس پاس نہیں ملتا۔ یہ چیز خدا کی دین ہے۔ جسے خدا محبت عطا فرماتا ہے تو بس چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ تلاش کرنے پر تو یہ ملتی نہیں لیکن اگر چمٹ جائے تو کمبل کی طرح پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آہا ہا ہا — مُنہ میں پانی بھر آتا ہے!

خیالات بھی افسانے کے کرداروں کے ساتھ ساتھ گھوم رہے ہیں۔ جب دردناک حصّہ شروع ہوتا ہے تو مُنہ لٹک سا جاتا ہے، آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں، ایک آدھ سرد آہ بھی کھینچ لی جاتی ہے۔ ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی بُخار چڑھے گا۔ اور پھر جب محبت کی فتح کا وقت نزدیک آتا ہے تو آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے، چہرے پر مُسکراہٹ آجاتی ہے بس کسی نامعلوم تال پر ہلنے لگتا ہے، طبیعت میں جوش پیدا ہو جاتا ہے، کسی سے لڑ پڑنے کو جی چاہتا ہے — غرضکہ اسی طرح افسانے کی ایک ایک سطر کے ساتھ پینترے بدلے جاتے ہیں — ! انہی خیالات میں مدہوش ہوتے ہیں کہ ایک زوردار کڑاکے کے ساتھ بجلی گرتی ہے، ایک زبردست طوفان آتا ہے، اور چلا جاتا ہے پھر آنکھوں کے سامنے ایک خلاء چھا جاتا ہے — ایک وسیع خلاء! خیالات منتشر ہو جاتے ہیں، اروح پر ایک عجیب سی بے چینی مسلط ہو جاتی ہے۔

یہ سارا سلسلہ کچھ اس طرح منقطع ہو جاتا ہے جیسے سینما ہال میں فلم یک لخت ٹوٹ جائے! نیچے لکھا ملتا ہے "باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر" اُس وقت دل پر کیسی کیسی قیامتیں گزر جاتی ہیں، ہم اپنے آپ کو کس قدر مظلوم سمجھتے ہیں، دُنیا بھر کے ستائے ہوئے — دُنیا بھر کی ہمدردی کے مستحق!

خُدایا کیا سے کیا ہو گیا؟ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

لیکن قہرِ درویش برجانِ درویش، اسب کچھ سہنا پڑتا ہے، اور "صفحہ فلاں" کھول کر پھر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن اس مرتبہ وہ جوش و خروش ہرگز باقی نہیں رہتا۔

بعض اوقات تو ایسے موقعوں پر نہایت وحشیانہ خیالات آنے لگتے ہیں کئی مرتبہ ہونٹ دبا دبا کر مُکّے کسے جاتے ہیں۔ اور ایسے ایسے منصوبے باندھے جاتے ہیں جن کا ذکر کرنا خالی از خطرہ نہ ہوگا۔

مثلاً ایک دل ہلا دینے والا خونچکاں افسانہ پڑھ رہے ہیں۔

ہیروئن نے پیار سے کہا "یوں ٹال مٹول کرنے سے فائدہ؟ میں ہمیشہ سچے انسان کو پسند کرتی ہوں، آپ جو مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں اس کی وجہ دریافت کرنا چاہتی ہوں — جو کچھ معاملہ ہے خُدا کے لئے صاف صاف بتا دیجیے!"

ہیرو نے کہا "آہ! یوں کہوں تو بھی مشکل، دُوں کہوں تو بھی مشکل — تم مانو گی نہیں!"

ہیروئن بولی "یہ آپ میں اتنی تبدیلی آ کیسے گئی — التجائیں کر رہی ہوں پھر بھی آپ نہیں بتاتے؟"

ہیرو بولا "اچھا تو لوسُن لو صاف کہے دیتا ہوں — لیکن کیا خاک بتاؤں۔ دکھانتا ہے! — اچھا لو سُنو — میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں کہ — "

دیکھئے صفحہ فلاں پر

خیر صاحب! جلدی جلدی وہ صفحہ کھولا جاتا ہے۔ دل میں وہ فقرہ گونجتا رہتا ہے ـــــ میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں کہ ـــــ میں کس طرح تمہیں سمجھاؤں کہ ـــــ

آگے آتا ہے ـــــ "کہ میں خود" اصل یاقوتی" کے استعمال سے مستفیض ہو چکا ہوں۔ دنیا بھر کے ڈاکٹر میرے مرض کو تپ دق بتاتے تھے۔ میں بالکل ہڈیوں کی مالا بن گیا تھا اور اب میں بفضل خدا قابل رشک صحت کا مالک ہوں ـــــ!"

طبیعت میں اُلجھن سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کیا ہو گیا! اس کا افسانے سے تو کوئی تعلق نہیں۔ اظہار محبت سے "اصلی یاقوتی" کا کیا واسطہ، صفحات کی جانچ پڑتال جو کی جاتی ہے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ لاحول ولاقوۃ! یہ تو کوئی اشتہار تھا۔

بعض اوقات افسانہ پڑھتے پڑھتے اِس آنے والے "خطرے" سے دل اچانک دھڑکنے لگتا ہے، کہ کہیں پڑھتے پڑھتے یک لخت ہی یہ "حادثہ" پیش نہ آجائے اور جہاں افسانے کا کوئی بڑا دلچسپ حصہ آتا ہے اُس وقت تو بس "جل تُو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کی قسم کا ورد شروع ہو جاتا ہے کہ "اے پاک پروردگار تو مُشکل کُشا ہے، بس کہیں "دیکھئے فلاں صفحہ" نہ بیچ میں آٹپکے۔ اور اگر قسمت میں یونہی لکھا ہے تو یہ ذرا دیر میں آئے، جب یہ دلچسپ حصہ ختم ہو لے۔"

کتنی ہی مرتبہ مسلسل ناکامیوں سے دل بیزار ہو گیا ہے، اور ان لگاتار بیزاریوں نے مجھے افسانوں کے معاملے میں ایک حد تک قنوطی بنا دیا ہے۔ افسانے کی سُرخی دیکھتے ہی میرے دل میں بے ثباتی عالم کا نقشہ پھر جاتا ہے ـــــ میں چپکے سے کہتا ہوں کہ "ہائے اے پیارے افسانے! کون جانتا ہے کہ کہیں تیرا حشر بھی وہی نہ ہو جو میں نے اتنے افسانوں کا ہوتے دیکھا۔"

میں نے کیسے کیسے جتن کئے ہیں؛ کیا بتاؤں آپ کو۔ مثلاً یہ کہ سب سے پہلے افسانے کی سُرخی سے لے کر اختتام تک سارے صفحات کا جائزہ لینا شروع کر دیا، اگر افسانے میں "دیکھئے فلاں صفحہ" کہیں نہیں (یہ نعمت بہت شاذ ہے) تو فوراً ہی کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ اُس افسانے کو جلد جلد پڑھ لیا، ایسے خوش نصیب لمحات پر بارہا میں نے خوشی کے آنسو بہائے ہیں۔ لیکن جلد ہی پونچھ ڈالے کیونکہ ایسی خوشی دیرپا نہیں ہوتی اور اگلے افسانے میں ضرور کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اُن افسانوں کا انتخاب ہوتا ہے جن میں "دیکھئے صفحہ" دو مرتبہ ہو یا زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ! جلدی سے دو انگلیاں اُن صفحات میں رکھ لیں اور روانی قائم رکھنے کے لئے اِدھر آخری پیرے کو دو تین مرتبہ پڑھ لیا اور پھر بڑی پھُرتی سے (جس کی مشق کافی دیر میں ہوتی ہے) بقیہ حصہ نکالا اور جلدی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ یوں کرتے وقت اکثر بلند آواز سے پڑھنا پڑا ہے۔

اور جن افسانوں میں "دیکھئے صفحہ" پانچ چھ مرتبہ ہو، تو انہیں زندگی کے صرف اُن لمحات کے لئے وقف کر رکھتا ہوں جب انسان افسانہ پڑھے بغیر نہ رہ سکے اور افسانہ نہ پڑھنے کی صورت میں خطرناک نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ ہو۔

آپ یقین کیجئے کہ کئی مرتبہ میں نے ایسے افسانے بھی دیکھے ہیں جن میں "افسانہ" کم ہوتا ہے اور "دیکھئے صفحہ فلاں" زیادہ!

یہ تو میں نے محبت کی کہانیوں کا ذکر کیا ہے، علمی مضامین اور ڈراؤنے افسانے بھی اس "دیکھئے صفحہ" کی دست برد سے نہیں بچتے۔

اب مثال کے طور پر کسی سُراغ رسانی کے افسانے کو لیجئے۔

"اندھیری رات تھی، بارش نے سوچ رکھا تھا کہ آج ہی برسوں گی، قبرستان کا منظر ـــــ ہوا کے تھپیڑے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آج کوئی بہت بڑی مصیبت ٹوٹنے والی ہے"

ـــــ یہ پڑھ کر دل پر تھوڑا سا خوف ضرور طاری ہونے لگتا ہے اور خصوصاً اگر اندھیری رات میں مضمون پڑھا جائے اور ساتھ بارش بھی ہو رہی ہو ـــــ

"ملزم بھاگا، اُس کے پیچھے پیچھے کانسٹیبل تھا۔ اس قسم کے تعاقب کا اتفاق کانسٹیبل کو کبھی نہ ہوا تھا۔ ملزم کے پاؤں میں گویا پہیئے لگے ہوئے تھے۔ کانسٹیبل نے چلا کر کہا، بدمعاش آدمی تو بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ میں سیٹی بجاتا ہوں ابھی سینکڑوں سپاہی تجھے گھیر لیں گے۔

مُلزم پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ اُس نے قلانچ بھری، برساتی نالے کو پھلانگ گیا اور لپک کر سامنے کی اونچی دیوار پر چڑھ گیا۔ بھاری بھرکم سپاہی پھاند نہ سکا اور وہیں رُک گیا ملزم دل کھول کر ہنسا، اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّا کر بولا کہ

باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر

دل پر بدستور ڈر طاری ہے، صفحہ تلاش کرتے وقت آخری فقروں کو دل میں دہرایا جا رہا ہے۔ بقیہ حصّہ مل جاتا ہے۔ ایک دفعہ اور آخری فقرہ پڑھا جاتا ہے —— ہاں تو مُلزم زور سے ہنسا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّا کر بولا کہ "خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے۔" لاحول پڑھتے ہیں، یہ کیا تماشا ہے؟ کہاں تو سہمے بیٹھے تھے اور کہاں کچھ ہنسی سی آجاتی ہے۔ ملزم کانسٹیبل سے کہہ رہا ہے کہ "نمبر خریداری کا حوالہ دیجئے" کیا بات بنی؟

دوبارہ دیکھتے ہیں کہ کہیں غلط تو نہیں پڑھ لیا —— خاصی چھان بین کے بعد پتا چلتا ہے کہ واقعی کچھ اور پڑھ لیا ہے۔ اب جو افسانے کو پڑھتے ہیں تو وہ مُلزم کا پُر لطف فقرہ بھولتا ہی نہیں۔ ہنسی ہے کہ زبردستی آرہی ہے۔ چلو افسانہ ختم۔

اب کوئی سنجیدہ سا مضمون لے بیٹھتے ہیں۔ سقراط پر مقالہ ہے صاحب، خوب ہے! دفعتہً پتا چلتا ہے کہ سقراط واقعی بہت بڑی ہستی تھا اور اب تک ہم بالکل اندھیرے میں رہے ہیں جو ہم نے اُس عظیم الشان رُوح پر کبھی فاتحہ تک نہ پڑھی، اپنی بے بضاعتی پر افسوس ہونے لگتا ہے۔

پھر سقراط کو زہر دیئے جانے کا واقعہ آتا ہے، دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ چہرہ لمبا ہو جاتا ہے، مسکراہٹ (ملزم کے فقرے والی مُسکراہٹ) —— جی تو اُس کی شکنیں دُور ہو جاتی ہیں، یک لخت انکشاف ہوتا ہے کہ دُنیا فانی ہے، یہاں سب کو مرنا بھی ہے۔ فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں "سقراط نے پہلے تو اپنے دُشمنوں کو بڑے سکون کے ساتھ دیکھا، اُس کے پُر نور چہرے کا جلال کئی گُنا بڑھ گیا تھا، وہ بالکل ہراساں نہ تھا، دشمنوں کا پِتّا پانی ہو چلا تھا سُقراط نے ایک چھینک ماری اور کہا شکر ہے اب پھر وہ گرجتی ہوئی آواز میں بولا کہ ——

باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر

جلدی سے کھول کر پڑھا۔ ہاں تو صاحب سقراط نے گرجتی ہوئی آواز میں اپنے دشمنوں سے کہا کہ "اگر آپ سالنامہ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو چندہ سالانہ پیشگی بھیج دیجئے"۔ جھنجلا اُٹھے! یہ کیا مصیبت ہے۔ پھر وہیں پہنچے۔ اس مرتبہ بڑی احتیاط سے سب کچھ دیکھا، پھُونک پھُونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے ایسے وقت میں۔ پھر آہستہ سے وُہ صفحہ کھولا۔ اب جو پڑھتے ہیں —— "سقراط نے گرجتی ہوئی آواز میں اپنے دشمنوں سے کہا کہ "ہمیشہ عبداللہ سگریٹ پیا کرو"۔ تو جھنّا کر رسالہ پٹخ دیا۔ اگر محض اتنا ہی ہو کہ "دیکھئے فلاں صفحہ" کے ساتھ اُس صفحے پر صرف اُسی مضمون کا بقیہ حصّہ ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ اب ایک ہی صفحے پر تین چار چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مضامین کے ہیں، چند بیش قیمت نصیحتیں خریداروں کو دی گئی ہیں۔ ایک آدھ اشتہار بھی ہے۔ اب بتائیے کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں! یا تو یوں ہو کہ "کھولئے صفحہ ۱۹ دیکھئے وسط کا حصّہ ڈھونڈیئے دوسرا کالم اور پڑھیئے وہاں سے —— !"

میرے خیال میں اس چیز کا محض ایک فائدہ ہے۔ کسی یونہی سے افسانے کو پڑھتے پڑھتے جب نہایت خشک حصّہ آجائے اور جی چاہے کہ بھئی پھینکو اسے ایک طرف۔ تب ضمیر ڈانٹتا ہے کہ خبردار! یہ آرٹ کی توہین ہے، اگر اتنے ہی بیزار تھے تو شروع کیوں کیا تھا، اب شرافت اسی میں ہے کہ اسے لفظ بلفظ پڑھ کر ختم کرو۔ اُس وقت انسان بہانے ڈھونڈنے لگتا ہے اور سب سے معقول بہانہ ایک ہے —— جہاں متواتر "دیکھئے فلاں صفحہ" آجائے وہاں ایک پڑھنے والے آرٹ کے شیدائی کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ بے شک رسالے کو انگیٹھی میں ڈال دے، یا اگر گرمیاں ہوں تو کھڑکی سے باہر پھینک دے۔ اور اگر ضمیر ذرا سا بھی بولے تو اُلٹا اُسے ہی ڈانٹ دے کہ "تجھے شرم نہیں آتی؟"

لوگ اکثر لکھا کرتے ہیں کہ جب میں اسمبلی میں پہنچوں گا تو یہ کروں گا، اگر ڈکٹیٹر بن جاؤں تو یہ منوا کر ہٹوں گا، اگر لیڈر بن گیا تو یُوں سے یُوں ہو جائے گا۔ مجھے تو یہی دُھن ہے کہ اگر میں کسی روز اتفاق سے بڑا آدمی بن گیا (واضح ہو کہ میں اپنے چھ فٹ قد پر قانع ہوں۔ اور بڑے آدمی سے میرا اشارہ طول و عرض کی جانب ہرگز نہیں) —— جی! تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر

میں کبھی یونہی کچھ بڑا آدمی بن گیا تو سب سے پہلے اس "دیکھئے صفحہ فلاں" کے خلاف آواز بلند کروں گا کہ کسی کو کیا حق ہے کہ ایک پیارے پیارے افسانے یا مضمون کا تکا بوٹی کر کے رکھ دے۔ اور پھر جیسا کہ بعض مصنفین نے کہا ہے ــــ (بہت سے آج کل بھی کہتے ہیں) کہ افسانے جگر کے ٹکڑے ہوتے ہیں، اِن میں بھی جان ہوتی ہے اور (در دروغ بر گردنِ راوی) افسانہ نگار کی رُوح کا حصّہ ہوتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہوتے ہیں تو اس صورت میں تو یہ ایک اچھا خاصا جُرم بن سکتا ہے۔ اگر قانونی جُرم نہیں تو کم از کم "روحانی جرم" یا "افسانوی جُرم" تو ضرور ہی ہو سکتا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ لوگ میری اِس اپیل کو سر آنکھوں پر لیں گے۔ اور وہ دن دُور نہ ہوگا جب "دیکھئے صفحہ فلاں مردہ باد" اور "دیکھئے فلاں صفحہ ہائے ہائے" کے نعرے بچّے بچّے کی زبان پر ہوں گے۔ پھر افسانے سالم چھپا کریں گے، مسلسل ہوں گے اور پڑھنے والوں کو ہرگز یہ مُشکلات پیش نہ آئیں گی۔

جب تک اس قسم کا قانون نہیں بنتا سمجھ لیجئے کہ یہ "دیکھئے فلاں صفحہ" بھی کہیں نہیں جانے کا، اور اسی طرح مدّتوں تک ہمارے سینوں پر مونگ دلے گا۔

ایک تجویز ہے! وُہ یہ کہ اگر ضرور ہی ایک افسانے کو کئی حصّوں میں تقسیم کرنا منظور ہے، اور اس کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا تو اس خشک سے فقرے کی جگہ اچھّے اچھّے فقرے بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں "دیکھئے" نا یہ سخت سا نادر شاہی حکم بار بار اچھا نہیں لگتا۔

جہاں مضمون کا کوئی حصّہ ختم ہوتا ہو وہاں ملائم الفاظ میں پڑھنے والے سے درخواست کی جائے کہ چونکہ اس صفحے پر جگہ تھوڑی تھی اور دوسرے صفحے سے نیا مضمون لازمی طور پر شروع ہونا تھا اس لئے اگر وُہ مناسب سمجھے تو فلاں صفحہ کھول لے۔ یا کوئی اچھا سا فقرہ لکھ دیا جائے۔ مثلاً

"اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کم از کم فلاں صفحہ ہی کھول لیجئے۔" یا
"گستاخی معاف! کیا آپ ہمارے لئے فلاں صفحہ نہ کھولیں گے؟" یا
"صفحہ فلاں کو ملاحظہ فرما کر مدیر و مینجر رسالۂ ہذا و عملۂ متعلقۂ رسالۂ ہذا و فاضل مضمون نگار ــــ سب کو ممنون فرمایئے۔ شکریہ!"

شفیق الرحمٰن

بچّہ سو رہا تھا

وُہ سوتے سوتے رونے لگا
ماں نے اُسے دایہ کی گود سے چھینا۔ اور اپنی آغوش میں لے لیا۔ اُسے میٹھی میٹھی لوریاں دے کر سُلا دیا۔
بچّہ پھر رونے لگا
اب خدا نے اُسے ماں کی گود میں سے چھین کر بہشت میں حُوروں کی گود میں سُلا دیا
بچّہ اب بھی سو رہا ہے!

(انگریزی) چاند شرما

جامِ صہبائی

(۱)

ہر چیز کو ذی حیات پایا ہم نے مجموعۂ واردات پایا ہم نے
ہر ذرّے میں بس رہی ہے دُنیائے حیات ہر ذرّے کو کائنات پایا ہم نے

(۲)

ہر شخص کو اِک کتاب پایا ہم نے افسانۂ لاجواب پایا ہم نے
دیکھا جب غور سے تو ہر ذرّے کو سمٹا ہُوا آفتاب پایا ہم نے

(۳)

مانندِ خلیل نار سے بھی خوش ہیں ہم مثلِ مسیح دار سے بھی خوش ہیں
اے دوست! نہ کر کرم کی تکلیف نہ کر بحرِ غمِ بے کنار سے بھی خوش ہیں

(۴)

سر دار کی نذر ہے ہمارا اے دوست! قلب اور جگر ہیں پارہ پارہ اے دوست!
ہم کو تو نہیں ہے کچھ شکایت لیکن کیونکر ہُوا تجھ کو یہ گوارا اے دوست!

اثرؔ صہبائی

دُعا

(تضمینِ اشعارِ حضرتِ اقبالؔ)

میرا دلِ مطمئن طالبِ نانِ شعیر - قیدِ جہاں سے بری گرچہ بظاہر اسیر
مجھ میں نہ پیدا ہُوا شوقِ لباسِ حریر دولتِ لعل و گہر میری نظر میں حقیر
می نہ بَرد حاجتے پیشِ سلاطیں فقیر "میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تُو شاخِ نشیمن بھی تُو"

صحبتِ اہلِ صفا حسنِ ازل کا ظہور صحبتِ اہلِ صفا وادیٔ ایمن کا نُور
صحبتِ اہلِ صفا دشمنِ فسق و فجور دشمنِ فسق و فجور حاملِ ذوقِ حضور
حاملِ ذوقِ حضور، قاتلِ کبر و غرور "صحبتِ اہلِ صفا نور و حضور و سرور
سرخوش و پُرسوز ہے لالہ لبِ آبِ جو"

خالقِ کون و مکاں مالکِ غیب و حضور! میرے لئے زیست میں تیرے کرم سے سرور
رُوح کی گہرائی میں فیض ترا دُور دُور عالمِ تاریک میں تیری تجلّی سے نُور
تجھ سے ہے سینہ مرا رَوکشِ کہسارِ طور "تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ہو"

میری تمناؤں کا پھول نہ اب تک کھلا سوز و تب و تاب و غم میری طلب کا صلہ
آرزوئے شوق میں اور مجھے کیا ملا روح میں موجود ہے درد کا اِک سلسلہ
عزم کو درپیش ہے صبر شکن مرحلہ "تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سو"

جگن ناتھ آزادؔ

سن کیاؤ

(ملکِ چین کی ایک کہانی)

وانگ پاؤ، سوداگر، اپنے گدیلوں سے بھرے ہوئے آرام دہ کمرے میں بیٹھا۔ پرندوں کے گھونسلوں، مچھلی کے پروں، مینڈک کی ٹانگوں اور اس قسم کی اور لذیذ ترین غذاؤں کے کاروبار سے منافع کا حساب کر رہا تھا کہ ایک بھکاری گانے والے کی آواز نے اس کے دل خوش کُن خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔ گانے والا سوداگر کی کھڑکی سے باہر سڑک پر ایک درخت کے ساتھ سہارا لگا کر بیٹھ گیا تھا اور ایک چھوٹی سی، پیالے کی شکل کی آدھی ڈھولک کو زور زور سے بجا کر اس کے ساتھ گذشتہ زمانے کے منظوم قصے الاپ رہا تھا۔

سوداگر نے تنگ آ کر اپنے پاس رکھے ہوئے، لٹکی ہوئی رکابی کی شکل کے آہنی گھنٹے کو اس کی چھوٹی سی موگری سے بجایا اور نوکر حاضر ہوا تو اس سے کہا کہ "یہ شخص جو درخت کے نیچے بیٹھا گا رہا ہے اس کو سمجھاؤ اور اگر ضرورت ہو تو موٹے ڈنڈے سے یقین دلاؤ کہ ہمارا غریب خانہ اس کی آواز کے بہشتی سُروں کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس لئے وہ کسی اور جگہ نقلِ مکان کر کے لوگوں کے دلوں کو لبھائے۔"

نوکر جب واپس آیا تو اس کے چہرے پر مالک کے حکم کو کامیابی سے بجا لانے کی فاخرانہ جھلک نہ تھی۔ اس نے کہا کہ فقیر نے مجھ سے ڈنڈا چھین لیا۔ میرے سر سے اپنی ڈھولک کو کئی دفعہ بجایا اور بدستور گاتا رہا۔

وانگ پاؤ نے کہا "تو اس کو غریب خانے کے اندر تشریف لانے کی زحمت دو تا کہ مناسب خاطر تواضع کی جائے۔"

یہ تجویز کامیاب ہوئی اور تھوڑی دیر میں گویّا نوکر کے ساتھ اندر آ گیا۔ وہ نوجوان سا تھا اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے لیکن چہرے پر غور وفکر کے آثار نمایاں تھے۔ اس کے گلے میں دھاگے کے ذریعے سے گتّوں پر لکھی ہوئی پانچ سات نظمیں لٹک رہی تھیں جن میں سے ہر ایک کا غالباً مختلف موقعوں پر گایا جانا مناسب ہوگا۔ پاؤں ننگے تھے اور ہاتھ میں ڈھولک تھی۔ اس نے اپنا نام "سن" بتایا اور خاندان کا نام کیاؤ۔

سوداگر نے ایسے رعب دار لہجے میں جس سے چھوٹے آدمیوں کو مخاطب کیا جاتا ہے کہا "تسلیم سن کیاؤ صاحب۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ اپنی شیریں آواز میرے غریب خانے کے باہر بلند کرنے پر کیوں مُصر ہیں ؟"

سن کیاؤ نے انکسار کے ساتھ آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا "کیونکہ غریب نواز نے مجھے اپنے محل کے اندر طلب نہیں فرمایا تھا۔ اب میں حاضر ہوں اور آپ کے پاس بیٹھ کر آپ کے معزز کانوں کو محظوظ کرنے کے لئے تیار ہوں۔" ان الفاظ کے ساتھ گویّا قالین پر بیٹھ گیا اور ڈھولک پر دو چار ہاتھ زور زور سے لگائے۔

سوداگر جلدی سے بولا "براہِ کرم اپنی مسلّمہ قابلیّت کو لگام دیجئے۔ آپ نے میرے سوال کو سمجھنے میں غلطی فرمائی۔ میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ آپ نے میرے نوکر کے نہایت ادب سے منع کرنے کے باوجود میرے غریب خانے کے باہر گانا بجانا کیوں جاری رکھا ؟"

گویّے نے جواب دیا "شاید آپ کے پیغام کی باریکی میں نہ سمجھ سکا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ بھوکے کے لئے کباب کی سیخ سے پٹنا کسی حسینہ کے پیار سے چٹکی لینے کی بہ نسبت زیادہ تسکین دہ ہوتا ہے۔ اس لئے اے عظیم الشان پیٹ والے تاجر صاحب واضح ہو کہ گو یہ گھر آپ کا ہے باہر کی سڑک میری ملکیّت ہے۔"

"یہ کیونکر ؟" سوداگر نے پوچھا

گویّے نے جواب دیا "اسی طرح جیسے یہ محل تمہارا ہے۔ کیونکہ میں وہاں رہتا ہوں۔"

وانگ پاؤ نے کہا "بے شک تمہارے جواب میں ایک نکتہ ہے۔ لیکن صرف اِن لوگوں کے لئے جن کا کام بال کی کھال نکالنا ہے۔ اس کو تسلیم کرتے ہوئے میں یہ پوچھتا ہوں کہ تمہیں کیا حق ہے کہ اپنے مکان میں اتنا شور مچاؤ کہ مجھے اپنے مکان میں رہنا دشوار ہو جائے۔"

گویّے نے جواب دیا "وہی حق جو تمہیں حاصل ہوتا ہے جب کسی اپنے سے بھی زیادہ بڑے پیٹ والے کی خاطر تواضع کرنے میں تم باجے گاجے سے محلّے بھر کو سر پر اُٹھا لیتے ہو۔"

سوداگر نے کہا "لیکن اس کا علاج تمہارے لئے آسان ہے۔ تم یہاں سے اُٹھ کر کہیں اور جا سکتے ہو" گویّے نے جواب دیا "بے شک لیکن یہی علاج ضرورت ہو تو تم بھی کر سکتے ہو۔ میرا پیشہ قانوناً جائز ہے اس کے ذریعے سے روپیہ پیدا کرنے میں مجھے کوئی نہیں روک سکتا"

"پیشہ؟" سوداگر کو پیشہ اور روپیہ کا نام سن کر غصہ آنے لگا "اس کو تم پیشہ کہتے ہو کہ تمام دن گلا پھاڑ پھاڑ کر چند فرسودہ اور بیکار نظمیں بار بار گاتے ہو اور شام تک دو چار آنے پیدا کر لیتے ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میری ایک دن کی آمدنی کس قدر ہے؟"

گویّے نے پھر بھی تحمل سے جواب دیا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ میری آمدنی تم سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے اگر میں وہ ذرائع استعمال کروں جو ایک تاجر کرتا ہے۔ یعنی دو چہرے اور تین ہاتھ۔؟

تاجر نے کہا "تم بڑے بدتمیز ہو۔!"

گویّے نے جواب دیا "یہ امر بحث کے مضمون سے تعلق نہیں رکھتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ میرا پیشہ تمہارے پیشے سے بہتر ہے کیونکہ تمہارا کام انسان کو یاد رکھنے پر مجبور کرتا ہے اور میرا کام اس کے افکار بھلا دیتا ہے"

یہ بحث اس طرح جاری تھی اور خدا جانے کب تک جاری رہتی (مثل ہے کہ ایک جاہل مزدور کئی من وزن کا پتھر چند منٹ میں ہٹا سکتا ہے لیکن دو عقلمند کئی چاند گذر جائیں ایک نقطہ کے معنی پر متفق ہونے میں نہیں آتے) اگر ایک ناگہانی واقعہ ظہور میں نہ آجاتا۔

شہنشاہ چین نانگ دی کا زمانہ تھا جو رعایا کے مقدمات میں انصاف کرنے کے لئے مشہور ہے۔ وہ خود اتفاق سے بازار میں سے گذر رہا تھا۔ اس نے ایک مکان سے دو آدمیوں کے آپس میں زور زور سے بحث کرنے کی آواز سُنی اور پالکی رُکوا کر صورتِ حال دریافت کی۔ جب دونوں طرف سے سن چکا تو کہا "یہ اختلاف کوئی نئی بات نہیں۔ بہت پُرانا ہے۔ اور ہم خود اس کا فیصلہ کرتے لیکن آزادی کا زمانہ آرہا ہے اور عوام کی رائے کو ایک شخص کی رائے سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا فیصلہ بھی عام رائے سے ہوگا۔ لہٰذا احکام جاری کر دئے جائیں کہ فلاں روز اتنے بجے شہر کے فلاں چوک میں سن کیاؤ اپنی بہترین نظم گا کر سنائے گا اور ٹھیک اُسی وقت دوسرے چوک میں وانگ پاؤ ـــ کہو وانگ پاؤ تم کیا کرو گے؟ اچھا یوں سہی کہ وانگ پاؤ کل آنے والوں میں دونیاں اور چونیاں تقسیم کرے گا۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہماری رعایا کی زیادہ تعداد کس کی قدر زیادہ جانتی ہے۔

وانگ پاؤ بول اُٹھا "واہ کیا انصاف ہے شہنشاہ سلامت! حضور سے بڑا منصف دنیا بھر میں دوسرا کوئی نہیں"

یہ اس لئے کہ وانگ پاؤ کو پورا یقین تھا کہ اسی کی فتح ہوگی۔ سن کیاؤ نے بادشاہ کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔

چند روز بعد جب مقررہ وقت آیا تو سن کیاؤ والے چوک میں صرف دو آدمی دکھائی دیتے تھے۔ ایک اندھا فقیر جو راستہ بھول گیا تھا اور ایک موٹا بنیا جس کے پالکی والے یہ سُن کر کہ دوسرے چوک میں دونیاں بٹیں گی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ لیکن وانگ پاؤ والے چوک میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چوک میں سے جو بازار نکلتے تھے وہ بھی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ راستہ بند ہو گیا تھا اور خود سن کیاؤ بھی اسی چوک میں موجود تھا۔

چوک کے ایک کنارے چبوترہ بنا کر قالین بچھا دئے گئے تھے اور ایک سونے کی کامدار مخملیں بڑی چھتری کے سایہ میں بادشاہ بیٹھا تھا۔ سوداگر وانگ پاؤ اس کے قریب ہی خوش وخرم کھڑا لوگوں کے انبوہ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ شاہی محل سے گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔ بادشاہ نے وانگ پاؤ کو بُلایا۔ وہ مسکراتا ہوا سامنے حاضر ہو کر آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے کہا۔

"وانگ پاؤ وقت آگیا ہے اور بہت سے لوگ جمع ہیں۔ اب تم اپنے پیشے کے سن کیاؤ کے پیشے سے بہتر ہونے کا ثبوت دو"

"غریب نواز؟" وانگ پاؤ حیرت سے بولا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

بادشاہ نے کہا "اب اپنے غلاموں کو بلاؤ اور دونیاں چونیاں تقسیم کرنا شروع کرو۔ بہت آدمی ہیں دیر لگے گی۔ ایسا نہ ہو شام ہو جائے"

وانگ پاؤ نے کانپتے کانپتے جواب دیا "لیکن حضور وہ تو فرضی شرط تھی۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ کس کی طرف زیادہ آدمی جمع ہوتے ہیں!"

بادشاہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آیا اور گذر گیا کیونکہ احساس کا اظہار بڑے آدمیوں کے لئے معیوب سمجھا جاتا ہے' اور اس نے کہا "یہ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں نہیں وانگ پاؤ۔ عوام الناس کے ہاتھ میں ہے کہ وہ کیا سمجھے۔ ان تمام لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھو جو تمہارے معتقد

کا فیصلہ کرنے آئے ہیں۔ اور خود ہی سوچ لو کہ اگر تم نے ان کی اُمیدوں کو برنہ آنے دیا تو وہ تم سے کیا سلوک کریں گے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہُوا تمہیں یاد ہو گا کہ ننگ لو کا جس نے لاٹری کے ٹکٹوں میں دغا بازی کی تھی کیا حشر ہُوا تھا۔ کو چنگ یان ـــ ؟" اور اس نے ان افسروں میں سے ایک کی طرف دیکھا جو اس کی ہمراہی میں آئے تھے۔ اس نے جواب دیا۔

ننگ لو کو لوگوں نے بچھوؤں سے بھری ہوئی ناند میں بند کر دیا تھا حضور! تاکہ اسے ہر ایک آدمی کو دھوکا دینے کا صلہ علیحدہ علیحدہ ملتا محسوس ہو۔

وانگ پاؤ کی حالت وہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

بادشاہ نے کہا "تو بتاؤ وانگ پاؤ اب کیا کیا جائے۔ میں مجبور ہوں اور لوگ اتنی دیر سے کھڑے ہیں ہم سب کو انتظار کی مصیبت سے نجات دلاؤ اور روپے کی تھیلیاں نکالو تاکہ ان کو رخصت کیا جائے"۔

وانگ پاؤ نے کانپتے کانپتے جواب دیا "جہاں پناہ میری جیب میں تو اس وقت صرف تین روپے اور کچھ پیسے ہیں۔

بادشاہ نے کہا "اس سے تو کچھ بھی نہ ہوگا۔ اس لئے ہمیں اس مرحلے کو طے کرنے کے لئے کسی اور طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ سن کیاؤ کہاں ہے؟"

مجمع کے ایک دُور کے کونے میں حرکت ہوئی اور گویا بمشکل بھیڑ کو چیرتا ہُوا چبوترے پر پہنچ گیا۔ بادشاہ نے فرمایا "سن کیاؤ دیکھیں، کیا تمہاری قابلیت کا اس انبوہِ کثیر پر کچھ اثر ہو سکتا ہے؟"

سن کیاؤ نے بے فکری کے انداز سے چاروں طرف دیکھا۔ ڈھولک پر تمہید کے طور پر دو چار ضربیں لگائیں اور گانے لگا۔

قصہ پہلے قدیم زمانے کے حالات سے شروع ہُوا جب سانپ اور جن بھوت دنیا میں آزادانہ چلتے پھرتے تھے۔ آہستہ آہستہ مجمع خاموش ہو گیا۔ اب دنیا کی فضا میں اور انسانوں کے دلوں پر ایک دھواں سا چھایا ہُوا تھا جس میں کہیں کہیں کوئی چیز صاف نظر آنے لگتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد دیوتا پیدا ہوئے اور فضا کو اپنی طاقت کے زور سے صاف کرنے لگے۔ گویّے کی آواز میں کچھ ایسی مٹھاس تھی اور الفاظ میں اس قسم کا جادو کہ ہزاروں کے مجمع میں کسی کے سانس لینے کی آواز تک نہ سنائی دیتی تھی۔ فضا کے دھوئیں میں سے دریا اور نہریں ظاہر ہو گئیں۔ ہرے بھرے درخت نکلنا شروع ہوئے۔ دھان کے کھیت لہلہانے لگے۔ ریشم کا کیڑا اپنا کام کرتا دکھائی دیا۔ پھر بہادر اور عقلمند ہستیاں جن کے کارناموں سے ہزاروں سال بعد تک سبق لیا جا رہا ہے پیدا ہوئیں اور ظلم اور جہالت کے جنّات سے لڑ کر ان کو تباہ کر دیا۔ امن چین اور خوشی کا دور دورہ شروع ہُوا۔ لیکن شمال کی طرف سے انسانی دشمنوں نے ملک پر حملہ کر دیا اور پانچ برس پانچ مہینے اور پانچ دن تک سخت جنگ ہوتی رہی۔ جب ان کو بھی مار کر بھگا دیا گیا تو ملک پھر آزاد ہو گیا۔ سنہری زمانے کا آغاز ہُوا۔ شطرنج ایجاد ہوئی چھپی ہوئی کتابوں سے ہر خاص و عام میں علم کا چرچا ہونے لگا۔

اب تک سن کیاؤ ان باتوں کا حال بیان کر رہا تھا جو سُنی سنائی تھیں۔ الفاظ کی خوبصورت بندش اور آواز کی کشش سے لوگوں کی توجہ گویا بندھی ہوئی تھی اور چاندی لُوٹنے کا خمار اُتر چکا تھا۔ اب اس نے اپنے قصّے کا رنگ پلٹا اور روزمرّہ کے واقعات بیان کرنا شروع کئے۔ کس طرح موسمِ بہار پہاڑوں اور وادیوں پر سے گذرتا ہُوا آہستہ آہستہ آتا ہے۔ سورج نکلتے وقت اس کی کرنیں دریا کی لہروں کے ساتھ کس طرح رنگ برنگ کا لباس پہن کر کھیلتی ہیں۔ آڑو اور چیری کے درخت کس طرح اپنا روزانہ استعمال کا سبز دوپٹہ اُتار پھینکتے ہیں اور پھولوں کی چادریں اوڑھ لیتے ہیں۔ اپنے یہاں کے میلے ٹھیلے۔ کشتیوں کا میلہ اور فانوسوں کا میلہ ملک والوں کے دل پر کیا اثر کرتے ہیں۔ آخر میں اپنے گھروں کے حالات۔ پالتو مویشی اور ہر وقت رونق بڑھانے والے بچے گھر میں کس طرح بہشت کا سماں پیدا کر دیتے ہیں۔

جوں جوں اس کا راگ خاتمے کے قریب آ کر آہستہ آہستہ ہلکا ہوتا جا رہا تھا لوگوں کا مجمع چپ چاپ بکھرتا جاتا تھا اور جس وقت سن کیاؤ خاموش ہو گیا تو چوک میں صرف بادشاہ اُس کے ہمراہی، وانگ پاؤ اور گویّا ہی باقی رہ گئے تھے۔

بادشاہ نے کہا "وانگ پاؤ دیکھا؛ دنیا کی نظر میں اصلی فوقیت اس بات پر قائم ہوتی ہے کہ تم اُس کو کیا دے سکتے ہو۔ اس بات پر نہیں کہ تم نے دنیا والوں سے کیا کچھ چھین کر لوہے کے صندوقوں میں بند کر رکھا ہے۔ سن کیاؤ! آج کے دن کی یادگار میں تمہیں "راگ استاد" کا خطاب دیا جاتا ہے اور دربارِ شاہی میں پانچ سو روپیہ ماہوار پر قصیدہ گو مقرر فرمایا جاتا ہے اور اسی دن کی یادگار میں ترحّمِ خسروانہ کے طور پر وانگ پاؤ کو یہ عزت بخشی جاتی ہے کہ قصیدہ گو کے عہدے کے تمام اخراجات ہر مہینے خزانۂ شاہی میں داخل کر دیا کرے۔

عطاء الرحمٰن

قبروں کے کتبے

قبروں کے کتبے دراصل زندگی ہی کے ایک رُخ کی تصویر ہیں۔ ان میں بارہا مرنے والوں کی زندگی کا خُلاصہ بیان ہوتا ہے یا ان کے متعلق اُن کے عزیزوں کی کسی حسرت کا اظہار۔

کتبہ نگاری اپنی جگہ ایک علیٰحدہ فن ہے جس کے بنیادی اصول دو ہیں۔ اختصار اور لطافت۔ وجہ یہ ہے کہ لوحِ مزار پر کوئی لمبی کہانی بیان نہیں ہو سکتی اور اگر ہو بھی سکے تو اس میں وہ اثر نہیں آتا جو دل پر تیر بن کر لگے۔ اسی طرح کتبے کے مضمون میں کوئی لطیف نکتہ ضرور ہونا چاہئے جس سے پڑھنے والے کے دل پر غم کے علاوہ ایک ذہنی سُرور بھی طاری ہو سکے۔ بہترین کتبہ وہی ہے جو کسی لطیف نکتے کو مختصر اور بلیغ عبارت میں ادا کرے۔

ہمارے بیان کا سب سے زیادہ پُرمغز اور لطیف ذریعہ شاعری ہے، یہی وجہ ہے کہ کتبے عام طور پر شعروں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ زبان کی بلاغت اور ذہن کی چمک دمک کے لحاظ سے دو قومیں ایسی گزری ہیں جن کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، قدیم یونانی اور اہلِ ایران۔ اسی لئے دُنیا کے بہترین کتبے پہلے یونانی اور پھر فارسی زبان میں ملتے ہیں۔ اِس وقت ہمیں یونانیوں کی کتبہ نگاری سے سروکار نہیں ہے، ہم فارسی اور اُردو سے کچھ نمونے لیں گے۔

سب سے پہلے فارسی کا ایک کتبہ سنئے جس میں زندگی کے عروج و زوال کی عبرت ناک داستان صرف دو مصرعوں میں بڑی لطافت سے بیان کی گئی ہے۔ یہ کتبہ سلطان الپ ارسلاں کی زندگی پر ایک تبصرہ ہے۔ الپ ارسلاں کی سلطنت ترکستان سے لے کر بحیرۂ روم تک پھیلی ہوئی تھی۔ وُہ ایک عظیم الشان معرکے میں فتح حاصل کرکے واپس آ رہا تھا کہ اتفاقاً اپنے ہی ایک قیدی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ مرنے سے پہلے اُس کی زبان سے یہ لفظ نکلے "آج صبح اپنے قطار در قطار لشکر کو دیکھ کر میرا دل غرور سے بھر گیا تھا، مجھے یہ خیال آیا تھا کہ دُنیا کی کوئی طاقت میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن دن ڈھلنے سے پہلے خدا نے اپنے ایک کمزور اور حقیر بندے کے ہاتھ سے میرے غرور کو خاک میں ملا دیا" الپ ارسلاں کا مزار مرو میں ہے اور اس کی لوح پر جو شعر لکھا ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے ؎

تم نے دیکھا کہ الپ ارسلاں کا سر بلند ہوتے ہوتے آسمان پر پہنچ گیا
لیکن مرو میں آؤ تاکہ اُسی الپ ارسلاں کا سر خاک میں ملا ہوا دیکھو۔

اصل شعر یوں ہے ؎

سرِ الپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں؛
بہ مرو آ تا بہ خاک اندر سرِ الپ ارسلاں بینی!

اب ایک اور قبر کا کتبہ سنئے جو بادشاہوں کو عبرت کا درس دینے کے بجائے نوجوانی کی محبّت اور اُس کی حسرت آمیز یاد کا مُرقّع پیش کرتا ہے۔ انارکلی کے حُسن و جمال کی داستان سب نے سن رکھی ہے، کس طرح شہزادۂ سلیم نے اُس سے اور اُس نے شہزادے سے دیوانہ وار محبّت کی، کس طرح اکبر کے شاہی جلال نے بھڑک کر انارکلی کو پل بھر میں بھسم کر دیا۔ اس کے بعد برسوں گزر گئے شہزادۂ سلیم شہنشاہِ جہانگیر بن گیا۔ ایک دن لاہور میں اُس نے اچانک انارکلی کی بے نام و نشان قبر کو دیکھا تو دل بے چین ہو گیا۔ ایک عالی شان مقبرہ بنوا کر انارکلی کی تربت پر یہ شعر لکھوایا ؎

کاش، ایک بار پھر میرے محبوب کا چہرہ مجھے نظر آئے!
آہ! اگر ایسا ہو سکے تو میں قیامت تک اپنے پروردگار کا شکر بجا لاتا ہوں

آہ گر من باز بینم روئے یارِ خویش را
تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را

اسی سلسلے میں شاید آپ کو توقع ہوگی کہ میں نور جہاں کے مزار کا مشہور کتبہ بھی آپ کو سناؤں۔ لیکن میں یہ نہیں کروں گا ایک تو اس لئے کہ وہ شعر پہلے ہی کافی مشہور ہے، دوسرے اس لئے (اور زیادہ تر اسی لئے) کہ درحقیقت وہ شعر نور جہاں کے مزار پر درج ہے ہی نہیں۔ اس کے بجائے آپ جہاں آرا بیگم کی قبر کا پاکیزہ کتبہ سنئے۔ جہاں آرا بیگم شاہ جہاں کی بیٹی اور اپنے صوفی مشرب بھائی دارا کی چہیتی بہن تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس کتبے میں تصوّف کا رنگ جھلکتا ہے ؎

سبزے کے سوا کوئی ہمارے مزار پر غلاف نہیں چڑھاتا
گورِ غریباں کی چادر کے لئے یہ گھاس ہی کافی ہے۔

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزارِ مرا
کہ قبر پوشِ غریباں ہمیں گیاہ بس است

یہ بات غور کے قابل ہے کہ اس قسم کے نفیس کتبے تقریباً سب کے سب بادشاہوں یا شاہی خاندان کی شخصیتوں کے متعلّق ہیں۔ عوام کی قبروں کے کتبے اس نفاست سے محروم ہیں۔ خود مرزا غالب کے مزار کا کتبہ جو میر مہدی مجروح کا لکھا ہوا ہے خاصا بے کیف ہے ؎

کل میں غم واندوہ میں با خاطرِ محزوں
تھا تربتِ اُستاد پہ بیٹھا ہوا غم ناک

دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا۔ گنجِ معانی ہے تہِ خاک

لاہور میں میاں محمد شاہ دین ہمایوں کے سنگِ تربت پر علّامہ اقبال کے لکھے ہوئے دو شعر ثبت ہیں۔ ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں نکل سکی ؎

در گلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج
آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گُل رمید

می جُست عندلیبِ خوش آہنگ سالِ فوت
"علّامۂ فصیح" ز ہر چار سُو شنید

ایک مرتبہ دلّی میں قدم شریف کے قبرستان سے لوٹتے ہوئے میں عام لوگوں اور غریبوں کی قبروں کو سرسری نظر سے دیکھتا چلا آرہا تھا کہ ایک کھلے میدان میں مجھے ایک ٹوٹی پھوٹی قبر دکھائی دی۔ اس پر ایک اینٹ لگی تھی اور اس اینٹ پر یہ الفاظ کسی کُند ہتھیار سے کھرچے ہوئے تھے:۔

والدۂ عبد الماجد
فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھاتے جاؤ۔

اس سیدھی سادھی عبارت میں بھی املا کی غلطیاں تھیں۔ میں ان غلطیوں پر مسکراتا ہوا آگے نکل چکا تھا جب مجھے خیال آیا: "اس شخص کا اعتماد ضرور داد کے قابل ہے جس نے لوگوں کے التفات پر صرف اس لئے اپنا حق سمجھا ہے کہ یہاں اُس کی ماں دفن ہے"۔ اس کے ساتھ ہی اس کتبے کی سادہ بلاغت بیٹے کی محبت کے غرور میں مجھے مخاطب کرکے یکایک بول اُٹھی "تم فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے بغیر کس طرح گزر سکتے ؛ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ میری ماں کی قبر ہے؟" اسے اُس کتبے کی سادگی کی تاثیر کہئے یا میری اپنی طبیعت کا اُبال کہ میں نے فوراً پلٹ کر اس کتبے کے حکم کی تعمیل کی۔

اب اس مختصر مضمون کو میں اُردو کے ایک دلآویز کتبے پر ختم کرتا ہوں۔ لاہور میں ایک ننّھی سی قبر پر یہ دو ننّھے سے شعر لکھے ہیں ؎

اندھیری رات کے ننّھے مسافر!
بتا، کس عرش کا تارا ہے اب تُو؟

تجھے ہم جانِ جاں کہتے تھے اب تک
مگر کچھ اس سے بھی پیارا ہے اب تُو

(ریڈیائی "رسالے" آہنگ میں نشر کیا گیا)

حمید احمد خاں

غزل

یوں مل کہ پھر فسونِ دوئی کارگر نہ ہو
اِس طرح دل میں آ کہ کسی کو خبر نہ ہو

ہاں لطفِ پردہ داریٔ اُلفت جبھی تو ہے
ہم پر بھی فاش حالِ دلِ یک دگر نہ ہو

کہتے ہیں موت چارۂ دردِ فراق ہے
کیا ہو، جو اِس علاج کا بھی کچھ اثر نہ ہو

صد حیف طائرانِ قفس تھک کے ہار کے
اُڑتے ہیں خواب میں کہ غمِ بال و پر نہ ہو

اک مختصر سا دن ہے ہماری یہ زندگی
اور موت ہے وُہ رات کہ جس کی سحر نہ ہو

حُسنِ زمیں کو کھائے نظر آسمان کی!
اَور اِس کے مہر و مہ کو کسی کی نظر نہ ہو؟

اِس مختصر سی فرصتِ ہستی میں اے خدا!
افسوس ہے کہ کارِ جہاں مختصر نہ ہو

حیراں ہے دل کشاکشِ ایمان و کفر میں
کچھ سُوجھتا نہیں ہے کِدھر ہو کِدھر نہ ہو

ہوں رہبروں کے جَور کا وُہ صیدِ نامراد
دھوکا ہے راہزن پہ، کوئی راہبر نہ ہو

زندانیٔ وجُود ہوں کیا فائدہ اگر
حامد یہ قیدِ گنبد و دیوار و در نہ ہو؟

حامد علی خاں

ایک قبر کا کتبہ

مسافر! ٹھہر، ڈال جا اِک نظر
اِدھر، میری محبوبہ کی قبر پر

مری غم نصیبی پہ رو جا ذرا
جو تو دردِ الفت سے ہے بہرہ ور

اگر عشق سے دل ہے خالی ترا
کبھی تُو نے اُلفت نہیں کی اگر

تو افسوس! افسوس اے بدنصیب
بھر آ، خود میں روؤں ترے حال پر

آئی۔ اے۔ ولیمز

(ترجمہ از حامد علی خاں)

ایک جاپانی نظم

جب میں
اپنے شفاف آئینے کے سامنے
رُک جاتا ہوں اور
اُس عکس کو دیکھتا ہوں
جو اُس کی گہرائیوں میں نظر آتا ہے
تو مجھے کسی ناواقف بوڑھے آدمی سے
ملنے کا احساس ہوتا ہے۔

(تادایُن)

مترجمہ میرزا طالب شیرازی

کلرک

بابو اور کلرک میں وہی فرق ہے جو جنس اور نوع میں یا اصل اور فرع میں۔ یعنی ہر کلرک بابو کہلا سکتا ہے لیکن ہر بابو صرف کلرک ہی نہیں ہوتا کیونکہ بابو میں آخر ریل کے وہ بابو لوگ بھی تو شامل ہیں جو محض دوسروں کو جھنڈیاں ہی دکھاتے دکھاتے اپنی زندگی کا سفر پورا کر لیتے ہیں۔ جب سے ہماری تہذیب نے چولا بدلا ہے، نئے نئے روپ کی اشیاء نظر آنے لگی ہیں۔ اِس آشوب زمانہ کے صدقے جس طرح مسند و فرش تلے سے فراش کھینچ کر لے گئے اور اُن کی جگہ چسٹر فیلڈ صوفوں نے گھیر لی اسی طرح دفتروں اور نظامتوں سے پرانے بستے اُٹھے اور نئے ڈیسک اور تپائیاں آن بچھیں، یعنی اگلے منشی متصدی رخصت ہوئے اور کلرک آجمے۔ چنانچہ کلرک خالصتہً دورِ جدید کی تخلیق ہے۔

کلرکوں سے شاید دو تہائی دفتر ہستی عبارت ہے اور سچ پوچھئے تو آج دُنیا کی تمام حکومتوں اور سلطنتوں کی باگ ڈور ہزارہا گمنام و ناتواں کلرک تھامے ہوئے ہیں۔ اِس جنس کے بارِ احسان سے نہ آمرین بچے ہیں نہ حاکمین۔ کانجی ہاؤس سے لے کر بین الاقوامی لیگ تک کوئی ادارہ انسانی، نیم انسانی یا غیر انسانی البیانہ ملے گا جہاں کلرک کا وجود با جود نہ ہو۔ یہ ہر مرض کی دوا اور ہر دُکھ کا مداوا ہے اور یہی وہ عجوبہ ہے جو انار نہ ہونے کے باوجود صدہا بیمار افسروں کے کام آتا ہے اور آخر کار بس کام ہی آجاتا ہے۔ اگر کسی روز کسی کرشمہ سے دُنیا کے تمام دفاتر کی چھتیں ایک لمحہ کے لئے اُتار کر رکھ دی جائیں اور ساتھ ہی ہر حاضر الوقت کلرک کی کھوپری میں ریڈیم کی ایک ایک میخ بھی ٹھونک دی جائے اور پھر مرّیخ سے اِس کرۂ ارضی کی جانب بذریعۂ دوربین دیکھا جائے تو مجھے یقین ہے کہ یہ ہماری زمین ہمارا آسمان نظر آئے اور وہ دن تاروں بھری رات سے مشابہ نکلے!

ہر چند کلرک اک معمولی حیوانِ ناطق ہوتا ہے لیکن اپنی چند در چند خصائص کی بنا پر اُس نے بہت جلد اپنی انفرادیت بزمِ انسانی میں قائم کر لی ہے یہ انسان ہوتے ہوئے بھی کچھ عام انسانوں سے جُدا سا نظر آتا ہے تا آنکہ اب اہلِ نظر ہزاروں کے مجمع میں ایک کلرک کو دُور سے پہچان لیتے ہیں۔ اس کی داستان یوں ہے کہ ایک طفل تو خیر جب سن کودکی سے گذر کر سنِ بلوغ کو پہنچتا ہے اور درس و تدریس کے مدارجِ متداولہ طے کرتا ہے تو بس وہیں سے اُس کے قدرتی رنگ روپ کا اُڑنا اور گرد فلاکت کا جمنا، دماغ کا خشک ہونا اور پتے کا پانی ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جدید طریقِ تعلیم اور تعلیمی ادارے بھی اِس ہیئت کذائی کے پیدا کرنے میں بڑے ممد ثابت ہوئے ہیں۔ زندوں کی زبان سے کبھی کبھی کے گڑے مُردوں کے من گھڑت افسانے سُنتے سُنتے بیچارے کا حال بے حال ہو جاتا ہے۔ کالے کوسوں پرے کے ندی نالوں کے نام اور شہروں کے "حدود اربعے" ذہن نشین کرتے کرتے خود اپنا "حدود اربعہ" بھول جاتا ہے اور ارسطو و افلاطون کے افکار میں اُلجھ کر اپنے ہی افکارِ حیات سے بے نیاز ہو بیٹھتا ہے جوں جوں وہ اس نام نہاد تعلیم سے آراستہ ہونے کی سعی کرتا ہے اس کا حلیہ بگڑتا اور اس کا ڈمچر نکلتا آتا ہے۔ آخر الامر یہ چکر اُسے شدید احساسِ کمتری اور احساسِ بے ہنری کے زیرِ اثر تیلی کا بیل بنا کر چھوڑتا ہے جسے بصورت پرکار گردش ہی مقدر نظر آنے لگتی ہے۔ اُس وقت اِس کی صورت سوال اَز نکہت چاکری' اس کا واحد جواب نظر آتا ہے۔ وہ زبانِ حال سے مغرور ڈیوڑھیوں اور معزز آستانوں پر پکار پکار کر کہتا پھرتا ہے کہ ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ مگر کوئی نہیں دیکھتا۔ عبرت حاصل کرنا تو در کنار گویا یہاں پہنچ کر حالات بھی بشارت دینے لگتے ہیں کہ عالمِ امکان میں مستقبل کا کلرک آرہا ہے!

اب ایک بڑے صاحب (ہر چھوٹے سے چھوٹا افسر بڑا صاحب کہلاتا ہے) کا دفتر ہماری نظر میں ہے جس کے دروازے اور دریچے بلحاظ ساخت ہی ہمہ تن چشمِ انتظار بنے ہیں، جس کی دیواریں اپنی کوری کوری اینٹوں اور بجھے ہوئے چونے کی ریخوں کے [illegible] کے ساتھ ایک نو وارد کا خیر مقدم کر رہی ہیں۔ یہ نو وارد وہی غنچۂ نو دمیدہ ہے جس کے انقباض کے بعد انبساط و انحطاط کے ہر دو مدارج نیرنگئ روزگار یک دم طے کرانا چاہتی ہے اور جواب فضائے نفسی نفسی سے گھبرا کر ع

لایا ہے دل کے داغ دکھانے کے واسطے کہ شاید کوئی نقادِ سوزِ دل ہی مل جائے!

دفتر کے چپراسیوں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں، دفتر کے مستقل و منہمک کلرک اپنے اپنے سنہری روپہلی چشموں کے نظرفریب پردے آنکھوں پر سے ہٹا ہٹا کر آنے والے کا جائزہ لے رہے ہیں، گویا پُرانے اسیرانِ قفس ایک نو گرفتار کے پر و بازو دیکھ رہے ہیں۔ وہ سب اپنے اپنے قلم ڈیسکوں پر دھر کر تھکی ہوئی انگلیوں کو آرام دینے کے لئے یا واقعی وفورِ جذبات سے ہاتھ مل رہے ہیں۔ جیسے سب کے عضلات میں سرد مہریٔ زمانہ نے آج پہلی بار دل شکن ارتعاش پیدا کیا ہے! با ایں ہمہ جہاں تک نو وارد کا تعلق ہے اس کی چال اب سے کچھ دیر پہلے تک مرغِ بسمل کی تڑپ تھی لیکن اب وہ ایک فاتحانہ تفاخر کے ساتھ اپنے "پروانۂ تعیناتی" کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے کہ دیکھوں دونوں طرف اِس ورق کے تصویریں ہیں یا یہ محض سامنے کی چیز ہے؟ کون بتائے، اس نے کیا دیکھا اور کیا سمجھا؟

نو وارد میں ایک عظیم الشان تبدیلی نظر آنے لگی ہے۔ بظاہر مراد آباد میں کوئی مُردہ زندہ ہو گیا ہے لیکن لے وائے کسی کو کیا خبر کہ اُس کو قوتِ لایموت کی فراغت مستعار دے کر اس کا عطرِ زندگی کھینچ لینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں گویا اب وہ دفتر دفتر نہیں ہے۔ قنوج ہے قنوج اُس گُلِ نورس کے لئے۔ اِس غریب کو کیا معلوم کہ وُہ اب دیکھتے ہی دیکھتے اِنسان سے کلرک بنایا جا رہا ہے کلرک! اور یہ کون بتائے کہ اسے کرسی پر نہیں بٹھایا جا رہا ہے بلکہ اُسے ایک پیکرِ حساس سے ایک مشینی پُرزے کی صورت میں ڈھال کر ایک محدود جگہ کے اندر پھنسایا اور فِٹ کیا جا رہا ہے جہاں دھنسے پھنسے وہ مخصوص و مقررہ نوع کی حرکت ضرور کرتا رہے گا لیکن اُس کھانچے سے باہر نہیں نکل پائے گا یہاں گھِس گھِسا کر وہیں ختم ہو جانے کی آزادی اُسے ہمہ وقت حاصل رہے گی!

تو یہ ہے شاندار آغاز اُس کلرک کا، اب انجام تک بھی نظر ڈالا چاہئے تاکہ دیکھیں کیا گذر رہے ہے کیا ہونے تک!

کلرک کا مسکن اُس عظیم الشان سیڑھی کے، آخری سے پہلے ڈنڈے پر ہوتا ہے جو اوپر نائب شاہ سے شروع ہو کر نیچے کی طرف ستر ہزار مدارج طے کرتی ہوئی چپراسی پر آکر ختم ہوتی ہے۔ اِس سیڑھی پر اوپر والے کچھ اس قرینہ سے اچھوائے بیٹھتے ہیں کہ سارا زور نیچے کی طرف کو رہے۔ یعنی ایک عریض و بسیط کوہِ گراں کا بار ایک چوہے کی کمر پر لٹکا ہوتا ہے، مگر واہ رے سخت جانی، اس بے جان کا دم نکلنے میں بعض اوقات پوری ایک چوتھائی صدی لگ جاتی ہے اور وہ جینے کے دھوکے میں مُدتوں سسکتا ہے! با ایں ہمہ لطف یہ ہے کہ جب کبھی کبھی کشتی کا رندے کلہاڑیاں اور رندے لئے اِس سیڑھی کو ٹھونک بجا کر دیکھنے آ نکلتے ہیں تو باوجود سب سے نیچے کی طرف ہونے کے سب سے زیادہ اُچھال اور جھٹکے بالعموم اسی ڈنڈے پر محسوس ہوتے ہیں جس پر اس کلرک کی رہائش ہوتی ہے چنانچہ اکثر اس کا مسکن شاخِ آشیاں کی طرح شبانہ روز لرزتا رہتا ہے اور جب یہ باعثِ ناتوانی وہ سنبھل نہیں پاتا تو مُنہ کے بل گر پڑتا ہے اور مزید لُطف یہ کہ اِس اُکھاڑ پچھاڑ، اِس پیمائش و مساحت کے اصطلاحی نقشے بہت پہلے سے اسی کمبخت کے ہاتھوں تیار کرائے جاتے ہیں، گویا اپنے قتل نامے پر سب سے پہلے دستخط اسے ہی کرنا ہوتے ہیں اور اس کی رگِ گلو پر نشان اِسی کے ہاتھوں سے لگوایا جاتا ہے!

کلرک کی یہ ناقدری و بے نصیبی اُسے بے ادب بنا کر چھوڑتی ہے۔ اُس کی ہر ادا میں ایک قسم کی روسی خشونت اور فراز یت سی پائی جاتی ہے وہ خدا وندانِ تہذیب و ادب کے سامنے ایک دہریے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ زمانہ اُس کے عبوسی ماحول کا خالق ہو کر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو وہ بھی زمانہ وابنائے زمانہ کے سب لگے بندھے ریت راستے کاٹتا ہُوا چلتا ہے۔ مثلاً لباس ہی پہنے گا تو ایسی بے دردی سے کہ کپڑا تک رو دے، یعنی شیروانی زیبِ تن کرے گا تو اس کے بٹن بھاڑ سے کھول دے گا، کوٹ پہنے گا تو اُسے کُتے کے کفن کی طرح لٹکائے لٹکائے پھرے گا، پاجامہ فرمائے گا تو اُس کے پائینچے سمت نما کے سے اشارے دیتے ہوئے چلیں گے، یا دھوتی باندھے گا تو اُسے گھڑ کی دا کی پگڑی بنا کر چھوڑے گا، یا پھر ڈبل زین کے پتلون پہنے بیچ سڑک پر ڈبل مارچ کرتا ہُوا سویرے ہی سویرے بھلے آدمیوں میں سے بلا تکلف گزر جائے گا۔ ڈھٹائی اِس قدر بڑھ جائے گی کہ اسٹیشنوں پر اور کچہری عدالتوں کے

احاطوں میں پہنچ کر بے دھڑک پتنے چاٹے گا اور شیرِ روباہ صفت کی طرح نرا سونٹھ کا پانی پی پی کر ڈکارتا ہوا نکل جائے گا اور باہر آ کر سب سے پہلے میونسپل بائی لاز کی خلاف ورزی کرے گا اور اپنی طرف کے شہروں میں یہ جو رات گئے دودھ کے خالی آبخورے پھوٹنے کی تڑاخ پڑاخ آوازیں سنائی دیتی ہیں ان کی ارتعاشی لہروں کی تخلیق میں ریڈیو والوں کا نہیں بلکہ بڑے بڑے دفتروں کے کلرکوں کا ہاتھ ہی تو ہوتا ہے!!

یہ ذہنی انقلاب جو کلرک پر طاری ہوتا ہے اس کے خصائل پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ اس کے ہر انداز میں ایک قسم کی تلخ طنز اور اس کی ہر ادا میں ایک قلندرانہ شان آجاتی ہے۔ پھر وہ ہر اہلِ معاملہ کی طرف ایک انتقامی جذبے کے ساتھ بڑھتا ہے اور چونکہ "مثلہ" کے دفینہ پر سانپ کی طرح چڑھا بیٹھا رہتا ہے اس لئے ہر آئے گئے کو ڈسنے کی فکر میں بھی رہتا ہے۔ چنانچہ کلرک کے کاٹے کا منتر نہیں۔ وہ اپنا ضابطۂ اخلاق جُدا مرتب کرتا ہے اور اپنی دُنیا الگ بساتا ہے۔ اس کی خاموشی خطرناک اور اس کے قہقہے زہر خند ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں پر عینک چڑھا لیتا ہے، دل پر پتھر دھر لیتا اور مُنہ میں گھنگنیاں بھر کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر اپنے دماغ کو اپنا واحد شریکِ کار بنا کر تمام دُنیا والوں سے سُلگنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی لئے اس کی تحریر پُرپیچ و پُرمعنی اور اس کی تقریر سادہ اور بے معنی سی ہوا کرتی ہے۔ اچھے کلرک کی علامت یہی ہے کہ وہ تحریر کا زور دار ہو یعنی یہ کہ صُغری دکبری کی بجائے وہ پورا زور نتیجہ پر دے۔ کلرک پا!! کھاتا ہے پیک نہیں تھوکتا، بات سنتا ہے اور پی جاتا ہے، اشارہ کہیں اور کا دیتا ہے اور وار کہیں اور کرتا ہے۔ غرض کو اکبِ آسمانی کی طرح وہ ہوتا کچھ ہے اور نظر کچھ آتا ہے اور بہرصورت کچھ اپنی عادت کے ماتحت کچھ آئینِ ملازمت کے زیرِ اثر غضب کا بھیترا، میٹھا اور گھاگ ہو جاتا ہے۔

کلرک کو سیاست دیاست سے مس نہیں ہوتا۔ وہ اس معاملہ میں کورا لبرل ہوتا ہے یعنی جس کا کھائے اُس کا گائے۔ وہ ہر اہلِ اقتدار کا ساتھی ہے مگر وہ کسی کا بھی آشنا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے افسر کے ساتھ دورہ پر بھی ننھی 'الف' کی طرح منسلک رہتا ہے، جیسے فرعون کی حضوری میں کاہن رہتے تھے، مگر بایں فرق کہ وہ افسر کو جملہ حالاتِ گردوپیش سے باخبر بھی رکھتا ہے اور بے خبر بھی، اور آنے والے معاملات کی اطلاع دیتا بھی ہے اور روکتا بھی ہے۔ وہ افسر سے آگے آگے اپنی چھاؤنی چھاتا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ دامِ ہمرنگ زمیں بھی بچھاتا جاتا ہے جس میں اس کے خاصے کے لئے موٹی موٹی چڑیاں پھنستی ہیں، وہ قحط زدہ علاقوں تک میں پہنچ کر محض تسموں کے لئے بھینسیں کٹوانے پر آمادہ رہتا ہے۔ جو کچھ اس سے بن نہیں پڑتا وہ افسر کے زبان و قلم سے کرا دیتا ہے۔ وہ اپنی جیبیں اور افسر کے کان بھرتا رہتا ہے۔ جس سے افسر کی کنپٹیاں موٹی ہو جاتی ہیں، تو خود اسے بینامی کھاتے کھولنے پڑ جاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ حاکم اسے نالائق بنائے وہ خود حاکم کو نالائق بنا کر چھوڑتا ہے اور اسے اپنی نالائقی کا یقین تک دلا دیتا ہے اور پھر اُسی حاکم سے خود اپنی لیاقت کی سند تحریری حاصل کر لیتا ہے! وہ اس معاملے میں گُربہ کشتن روزِ اوّل کا قائل ہوتا ہے۔ اس کی سیاست اگر کوئی ہے تو سیاستِ درباں کہی جا سکتی ہے جس سے نہ صرف بندگانِ خواجہ بلکہ خود خواجہ تک لرزتا ہے۔ وہ جس صحبت میں بیٹھتا ہے اپنے افسروں کی بُرائی اپنے ہاتھ پیر بچا کر کرتا ہے۔ اور اگر تعریف کرتا ہے تو اس طریق پر کہ سامعین اس کو بھی خراجِ تحسین دئے بغیر نہ رہ سکیں اور آخر میں ہر افسر جو رخصت ہوتا ہے اسے وہ سپاس نامۂ غم پیش کرتا ہے اور اسی صحبت میں اُس کے جانشین کو تہنیت و تبریک پیش کرنے میں بھی سبقت کرنے والا وہی ہوتا ہے۔ غیر ملکی سیاست میں اسے قطعاً درک نہیں، البتہ برطانیہ و جاپان کی صلح کا خواہشمند رہتا ہے کیونکہ جاپان نے اس کی ناداری کی بڑی پردہ پوشی کی ہے!

تھانے میں پہنچ کر یہی کلرک کلارک کہلانے لگتا ہے۔ تھانے کا کلارک کلرکوں میں بڑا سلوتری اور سیانا سمجھا جاتا ہے۔ وہ تھانہ دار صاحب کے خفیہ روزنامچے سے واقف ہوتا ہے۔ وہ اُن کی دُکھتی رگیں جانتا ہے اور اسی لئے اسے

ہی صحیح علم رہتا ہے کہ کب نشتر زنی کرے اور کب تھانہ دار صاحب کے زخموں پر پھاہے رکھے۔ وہ دفعہ ۱۹۳ کا ماہر ۳۰۲ کا حافظ بات بے بات رپٹ لکھنے کا مشتاق اس کا قلم اس درجہ رٹھوان اور رواں کہ خدا کی پناہ وہ چاہے تو اپنی نوکِ قلم سے انسان کو بے دھڑک پھانسی کے تختے پر لٹکوا دے اور چاہے تو چند لفظوں کے ہیر پھیر سے سنگین سے سنگین مقدمات حرفِ غلط کی طرح ختم کرا دے۔ یہ نفیر قانون ایک روشن چوکی، پر ایک ڈنبک کی آڑ لئے تھانہ کے صدر دروازہ کے سامنے بیٹھا رہتا ہے اور ہر آئندہ و روندہ کی صلاحیت درج کرتا رہتا ہے اس کا ہر کام للٰہی طریق پر ہوتا ہے یعنی جو دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔

کلرک گھٹے تو محرر چنگی ہو جائے اور بڑھے تو ہیڈ کلرک بن جائے ہیڈ کلرک اک کہنہ مشق پختہ کار اور مکمل کلرک کا نام ہے اور عام کلرکوں میں اس کا درجہ ایسا ہی ہے جیسے سنپولیوں میں کالے کا۔ اس کے ہاتھ میں بین بادشا ہزادی کے قصہ کی طرح تمام دفتر کی جان ہوتی ہے۔ وہ بولتا کم ہے سنتا زیادہ ہے، وہ دیکھتا نہیں نوٹ کیا کرتا ہے۔ اگر اس کی راہ میں آئینہ رکھ دیا جائے تو اس کی نیچی نگاہ میں ہزاروں فتنے نکلیں۔ وہ اہلِ دفتر کا کاتبِ تقدیر ہوتا ہے اور اکیلا کرامٌ کاتبین سے زیادہ کام کر لیتا ہے کیونکہ محکمہ جزا و سزا بھی اسی کے مشورہ کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کا سینہ رازوں کا مدفن ہوتا ہے جس میں دفتر کے سب خرد و کلاں کے اعمال نامے بند رہتے ہیں (وہ اعمال نامے جن کے دمِ تحریر کوئی اور آدمی نہیں ہوتا) اس کا دماغ عمرو عیار کی زنبیل جس میں سرخ اور نیلی پنسلیں، آلپین، چاقو، "ضروری" اور "اشد ضروری" کی پرچیاں اور صدہا کاغذات کے پلندے ہمہ وقت بھرے رہتے ہیں۔ اس سے نپٹنے کے لئے توفیقِ الٰہی کا شاملِ حال ہونا ضروری ہے وہ مشتِ بعد از جنگ پر اعتمادِ کامل رکھتا ہے اور ہمیشہ کلۂ حریف ہی کو ٹھیک نشانہ بناتا ہے۔

شاعر کی طرح ہیڈ کلرک بھی جس قدر بوڑھا ہو گا اس کی کلرکی جوان ہوتی جائے گی۔ وہ جتنا پرانا ہو گا اتنا ہی خرانٹ اور گرگِ باراں دیدہ ہو گا۔ سنا ہے کہ کسی پی ڈبلیو۔ ڈی کے دفتر میں سڑک کوٹنے کا آہنی رولر خریدا گیا، اس کی خریداری اور تحویل وغیرہ کے کاغذات مکمل تھے اس کے استعمال، حمل و نقل کی مثل بھی پوری تھی۔ دو برس کے بعد معلوم ہوا کہ عفریت پیکر رولر کہیں چوری چلا گیا۔ اس کی گمشدگی کی اطلاعات پولیس اور صدر دفتر سب جگہ پہنچیں تفتیش مکمل ہوئی اور مجبوراً سراغ نہ ملنے پر مثل داخل دفتر کر دی گئی۔ ایک روز گھر والی نے ہیڈ کلرک صاحب سے یونہی پوچھ لیا:-

"اے ہے وہ نامراد رولر ملا بھی جس کا اتنا فضیحتا ہو رہا ہے؟" ہیڈ کلرک صاحب نشانے ہلا کر استفہامیہ انداز میں بولے "اور خریدا کس مسخرے نے تھا؟"

اسٹیونز کے قول کے مطابق شادی اور موت سے کسی کو مفر نہیں۔ کلرک کی زندگی کے بھی دو لازمی پہلو شادی اور موت ہوتے ہیں۔ شادی اس کے گھر والے کر دیتے ہیں، موت کا سامان دفتر میں ہو جاتا ہے بلکہ اوّل الذکر کو آخر الذکر کی دلیلِ قطعی سمجھنا چاہیئے۔ اور اس درمیانی وقفے میں کہ اس کی روح پرواز کرے قضا و قدر کو چند مُٹی ارواح کے نازل کرنے کا بہانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ کلرک کی نیمۂ بہتر اپنے احساسِ برتری اور اس کے احساسِ کمتری کو قائم رکھنے میں چندے کامیاب رہتی ہے لیکن اس کے دفتری کثیف پلندے اس لطافتِ حیات کا خون کر دیتے ہیں چنانچہ کلرک کی جوانی اور بڑھاپے میں محض آمد و آورد کا سا فرق رہتا ہے۔ بچوں کا دخل در معقولات اور خود اس کے مصروف و غیر منضبط اوقات، یعنی اس کی صبح خیزی اور دیر واپسی جو ہمیشہ دیر آید درست آید کی سخت تضحیک و تکذیب سی بنی رہتی ہے، اور دیگر مختلف اسباب مل کر توازنِ طاقت کو توڑ دیتے ہیں اور بسا اوقات کلرک کے گھر میں سیاسی تعطل کی صورت قائم رہتی ہے۔ عوارض و مصارف، فرض قرض، محبت و ملازمت سب کے درمیان ایک کشاکش شروع ہوتی ہے اور انجامِ کار کسی ایک فریق کو وادیٔ فنا کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ بالعموم یہی سخت جان ہوتا ہے جو مانجھا لے جاتا ہے تاکہ بقیۂ عمر معصوم بچوں کو پیپیاں بجا بجا کر بہلاتا پھرے اور جلسوں اور عید گاہوں میں پہنچ پہنچ کر دیگر آسودگانِ ہستی کے

سکون و حضورِ قلب کا مضحکہ اُڑ وائے! تعلیم و تربیت کا تو سامان ہی کیا ہوتا ہے اور تعلیم، وہ بھی موجودہ تعلیم؟ اُف اس کا دل اُٹھتے بیٹھتے پکار پکار کر کہتا ہے کہ ع

من نکردم شما حذر بکنید!

کلرک کی زندگی کے بہترین دن تالاب کے مینڈک کی طرح دفتر کی چار دیواری میں بسر ہوتے ہیں، اسی لئے جب وہ بے چارہ باہر کی دُنیا میں آتا ہے تو غضب کا معصوم انجان، مظلوم و مسکین سا نظر آتا ہے۔ نظر کیا آتا ہے اس کی حالت ہوتی ہی ایسی ہے۔ ملک میں کچھ ہی ہوا کرے اس کی بلا سے۔ سماج میں نہ اس کی کوئی جگہ نہ اس کی کوئی آواز۔ اس کا وجود بیرونِ دفتر نہ کسی شمار میں نہ قطار میں۔ وہ تو جب داخلِ دفتر ہوتا ہے تو صبح ہوتی ہے اور جب وہاں سے نکلتا ہے تو شام، بلکہ شاید یوں کہئے کہ اس کے دفتر جانے کے لئے سویرا ہوتا ہے اور اس کے گھر لوٹنے کے لئے اندھیرا!

آخر گردشِ لیل و نہار کلرک کی پچپنویں سالگرہ کی شام بھی لے آتی ہے جب یہ امن پسند سپاہی، جسے نہ زندگی میں کوئی خراجِ تحسین دیتا ہے اور نہ مرنے پر فہرست مجروحین و مقتولین میں نام آنے کی نوبت آتی ہے، تھک کر اپنے ہتھیار ہاتھ سے دھر دیتا ہے اور جب دن ڈگڈگیوں رہ جاتا ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ ایک ضعیف جس کے سر پر طبا شبیرِ سحر بکھری ہوئی ہے، جس کی آنکھیں مغلس کے چراغ کی طرح بجھی بجھی سی نظر آتی ہیں، اُسی بڑے صاحب کے دفتر کی عمارت سے لڑکھڑاتا ڈگمگاتا ہوا نکل رہا ہے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں ایک کاغذ ہے، دوسرا ہاتھ رعشہ براندام اُس ہار سے کھیل رہا ہے جو اس کے گلے میں کسی ستم ظریف نے ہنگام رخصت ڈال دیا ہے۔ وہ ہار کے پھولوں کی تازگی پر تبسم کی سعیٔ نامشکور کرتا ایسا سنجیدہ چلا آرہا ہے جیسے کوئی غم نصیب کسی چہیتے کی میّت کو کاندھا دیتا چلے۔ کیا خبر یہ اس کے رنگین خوابوں اور خوں گشتہ تمناؤں اور خاک شدہ آرزوؤں ہی کا جنازہ ہو جسے وہ خود تن تنہا لئے جا رہا ہو!

سامنے سڑک پر کالج کے طلبہ کے مشاعرے کا پوسٹر لگا ہوا ہے جسے وہ بوڑھا کھڑے ہو کر پڑھنے لگتا ہے ع

بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ہوئی

اور ... ... ، دفعتہً ہارن کی کریہہ آواز، بریکوں کی دلدوز چیخ اُسے چونکا دیتی ہے، ایک کار سائیں سے گزر جاتی ہے، بوڑھا سہم کر قریب کے کھمبے سے بے تابانہ چمٹ جاتا ہے اور رفتارِ زمانہ سے گھبرایا ہوا سا پوسٹر کے آخری بول پڑھنے کے لئے مُڑ مُڑ کر دیکھنا چاہتا ہے!

اگلے روز صبح کو اخباروں میں اشتہار نکلتا ہے :-

"ضرورت ہے ایک نوجوان گریجویٹ کی ایک کلرک کی اسامی کے لئے، جگہ مستقل، مشاہرہ معقول"

فضل احمد صدیقی

دانش و ہنر کی بزمِ مشورت

مُغنّی:۔

جب یہاں کچھ بھی نہ تھا، اُس وقت بھی موجود تھی
روحِ موسیقی جیسے انجیل کہتی ہے کلام[1]

شہپرِ جبریلؑ کی پرواز میں نغمہ ہے بند
لوگ سمجھے ہی نہیں، اب تک مغنّی کا مقام

وُہ صدائیں آج بھی دیباچۂ اخلاق ہیں
جن سے نکلا "اشرقَ البدرُ علینا"[2] کا پیام

دستِ ماضی میں ہے سازِ ابتدا و انتہا
کاش مُڑ کر دیکھ سکتے رہ روانِ تیز گام

دِل میں جذب و سوز کا طوفان ہونا چاہیے
ساز کی گت پر بھی ہو سکتی ہیں تیغیں بے نیام

[3]"نے" کو سُن کر "پیرِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت"
بُو علی بیٹھا ہُوا سوچا کیا، علمِ کلام

جو نہ آئے وجد میں دولاب[4] کی آواز پر
ایسے کافر دل پہ ہے واللہ موسیقی حرام

صورِ اسرافیل میں ہے زندگی بھی موت بھی
سازِ ہستی کے ہیں دو پردے "تمام و نا تمام"

مُصوّر:۔

پیکرِ آدم بنایا کس نے آب و خاک سے
میں یہ کہتا ہوں کہ قدرت خود ہے پہلا بُت تراش

"احسنِ تقویم"[5] کے سانچے میں ڈھل کر آدمی
بن گیا قدسی صفت، شبنم فشان و برق پاش

"پھول کانٹے، بلبل و طاؤس و قمری، زاغ و چرغ
یہ جہاں ہے خوب اور ناخوب تصویروں کا ناش

ڈال سکتی ہے مری صنعت گری ہر شے میں جاں
شمع کا اشکِ چکیدہ ہو کہ پروانے کی لاش

دم بخود ہیں سب مرے موئے قلم کے سامنے
خوشۂ انگور ہو یا سیبِ ایرانی کی قاش

یہ جہاں، نقّاشِ فطرت کا ہے وُہ نقشِ عجیب
راز تھا جس کو گیا ذوقِ خود آرائی نے فاش

حسن کی رنگینیوں سے سلب کر سکتا ہے رُوح
میری نازک انگلیوں کا اِک ذرا سا ارتعاش

میں کہ نقّاشِ ازل کا رازدارِ خاص ہوں
میرے رُتبے کو سمجھ سکتا کوئی دُنیا میں کاش

فلسفی:۔

میں نے غور و فکر سے کھولے ہیں وُہ عقدے تمام
منحصر ہے جن پہ یہ دُنیائے اسباب و علل

اُس جگہ ہے توسنِ تخئیل میرا گرم رو
جس جگہ تقدیر کے بازو بھی ہو جاتے ہیں شل

مجھ سے پوچھو کس طرح پیدا ہوئی ہے کائنات
بزمِ ہستی "جنبشِ اوّل"[6] کا ہے ردِّ عمل

---

[1] مُقدس انجیل کی مشہور آیت:۔ [2] جب حضرت پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم مکّہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے تو مدینہ میں داخل ہوتے وقت آپ کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا، مدینہ کی معصوم کمسن لڑکیاں ترانہ گا رہی تھیں۔
اشرق البدرُ علینا۔ من ثنیاتِ الوداع:۔ وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند نکلا ہے۔
[3] مثنوی مولانا روم کا پہلا شعر بشنو از "نے" چوں حکایت می کند۔ از جدائی ہا شکایت می کند [4] کسانیکہ ایزد پرستی کُنند۔ بر آوازِ دُولاب مستی کُنند۔
[5] لقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم (قرآن پاک) [6] First motion

ایک نامعلوم قوت کی ہیں بزم آرائیاں
مہر و مہ کے آشیانے یہ ستاروں کے محل
آدمی کا تجربہ خود ہے فریبِ وہم و ہوش
کون کہہ سکتا ہے ہر قانونِ فطرت کو اٹل
عقلِ اوّل، علت و معلول، جوہر اور عرض
چند لفظوں سے کیا ہیں نے مسائل کو بے حل
کس قدر محکم ہے میری قوتِ نقد و نظر
زندگی تو زندگی ہے، کانپ جاتی ہے اجل

فلسفی ہی صرف بن سکتا ہے دُنیا کا امام
ہے یہی منشاء ابد کا اور تقدیرِ ازل

شاعر:

میرا اِک اک شعر ہے، نغمہ گر و نغمہ نواز
میں اگر چاہوں تو بج سکتے نہیں چنگ و رباب
وہ مُصوّر جس کی دُنیا پھول، پتوں کے نقوش
وہ سمجھ سکتا نہیں بے تابیٔ رُوحِ گلاب
فلسفی اسباب کی ہے بحث میں اُلجھا ہُوا
اُس کے ذہن و فکر کی منزل ہے دیوانے کا خواب
سینۂ گیتی کی دھڑکن مجھ کو دیتی ہے پیام
رُوحِ مُستقبل کی لرزش مجھ سے کرتی ہے خطاب
نبضِ ہستی پر ہیں میری انگلیاں رکھی ہوئی
گرمیٔ دل سے مری قائم ہے دُنیا کا شباب
مجھ کو کرتے ہیں اشارے شعر کہنے کے لئے
ڈوبنے والے ستارے، ٹوٹنے والے حباب
کیا کہوں، کس سے کہوں، کیونکر کہوں اے ہم نشیں!
میری چشمِ شوق نے دیکھا ہے کس کو بے نقاب!

سچ کہا ہے "شاعری جزویست از پیغمبری"
میری فطرت پر ہوئی نازل محبت کی کتاب

[فضا میں پُر جلال لرزش پیدا ہوتی ہے]

صوتِ سرمدی:

کیا یہاں آئے ہو تم زور آزمائی کے لئے
خود فروشی، خود فریبی، خودستائی کے لئے
شعر، نغمہ، فلسفہ اور صنعتِ صُورت گری
صرف ہوتے ہیں جہاں میں خودنمائی کے لئے
اِس جہاں کے اہلِ دانش اور اربابِ ہُنر
جھوٹ کا پربت بنا دیتے ہیں رائی کے لئے
دانشِ علم و ہنر کی سعیٔ پیہم کا مآل
یا بڑائی کے لئے ہے یا کمائی کے لئے
صرف تقویٰ ہے ترازو عظمتِ کردار کی
ہے یہی معیار انساں کی بڑائی کے لئے
آپ اپنے "آرٹ" کو تکلیفِ آرائش نہ دیں
ہم بہت کافی ہیں اِس اپنی خدائی کے لئے

آدمی بارِ خدائی کو اُٹھا سکتے نہیں
بُلبلے، ساکن سفینے کو چلا سکتے نہیں

آواز سُننے کے بعد:

[مُغنّی، مُصوّر، فلسفی اور شاعر بے اختیار سجدے میں گر جاتے ہیں]

ہوش سے جاتے رہے، چلتی زبانیں رُک گئیں
آرٹ کی نازک جبینیں بہرِ سجدہ جُھک گئیں

ماہر القادری

اصغر کی یاد میں

تقریباً دو مہینے ہوئے اصغر کی امّی نے کہا بہتر ہے کہ اصغر کی نظموں کا مجموعہ ہی چھاپ دیا جائے۔ اِدھر میں پونے دو سال سے اِس بات کا خواہش مند رہا کہ اصغر کی سوانح عمری لکھوں لیکن اُن وجوہ سے جن کا بار بار ذکر کرنا بہت تکلیف دہ ہے ایسا نہ کر سکا۔ میں نے کہا یہ تو معمولی بات ہے، پندرہ سولہ انگریزی کی نظمیں ہیں، ان پر دو تین صفحے تو دیباچے کے طور پر دو ایک دن میں ہی لکھ لوں گا اور یہ شائع کر دی جائیں گی، آخر صرف عزیزوں اور چند دوستوں کے حلقے میں ان کی اشاعت ہوگی اور بس! اصغر کی کتابوں میں سے ایک کتاب Poems of Wilfred Owen میرے پاس تھی، میں نے اٹھا کر اُس کا پہلا صفحہ پڑھا تو خیال آیا کہ قلم برداشتہ کچھ لکھنے سے پہلے ذرا پھر اصغر کے کاغذات پر ایک نظر تو دوڑا لوں، وہ حالات جن میں یہ نظمیں لکھی گئیں انہیں پھر دیکھ لوں اور یاد کر لوں!

اِس یاد نے دامن پکڑ لیا۔ میں نے دو چار ورق اُلٹے دو چار کاپیاں دیکھیں دو چار چیزوں پر نگاہ ڈالی لیکن ایک چیز دوسری چیز کی طرف لے گئی، ایک چیز دوسری سے زیادہ اہم اور کم از کم اپنی جگہ انوکھی نظر آئی۔ اور پھر میرے لئے ایک ایک ذرا ذرا سی چیز انتہا درجہ دلچسپ دلسوز اور بے پناہ ثابت ہوئی۔

اِس جانکاہ مشغلے کا تعجب ہے کہ ایک پہلو نہایت حیات بخش نکلا۔ میں نے اصغر کی تمام چیزوں کتابوں کاپیوں کاغذات اور خطوط وغیرہ کو لیا، اُس کی تمام تصنیفات اور مکتوبات کو گہری نظر سے دیکھا۔ اِن کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے میں نے ایک چھوٹی سی کاپی میں اُس کی مختصر زندگی کا ایک نقشۂ واقعات بنانا شروع کیا اور سنہ وار ان واقعات کو قلم بند کیا۔ بالخصوص اُس کی انگلستان کی زندگی کو میں نے اُس کے خطوط کے ذریعے سے اور اُس کے تین چار مہینے کے روزناموں کی مدد سے گویا اِس طرح مرتب کر لیا کہ وہ مجھے چلتا پھرتا نظر آنے لگا۔ پونے دو سال کی خاموشی کے بعد وہ گویا پھر بولنے تقریر کرنے بحث کرنے مسکرانے اور ہنسنے کھیلنے لگا۔ اُس کی موت نے میری آنکھوں کے سامنے زندگی کا لباس پہن لیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوا گویا ہم نے خود ہی اُس کی کتاب حیات کو تہ کر کے رکھ دیا تھا، اب جو اسے کھولا تو وہ کھلتی گئی اُس کے صفحے صفحے پر جیتی جاگتی تصویریں گویا بولنے اور مسکرانے لگیں، موت نے اُس کی زندگی کو ختم کیا نہ کیا ہم نے اُسے ختم شدہ سمجھ کر بالکل مُردہ کر دیا۔ اب جو اُسے بلایا تو وہ بولی اُسے ہلایا تو وہ ہلی، اُس میں اتنی جان پڑ گئی کہ کئی جانداروں میں اُس سے آدھی بھی نہیں ہوتی۔ سچ ہے جو ایک بار جیتے یا جی اُٹھے اُسے موت بھی مُردہ نہیں کر سکتی، اُس کی زندگی فنا بھی ہو جائے تو فنا نہیں ہو سکتی، وہ زندہ ہے ہمیشہ زندہ، وہ خود رُکتا ہے تو دوسرے کو حرکت میں لے آتا ہے، وہ وقت کے گزرے ہوئے لمحے کی مانند ہے جس کے بل پر گزرنے والے اور آنے والے لمحات کا انحصار ہے، کل سے آج پیدا ہوا اور آج سے پھر کل پیدا ہوگا، "تھا" "نہ ہوتا" تو "ہے" ہیچ تھا اور "ہوگا" فضول! یہی حال مرنے والوں کا ہے اور پھر بعض بعض مرنے والے تو ایسے ہو گزرے ہیں کہ ایک زمانہ گزرنے پر بھی لاکھوں زندہ لوگوں سے ہزار گنا بڑھ چڑھ کر زندہ و تابندہ ہیں!

کم از کم ہمارے لئے یعنی اُن سب کے لئے جو اصغر کو جانتے تھے جو اِسے اچھی طرح سمجھتے تھے وہ مر نہیں سکتا، وہ آیا جیا اور چلا گیا لیکن "وہ جی گیا بہت کچھ تھوڑی سی زندگی میں"! اگر ہم اُس کے ساتھ انصاف کریں انسان کے ساتھ زندگی کے ساتھ قانونِ قدرت کے ساتھ انصاف کریں تو باوجود ہزار رنج و غم کے باوجود اُس ٹھیس کے اُس چبھن کے اُن غمگین تیروں کی بارش کے جو ایک محبت کرنے والے دل کو ہمیشہ اپنا نشانہ بناتے ہیں باوجود ان ہزار آفتوں کے ناممکن ہے کہ اگر ہم دیانت داری اور حقیقت بینی سے کام لیں تو ہمیں ایک ایسی دلکش ہستی کے مرنے پیچھے بھی اُس کی یاد سے دلی خوشی محسوس نہ ہو۔ کیا کوئی سچا دل محسوس کر سکتا ہے اِس گناہ گارانہ بات کا اظہار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اگر اُسے اتنا جلد مرنا تھا تو بہتر تھا کہ وہ پیدا ہی نہ ہوتا؟ ہرگز نہیں، بعض رسیلے پھول جلد مرجھانے کے لئے ہوتے ہیں بعض پیاری کلیاں کھلنے سے بہت پہلے ہی کمھلا جاتی ہیں اور کیوں نہ کمھلائیں؟ اِس دُنیا کی ہوا اُن کی بہار کو برداشت نہیں کر سکتی، آنکھیں دیر تک اُن کے وجود کی تاب نہیں لا سکتیں پھر کیا ضرور ہے کہ دُنیا والوں کی آنکھیں ہی چندھیا جائیں کائنات خود لپک کر اُس انوکھے وجود کو جلد اپنے پہلو میں چھپا لیتی ہے۔ اصغر ایک ایسا جلد چھپنے والا استارہ تھا۔ ستارہ چھپ گیا لیکن جن آنکھوں نے اُسے دیکھا اُن میں ابھی روشنی باقی ہے!

بشیر احمد

محفلِ ادب

اُردو ادب پر طوائفوں کا اثر

گزشتہ دَور کے حالات، اور واقعات تو تاریخ سے بخوبی معلوم ہو جاتے ہیں لیکن وہ واقعات کیوں رونما ہوئے، اور وہ کون سی باتیں تھیں جو پس پردہ اُن واقعات کی ذمہ دار تھیں، اُس کے لئے تاریخ کے صفحات کافی نہیں ہوتے۔ اور ہمیں اُس دور کے تمدّن اور معاشرت کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ہمارے لئے اُس زمانہ کے ادب کا گہرا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور اگر ایک دَور کا ادب بغور دیکھا جائے تو اس زمانے کے لوگوں کے احساسات اور خیالات، اُن کی رسوم اور عقیدے اُن کے ذہنی اور جذباتی رُجحانات، سب کا عکس اور تصویر صاف اور نمایاں نظر آتی ہے۔ کیونکہ ادب کے لئے ناممکن ہے کہ وہ زندگی سے متاثر نہ ہو۔ کسی شاعر، ادیب کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وُہ اپنے ماحول سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ اس لئے یہ سمجھنے کے لئے کہ اُردو ادب پر طوائفوں نے کیا اثر ڈالا، ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ ہماری معاشرت میں طوائفوں کی کیا جگہ تھی۔

قدرت نے جہاں عورت کو جسمانی اعتبار سے مرد سے کمزور بنایا ہے، وہاں اُسے حیات کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک فوقیت بھی دی ہے۔ وہ اپنے جسم ہی کو ذریعۂ معاش بنا سکتی ہے، اور جہدِ زیست کی بازی میں اِسے داؤں پر لگا سکتی ہے۔ عورت کا اوّلیں پیشہ یہی تھا اور آج بھی جب کہ عورت مرد کے بہت کچھ ہمدوش آگئی ہے اُس کے لئے زیست کی مشکلوں کو آسان بنانے کا اس سے بہتر دوسرا طریقہ نہیں۔ مختلف ملکوں میں اس جسم فروشی کے طریقے مختلف ہیں، اور مختلف مذہبوں نے مختلف رسموں کے حسین لباس پہنا کر اور شادی کا پاک اور مقدس نام دے کر اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر ملک میں آج بھی بہ کثرت ایسی عورتیں ہیں جو بغیر کوئی حسین نقاب پہنے ہوئے بالاعلان اپنا اوّلیں پیشہ کر رہی ہیں۔ اکثر ملکوں کے جھوٹے اور مصنوعی تمدّن نے انہیں معاشرت کا جزو اقبال کرنے سے گریز کیا ہے لیکن ہندوستان کے جس دَور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت کی معاشرت میں اُن کی ایک اہم اور مستقل جگہ تھی۔

اُنیسویں صدی میں شمالی ہندوستان کے اُس حصّہ میں جہاں اُردو رائج تھی مسلمانوں کا راج تھا۔ دہلی میں شاہانِ مُغلیہ تھے اور لکھنؤ میں شاہانِ اودھ۔ سیاسی اقتدار یا فوجی طاقت دونوں میں سے کسی کو نصیب نہ تھی۔ کیونکہ دونوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے باجگذار اور نمک خوار تھے۔ ایسی صورت میں جبکہ شاہی خزانے بھرے ہوئے تھے اور لوگوں کے پاس باپ داداؤں کی چھوڑی ہوئی دولت کافی تھی شہزادوں رئیسوں اور امیروں کا عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کے سوائے دوسرا کام نہ تھا۔ روز نئے سامانِ نشاط اور تفریح کی ضرورت ہوتی تھی ایسی صورت میں اربابِ نشاط کی خاص قدر ہونا لازمی تھا۔ لیکن جس وجہ سے کہ وہ ہماری معاشرت پر چھائی ہوئی تھیں اس کی بنا محض امرا کی عیاش مزاجی نہ تھی بلکہ پردہ کی رسم۔

پردہ ہندو اور مسلمان دونوں میں نہایت سختی سے رائج تھا۔ کسی رئیس شریف زادے کو اپنی ماں اور حقیقی بہن کو چھوڑ کر کسی اور عورت کو جو کہ خادمہ یا نیچ قوم نہ ہو دیکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ شادی حالانکہ صغیر سنی میں ہو جاتی تھی لیکن اس میں اُس کی پسند کا کوئی سوال نہ تھا، کیونکہ شادی کے بعد ہی بیوی کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی تھی۔ شادی دراصل دو خاندانوں کے خوشگوار تعلقات کو مستحکم اور استوار بنانے کے لئے کی جاتی تھی نہ کہ دو دلوں کا تقاضا پورا کرنے کے لئے۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کرنے والے افراد کی طبیعت، سِن، اخلاق یا رجحانات کا کوئی خیال نہ کیا جاتا تھا۔ اکثر خاوند اور بیوی کی عمر میں کافی فرق ہوتا تھا۔ شادی کے بعد بھی بیوی سے اختلاط برتنے کی اجازت نہ تھی، بڑوں کے سامنے خاوند کی مجال نہ تھی کہ بیوی سے ہنس کر بول سکے۔ بیوی کی قدم قدم پر نندیں بھاوجیں پاسبانی کرتی تھیں۔ اور اگر اُس نے اشارۃً یا کنایتہً خاوند سے ملنے کا شوق ظاہر کیا تو وہ بے حیا قرار دی جاتی تھی۔ گویا ہماری معاشرت میں خاوند بیوی کا کسی کے سامنے ایک دوسرے سے کسی قسم کا اظہارِ محبت کرنا بُرا اور مذموم سمجھا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں نہ تو جوان لڑکا جس کے دل میں ہزاروں ارمان ہوتے تھے محبت کا کوئی مناسب تقاضا کر سکتا تھا اور نہ ایک رسم کی پابند اور سہمی ہوئی کم عمر نادان لڑکی اُس کا کوئی مناسب جواب دے سکتی تھی۔

لیکن انسانی فطرت کو نہ رسم تبدیل کر سکتی ہے اور نہ مذہب قید کر سکتا ہے۔ بھوک اور پیاس کو چھوڑ کر عشق انسان کی فطرت کا سب سے زبردست تقاضا ہے کسی تندرست نوجوان کو محض ایک روحانی ہم آہنگی کا حسین خواب دکھا کر تسکین نہیں دی جا سکتی۔ ہماری سماج کا خلافِ فطرت دباؤ صرف یہاں تک کامیاب ہوا کہ اُس نے عشق ومحبت کے جنسی لوازم کو گھروں سے نکال دیا اُس نے بازاروں میں نشو ونما پائی۔ بیویوں نے رفتہ رفتہ اِن باتوں کو جن سے جنسی خواہشات مشتعل ہوتی ہیں ترک کر دیا انہوں نے کوشش کی کہ وہ دیویاں بن جائیں، وُہ فخر سے اپنے بارے میں کہنے لگیں۔

عشق کا حال بیسوا جانیں
ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا ہمارے اکثر نوجوان شریف زادوں کے دل پر پہلی بجلی ایک طوائف سے آنکھیں چار کرنے کے بعد گری۔ اُن کے جنسی شعور نے ایک طوائف کی آغوش میں آنکھیں کھولیں۔ بیوی محض خاندان چلانے کا ذریعہ رہ گئی، لیکن اُن کی جذباتی دُنیا کی مالک طوائف بن گئی۔

عشق و محبت کا جو تعلق شاعری اور ادب سے ہے وُہ ظاہر ہے خصوصاً ایسے دَور میں جبکہ شاعری صرف نشاط اور تفریح کا ذریعہ تھی۔ وہی طوائف جو ہماری معاشرت میں ہمارے عشقیہ جذبات کی تنہا مالک بن چکی تھی ہمارے ادب کی بھی معشوق بن گئی۔ اگر آپ غور سے ادب کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے فسانوں، مثنویوں اور غزلوں کے معشوق میں طوائف کا کردار اور اُس کے خدوخال بہ خوبی نمایاں ہیں معشوق کا ہرجائی پن اور بے وفائی، رقیبوں کا ہجوم، کبھی ظلم و ستم کبھی لگاوٹ کی باتیں، شوخی اور طراری، ناز و غمزے یہ ہو بہو ایک طوائف کی تصویر آنکھ کے سامنے لے آتے ہیں، اکثر شاعر اور ادیب جو کچھ کہتے یا لکھتے تھے اس میں اسی معاشرت کا خاکا نظر آتا ہے۔ آج کل کے پڑھنے والے اُن کے کلام پر اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ مبتذل، رکیک اور مخربِ اخلاق ہے لیکن وہ اپنی نظر کافی دُور تک نہیں لے جاتے کیونکہ یہ قصور شاعروں اور ادیبوں کا نہیں ہے بلکہ اس دَور کی معاشرت کا ہے جس کے وہ [illegible] تھے۔

طوائفوں کے ساتھ عشق و محبت کے جذبات وابستہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ادب پر ایک اثر اور بھی پڑا طوائف ظاہر ہے کہ ایک پیشہ ور عورت ہوتی ہے اُس سے پاک محبت کی اُمید کرنا حماقت ہے ایسی حالت میں محبت پر ہوس پرستی کا غالب آجانا لازمی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہمارے ادب میں جس محبت کا ذکر ہے اُس پر جنسی ترغیب و جسمانیت پرچھائی ہوئی ہے محبت کی وہ رفعتیں جہاں دو دل ایک ذہنی اور جذباتی آویزش کی وجہ سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اس کے نغمے ہمارے ادب میں سنائی نہیں دیتے۔ ہماری عشقیہ شاعری زیادہ تر معاملہ بندی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ اس زمانے کی ساری کائنات عشقیہ شاعری ہی ہے لہذا ہمارے ادب میں ایسے شاہکار نہیں ملتے جن کو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔

طوائفیں معاشرت کا یہ راز بھی بخوبی سمجھ گئی تھیں کہ کسی مرد کے دل پر ایک مدت تک قابو رکھنے کے لئے محض اس کی جنسی آسودگی ہی کافی نہیں بلکہ اس میں تہذیب، خوش سلیقگی، شیریں زبانی، حُسن کی آرائش اور نشست و برخاست کے جملہ آداب کو کافی دخل رہتا ہے، لہذا اُن کی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ مردوں کے لئے محض سامانِ عشق ہی نہ ہوں بلکہ ایک حد تک ان کے واسطے نشاط اور تفریح کا سامان بھی مہیا کریں اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے انہیں اپنی تعلیم و تربیت کا بھی کافی خیال رکھنا پڑتا تھا۔

مرزا محمد ہادی صاحب رسوا کی معرکتہ الآرا کتاب "امراؤ جان ادا" میں جو کہ طوائف کی سچی سوانح عمری کہی جاتی ہے، ان تمام باتوں کا ذکر ہے جو ایک طوائف کو سیکھنا پڑتی تھیں۔ رقص اور موسیقی میں تو وہ اتنی ماہر ہوتی تھیں کہ اس فن کو اُنہوں نے بالکل اپنا ہی لیا تھا۔ شعر و سخن سے بھی ذوق ہونا لازمی تھا۔ بعض طوائفیں اُس زمانے کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔ پوشاک میں بھی تراش خراش یہی نکالتی تھیں، اور اپنے وقت کے فیشن کی موجد ہوتی تھیں۔ خاص خاص طوائفوں تک تو ایسے ویسے آدمی کی رسائی آسان نہ تھی۔
جس طرح کہ برطانوی اُمراء کے لڑکے اپنی تعلیم پر جلا دینے کے لئے یورپ کی سیاحی کے لئے بھیجے جاتے تھے اُسی طرح ہمارے رئیس زادے آدابِ محفل سیکھنے کے لئے کسی مشہور طوائف کے سپرد کئے جاتے تھے۔ گویا ایک طوائف کا مکان تہذیب کا ادارہ تھا خاندانی طوائفوں کی زبان ادبی اعتبار سے مستند سمجھی جاتی تھی رئیسوں کے لئے جہاں شانِ ریاست برقرار رکھنے کے لئے گھوڑے گاڑی مصاحب وغیرہ ضروری تھے وہاں کسی نہ کسی طوائف سے وابستگی بھی لازمی تھی۔ اس معاشرت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادب میں تصنع اور تکلف حد سے زیادہ دخیل ہو گیا جس سے ادب بھی ایک طوائف بن کر رہ گیا۔ وہی ظاہری حُسن، وہی آرائش اور نمائش، وہی حسین لباس، لیکن فطری جذبات کی وہی کمی۔ ہمارے اشعار کے الفاظ حسین، جملے چست اور بندشیں دلکش لیکن مصنوعی جذبات کے حامل اور بے روح۔

طوائفوں نے ہمارے چند مخصوص اصنافِ سخن کو رائج اور مقبول بنانے میں بھی بہت بڑا حصہ لیا۔ گزشتہ زمانے میں نہ تو اتنے تعلیم یافتہ لوگ تھے اور نہ اتنے اخبار اور رسالے نہ مائیکروفون اور نہ ریڈیو، شعرا کی شہرت کا دار و مدار صرف مشاعروں کی کامیابی پر یا کسی مشہور خوش گلو طوائف کا ان کی غزل کسی صاحبِ ذوق شہزادہ یا رئیس کی محفل میں گا دینے پر تھا۔ شاعر اپنی معراجِ شہرت اور حاصلِ زندگی یہی سمجھتا تھا کہ اس کی شہزادوں کے دربار تک رسائی ہو جائے تاکہ عمر بھر روٹیوں کا سہارا ہو جائے۔ نسیم لکھنوی کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ شاہ اودھ کے دربار میں ایک طوائف اُن کی غزل جس کا مطلع ہے ؎

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دُنیا عاقبت بخشائے گی

گا رہی تھی بادشاہ سُن کر بہت محظوظ ہوئے اور پوچھا کہ یہ نسیم کون ہیں اور اس طرح نسیم کا دربارِ اودھ میں پہلے پہل غائبانہ تعارف ہوا ایسی صورت میں وہ اصنافِ سخن جن کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا زیادہ رائج اور مقبول ہو گئیں غزل کا اور اصنافِ سخن سے مقبولیت میں اس قدر زیادہ بڑھ جانے کا بڑی حد تک راز یہی ہے کہ وہ گانے کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھی اسی طرح شاہانِ اودھ کے زمانہ میں مرثیوں کے فروغ پانے میں طوائفوں کی سوز خوانی کا بھی ایک حد تک اثر تھا۔

گو اس کی اصل وجہ شاہانِ اودھ اور اُن کے درباریوں کا امامیہ مذہب تھا، لیکن وُہ خاص صنفِ سخن جو اس معاشرت سے ظہور پذیر ہوئی ریختی ہے۔ ریختی دراصل ایک طوائف کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتی ہے اور غالباً ایک طوائف اور تماش بین کے تعلقات ہی اس صنفِ سخن کے ایجاد کے محرک ہوئے۔ اکثر مصوروں نے تصویروں کے ذریعہ سے رنگ اور رنگینیوں کے روپ اور بہاؤ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دَورِ گزشتہ کے اُردو ادب کے روپ اور بہاؤ کو جب ہم تشکیل دینا چاہتے ہیں تو ہماری نظر کے سامنے ایک نیم برہنہ حسین رقاصہ کی تصویر آتی ہے جو خوبصورت پوشاک اور زیور سے لدی ہوئی ہے اور گت پر ناچ رہی ہے جس کے گرد تماش بینوں کا ہجوم ہے جس کی زبان پر معشوقانہ عشقیہ بول ہیں جن کو باری باری سے ہر تماش بین کو وہ بھاؤ کے ساتھ بتا رہی ہے جس کی نظریں ہر ایک کے لئے ایک پیام ہے جو اُن کی آتشِ ہوس کو بھڑکا رہا ہے۔ لیکن جس کے ہونٹوں پر ایک خفیف طنز آمیز تبسم ہے۔ کیونکہ اُس کا دل سرد ہو چکا ہے اور اُس میں کسی فطری جذبہ کی چنگاری کے مشتعل ہونے کی صلاحیت نہیں۔

(پنڈت آنند نرائن ملّا ۔ لکھنؤ ریڈیو)

قدر زمانہ

مطبوعات

فنِ شاعری: پروفیسر عزیز احمد بی اے۔ آنرز (لندن) استادِ انگریزی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے اس نام سے ارسطو کی کتاب "بوطیقا" (Poetics) کا ترجمہ کیا ہے اور انجمن ترقی اُردو ہند دہلی نے اسے شائع کیا ہے۔ ارسطو کی یہ کتاب ادبی تنقید پر دُنیا کی غالباً پہلی کتاب ہے یہ کتاب بلاشبہ دُنیا بھر کے ادبی اور تنقیدی نظریوں پر اثر انداز ہوئی ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے نقادوں نے اس کتاب کی خوشہ چینی کی ہے۔ یورپ میں ادبی تنقید بہت ترقی کر چکی ہے لیکن آج بھی یہ کتاب ہر نقاد کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ پیشِ نظر ترجمہ بہت صاف سلیس اور بامحاورہ ہے۔ ابتدائی تینتیس صفحات عزیز احمد صاحب نے تمہید کے لئے وقف کئے ہیں جو بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ قیمت ۱۲/ انجمن ترقی اُردو دہلی سے طلب کیجئے۔

تاریخ بہمنی (منظوم): یہ کتاب ابوالفتح ضیاء الدین محمد المعروف بہ سید امجد حسین بن سید اشرف الحسینی کی فارسی تاریخ کا منظوم اُردو ترجمہ کیا۔ مصنف نے پہلے پہل یہ ترجمہ نواب سالار جنگ کے عہدِ وزارت میں نواب خورشید جاہ کی سرپرستی میں شائع کیا تھا اب یہ دلچسپ تاریخی نظم انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی نے شائع کی ہے۔ قیمت ۱۰/

انشائے داغ: حضرتِ احسن مارہروی (مرحوم) نے اپنے اُستاد حضرتِ داغ دہلوی کے خطوط کا یہ مجموعہ اپنی زندگی میں مرتب کیا تھا لیکن افسوس کہ انہیں خود اس کی اشاعت کا موقع نہ مل سکا۔ اب یہ کام انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی نے کیا ہے۔ ابتدا میں حضرتِ احسن کا فاضلانہ دیباچہ ہے اس کے بعد ۱۶۲ صفحات حضرتِ داغ کے خطوط کے لئے وقف ہیں۔ یہ خطوط نہ صرف اس لحاظ سے پڑھنے کے قابل ہیں کہ ان کا لکھنے والا اُردو کا ایک بہت بڑا شاعر ہے اور ان سے اُس کی زندگی اور سیرت کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی قابلِ مطالعہ ہیں کہ یہ تحریریں گوناگوں ادبی و لسانی معلومات کا مخزن بھی ہیں۔ خطوط کی ترتیب سے حضرتِ احسن مرحوم کا سلیقہ اور تجربہ نمایاں ہے اس کے علاوہ اکثر خطوط کے ساتھ حضرتِ احسن کے تشریحی حواشی نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں۔ قیمت ۱۲/

دیوانِ جوشش: جوشش عظیم آباد کے مایۂ ناز شاعروں میں سے ہیں۔ افسوس کہ اب تک اُن کا کلام چھپ نہ سکا تھا اب قاضی عبدالودود صاحب نے اُن کا دیوان ۱۱۶ صفحے کے ایک مفصل دیباچے کے ساتھ مرتب کیا ہے اور انجمنِ ترقی اُردو (ہند) دہلی نے اسے شائع کیا ہے۔ دیباچے کے علاوہ تقریباً پونے تین سو صفحات دیوان کے لئے وقف ہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

کوئی اس غم کدے میں اپنی غم خواری نہیں کرتا	دیا ہے ایک کو دل وہ بھی دلداری نہیں کرتا
تجلّی تیری یا رب برقِ عقل و ہوش ہے لیکن	مجھے تو روشناسِ شعلۂ ادراک کر دینا

قیمت ۱۲/ پتا انجمن ترقی اُردو دہلی

علم الاقوام: یہ کتاب سیرن عمر رالف ایبرن قیلیس نے انجمن ترقی اُردو کی فرمائش پر لکھی تھی اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ علم الاقوام پر اس سے پہلے اُردو یا کسی اور ہندوستانی زبان میں کوئی کتاب موجود نہیں۔ نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ اپنی جامعیت اور کثرتِ معلومات کے لحاظ سے بھی زیرِ نظر کتاب بہت قابلِ قدر ہے۔ دوسری جلد میں ایک خاص حصہ ہندوستانی اقوام کے لئے وقف ہے۔ قیمت جلد اول ۱۲/ جلد دوم ۱۲/ پتا:۔ انجمنِ ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

ہماری غذا: مصنفہ ڈاکٹر رابرٹ میکریسن سی۔ آئی۔ ای، ایم ڈی، ڈی۔ ایس سی، ایل ایل ڈی، آئی سی۔ ایس وغیرہ مترجمہ سید مبارز الدین احمد صاحب رفعت بہ نظرِ ثانی ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب منشی فاضل ایم بی۔ بی ایس رکنِ دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی۔ یہ کتاب ہر اُس شخص کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے جو صحت کی قدر و قیمت سے واقف ہو اُردو میں علمِ غذا پر ایسی جامع اور فاضلانہ کتاب شائع کر کے انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی نے اہلِ ملک کی بہت مفید خدمت انجام دی ہے۔ قیمت ۱۲/

ہماری قومی زبان: اُردو زبان کے متعلق ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے خیالات کا یہ مجموعہ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی نے شائع کیا ہے۔ تعصب کے اس دور میں جب اہلِ ملک کا ایک حصہ مشترک زبان کو چھوڑ کر ایک فرسودہ زبان کو اختیار کرنے پر زور دے رہا ہے سر تیج بہادر کے یہ خیالات اُن کی اصابتِ رائے اور بلند خیالی کی دلیل ہیں۔ امید ہے کہ ہر وہ شخص جو اُردو زبان کے صحیح درجے سے واقف ہونا ضروری سمجھتا ہے اور جو زبان کے متعلق موجودہ متعصبانہ اور گمراہ کن خیالات سے اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے اس کتاب کا مطالعہ اپنا فرض سمجھے گا۔ قیمت ۸/

حیوانی دُنیا کے عجائبات: مولفہ پروفیسر عبدالبصیر خاں صاحب شعبۂ حیوانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اس کتاب میں ہوا پانی اور جنگل کے جانوروں کے متعلق بے حد دلچسپ معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اندازِ بیان اور زبان صاف اور سلیس ہے۔ بچوں اور بوڑھوں کے لئے یکساں مفید اور دلچسپ ہے۔ حجم ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ۱۲/ پتا:۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔
صرف سرورق تاف ٹون پریس رام نگر لاہور میں چھپا

نمبر ۵

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ مئی ۱۹۴۲ء

ضروری اطلاع: جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھا ہوا جوابی کارڈ۔ اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے ورنہ بصورت دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔

چندہ سالانہ للعہ۔ ششماہی سے (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸ر

جہاں نما

مادام چیانگ کائی شیک اور ہندوستانی خواتین

۸ مارچ ۱۹۴۲ء کو چنگ کنگ میں عورتوں کا بین الاقوامی دن منایا گیا۔ اس موقع پر مادام چیانگ کائی شیک نے جو پیغام بھیجا اُس میں انہوں نے ہندوستانی عورتوں کا خاص طور پر ذکر کیا اور چینی عورتوں کو یقین دلایا کہ ہندوستانی عورتوں میں قوتِ عمل کی کمی نہیں اور اُن کی قوتِ برداشت قابلِ تعریف ہے۔

ہندوستان کے قیام کے دنوں میں مادام چیانگ کائی شیک نے "آل انڈیا ومنز ایسوسی ایشن" کے اجلاس میں شرکت کی تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے چینی عورتوں کو بتایا کہ جب میں نے چینی عورتوں کے مصائب کا ذکر کیا تو بہت سی ہندوستانی عورتیں آبدیدہ ہو گئیں

اسی سلسلے میں مادام چیانگ کائی شیک نے ہندوستان کی بعض سربرآوردہ عورتوں کا ذکر کیا اور کہا :-

میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ میں مسز سروجنی نائیڈو، مسز وجیا لکشمی پنڈت اور بیگم شاہنواز سے ملی۔ ان میں سے ہر خاتون قابلِ تعریف اوصاف سے متصف اور بجائے خود نمایاں شخصیت کی مالک ہے۔ مسز نائیڈو ایک بہت بڑی کانگرسی رہنما ہیں۔ میں زندگی کے مسائل کے متعلق اُن کی گہری واقفیت سے بہت متاثر ہوئی۔ مسز پنڈت "آل انڈیا ومنز ایسوسی ایشن" کی صدر اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی بہن ہیں۔ وہ ایک قابل، حسین اور ذی وقار خاتون ہیں۔ اُن میں وہ تمام نسوانی اوصاف موجود ہیں جن کی قدر کی جاتی ہے۔ بیگم شاہنواز ایک بڑی لیڈر ہیں اور جب میں اُن سے مصروفِ گفتگو تھی تو مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک خاتون جنرل سے باتیں کر رہی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ پنجاب کی عورتوں کی خدمات پنجاب کے مردوں سے کسی طرح کم نہیں۔ ان چند عورتوں کے متعلق جو کچھ میں نے کہا ہے اُس سے آپ کو جدید ہندوستان کی عورتوں کی عمومیت کی قابلیت، ذہانت اور سیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستانی خواتین جفاکش اور مستقل مزاج ہیں اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اگر انہیں موقع ملے تو وہ آزادی کی جد و جہد میں بہت مفید حصہ لے سکتی ہیں۔

ہوائی سفر کا مستقبل

مسٹر لیزلی رنسیمین ڈائرکٹر جنرل برطانی محکمۂ پرواز نے جو تھائی لینڈ سے بھاگ کر لندن پہنچے ہیں یہ اندازہ کیا ہے کہ مستقبلِ قریب میں ہوائی سفر کے وسائل کی ترقی برطانیہ سے دنیا کے اہم مقامات کے فاصلوں کو بہت گھٹا دے گی۔

مسٹر رنسیمین کا خیال ہے کہ آئندہ برطانیہ سے ہندوستان، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کا سفر علی الترتیب بیس، تیس اور پچاس گھنٹوں میں طے ہو سکے گا۔

برطانیہ سے ہندوستان کے راستے آسٹریلیا پہنچنے کے لئے ہوائی جہازوں کو قاہرہ، کراچی، کلکتہ، سنگاپور، ڈارون اور سڈنی کے مقامات پر ٹھہرنا ہوگا لیکن کسی جگہ دو گھنٹے سے زیادہ رُکنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

گاؤ اور صحت مند بن جاؤ

انسان کی بعض خِلقی خصوصیات اُس کی زندگی اور صحت کے قیام کے لئے عام لوگوں کے اندازے سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ بہت

سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو گانے کو ایک بیکار تفریح سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ کوئی تفریح بجائے خود بیکار نہیں ہے بلکہ اکثر تفریحات انسانی صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہیں۔ اس سلسلے میں گانا نہایت مفید قسم کی تفریح ہے۔ صبح کے وقت گانا صحت کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دن کے باقی حصّوں میں بھی جب وقت ملے گانا فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ بہت لوگوں کو یہ تو معلوم ہوگا کہ گہری سانس لینے کی ورزش بہترین ورزشوں میں سے ہے مگر یہ علم بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ اس ورزش کا بہترین طریقہ گانا ہے۔ صحت حاصل کرنے کے لئے جب گایا جائے تو یہ ضروری ہے کہ پورے جذبے کے ساتھ گایا جائے۔ گانا دل میں زندگی کا ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔

بعض ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اکثر جسمانی اور روحانی بیماریوں کا سبب غلط طریقۂ تنفس ہے۔ اگر یہ درست ہے تو گانا صحت کے لئے بے حد مفید ہے کیونکہ یہ انسان کو صحیح طریق تنفس سکھاتا ہے۔

جو لوگ گا سکتے ہیں وہ اُن لوگوں کے طرزِ عمل پر بہت حیران ہوتے ہیں جو اپنی اس قدرتی استعداد کو بڑھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب ہم اپنی دوسری صلاحیتوں کی ترقی چاہتے ہیں تو آخر آواز کی اصلاح کیوں نہ کی جائے۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص اعلیٰ درجے کا گویا نہیں بن سکتا لیکن تاہم آواز کی جتنی بھی تربیت ہو سکے اس کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ گانے کا مشغلہ نہ صرف بہت اچھی تفریح ہے بلکہ ایک مفیدِ صحت ورزش بھی ہے۔

دیہاتی کتب خانے

ہندوستانی ریاستوں کی پسماندگی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ جب کسی ریاست میں ترقی کے کچھ آثار نظر آتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ کوچین کے وزیر اصلاحِ دیہات نے حال ہی میں اعلان کیا ہے کہ ریاست کی حکومت دیہاتی کتب خانوں کے رواج کی خاص طور پر سرپرستی کرے گی۔

جبری ابتدائی تعلیم کے بہت سے حامی اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ دیہاتی لڑکوں کو مدرسے سے نکلنے کے بعد پڑھنے کے لئے کوئی کتاب نہیں ملتی۔ اور وہ بہت کم عرصے میں سب پڑھا لکھا بھول جاتے ہیں۔ جب نتیجہ یہ ہو تو پھر اس جبری تعلیم کو تضیعِ وقت اور قومی تضیعِ دولت کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی تعلیم جس کے اثرات مدرسہ چھوڑنے کے بعد مفقود ہو جائیں بیکار ہے۔ حامیانِ اصلاحِ دیہات کو جبری تعلیم کے ساتھ اس بات کا انتظام بھی کرنا چاہئے کہ فارغ التحصیل دیہاتی طلبہ بعد میں بھی تعلیمی ماحول میں رہ سکیں اور یوں نہ صرف اُن کی پڑھنے کی استعداد قائم رہے بلکہ ترقی کرے اور اُن کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا رہے تاکہ تعلیم کا اصل مقصد پورا ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ابتدائی تعلیم کے مراکز کے ساتھ آسان اور عام پسند کتابوں اخباروں اور رسالوں کی مفت بہم رسانی کا انتظام بھی ہونا چاہئے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دیہات میں عوام کے لئے کتب خانے اور مطالعہ خانے قائم کر دیئے جائیں۔

کوچین کے وزیر نے اپنی حکومت کے جس فیصلے کا اعلان کیا ہے وہ بہت قابلِ تعریف ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ کوچین کی دیہاتی رعایا حکومت کے اس فیصلے کی قدر و قیمت کو سمجھتی ہے اور پورے تعاون پر آمادہ ہے۔ کاش برطانی ہندوستان اور دوسری ہندوستانی ریاستیں بھی اس معاملے میں کوچین کی تقلید کریں۔

ہندوستانی بائیسکل

ہندوستان کی تجارت "تحفظ" سے عموماً محروم رکھی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اب تک بائیسکل جیسی معمولی چیز بھی بنا کر بازار میں نہیں لا سکا۔

گزشتہ جنگ میں ہندوستان کی بعض مصنوعات کو قدرۃً تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مصنوعات کی حد تک ہندوستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ کپڑے اور جوتے کی تجارت اُسی زمانے میں چمکی تھی۔ موجودہ جنگ نے پھر ہندوستان کی تجارت کے لئے ویسا ہی تحفظ پیدا کر دیا ہے۔ اگر ہندوستان سرمائے سے اتنا محروم نہ ہوتا جتنا کہ ہے تو اب پہلے سے زیادہ اشیاء کی تجارت ہندوستان کے ہاتھ میں آ سکتی تھی۔ بہرحال جو چند سرمایہ دار ہندوستان میں ہیں اُن کو اس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔

ہمیں مسرت ہے کہ مسٹر جی۔ ڈی۔ برلا نے موقع شناسی سے کام لے کر بمبئی میں "ہند سائیکلز لمیٹڈ" کے نام سے بائیسکلوں کا ایک کارخانہ کھول دیا ہے۔ اس کارخانے کی بائیسکلیں اب فروخت ہونے کے لئے تیار ہیں اور کالبا دیوی کی تجارتی منڈی میں پہنچ گئی ہیں۔

"ہند سائیکلز" کا کارخانہ نئے طریقوں کے مطابق قائم کیا گیا ہے۔ اس بائیسکل کے تقریباً تمام پُرزے بمبئی میں تیار ہوئے ہیں اور یہ

امر موجب اطمینان ہے کہ بائیسکل کے عام سوداگروں نے ہندسائیکل کی مضبوطی اور نفاست کی تعریف کی ہے "چیف انسپکٹر آف سپلائیز" نے بھی ان بائیسکلوں کا معائنہ کرنے کے بعد انہیں قابلِ اطمینان قرار دیا ہے۔

جنگ کی وجہ سے کارخانے کے لئے مشینوں کے حصول میں کچھ دقت پیدا ہو رہی تھی لیکن غنیمت ہے کہ اس موقع پر حکومتِ ہند نے بھی غالباً اپنی آئندہ ضروریات کے لحاظ سے مسٹر برلا کی مدد کی اور انہیں انگلستان اور امریکا سے ضروری مشینوں کی درآمد کے سلسلے میں کچھ آسانیاں بہم پہنچائی ہیں۔

برطانی ہوائی سلسلۂ حمل ونقل کی کامیابی

اب سے کچھ عرصہ پہلے ہوائی جہاز کا سفر بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا لیکن گزشتہ چند سال میں یورپی ممالک کے محکمہ جاتِ پرواز نے بہت ترقی کی ہے اور اب ہوائی جہاز ڈاک اور مسافروں کے حمل ونقل کے سلسلے میں بہت مفید کام کر رہے ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ گزشتہ سال برطانوی ہوائی ڈاک کے ذریعے سے جو خط بھیجے گئے ان میں سے ایک خط بھی ضائع نہ ہوا۔ ان "ہوائی خطوں" کی تعداد (ایک کروڑ پینتیس لاکھ) کو مدِنظر رکھا جائے تو یہ کامیابی بہت قابلِ تعریف معلوم ہوتی ہے۔ ان خطوں میں جنگی قیدیوں اور ان کے رشتہ داروں کے خط بھی شامل تھے۔

ڈاک کے علاوہ گزشتہ سال چار ہزار مسافروں نے برطانوی ہوائی جہازوں پر ساڑھے سات لاکھ میل کا مجموعی سفر طے کیا اور لطف یہ ہے کہ جنگ یا موسم کی خرابی کے باوجود پرواز کے نظامِ اوقات میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ اسی نظامِ اوقات پر ۱۹۳۹ء سے لے کر اب تک باقاعدہ عمل ہو رہا ہے۔ تمام دورانِ جنگ میں انگلستان پرتگال اور ممالکِ متحدہ امریکا کے درمیان ہوائی سلسلۂ رسل ورسائل برابر قائم رہا ہے۔

ہندوستان میں چاول کی کاشت کی وسعت

۴۱-۱۹۴۰ء کے مقابلے میں ۴۲-۱۹۴۱ء میں ہندوستان میں چاول کی کاشت کے رقبے میں ایک فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ ۴۱-۱۹۴۰ء میں چاول کی فصل کا کل زیرِ کاشت رقبہ ۶۹۱۹۵۰۰۰ ایکڑ تھا۔ ۴۲-۱۹۴۱ء میں یہ رقبہ ۶۹۹۸۲۰۰۰ ایکڑ تک پہنچ گیا۔

ہندوستان میں ۱۴۷۰۰۰ ریڈیو سٹ

دسمبر ۱۹۴۱ء میں ۱۶۰۴۱ ریڈیو لائسنس جاری ہوئے۔ اس کے مقابلے میں دسمبر ۱۹۴۰ء میں جاری شدہ لائسنسوں کی کل تعداد ۱۲۷۳۲ تھی۔ دسمبر ۱۹۴۱ء سے زیادہ ریڈیو لائسنس ہندوستان میں اور کسی ایک مہینے میں کبھی تقسیم نہیں ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء کے بعد اکتوبر ۱۹۴۱ء کا نمبر ہے۔ اس مہینے میں ۱۴۵۱۳ لائسنس تقسیم کئے گئے۔

دسمبر ۱۹۴۱ء کا مہینہ ہندوستانی ریڈیو کی تاریخ میں ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہے یعنی اس مہینے میں سب سے زیادہ ریڈیو لائسنسوں کی تجدید کرائی گئی۔ یہ تعداد ۱۰۸۶۸ تھی۔ اس مہینے میں نئے جاری شدہ لائسنسوں کی تعداد ۵۱۷۳ کو پہنچی۔

دسمبر ۱۹۴۱ء کے خاتمے پر ہندوستان میں جاری شدہ ریڈیو لائسنسوں کی کل تعداد ۱،۴۷،۱۲۱ تھی۔ اس کے مقابلے میں ۱۹۴۰ء کے خاتمے پر ان کی کل تعداد صرف ۱،۱۹،۷۱۷ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء میں ۲۷،۴۰۴ ریڈیو لائسنسوں کا اضافہ ہوا۔

حامد علی خاں

حقائق

میں جوئے بے کنار ہوں ساغر نہیں ہوں میں
خود موجِ زندگی ہوں شناور نہیں ہوں میں

مجھ پر نہیں ہے گردشِ ایّام کا اثر
میں لامکاں کا نور ہوں، اختر نہیں ہوں میں

یہ خاک و آب و باد ہے بازیچہ گاہِ جاں
اس خاک و آب و باد کا پیکر نہیں ہوں میں

ہے شغل میرا صیقلِ آئینۂ وجود
آئینہ سازِ مثلِ سکندر نہیں ہوں میں

دل کیا ہے موجِ نورِ ازل کی ہے اک گرہ
بنتا ہے جو صدف میں وہ گوہر نہیں ہوں میں

مجھ کو بھلا حقیقتِ عریاں سے کیا دریغ
افسانہ بافِ واعظِ منبر نہیں ہوں میں

خلیفہ عبدالحکیم

نفسیات اور جوہر قابل

یوں تو مختلف مصنفین نے جوہر قابل (Genius) کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کی کافی کوشش کی ہے یا کر رہے ہیں۔ لیکن اس حیاتیاتی مسئلے کا سائینٹیفک مطالعہ موجودہ زمانے میں ڈاکٹر لانبروسو (اٹلی کا ایک مشہور ڈاکٹر جو پاگلوں کا علاج کیا کرتا تھا) اور سر فرانسس گالٹن دونوں کی نفسیاتی تحقیق سے شروع ہوا اگرچہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جداگانہ طریق پر چلے ہیں اور دونوں کے نظریئے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں اپنے اس مقالے میں صرف ڈاکٹر لانبروسو ہی کے نقطۂ نظر کو مفصل بیان کروں گا۔ اور سر فرانسس گالٹن کے نظریئے کو آیندہ کسی قسط میں پیش کروں گا۔

ڈاکٹر لانبروسو نے جوہر قابل اور دماغی عوارض میں گہرا تعلق ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بہت بحث ہوتی رہی ہے۔ اس کے انکشاف کو اب تجزیۂ نفس کی سوسائٹی (Psychoanalytical Society) نے بھی درست قرار دیا ہے کریشمر نے جو جرمنی کا بڑا ماہر نفسیات ہے لانبروسو کی اس منقطع تحقیق کو از سر نو شروع کیا۔ جس پر اب تک صرف فرائیڈ (Freud) اور ایڈلر (Adler) نے تھوڑا بہت لکھا ہے کریشمر نے اس عمارت کو نئے سرے سے مضبوط اور مستحکم کیا ہے جو اب تک صرف قیاسات کی بنیادوں پر کھڑی تھی۔ اور لانبروسو کی مردہ تحقیق کو نئی زندگی بخشی ہے یعنی اس نے سائینٹیفک طریقے پر طبیعت اور قوائے جسمانی کے آپس میں گہرے تعلق پر روشنی ڈالی اور اسی بنیاد پر اپنی مشہور کتاب (Physique and Character) لکھی۔ کریشمر نے یہ کتاب نہایت عمدہ طریقے پر لکھی ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اس کتاب میں جرمن نظریئے بہت کم ہیں۔ اس لئے انگریزی ادب سے واقفیت رکھنے والوں کے لئے بہت مفید، پُر از معلومات اور دلچسپ ثابت ہوئی ہے۔ جواہر قابل کے متعلق اس کے بہت سے ذاتی نظریئے بھی ہیں۔ مثلاً وہ بہ یک جنبش قلم تمام مشہور خواتین کو جواہر قابل کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ کوئی عورت genius نہیں ہو سکتی اور اگر کوئی اس قابل ہے بھی کہ اُسے genius کا درجہ دیا جائے تو صرف اسی بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بجائے عورت کے مرد تصوّر کرتی ہے۔ یعنی اس کے آرٹ میں نسوانیت بالکل مفقود ہوتی ہے۔ پھر ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ یہ ایک عجیب امر ہے کہ جنہوں نے جواہر قابل پر کتابیں لکھی ہیں وہ ہمیشہ آرٹسٹوں اور صحیفہ نگاروں ہی کو لیتے ہیں اور بڑے بڑے انجینیروں اور منتظمین تجارت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی زندگیوں کا مطالعہ بھی بہت اہم اور ضروری ہے۔ معلوم نہیں کریشمر کا پہلا نظریہ کہاں تک درست ہے۔ تاہم اُس نے لانبروسو کی تحقیق کو بڑی حد تک کامیاب اور درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے یہ مضمون لکھتے وقت کریشمر کی مشہور کتاب (The Psychology of Men of Genius) سے کافی مدد لی ہے اور اس کتاب میں اُس نے لانبروسو کے نقطۂ نظر کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔

ڈاکٹر لانبروسو موجودہ زمانے کا پہلا شخص ہے جس نے کہا کہ ادراک اور جنون میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس کے بعد تعلیم یافتہ طبقے میں اس موضوع پر بہت بحث ہوتی رہی، اور عجیب و غریب قیاس آرائیاں بھی ہوتی رہیں۔ جن کا ماحصل یہ نکلا کہ موجودہ تجزیۂ نفس کی سوسائٹی کے سوا جنون اور فہم و ادراک کے باہمی رابطہ کو اور کوئی بھی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ عوام اس رابطہ کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے لیکن یہ کہنا کہ ان دو چیزوں میں سرے سے اتحاد ہی نہیں ہے سراسر غلط ہے کیونکہ ایک جگہ یونانی فلاسفر ارسطو نے بھی کہا ہے کہ مشہور شعراء آرٹسٹ اور سیاست دان عموماً مالیخولیا یا جنون کا شکار ہوتے رہے ہیں اور خاص کر مشہور شعراء پر تو اس کا بہت اثر ہوتا ہے اور پھر ہوش میں آنے پر کہتے ہیں کہ کوئی آسمانی قوت ان کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہے اور زبردستی یہ الفاظ نکلواتی ہے۔ مثلاً مرزا غالب ایک جگہ فرماتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ۔۔۔ غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

حکیم ارسطو نے اس بات پر بھی بہت زور دیا تھا کہ کوئی ایسا جوہر قابل پیدا نہیں ہوتا جس کے خاندان کی کسی پشت میں پاگل پن کا سراغ نہ ملتا ہو۔ گذشتہ چند سالوں میں ماڈزلے (Maudsley) نے بھی اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ اور پیسکل (Pascal) نے بھی اسی بارے میں کہا ہے کہ جوہر قابل کے انتہائی درجے میں اور جنون میں کوئی فرق نہیں ہے۔ گویا ان سب کے نزدیک ایک جوہر قابل کو پاگل پن یا جنون کے معیار پر پورا اترنا پڑتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جواہرِ قابل کا خود اپنے متعلق کیا خیال ہے۔ فلاسفر شوپنہار مختصر لیکن خشک الفاظ میں کہتا ہے "کہ جوہرِ قابل اوسط درجے کی فہم کی نسبت جنون کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے" اس پر طرّہ یہ کہ بہت سے جواہرِ قابل جنون اور پاگل پن کو ایک غیر معمولی انسان کے دماغ کا جزوِ اعظم یا جزوِ لازم سمجھتے ہیں۔ اس مسئلہ کو ٹھیک طور پر جاننے کے لئے ہمیں پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اس بات میں سچائی کہاں تک ہے۔ اوّل تو ہم مختلف سوانح عمریوں کا مطالعہ کر کے بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں کہ کتنے جوہرِ قابل اوائلِ عمر ہی میں یا بعد میں پاگل ہو گئے تھے۔ (تمام مثالیں یورپین جواہرِ قابل ہی کی آئیں گی کیونکہ ہندوستانی جواہرِ قابل کے حالاتِ زندگی کا تجزیۂ نفس Psychoanalysis میری نظروں سے نہیں گزرا) فلاسفروں میں سے روسو، نیٹشے، سائنس دانوں میں سے گالٹن، نیوٹن، رابرٹ میر اور فیلڈ مارشل بلوشر۔ شعرا اور مصنفین میں ٹاسو، کلیسٹ، ہولڈرلین، سی۔ ایف۔ میر، لنیاؤ، موپساں سٹرنڈبرگ اور فان گف جیسی ہستیاں اس بات کی شاہد ہیں۔ ان کے علاوہ مائیکل انجیلو، بائرن، گرل پارزر اور پلاٹین کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مانا کہ بالکل صحیح الدماغ ہونا بہت اچھا ہے لیکن یہ بات بذاتِ خود فائدہ مند نہیں۔ صحیح الدماغ اس کو کہنا چاہئے جس کے جذبات اور احساسات میں مکمل توازن ہوتا ہے اور دماغ Complexes سے مبرّا ہوتا ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ تسکینِ قلب یا دماغی اطمینان اور متوازن جذبات دنیا میں بڑے بڑے کارناموں کی آگ بھڑکانے سے عاری ہوتے ہیں۔ اُدھر جنون ایک طرح کی بدقسمتی تو ضرور ہے لیکن بہت دفعہ یہ انسان کو آسمانِ شہرت پر چمکاتی ہے۔

آپ نے اکثر سنا ہوگا اور حیران ہوئے ہوں گے کہ کیوں ایک جوہرِ قابل کی زندگی میں ایک لامتناہی کشمکش جاری رہتی ہے۔ مثلاً شروع ہی سے اس کے اساتذہ کو اس کے متعلق غلط فہمی ہوتی ہے، بلکہ اس کے والدین بھی اس کو بدقسمت اور بیوقوف خیال کرتے ہیں اور اس کے آشنا اس کا مذاق اُڑاتے ہیں، کیوں اس کی قدر نہیں کی جاتی اور کیوں اُسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملتا۔ ان باتوں کی تہ میں کیا راز ہے۔ وہ کیوں اپنی تمام زندگی رنج و فکر، تلخی و بے آرامی کے بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اس کا ماحول جو عوام سے پُر ہوتا ہے بڑی حد تک اس بات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ عوام اس کی مافوق العادت فطرت کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور اس کی عمیق گہرائیوں تک پہنچنے سے عاری۔ علاوہ ازیں جوہرِ قابل کی تکلیفات کی ایک وجہ اور بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک اوسط درجے کے دماغ کا انسان اپنے دنیاوی کاروبار کو اچھی طرح نباہ سکتا ہے اور خاص کر مشکلات کا اچھی طرح سامنا کر سکتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ دنیا میں کیسے رہنا ہے اور ایک خوش و خرم طبیعت کے ساتھ دنیا میں کامیاب رہتا ہے۔ لیکن برخلاف ایسی شخصیت کے ایک جوہرِ قابل جو صحت در کہلانے کے باوجود بھی کسی نہ کسی اعصابی مرض میں ضرور مبتلا ہوتا ہے۔ ایسے نہیں رہ سکتا۔ ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں جو بہت کشمکش کے بعد کسی حد تک بنا ہنے کی قوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ ہاں صرف گوئٹے اور شلر ایسی ہستیاں ہوتی ہیں۔

کوئی انسان بھی جو بظاہر تو صحیح الدماغ نظر آتا ہے لیکن حالات سے اپنی مسلسل تطبیق کرنے سے قاصر ہے، ہرگز صحیح الدماغ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ طبّی نقطۂ نگاہ سے پیہم ناکامیاں اور لاانتہا مایوسیاں اور ایک کشمکش سے نکل کر دوسری میں پڑنا ایسی باتیں ہیں جو یقیناً ایک جنونی حالت کا بیّن ثبوت ہیں۔ مائیکل اینجیلو اور فاربک کی ہستیاں اس بات کی شاہد ہیں۔

مختصراً اگر جواہرِ قابل کی دردناک زندگیوں کو صحیح طور پر سمجھنا ہے تو ہمیں ان کو دو پہلوؤں سے دیکھنا پڑے گا۔ ایک پہلو تو ہے ان کا ماحول یعنی اوسط درجے کی فہم کے لوگ جن کے ساتھ ان کا براہِ راست تعلق رہتا ہے اور جو اپنے دنیوی فرائض بڑی اچھی طرح سے سرانجام دیتے ہیں اور اپنی قوتِ مدافعت کے بل پر صدمات سے غیر متاثر رہتے ہیں۔ دوسرا پہلو ہے اُن جواہرِ قابل کی اپنی شخصیتیں۔ جو برخلاف اپنے ماحول کے بہت زیادہ حساس، جنونی، نیز طبیعت اور تطبیق سے عاری ہوتی ہیں۔ ان کے دل صدمات سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور لاانتہا مشکلوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ بڑے بڑے مصلحین (Reformers) بہت شرمیلے، حساس اور تنہائی پسند ہوتے رہے ہیں۔ وہ برخلاف دیگر اشخاص کے صدمات کو بہت زیادہ محسوس کرتے تھے۔ یقیناً یہی حالت دوسرے جواہرِ قابل کی ہوتی ہے۔ ان کے دماغ میں عموماً پریشانیاں رہتی ہیں وہ ایک مسلسل ذہنی اضطراب میں مبتلا رہتے ہیں اور ان کے دل میں ایک کشمکش جاری رہتی ہے جسے عوام نہیں بھانپ سکتے۔ وہ معمولی حادثات کی تاب بھی نہیں لا سکتے اور بعض دفعہ اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر دنیا سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ بالکل یہی حالت روسو اور مارٹن لوتھر کی تھی۔ روسو یہ سوچ کر ہمیشہ گھبرایا کرتا تھا کہ

کسی مجمع میں اپنے آپ کو کیسے سنبھالے گا۔ لیکن وہی روسو انقلابِ فرانس میں سب سے آگے تھا۔

جوانی میں دونوں طبائع۔ ایک وہ جو ادراک و فہم کا سرچشمہ ہے اور دوسری وہ جس کی بنا پر وہ سوسائٹی کو چھوڑ دینے پر مجبور ہوتا ہے ایک ہی چیز سے پیدا ہوتی ہیں اگر ایک گل ہے تو دوسری خار۔ لیکن دونوں ایک ہی شاخ پر پیدا ہوتی ہیں اور یہ ایسی حقیقت ہے جو جواہر قابل خود بھی تسلیم کرتے ہیں۔ بسمارک نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں پرشیا کا یا تو سب سے بڑا آوارہ شخص ہوں گا، یا سب سے بلند مرتبہ آدمی۔ ٹسلر کو لیجئے عنفوانِ شباب میں دماغی توازن بالکل قائم نہیں تھا۔ یہی حالت ہزاروں اور ناصحیح الدماغ شخصوں کی اوائلِ عمر میں ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمام شاعر تھے۔ ہر ایک جوہرِ قابل جنونی ہو سکتا ہے لیکن ہر ایک جنونی جوہرِ قابل نہیں ہو سکتا۔

عام طور پر وہ کونسی ہستی ہوتی ہے جو سیاسی و عقلی تاریخ میں انقلابات اور فیصلہ کن تحریکات پیدا کرتی ہے۔ کیا وہ ایک معمولی آرام طلب اور عیش پرست ہستی ہوتی ہے جو اُن انقلابی حادثات سے فائدہ اُٹھا کر اپنی خود غرضانہ خواہشات کو پورا کرتی ہے؟ یا وہ ایسی شخصیت ہوتی ہے جو طبی نقطۂ نظر سے ذہنی اور جسمانی صحت کی مالک ہوتی ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ذہنی یا جسمانی صحت سے مراد یہ ہے کہ دل کو اطمینان ہو اور کسی قسم کی دماغی یا جسمانی تکلیف نہ ہوتی ہو۔ جس شخص کا دماغ رنج و فکر اور غم کی عدم موجودگی میں درست حالت میں ہو اور وہ خوب سمجھتا ہو کہ قوانین کے ماتحت کیسے زندگی بسر کرنا ہے تو وہ کسی صورت میں نہ تو شاعر ہی ہوگا نہ کسی انقلاب میں حصہ لے گا۔ اور نہ کسی جنگ میں شرکت کرے گا۔

سیاسی اور عقلی تاریخ میں انقلاب برپا کرنے والے ہرگز ذہنی یا بدنی حالت میں مکمل طور پر صحت ور نہ تھے۔ اُن میں کوئی نہ کوئی دماغی کمزوری ضرور موجود تھی۔ کیونکہ ایک انسان صرف دماغی توازن نہ ہونے کی حالت ہی میں اپنے ماحول سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ جو باتیں ہم بعض انقلابی شخصیتوں میں دیکھتے ہیں وہ ہمیں امن کے زمانے میں پاگلوں کے ہسپتالوں (Mental Hospitals) میں نظر آتی ہیں۔ اِن پاگلوں میں بھی وہی علامات ہوتی ہیں اور ایسے بے شمار اشخاص ماہرانِ تجزیۂ نفسی (Psychoanalysts) کے پاس بغرضِ علاج لائے جاتے ہیں۔

اگر ہم بہت مشہور جواہرِ قابل کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت اور واضح ہو جائے گی۔ اب ہمارے سامنے ایسے اشخاص ہیں جو غیر معمولی عقل کے مالک تھے لیکن وہ بھی انقلابی شخصیتوں کے مانند ناصحیح الدماغ تھے۔ ان میں مشہور محققین اور انقلابِ فرانس کے چیدہ چیدہ لیڈر شامل ہیں۔ مثلاً روسو، میرابو اور رالس پیری وغیرہ رالس پیری کا باپ مالیخولیا کا مریض تھا اور خود رالس پیری عصبی امراض میں مبتلا تھا۔ میرابو ایک خطر پسند آدمی تھا جس کا ماضی ذہنی تکالیف میں گذرا اور بعد ازاں مالیخولیا کا شکار ہو گیا۔ روسو فلاسفر جو عقل و فہم میں پہلی دونوں ہستیوں سے کہیں بڑھ کر تھا وہ بہت سخت دماغی امراض میں مبتلا تھا۔ ان واقعات کو دیکھ کر ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ دماغی بیماریوں کے مریض اپنی قوم کی کایا پلٹنے میں ایک نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایک وقت میں کسی ملک کی عقلی فضا پُرسکون ہو اور سوسائٹی کا نظام عمدہ اور ٹھیک چل رہا ہو تو ایسے پاگل لوگ جو بینک میں آوارہ پھرتے ہیں بالکل بے ضرر اور بے اثر ہوتے ہیں لیکن ذرا ہوا کا رُخ بدل جائے اور سوسائٹی کے نظم و نسق میں فرق آجائے اور عوام قعرِ مذلت میں گرنے پر مائل ہو جائیں تو پھر وہی پاگل، اور آوارہ لوگ صفِ اوّل میں آن کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے اڑے وقت میں یہی لوگ کام آتے ہیں۔ دنیا ان کے سامنے سر خم کر دیتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ انقلابی شخصیتیں دنیا میں صرف ایسے وقت میں آتی ہیں جب ان کی اشد ضرورت ہوتی ہے، بالکل غلط ہے۔ ایسی ہستیاں تو ہر وقت اور دنیا کے ہر تختے پر موجود ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا اثر وقت وقت پر منحصر ہے، ایک وقت میں عوام انہیں پاگل کہتے ہیں۔ لیکن دوسرے وقت میں انہیں جواہرِ قابل اور مشاہیر کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

ان حالات کو دیکھ کر کیا ہمیں لامبروسو کے مقولہ کو مان لینا چاہئے کہ ادراک اور جنون لازم و ملزوم ہیں؟ یقینی طور پر نہیں۔ لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے جوہرِ قابل عوام سے بڑی حد تک مختلف ہوتا ہے، ایسے انتہائی درجے کے اختلافِ حیاتیات میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ عوام کے برخلاف ان کی جسمانی بناوٹ میں ناپائیداری ہوتی ہے یعنی انحطاط کی طرف بہت زیادہ رجحان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں عام رسم و رواج بھی ان کے لئے تکلیف دہ چیز ہوتی ہے۔

اس لئے ہمیں یہ دیکھ کر بالکل حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ یہ بنی نوع انسان جن کو جوہرِ قابل (Genius) کے نام سے پکارا جاتا ہے اپنی ذہنی ساخت میں بھی ایک طرح کا غیر معمولی تنزل رکھتے ہیں۔ وہ بہت ذی حس ہوتے کے علاوہ دیگر دماغی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ہاں یہ بالکل ممکن ہے کہ حکیمانہ یا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے ایک جوہرِ قابل کو عوام سے بلند اور امتیازی حیثیت حاصل ہو لیکن اِس بات پر اصرار کہ ایک جوہرِ قابل حیاتیاتی کا نقطۂ نظر سے بہت بلند فہم و ادراک کا مالک ہوتا ہے، علم سائنس کی بھاری اور عریاں حقیقتوں کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتا۔

جوہرِ قابل ایک خاندان میں یا مربوط خاندانوں کے مجموعے میں آہستہ آہستہ نشو و نما پاتا ہے، ایسے اعلیٰ خاندان جن میں لائق آدمیوں کی افراط ہوتی ہے۔ (جیسا کہ سر فرانسس گالٹن نے بہت تحقیق اور جستجو کے بعد ثابت کیا ہے) جوہرِ قابل کی ترقی کا پہلا زینہ ہیں۔ لیکن جوہرِ قابل پر اِس بات کا بذاتِ خود کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ جواہرِ قابل کی زندگیوں کے حالات پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ جس خاندان میں کوئی جوہرِ قابل پیدا ہُوا وہ پہلے پہل بدقسمت گِنا گیا، کیونکہ شروع ہی سے اس کے اپنے خویش و اقارب سے تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں اور چونکہ ہر کوئی اپنی عقل کے مطابق اُسے پرکھتا ہے اِس لئے اس کی حرکات و سکنات ان کو بہت عجیب اور اکثر بیہودہ نظر آتی ہیں، لیکن وہ اپنے لئے ایک بالکل مختلف ماحول پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، دوسرے تو اپنی سوسائٹی کے قوانین پر عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن وہ انہیں چیزوں کو بالائے طاق رکھتا ہے اور رسم و رواج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے لئے نئے قوانین مرتب کر لیتا ہے، دوسروں کی قابلیت یا علمیت اُس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں محو ہوتا ہے۔

علمِ حیات کا مطالعہ کرنے سے یہ حیران کُن حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ جواہرِ قابل کی نسل بہت جلد غائب ہو جاتی ہے اور گویا خود قدرت ہی کے ایک بہت آسان قانون کے ماتحت ایسا ہوتا ہے، مثلاً بہت سے جواہرِ قابل نے شادی نہیں کی یا اگر کی تو بے اولاد رہے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن میں شہوانی جذبات کا فقدان تھا یا کچھ برگشتۂ جنس یعنی Perverts تھے جن میں شہوانی جذبات کی شدت موجود تھی اُنہوں نے اولاد پیدا کرنے سے گریز کیا۔ اگر کسی کے اولاد ہوئی بھی۔ تو ناکارہ۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے، چمن میں دیدہ ور پیدا

پہلی ہی پشت میں اتنا تنزل اِس بات کی دلیل ہے کہ قدرت کا نظام بے قاعدہ ہے اسی طرح ہم خاص طور پر بالکل یہی بات بڑے بڑے حکمرانوں کی اولاد میں دیکھتے ہیں کہ ناخوشگوار مریضوں اور تنزل پذیر شخصیتوں کی کثرت ہونے لگتی ہے۔ ایک جوہرِ قابل کے خاندان میں اِس طرح کا زوال اُس سے اگلی ہی پشت میں ظاہر ہو جاتا ہے جس سے وہ خود تعلق رکھتا ہے، اور عموماً ضعیف الدماغ شخصوں کی صورت میں۔ اور پھر یک جا خاندانوں کا زوال تو حیران کُن تیزی سے ہوتا ہے، گوئٹے، بائرن، بی تھوون، بیک اور فاریک کے خاندان اِس بات کا بیّن ثبوت ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جواہرِ قابل اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک بہت اعلیٰ اور باہنر خاندان تنزل پذیر ہونے لگتا ہے، اگر بہت سی سوانح عمریوں کا مطالعہ کریں، تو پتا چلتا ہے، کہ ادراک اور جنون میں ایک فطری رشتہ قائم ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جوہرِ قابل کے لئے بہت موزوں وقت وہی ہوتا ہے، جب ایک باکمال خاندان زوال کی طرف مائل ہوتا ہے، یہ تنزل کی طرف رجحان جو قدرت کی طرف سے ہوتا ہے قابلِ افسوس تو ضرور ہے لیکن یہ ایسا ضروری اور فطری امر ہے جس سے بچنا محال ہوتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ کیا دماغی امراض ایک جوہرِ قابل کے لئے ضروری ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ کیا Genius اور جنون ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ کیا جنون ہی کی وجہ سے ایک غیر معمولی قابلیت کا انسان جوہرِ قابل بنتا ہے؟ تو ان سوالوں کا تسلی بخش جواب ملنا ابھی مشکل ہے، کیونکہ سائنس دانوں میں اس بارے میں بھی بہت اختلاف ہے۔ تاہم Hereditary relations دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دماغی عوارض کا اعلیٰ درجے کی قابلیت سے براہِ راست کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سی ایسی ہستیاں بھی ہو گزری ہیں جن کا دماغی توازن تو درست نہ تھا لیکن اِس بات کے باوجود بلند پایہ قابلیت کی مالک تھیں اور بے شمار ایسی ہستیاں بھی ہوتی ہیں جو قابل تو بے شک ہوتی ہیں لیکن اُن میں وہ کمی ہوتی ہے

جو ایک جوہرِ قابل بننے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ genius کے دماغ میں جو جنون ہوتا ہے وہ سرفراز ہو کر اُسے وہاں لے جاتا ہے جہاں دوسری ہستیاں چاہے کتنی ہی قابلیت کی مالک کیوں نہ ہوں ہرگز نہیں پہنچ سکتیں۔ جنون تازیانے کا کام دیتا ہے اور اس بنا پر وہ دنیا کی وسعتوں کو تنگ خیال کرتا ہے، اور اپنے لئے ایک نئی دنیا آباد کرتا ہے، بڑے بڑے سائنس دانوں، آرٹسٹوں اور شاعروں کی شہرت کا باعث یہی mania یا جنون ہی ہوتا ہے۔

اِن حالات کے مطالعہ کے بعد ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ دماغی عوارض بیشتر حالات میں ایک عام یعنی اوسط درجے کے انسان کی دماغی قوتوں کو گھٹا دیتے ہیں اور اُسے سوسائٹی کے ناقابل کر دیتے ہیں، لیکن بعض حالتوں میں چند شخصیتوں کو جو خاص دماغی ساخت اور بہت قابلیت سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔ جوہرِ قابل بنانے میں ایک نمایاں حصّہ لیتے ہیں، بشرطیکہ وہ عوارض اتنے طاقتور نہ ہو جائیں کہ بجائے فائدہ کے نقصان ہو۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ اُدھر جنون نے شدت اختیار کی اور اِدھر وہ صاحب بالکل پاگل ہو گئے اور ان کا بلند مطمحِ نظر دھیں کا دھیں رہ گیا۔

رشید۔ اے۔ انور

عکسِ فردا و دوش

موت ہے اک طویل ٹھنڈی رات
زندگی روزِ حبس ہے یکسر
تیرگی شب کی بڑھتی جاتی ہے
چھائی جاتی ہے ایک مدہوشی
زندگی سے میں تنگ آیا ہوں

سرِ بالیں ہے اک عجیب درخت
جس سے چھنتی ہے پھیکی پھیکی ضو
ایک بلبل جوانِ خوش الحان
اُس پہ الفت کے گیت گاتا ہے
جن کو سپنوں میں بھی میں سنتا ہوں

(ہائینے) مترجمۂ طالب شیرازی

*

عزم

اُڑ گئی روح کے آئینے سے گردِ تقلید
ناخدا اب مری کشتی کا کوئی غیر نہیں
ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے معبد مجھ کو
میرے ایماں کو جنونِ حرم و دیر نہیں

رخشِ احساس کی ہے باگ مرے ہاتھوں میں
اب کوئی میرے خیالوں کو نہیں بھٹکاتا
نام دیتی ہے غلامی کا جسے یہ دُنیا
میرے جذبات پہ وہ بھوت نہیں منڈلاتا

کائنات ایک کھلونا ہے مری نظروں میں
جی میں جس طرح بھی آئے گی، گھماؤں گا اِسے
اِس کے ہر جزو کے جوہر کو پرکھنے کے لئے
گاہ توڑوں گا اِسے، گاہ بناؤں گا اِسے

میری قسمت کو نپٹائے گا ارادہ میرا
میرے پنجے میں سمٹ آئیں گی سب تقدیریں
گل کے بن جائیں گی حُرّیتِ عالم کا حصار
بازوئے دہر سے لپٹی ہوئی یہ زنجیریں

منجمد قلب سے اُبلیں گے بھڑکتے شعلے
جن سے جل جائے گا دُنیا کا یہ فرسُودہ نظام
خاک بوسوں کو اچھالوں گا فلک کی جانب
اونچا کر دوں گا ستاروں سے بھی انساں کا مقام

احمد ندیم قاسمی

خمکدہ

خیالِ ماسوا سے پاک جس کا دل نہیں ہوتا
نہیں ہوتا وہ بزمِ دوست کے قابل نہیں ہوتا
وہ بدبختِ ازل جو تارکِ باطل نہیں ہوتا
اُسے دربارِ حق میں بار تک حاصل نہیں ہوتا
وہ دل جو آرزوئے دوست کے قابل نہیں ہوتا
بظاہر اُس کو دل کہہ لو بباطن دل نہیں ہوتا
فضا ہائے بریں گو دعوتِ پرواز دیتی ہیں
مگر اب دل ہی کچھ پرواز پر مائل نہیں ہوتا
تری نظروں کا جادو وہ تحیّر خیز جادو ہے
کہ دل ہے اور پھر دل پر گمانِ دل نہیں ہوتا
سکونِ عارضی تو زندگی میں مل ہی جاتا ہے
مگر شاید سکونِ مستقل حاصل نہیں ہوتا
محبّت میں اِک ایسا وقت بھی آتا ہے جب اکثر
خیالِ دوست بھی وجہِ سکونِ دل نہیں ہوتا
بسا اوقات کوئی آرزو دل میں نہیں ہوتی
بسا اوقات پہلو میں ہمارے دل نہیں ہوتا
جزاک اللہ شوقِ رہبرِ منزلِ جاناں
ہمیں مطلق خیالِ دوریٔ منزل نہیں ہوتا
ہمارا دل تمہارا دل تو ہو سکتا ہے اور ہے بھی
مگر یہ کیا تمہارا دل ہمارا دل نہیں ہوتا
میں ہوں وہ موجِ بحرِ زندگی اس دہر میں جس کو
میسّر لطف ہم آغوشیٔ ساحل نہیں ہوتا
گئے وہ دن کہ ہو جاتا تھا غافل چند قطروں میں
خمار اب رات دن پیتا ہے اور غافل نہیں ہوتا

سید ولایت حسین خمار دہلوی

مَلک المَوت سے گُریز

جوانی ڈھل جانے کے بعد جو خوش نصیب ہیں وہ تو جلد ہی کسی مشہور طبیب کی گولیوں کی مدد سے یا کسی لائق ڈاکٹر کے انجکشن کے زور سے چین سے قبر میں پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں مگر جن کمبختوں کو گولیوں اور ڈاکٹروں سے ضد ہو وہ بہت مشکل سے مرتے ہیں۔ سالہا سال تو ورزش کرتے کرتے ختم کر دیتے ہیں۔ ورزش کے ساتھ کم کھاتے اور لمبے سانس کی عادت ڈالتے ہیں۔ کچھ سال ان گہرے سانسوں میں نکال دیتے ہیں۔ آخر میں گوشت چھوڑ کر اخروٹ، انڈے اور ٹماٹو پر گذارا کرتے ہیں۔ بالکل ہار جائیں تو چند سال دہی کھاتے کھاتے بسر کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کی نبس مارتے ہیں، قسائی کا بل چٹ کر جاتے ہیں اور اگر پنشن یافتہ ہوں تو پبلک کے خزانے پر مُردار خواروں کی طرح ڈٹے رہتے ہیں۔ چل پھر نہ سکیں مگر زندہ ضرور رہتے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ کمزور اور ناکارہ ہوتے جاتے ہیں مگر یہ ضرور کہیں گے "پہلے سے بہت بہتر ہوں" "اخروٹ اور انڈے بہت مفید ثابت ہو رہے ہیں" "دہی نے تو گویا مجھے از سرِ نو جوان کر دیا" وغیرہ۔ (طبیب اور ڈاکٹر نہ ہوں تو ہندوستان کی زہریلی آب و ہوا میں بھی اسّی نوّے سے پہلے شاید ہی کوئی مرے)

ستّر سالہ۔ (مصنوعی دانتوں کو چمکاتے ہوئے) واللہ مجھے تو جس دن سے دواؤں سے نفرت ہوئی ہے زندگی کا لطف آ گیا ہے۔ کھاتا کم ہوں، سوتا کم ہوں مگر توانائی پہلے سے دونی ہے

بہتّر سالہ۔ بجا درست، یقین جانو کہ یہ کمبخت کھانسی نہ ہو تو میری صحت اُس سے جو آج سے دس سال پہلے تھی کہیں بہتر ہے۔

اسّی سالہ۔ تم کل کے لونڈے صحت کی قدر کیا جانو۔ اب بھی دو میل روزانہ صبح کی سیر جاری ہے اور اشتہا کا یہ حال ہے کہ احتیاط کا تقاضا نہ ہو تو چار انڈے کھا جاؤں اور ڈکار تک نہ لوں۔

ستّر سالہ۔ (اسّی سالہ کو مخاطب کر کے) حضرت اور سب کچھ تو سمجھ میں آ گیا مگر یہ تو فرمائیے کہ شباب کی آرزو دل سے کیوں نہیں جاتی؟

اسّی سالہ۔ صاحب ہوش کی لو۔ یہ آرزو سو سال تک دو سو سال تک نہ جائے گی۔ جب تک جان ہے شباب کی آرزو ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ شباب جائے مگر شباب کی آرزو نہ جائے۔

ستّر سالہ۔ میں تو دل سے چاہتا ہوں کہ یہ آرزو نہ ہو۔ انسان اس قید سے آزاد ہو کر کوئی عقل کا کام کرے۔

بہتّر سالہ۔ یہ گئی تو مرے ع مرد چوں پیر شود حرص جواں تر گردد۔

ستّر سالہ۔ میرے دماغ پر تو واضح ہوتا جاتا ہے ؎

بہ شراب و کباب و رنگِ خضاب
باز ناید گذشتہ برنائی

بہت چاہتا ہوں کہ شباب اور شباب کی داستانیں قطعی محو ہو جائیں مگر دل نہیں مانتا۔

اسّی سالہ۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ دل دانا ہے دماغ محض پاگل ہے۔ اب تک کرکٹ کے میچ، میچ کے بعد کی چائے، چائے میں پہلو والی میمیں، اُن کا مُسکرانا یاد آتا ہے۔ ہم تو خیر کیا تھے ہمارے پروفیسر صاحب کی باچھیں کھلی جاتی تھیں اور یہ ساٹھ سال کا قصّہ ہے۔ کافر ہو جس کا اب بھی جی نہ چاہتا ہو کہ وہی میچ ہو، وہی چائے ہو اور پروفیسر absent ہو۔ جماعت میں وہ ہماری غیر حاضری لگاتا تھا۔ چائے کے موقع پر ہم اس کی غیر حاضری کے متمنّی ہُوا کرتے تھے۔

بہتّر سالہ۔ کیا بات کہہ گئے ہو اُستاد۔ مگر بُرا نہ مانو تو ہم سے یہ آج کل کے ٹینس کھیلنے والے چھوکرے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ آنکھیں سینکنے کے لئے چائے کے محتاج نہیں۔ چست چالاک خاتونوں کے ہجوم میں دندناتے پھرتے ہیں۔ نہ تھی ہمارے وقت میں ٹینس ورنہ ہم بھی یہ لطف اٹھاتے۔

ستّر سالہ۔ بھتیا ہمیں تو کوئی کچھ ہی کہے اب بھی فلالین کی پتلون ڈانٹے ٹینس کا بلا ہلانے میں لطف آتا ہے۔ کھیلتے نہیں مگر پہنچ تو جاتے ہیں۔ بیس سال ہوئے کہ کھیلنا شروع کیا، دس سال ہوئے کہ چھوڑ دیا مگر ......

بہتّر سالہ۔ جی ہاں

چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہ جائے

ستّر سالہ۔ یوں ہی سہی مگر بندہ نواز اب بھی کبھی کبھی ایک دو سٹ نہیں تو دو چار game تو ضرور ہو ہی جاتے ہیں۔

اسّی سالہ۔ اس پر یہ خیال کہ شباب کی آرزو نہ ہو۔ بڑے ترٹ کھٹ ہو۔

ستّر سالہ۔ وہ تو محض ناصفیانہ نقطۂ نگاہ سے آپ کے تجربہ سے مستفید ہونے کے لئے ذکر چھیڑا تھا ورنہ ردّی کی ٹوکری کی امانت بننے کو کس کا جی چاہتا ہے۔

بہتّر سالہ۔ واللہ اگر کوئی نوجوان ہماری باتیں سُن لے تو بے اختیار کہہ اُٹھے کہ یہ پیر فرتوت بھی کس قدر نابالغ ہیں۔

اسّی سالہ۔ نوجوانوں کی ایسی تیسی۔ پرسوں ہی میں اپنے پوتے کو للکار چکا ہوں کہ خبردار جو تم نے یہ سمجھا کہ ہم تم سے کم ہیں۔ صرف یہ فرق ہے کہ ہم محسوس تو سب کچھ تمہاری طرح کرتے ہیں مگر اظہار کم کرتے ہیں۔ زبان رُکتی ہے پاؤں لڑکھڑاتے ہیں مگر دل کی دھڑکن وہی ہے۔ وہ بے حیا دبی زبان سے کہنے لگا "داداجان کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے"۔ اس قدر غصہ آیا کہ لاٹھی مارنے کو جی چاہا۔ نالائق کہیں کا

بہتّر سالہ۔ سخت نالائق۔

ستّر سالہ۔ بدلگام مُنہ پھٹ۔ مجھے بھی غصہ آرہا ہے۔ یہ کہنا تھا کہ سب کھانسنے لگے۔ ایک منٹ تک کھانسی جاری رہی۔ اُگالدانوں کا استعمال ہُوا، رومال سے ہونٹ پونچھے گئے، گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ لو بھئی خدا حافظ خدا حافظ کہہ کر ستّر سالہ اور بہتّر سالہ رخصت ہونے کے لئے اُٹھے۔ پھر کچھ کھانسے۔ اسّی سالہ نے کہا "آج ہوا میں کچھ خنکی زیادہ ہے"

کوٹھی کے صحن میں نوجوان لڑکے اور خاتونیں ہلکے کپڑوں میں بھاگ دوڑ کھیل کود شور وغل میں مشغول قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ بڈھوں نے سب کچھ دیکھا مگر یہ اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ گلابی سے موسم میں موٹے موٹے کوٹ، اس پر کھانسی اور باتیں جوانی کی گویا زندگی کی بدترین (Tragedy) کے وہ غلام ایکٹر تھے۔ اس غلامی کے سوا اور اب کسی قابل نہ تھے۔ ڈاکٹروں سے مدد نہ لینے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

"فلک پیما"

فلک پیما کا خط

اُوپر کا مضمون پہلے عنوان کے بغیر موصول ہُوا تھا راقم الحروف نے عنوان لکھنے کے لئے مسودہ دوبارہ حضرت فلک پیما کی خدمت میں بھیجا تو عنوان کے ساتھ اُن کا یہ دلچسپ خط ملا چونکہ اس میں اوپر کے خیالات کی مزید تشریح ہے اس لئے میں نے اسے یہاں شائع کر دینا مناسب سمجھا۔

ڈیر حامد علی خاں صاحب تسلیم۔ لیجئے عنوان لکھ دیا ہے۔

اخلاقی طور پر میرا ایمان یہ ہے کہ اچھے وہ ہیں جو جوان مرجائیں۔ بڑھاپے میں شباب کا ماتم، خود اپنے مدفون شباب کا ماتم زندگی کا تاریک ترین پہلو ہے۔ وہ نمازیں جو وصل حور کی نیت سے ادا کی جاتی ہیں ڈاکے اور قتل سے کم نہیں۔

ملک الموت سے اور اس کے رفیقوں (ڈاکٹروں اور طبیبوں) سے مُنہ چھپاتے پھرنا بدترین بے حیائی ہے۔ جب چلنے کا وقت آئے تو انسان کے لئے جلد چل دینا ہی موزوں ہے۔ اٹک اٹک کے رُک رُک کے قبر کی منزل کو طے کرنا ایک قسم کا دیوانہ پن ہے۔ یہ وجہ ہے کہ بہت کم بوڑھے قابل عزت ہیں۔ شہد میں گھس کر مر جانے والی چیونٹی ان سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

آپ کا عزیز

سامانِ تسکین

دل کی دھڑکن سے عبارت ہیں اُمیدیں، اے دوست!
ہر ستارے کو تمنائے بقا ہوتی ہے۔

آرزوؤں کے سمندر کی اُبھرتے ہیں حباب
شب کے پہلو سے سحر جلوہ نما ہوتی ہے۔

کارواں چلتے ہیں منزل کا سہارا لے کر
اور منزل کی کشش راہنما ہوتی ہے۔

قطرے قطرے میں ہے طوفانِ تمنّا بے تاب
موجِ قلزم کے لئے آبلہ پا ہوتی ہے

ذرّے ذرّے سے جھلکتی ہے بیاباں کی طلب
پھول کے لب پہ گلستاں کی دعا ہوتی ہے۔

مضطرب ہے مرے دل میں بھی تو ارماں کوئی
جی رہا ہوں تو بھلا تم پہ ہے احساں کوئی؟

کچھ نہ کچھ باعثِ تسکیں بھی ہے مایوسی میں
ہر ستارے کی کرن نور میں ڈھل جاتی ہے

ذرّہ ہم پہلوئے ذرّہ نظر آ جاتا ہے
خار کی پھانس رگِ گل سے نکل جاتی ہے

متّصل چلتے ہیں دریا پہ حبابوں کے حباب
قسمتِ شب مہ و انجم سے بدل جاتی ہے

کارواں منزلِ مقصود کو جا لیتے ہیں۔
شبنم آغوشِ گلستاں میں مچل جاتی ہے۔

آرزو ہے تو مقابل نہیں طوفاں کوئی
تیز ہو لہر تو دیوار بھی گل جاتی ہے

تم میں، اور میرے خیالوں میں بہت دوری ہے
میری تسکین بھی آلودۂ مجبوری ہے۔

یوسف ظفر بی اے

کشمکشِ حُسن

موجزن دل میں شوق کی لہریں
شرم کے بوجھ سے جُھکی نظریں

ہر ادا مضطرب نظر بے کل
بے ضرورت سنبھالنا آنچل

دل کی اُمیدیں تشنۂ تکمیل
رنگ چہرہ کا شرم سے تبدیل

رنگ چہرہ کا نکھرا نکھرا سا
غازۂ شرم بکھرا بکھرا سا

سُرخ چہرہ ہری سی ساری میں
اک حسیں پھول جیسے کیاری میں

ہلکا ہلکا تبسّم سیمیں
مُسکرانا سا اِک گلِ رنگیں

ہر ادا انکسار میں ڈوبی
سر سے پا تک خمار میں ڈوبی

خود بخود گاہ مُسکرا دینا
کبھی شرما کے سر جُھکا لینا

خواہش اظہارِ شوق کی دل میں
شرم سے اِک عجیب مشکل میں

دل کی باتیں بھی کہہ نہیں سکتی
اور چپ بھی تو رہ نہیں سکتی

تراب رضوی جاذب

ہندوستانی موسیقی

فنِ تعمیر، فنِ بُت تراشی، فنِ مصوّری، فنِ شاعری اور فنِ موسیقی سب ملتے جلتے فن ہیں۔ سب حُسن کے مظہر ہیں اور جذبات کے محرّک۔ ان میں سے فنِ شاعری اور فنِ موسیقی ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ دونوں انسانی جذبات یعنی عشق و محبت، بیزاری و نفرت، ہمت و شجاعت، حبِ وطن اور حقیقت و معرفت کے ترجمان ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موسیقی ان جذبات کی ایک گونگی تصویر ہے اور شاعری ان کی مُنہ بولتی تصویر۔ شاعری اور موسیقی دراصل لازم و ملزوم ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر نامکمل اور ادھورے۔

موسیقی صرف دو چیزوں سُر اور تال سے مرکّب ہے۔ سُر موسیقی کی جان ہے۔ چنانچہ گانے والے کو سب سے پہلے یہ سبق دیا جاتا ہے کہ وہ سُر کو قائم کرے۔ سچے سُر کی پہچان یہ ہے کہ روشن اور عمیق ہو جس کو سُن کر نیند آنے لگے، جو سب طرف سے توجہ کو ہٹا کر اپنی طرف مائل کرلے۔ جو قائم ہو کر یہ معلوم ہو کہ ایک چراغ روشن ہے، جس کی آواز میں گونج اور رس ہو، جو کانوں کو میٹھا اور پیارا لگے۔ گانے میں زمزمہ اور تان نہ ہو تو سیدھا سادہ روکھا پھیکا گانا ہے۔ غیر متمدن قوموں اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کا گانا ایسا ہی ہوتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ باوجود اس قدر تہذیب و تمدّن اور ترقی کے جس کے ماننے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا مغربی اقوام کا موسیقی روکھا پھیکا بے مزہ اور منمنیانہ ہے۔ اس موسیقی میں زمزمہ اور تان وغیرہ یا تو ہیں نہیں یا اُس درجے اور پایہ کے نہیں جن کو ہم جانتے ہیں۔ نہ اس میں سُروں کی ایسی ترکیب و ترتیب ہے جن سے کسی راگ یا راگنی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھچ جائے۔ اس موسیقی کو عمر بھر سُنئے کبھی آپ کے ذہن میں اس کے سروں کا باہمی رشتہ نہ آئے گا۔ اگر کوئی دُھن اتفاقاً بنتی ہوئی معلوم بھی ہو تو سمجھ لیجئے کہ ہندوستانی موسیقی کی خوشہ چینی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انگلستان کے مشہور ادیب چارلس لیمب سے جب پوچھا گیا کہ تم موسیقی (انگریزی موسیقی) سے کیوں بھاگتے ہو۔ تو اُس نے یہ جواب دیا کہ میرے پاس موسیقی سننے کے کان ہی نہیں۔ یہی حال مشہور ڈاکٹر جانسن کا بھی تھا۔ جن کو مغربی موسیقی اچھا نہ لگتا تھا۔ کاش یہ لوگ ہندوستانی موسیقی کو سُنتے تاکہ ان کو معلوم ہوتا کہ یہ موسیقی انسانی جذبات کی کیسی ترجمانی کرتا ہے۔ مغرب کے مَردوں کا گانا تو سرے سے قابلِ ذکر ہی نہیں۔ وہاں کی خواتین بھی موسیقی کے مذاق سے بے بہرہ ہیں۔ یہ خواتین جب اپنی آواز کو لہراتی ہیں یا اُس میں درد پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو ہمارے کان عجب بے چینی محسوس کرتے ہیں۔ یہی حال کم و بیش ایشیا کے دوسرے ملکوں کا ہے۔ اور مغربی موسیقی تو محض دُھم دھم کے لئے موزوں ہے۔

ہندوستانی موسیقی سراپا درد ہے، جادو ہے، جذبات کا ایک سمندر ہے جو روتے انسان کو شگفتہ خاطر کردے۔ جو سنگدل سے سنگدل انسان کو رُلا دے، اس کے دل کو موم کردے، اُس میں عشق و محبّت کا جذبہ پیدا کردے، اور اُسے مرغِ بسمل کی طرح لوٹا دے۔ حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر ہندوستانی موسیقی کے موجدوں نے صرف چند سُروں سے راگ راگنی کی کیسی کیسی قسمیں ایجاد کیں اور اُن کو کس خوبصورتی کے ساتھ ملا جلا کر ایسا ٹھاٹھ تیار کیا جس کے سمجھنے کے لئے بھی ایک مدّت درکار ہے۔ زمزمہ تو گلے کی ایک قدرتی ودیعت ہے تان ایک ایسی چیز ہے جو اچھے گلے میں بھی بلا کافی مشق کے پیدا نہیں ہوتی۔ سچی تان کی تعریف یہ ہے کہ سُر میں ڈوبی ہوئی ہو اور اُس کا ایک ایک "دندونہ" الگ الگ روشن ہو۔ صحیح تان جب کسی گلے سے نکلتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجلی کوند گئی یا کوئی تیز رفتار ہلکی پھلکی ریل گاڑی "زن" سے نکل گئی۔

سُر اپنے مزاج کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ اثر رکھتے ہیں۔ بھاری سُر سنجیدہ و افسردہ، اور تیکھے سُر شگفتہ ہوتے ہیں۔ مگر شگفتہ سُر بھی باوجود شگفتہ ہونے کے خدا جانے کیوں درد پیدا کرتے ہیں۔ پچھلی رات اور صبح سویرے کی راگ راگنیاں نہایت افسردہ اور دردانگیز ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن میں مایوسی، دُکھ اور تکلیف کے مضامین بہت کِھلتے ہیں۔ صبح سے شام تک کی چیزوں میں بعض شگفتہ اور بعض افسردہ ہیں۔ شام کی چیزیں نہایت افسردہ اور بیراگ سندھیا پوجا اور عبادت کے مضامین کے لئے موزوں ہیں۔ شام کے بعد آدھی رات تک کی چیزیں عموماً شگفتہ اور اس کے بعد کی افسردہ ہیں۔ وقت کی پابندی گانے کا سماں باندھنے میں امداد کرتی ہے۔ مگر باکمال گانے والے کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں بشرطیکہ اُس کا دل گانے وقت گواہی دے اور گانا اُس کے دل اور احساس کی روح سے نکلے۔

جس طرح شاعری میں قصیدے غزل وغیرہ کی جدا جدا شکلیں ہیں، اُسی طرح موسیقی میں دُھرپد، خیال، ٹپہ، ٹھمری اور غزل کی ترکیبیں ہیں۔ اور سرگم اور ترانہ گویا راگ راگنیوں کی گردانیں ہیں۔ دُھرپد، خیال اور ٹپہ سنجیدہ گانوں کے لئے ہیں اور اُن کو سُن کر طبیعت تفکّر کی طرف مائل ہوتی ہے۔ غزل دادرے اور ٹھمریاں عاشقانہ جذبات کے لئے موزوں ہیں۔ دادرے اور قوّالی کی طرزیں خاص طور سے موجبِ تفریح ہیں۔

موسیقی کا دوسرا جزو تال ہے۔ یہ گویا سروں کا ایک بندھا ہوا ضابطہ ہے جسے کسی حال میں توڑا نہیں جا سکتا۔ سُر اگر قاعدے سے ادا نہ کئے جائیں تو گانے والا "بے سُرا" کہلاتا ہے اور تال کی پابندی نہ رکھی جائے تو گانا "بے تالا" ہو جاتا ہے۔ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ تال اور سُر کے عیوب کو کان بالکل اِس طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح مصرع اور شعر کا وزن سے گرجانا پہچان لیا جاتا ہے، اتنی بات ضرور ہے کہ تال کے پہچاننے کے لئے سُر سے زیادہ واقفیت کی ضرورت ہے جو اکتساب سے حاصل ہوتی ہے۔ تال کا پھیلاؤ بھی سُر کے پھیلاؤ سے کچھ کم نہیں۔ اِس کی قسمیں بھی جُدا جُدا اور پُر لطف کیفیت رکھتی ہیں۔ تال بھی شگفتہ اور افسردہ دو طرح کی ہوتی ہے۔ مثلاً دُھرپد، خیال ٹپّہ اور ٹھمری کی تال دبی دبی اور باوقار ہوتی ہے، اسی لئے افسردہ اور سنجیدہ ہوتی ہے۔ دادرے کی تال تیز اور چنچل ہوتی ہے، اس لئے وُہ رقص پر آمادہ کرنے کی قوت رکھتی ہے۔

تال کا حساب علم الحساب کا سا ہے جس کو ہر وقت دھیان میں رکھنا پڑتا ہے اور اچھے اچھے گانے والے اِس حساب کو گاتے وقت بھول جاتے ہیں۔ شاعری کی جس قدر بحریں اُردو، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی میں پائی جاتی ہیں اُن سب کے موافق کوئی نہ کوئی تال ہے۔ تال میں ایک مقام سم کا ہوتا ہے۔ اِس مقام کے لئے یہ شرط لازمی ہے کہ گانے والا جب سانس لینا چاہے اور ٹھہرے تو اسی مقام پر آکر ٹھہرے ورنہ گانے والے اور تال دینے والے کا ساتھ قائم نہ رہ سکے گا، اور سارا گانا بے مزہ ہو جائے گا۔

یوں تو محض تال اور سُر ہی موسیقی کا اثر رکھنے والی چیزیں ہیں مگر جب تک اُن کے ساتھ بول اور لفظ نہ ہوں اُن کی مثال ایسی ہے جیسی تصویرِ بے جان کی۔ مکمل اثر پیدا کرنے کے لئے سُر کی بھی ضرورت ہے تال کی بھی اور الفاظِ موزوں یعنی بولوں کی بھی۔ دوسرے الفاظ میں یہ سمجھئے کہ موسیقی کے لئے شاعری کی بھی ضرورت ہے۔ جس قدر اعلیٰ درجے کی شاعری ہو گی اُسی قدر موسیقی کا رنگ اُس پر کھلے گا۔

اچھی موسیقی کے لئے خوش گلوئی بڑی شرط ہے۔ بھدّے گلے سے زمزمہ تان اور خود سُر بھی خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہوتے۔ اور اُن کو سُن کر طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدی نے ایک کریہہ الصوت گانے والے کو سُن کر ہی یہ کہا تھا کہ گر تو قرآں بریں نمط خوانی بیبری رونقِ مسلمانی۔ حقیقت میں خوش گلوئی اتنی بڑی صفت ہے کہ گانے والے کی ساری قابلیت اور ہنر ایک طرف اور یہ ایک طرف۔

گانے والے کے لئے دوسری نہایت ضروری بات یہ ہے کہ وہ اشعار پر دُھن لگاتے وقت اِس بات کا خیال رکھے کہ جو مضمون میں گانا چاہتا ہوں وہ کس خاص دُھن میں اور کس خاص تال میں کامیابی کے ساتھ گایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے ہر دھن اور تال کا مزاج جُدا جُدا اور اُس کی کیفیت مختلف قسم کی ہے۔ ہر مضمون پر ہر طرح کی دُھن اور ہر طرح کی تال لگائی نہیں جا سکتی۔ تفریحی گانے، غزل، ٹھمری اور دادرے کی طرزوں میں گائے جاتے ہیں۔ اور سنجیدہ اور تفکّر انگیز گانے دُھرپد خیال اور ٹپّہ کی طرزوں اور تالوں میں۔ بالفاظِ دیگر غم کے لئے غم کا مضمون، غم کی تال اور غم کی راگنی کی ضرورت ہے، اور خوشی کے لئے خوشی کے مضمون، خوشی کی دُھن اور خوشی کی تال کی۔ جو گانے والا اِس نکتہ سے بے خبر ہے اُس کا گانا اثر سے خالی ہے۔ اِس نکتہ کو لکھنؤ کے بعض باکمال مرثیہ خوانوں نے جیسا سمجھا ہے ویسا شاید کسی نے نہیں سمجھا۔ یہ لوگ مضمون اور دُھن کی مطابقت کو خوب سمجھتے ہیں۔ یعنی جہاں بہاریہ مضمون ہوتا ہے وہاں اُس کے ساتھ "سوز" بھی بہاریہ ہوتا ہے۔ اور جہاں غم انگیز مضمون ہوتا ہے وہاں اُس کے ساتھ ویسا ہی "سوز" بھی ہوتا ہے۔ اِس نکتہ سے بڑے بڑے مشّاق گانے والے بے خبر ہوتے ہیں۔

گانے والے کے لئے ایک اور بات کی بھی ضرورت ہے۔ ہندی گانے یعنی دُھرپد خیال ٹھمری ٹپّہ اور دادرا مختصر ہوتے ہیں ان میں غزل کی طرح زیادہ اشعار نہیں ہوتے ان ہندی بولوں کی تکرار بار بار چاہے کتنے ہی ہنر کے ساتھ کی جائے طبیعت اُس کو سُن سُن کر مکدر ہو جاتی ہے۔ اِس لئے گانے والے کو چاہئے کہ وہ اپنے گانے میں مختلف مگر مناسبِ موقع اشعار یاد رہے شامل کرتا رہے تاکہ ایک ہی طرح کا رنگ بُرا اثر پیدا نہ کرے۔ دوسری ترکیب یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اصل چیز میں کہیں کہیں دوسرے راگ یا راگنی کا رنگ دکھایا جائے۔ یہ ذرا مشکل بات ہے مگر ہے کام کی۔

ہندوستانی موسیقی میں بہت سے راگ اور راگنیاں روکھی پھیکی اور بے مزہ ہیں۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے آپس میں ایک آدھ سُر کا ہی فرق ہوتا ہے۔ اِن کو وہی لوگ فخر سے گاتے ہیں جن کو اپنی اُستادی کا دعوےٰ ہوتا ہے۔ مگر اس اُستادی کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ سننے والے اُن کی خاطر سے اُن کی محنت کو دیکھ کر مجبوراً اُن کی تعریف کر دیتے ہیں۔ ورنہ دراصل ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ ایسے گانے کو یہ لوگ "پکا گانا" کہتے ہیں گویا اُن کے نزدیک دوسری ہر قسم کی چیزیں کم درجے کی ہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ مُشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ ایسی راگنیاں اور راگ ترک کرنے کے لائق ہیں اور اُن کا عام پسند اور مروّج نہ ہونا اِس امر کی دلیل ہے کہ وہ کسی کام کے نہیں۔

بعض مغربی نقادوں کا اعتراض ہندوستانی موسیقی پر یہ ہے کہ اس میں "ہارمنی" نہیں یعنی سنگت میں اس کے ساتھ بہت سے ساز نہیں ہوتے۔ یہ اعتراض ایک اصولی غلطی پر مبنی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کا مقصدِ اعلیٰ ایک مستقل اور دیرپا اثر سامعین کے دلوں پر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ غُل مچانا اُس کا مقصد نہیں ہوتا۔ اِسی لیئے اُس کی سنگت میں جہاں تک مناسب معلوم ہوتا ہے ساز کم ہی رکھے جاتے ہیں اور وہ ساز بھی ایسے ہوتے ہیں جن کی آوازیں گانے والے کی آواز سے دب کر رہیں نہ یہ کہ اُس کی آواز پر غالب آجائیں اور گانے کے مضمون کو غارت کر دیں۔ ہاں جہاں کہیں غل مچانے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں بہت سے سازوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ جیسے قوالی کی محفل میں۔ مگر یہ طریقہ عوام الناس کے مذاق کا ہے۔ البتہ اِس اعتراض کے دُور کرنے کے لیئے جو طریقہ آرکسٹرا کا جدید نکالا گیا ہے وہ کوئی بُرا طریقہ نہیں۔ مگر یہ یاد رہے کہ یہ طریقہ صرف سازوں کی موسیقی سے ہی متعلق ہے۔ گانے والا آرکسٹرا کی سنگت میں کبھی نہیں گا سکتا۔

موسیقی ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں اِس قدر دخیل ہو گیا ہے کہ اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اِس کا سُننا جائز ہے یا ناجائز۔ گھر گھر میں ریڈیو لگا ہے جس کو بچے بوڑھے اور مستورات سب سنتے ہیں۔ ہماری رائے تو اس کے متعلق یہ ہے کہ جہاں اِس زمانے میں اور بہت سی لبھانے والی باتیں علی الاعلان موجود ہیں وہاں ایک یہ بھی سہی۔ عقلمند کو عربی کے اس مقولے پر عمل کرنا چاہیئے "خُذ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدر"۔ موسیقی دراصل بذاتِ خود کوئی بُری چیز نہیں۔ یہ انسانی تفکرات کا دُور کرنے والا، غم غلط کرنے والا، اور بعض صورتوں میں دل کو عبادت کی طرف راغب کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ ہندوستانی موسیقی اگر فی الحقیقت اعلیٰ درجے کا ہو، ایک حسین چیز ہے اور ایک مستقل لطف اور دلچسپی کا باعث۔ یہ منجملہ اُن چند چیزوں کے ہے جن پر ہمارے ملک کو بجا طور سے فخر ہو سکتا ہے۔

سید نذیر حسین ناشاد

قطعات

(۱)

تیری ہر بات، بات ہے پیارے
فیصلہ تیرے ہات ہے پیارے
تو کہے دن تو رات بھی دن ہے
میں کہوں دن تو رات ہے پیارے

(۲)

تو اگر مہرباں نہیں، نہ سہی!
میں اگر شاداں نہیں، نہ سہی
دائمی موت ہی عطا فرما!
زندگی جاوداں نہیں، نہ سہی

مجید لاہوری

غزل

کس طرح آپ دکھاتے ہیں یہ جلوا مجھ کو
میرا نظارہ بنا جاتا ہے پردا مجھ کو

بت کدہ ہو کہ حرم اس سے غرض کیا مجھ کو
کرنا آتا ہے ترے نام کا سجدا مجھ کو

میرے ہی دل کی ضیا طور پہ جا چمکی تھی
جلوۂ غیر نہ تھا جو نظر آیا مجھ کو

غالباً میری تمناؤں میں کچھ خامی تھی
ہر قدم پر جو ملا داغِ تمنا مجھ کو

تم تو ملتے مجھے، دنیا نہ ملی تو نہ سہی
واسطہ تم سے ہے دنیا سے غرض کیا مجھ کو

دیکھنے تم بھی اس آئینے میں اپنی تصویر
کر دیا ہے مری حیرت نے تماشا مجھ کو

سنتے سنتے مرے شیون یہ سمجھ کر ہنستے
دیکھتے دیکھتے ہو جائے گا سودا مجھ کو

وہ بھی دن یاد ہیں ڈھونڈے سے نہ ملنے والے!
ہر طرف ڈھونڈ رہا تھا ترا جلوا مجھ کو

حشر میں بھی ہے وہی حسن کے چہرے پہ جلال
میں جہاں پہنچا ملی ایک ہی دنیا مجھ کو

ہو چلے تھے حرم و دیر میں سجدے گمراہ
مل گیا وہ تو ترا نقشِ کفِ پا مجھ کو

داغہائے غمِ احسن[1] سے ہے سینہ لبریز
اور کیا دیتی بھلا آ کر یہ دنیا مجھ کو

ابر احسنی گنوری

[1] خلد آشیانی حضرت احسن مارہروی مغفور

سازِ دل

مطرب یہ ساز تیرا
دل ہو گیا ہے میرا!

فردوس کے یہ نغمے
دل میں اتر رہے ہیں
رگ رگ میں دوڑتے ہیں
بجلی سی بھر رہے ہیں ——

اِن انگلیوں کی لرزش
مضرابِ زندگی ہے
تارِ نفس سے لگ کر
نغمہ سا بھر رہی ہے ——

دیپک کی شعلہ ریزی
تن من جھلس رہی ہے
پیاری سی جھنجھناہٹ
رگ رگ کو کس رہی ہے ——

ہے روح میری بے کل
اعصاب میں ہے ہلچل
بھاری ہے ایک اک پل
اے گیت ساتھ لے چل ——
دل ہو گیا ہے میرا
مطرب یہ ساز تیرا!

مقبول احمد پوری

ماہیا[1]

(۱)

یہ حسن کی دُنیا ہے اس خاک کا ہر ذرّہ ہم دوشِ ثریّا ہے
یہ حُسن کی دُنیا ہے

(۲)

گردوں پہ ستارے ہیں دوشیزۂ فطرت کے معصوم اشارے ہیں
گردوں پہ ستارے ہیں

(۳)

ہر پھُول ہے پیمانہ ہر شاخ کے پہلو میں آباد ہے مَے خانہ
ہر پھُول ہے پیمانہ

(۴)

اِک طُرفہ مسّرت ہے آغاز ہے اُلفت کا انجام سے غفلت ہے
اِک طُرفہ مسّرت ہے

(۵)

اِتنا بھی نہ اِتراؤ توہینِ وفا کب تک روٹھے ہو تو من جاؤ
اِتنا بھی نہ اِتراؤ

قطعات

(۱)

ناصحا اب نہ یہ سنا ہم کو زندگی عارضی ہے فانی ہے
یہ سہانی گھڑی یہ چاندنی رات غیر فانی ہے جاودانی ہے

(۲)

مجھ سے ناراض ہو گئے ہو تم کوئی تقصیر ہو گئی ہے کیا؟
کس کے خوابوں میں کھو گئے ہو تم میری تقدیر سو گئی ہے کیا؟

سید اصغر علی

[1] پنجابی گیتوں کی ایک قسم۔

امام الدین

امام الدین کی وفات کو تقریباً دو سال ہونے کو آئے لیکن اُس کی شخصیت اور کردار کے نقوش میری یادداشت کے صحیفہ پر ابھی تک نمایاں ہیں۔ ممکن ہے کہ تاریخ کے طالب علم کو اس کی سیرت میں کوئی کشش نظر نہ آئے کیونکہ وہ کوئی سپاہی۔ لیڈر یا بہادر جرنیل نہیں تھا لیکن جہاں تک انسانی نفسیات اور رجحانات کا تعلق ہے۔ وہ اپنی وحشت اور نیم دیوانگی کے باوجود وزیرآباد میں ہمارے محلے کی ایک نہایت ہی دلچسپ ہستی تھا۔

اُس کی تمام عمر میرے بچپن کے ساتھی اور عزیز دوست منظور حسین صاحب کے ہاں بیت گئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے گھر میں اُسے ایک بزرگ فرد خاندان کی تمام مراعات حاصل تھیں۔ وہ منظور صاحب کو چشم نمائی کر سکتا تھا۔ اُن کے بڑے بھائی شفیع صاحب سے تو اکثر اُس کی دانتا کلکل رہتی تھی۔ کیونکہ وہ اُس کا نام بگاڑ کر اُسے عام طور پر امام الدین کی بجائے "ماموں" کہا کرتے تھے۔ خود منظور صاحب کے والد اُس کی بہت ناز برداری کرتے تھے۔ محلے کے دوسرے گھروں میں بھی امام دین بے روک ٹوک آجا سکتا تھا۔ عورتیں اُس سے اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری کے لئے دعائیں منگواتی تھیں اور بچے تالیاں پیٹتے ہوئے اُس کے آگے پیچھے دوڑتے پھرتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب اُس سے ایک دو دن کے لئے ملاقات نہ ہوسکتی تو میں یوں محسوس کرتا جیسے میری زندگی کے روزانہ معمول میں کوئی فرق آگیا ہے۔ ہمارے شاعروں نے گریباں چاکی کو عاشق کی نشانی قرار دیا ہے اور اس نظریہ کے لحاظ سے امام الدین بہت بڑا عاشق تھا۔ گرمی ہو یا سردی، بارش ہو یا آندھی اُس کا گریبان ہمیشہ کھلا رہتا تھا اور اس کے ننگے فراخ سینے پر بالوں کی گھنی فصل ہمیشہ نظر آتی تھی۔

اب بھی اُس کی تصویر بالکل سامنے ہے۔ میانے سے کچھ نکلتا ہوا قد۔ گندمی رنگ۔ گھنے ابرو جن کی سفیدی صبح پیری کے طلوع کا پیغام دے رہی تھی۔ آنکھوں پر کچھ ایسا بوجھ گویا ہر چیز کو غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چھوٹی سی داڑھی جس پر وقت نے اپنی افشاں چھڑک رکھی تھی۔ اوپر کا ہونٹ درمیان سے کٹا ہوا شاید یہی وجہ تھی کہ جب وہ بات کرتا تو منہ سے تھوک اُڑ کر داڑھی میں موتی بکھیر دیتا۔ سر کبھی بالکل گھٹا ہوا اور کبھی پریشان اور گرد آلود بالوں سے ڈھکا ہوا۔ اکثر ننگے پاؤں چلتا تھا اور اسی لئے اُس کے تلووں پر ایک ایسی سخت تہ پیدا ہوگئی تھی جس نے اُسے جوتے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ چلتا تو دونوں ہاتھ پیٹھ پر رکھ لیتا تھا۔ اُس کی چال میں رقص کا ایک عنصر تھا۔ یعنی چلتے چلتے داہنی طرف خاص جھکاؤ پیدا کرکے پھر فوراً ہی جسم کا توازن قائم کر لیتا جیسے گرتے گرتے سنبھل گیا ہو۔ چلتے وقت دونوں ہاتھ پیٹھ پر رکھنے کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ اُسے کتوں سے بہت دشمنی تھی۔ اس لئے وہ بالعموم اپنے ہاتھوں میں اینٹ یا پتھر رکھتا تھا۔ جب کوئی انجان یا غیر محتاط کُتّا اُس کے نشانے کی زد میں آتا تو وہ اُس پر اینٹ یا پتھر دے مارتا اور کُتا چوں چوں کرتا ہوا بھاگ نکلتا۔ اُس وقت امام الدین کی آنکھوں میں کامیابی کی خوشی چمک اُٹھتی اور وہ پسپا ہوتے ہوئے فریادی کُتے کی طرف ایک ایسے فاتحانہ تبسم کے ساتھ دیکھتا جو ہر کامیاب نشانہ لگنے کے بعد غیر شعوری طور پر شکاری کے ہونٹوں پر آجاتا ہے۔ امام الدین کو ہم لوگ مولوی کہا کرتے تھے اور وہ اس خطاب کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ میں نے سُنا ہے کہ نماز کی پابندی اُس نے مرض الموت کے ایام میں بھی نہیں چھوڑی۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کے "دشمنوں" نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وضو اور نماز کی رکعتوں کے بارے میں وہ شرعی احکام کا کچھ ایسا پابند نہیں تھا۔ امام الدین کو مولوی کہنے کے لئے ہمارے پاس ایک وجہ اور بھی تھی۔ عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے دوران میں اس نے بے شمار تقریریں اور نظمیں سُنی تھیں اور اِن تقریروں اور نظموں نے اُس کے ذہن پر کچھ مبہم اثرات چھوڑے تھے۔ اِن اثرات کے اظہار کے طور پر اُس نے ترنم کے ساتھ تقریر کرنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں کسی نے "مولوی امام الدین زندہ باد" کے نعروں سے گرمایا۔ وہ اپنی مترنم تقریر شروع کر دیتا۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ اُس کی تقریر میں "برطانیہ" "ہمارا" "خدا" اور "اور کہ" کے الفاظ کے سوا کبھی اور کوئی لفظ میری سمجھ میں آیا ہو۔

امام الدین نے مارشل لا کے زمانے میں پکڑ دھکڑ ہوتے بھی دیکھی تھی اس لئے سپاہی کا لفظ آخری دم تک اُس کے سینے کا کابوس بنا رہا چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ بازار میں امام الدین کی سماعت میں کسی نے سپاہی کا نام لیا اور امام الدین نے گھر کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ بازار میں بگڑے دل پکارتے "دیکھنا! دھوتی جانے نہ پائے"۔ امام الدین دوڑتا جاتا اور ساتھ ساتھ اپنی تسکین کے لئے پیچھے مُڑ مُڑ کر بھی دیکھتا جاتا۔ امام الدین کو

شفیع صاحب کے بچوں سے بہت محبت تھی۔ وہ خود انہیں گھوریں بھی لیتا تھا لیکن وہ یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ اُن کی طرف کوئی اور آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے۔ اس لئے شفیع صاحب اگر کبھی بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے تو امام الدین اپنا سینہ پیٹنے لگ جاتا اور چیخ چیخ کر اس قدر سخت احتجاج کرتا کہ شفیع صاحب کو ہتھیار ڈالنے پڑتے۔ اصل میں اُس کی محبت میں شدت کو بہت دخل تھا۔ اُس کے دل میں جس آدمی کے متعلق اچھا خیال پیدا ہو جاتا اُس کی نسبت وہ اپنی رائے کبھی تبدیل نہیں کرتا تھا۔ تحریکِ شہید گنج کے دنوں میں وہ محلے کی مسجد کے چبوترے پر کھڑے ہو کر مجلسِ احرار پر تبرے بھیجا کرتا تھا۔ لیکن اُس کی تقریر کی تان ہمیشہ "عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد" پر ٹوٹتی تھی۔ وہ شاہ صاحب کے متعلق کوئی گستاخانہ فقرہ نہیں سن سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے سامعین میں سے اُسے چھیڑنے کے لئے اگر کوئی "عطاء اللہ شاہ بخاری مردہ باد" کا نعرہ لگاتا تو وہ فوراً نعرہ لگانے والے کی طرف اشارہ کرکے پکار اُٹھتا "مرزائی مردہ باد" "کافر مردہ باد" وہ اس بات کو ماننے سے متواتر انکار کرتا رہا کہ شاہ صاحب اُس مجلسِ احرار کے رکن ہیں جس کو وہ مسجدِ شہید گنج کے انہدام کا ذمہ دار قرار دیتا تھا۔ امام الدین نے کہیں سے یہ مسئلہ سن لیا تھا کہ مسلمانوں کو آپس میں ناراض نہیں رہنا چاہیئے۔ منظور حسین صاحب ہمارے دوست لطیف صاحب کو دق کرنے کے لئے اُس کے اس اعتقاد کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتے۔ چنانچہ وہ امام الدین کو مخاطب کرکے بڑے تعجب سے کہتے۔ "مولوی! تم نے لطیف صاحب کو ناراض کیوں کر دیا ہے" اور جب وہ انکار کرتا۔ تو کہتے "اچھا اگر تم ناراض نہیں ہو تو مسلمانوں کی طرح لطیف صاحب کے گلے مل کر دکھاؤ" اب لطیف صاحب کتراتے ہیں اور امام الدین اپنے گرد سے اٹے ہوئے جسم اور پسینہ سے شرابور کپڑوں کے ساتھ اُن کی طرف بازو پھیلائے بڑھ رہا ہے۔ لطیف صاحب لاکھ کہتے ہیں کہ "مولوی صاحب میں راضی میرا خدا راضی" لیکن منظور صاحب اُسے برابر اُبھارتے جاتے ہیں اور لطیف صاحب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں "بھئی اب تو صاف پتہ چل گیا کہ تم مولوی صاحب نے ناراض ہو گر ناراض نہیں ہو تو اُن سے بغل گیر کیوں نہیں ہوتے"۔ یہ سُن کر امام الدین اور بھی آگے بڑھتا لطیف صاحب بھاگنے کی کوشش کرتے۔ اس کشمکش میں کبھی تو ہم انہیں جبراً پکڑ کر مولوی صاحب سے بغل گیر کرا دیتے۔ اور کبھی کبھی وہ بھاگ کر جان چھڑا لیتے تھے۔

امام الدین اصل میں جہلم کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ کئی دفعہ بیمار ہوا مگر وطن کی یاد نے اُسے کبھی نہیں ستایا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مرض الموت میں وطن کی کشش نے بے تاب کر دیا تھا۔ چنانچہ اُس کی خواہش پر منظور صاحب کے والدِ محترم نے اُسے وطن بھجوا دیا۔ روانگی کے وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگا۔

"جب منظور کے ہاں بیٹا ہو تو مجھے خط ضرور لکھنے گا"

سب نے اُسے دلاسا دیا کہ تمہیں ضرور اطلاع دیں گے اور پھر تم آ جانا۔ لیکن وہ واپس آنے کے لئے تو گیا ہی نہ تھا۔ جہاں کی خاک تھی وہیں کی مٹی میں مل گئی۔

عطاء اللہ سجاد

غزل

پھر اُس پہ روزگار کا قابو نہ چل سکا	جو دل تری نگاہ کی زد سے سنبھل سکا
شاہد ہے تو کہ مجھ کو غمِ دل عزیز تھا	دونوں جہاں کا عیش نہ جس کو بدل سکا
دلبستگی کے دہر میں ساماں ہزار تھے	تیرے بغیر دل نہ ہمارا بہل سکا
محشر میں انتظار کی یہ لذتیں کہاں	کچھ اور تیرا وعدۂ فردا نہ ٹل سکا

حسرت مزاجِ یار کا اللہ رے احترام
اِک حرفِ مدعا بھی نہ لب سے نکل سکا

حسرت ترمذی

غزل

دل میں فراق پھر بھڑک اٹھی یہ کیسی آگ
دُنیا سدا بہار محبت سدا سُہاگ

کیا چیز سوزِ عشق تھا مجھ کو بھی یاد ہے
وہ دھیمی دھیمی آنچ سی وہ اک دبی سی آگ

تو چونک اُٹھا ہے عشق کے خوابِ نشاط سے
اب وقت ہے کہ غم کے بھی خوابِ گراں سے جاگ

میں عشقِ بے نیاز ہوں تو حسنِ بے نیاز
بے لاگ دیکھ کتنی ہے یہ میری تیری لاگ

پھر مُسکرا کے کھول رہا ہے کوئی کواڑ
پھر مدتوں کے بعد کھلے ہیں کسی کے بھاگ

وُہ نو بہارِ ناز ہے آغازِ صد بہار
اِک ادھ کھلا سا غنچہ ہے اک ادھ سُنا سا راگ

دل میں نشاطِ عشق کو میں پالتا تو ہوں
ڈر ہے کہ وقت پا کے کہیں ڈس نہ لے یہ ناگ

اہلِ وفا پر آج بپتی پڑتی ہے بہار
خود اپنے اپنے خون سے کھیلا ہے سب نے پھاگ

اے نرگسِ سیاہ کسی اور شکل سے
ہو جاگنا محال تو جادو ہی بن کے جاگ

بچنا ہے موت سے تو نہ کر زندگی کی فکر
جس رستے موت آئے اُسی رستے تو بھی بھاگ

تیری صدا سے اب بھی تاروں میں تھرتھری
تو دے رہا ہے بند بھی ہو کر وہ راگ

کیوں ہے اُڑا اُڑا سا ترا رنگِ رخ فراق
دنیا سدا بہار محبت سدا سہاگ

فراق گورکھپوری

غزل

ہنسے گا کوئی، کوئی روتا رہے گا
اسی طرح دنیا میں ہوتا رہے گا

نہ چرخ تا حشر نیرنگِ عالم
یونہی رنج و راحت سموتا رہے گا

تصوّر ترا میری آنکھوں کے تارے
کلیجے میں نشتر چبھوتا رہے گا

غمِ ہجر میں اب نہ آنسو تھمیں گے
ہمیشہ دلِ زار روتا رہے گا

عقوبت میں گزرے گی فرقت زدوں کی
وہ جاگیں کے سنسار سوتا رہے گا

ان آنکھوں سے آنسو برستے رہیں گے
ستم دیدہ دامن بھگوتا رہے گا

چلی جائیگی اُٹھ کے میّت ہماری
سیہ خانہ میں شور ہوتا رہے گا

فہیم اب تو کچھ ہوش کی لے خدارا
کہاں تک یونہی وقت کھوتا رہے گا

میرزا فہیم چغتائی

فرض

جس طرح ایک ہی شہر کے دو شخص کسی اجنبی شہر میں مل کر اپنے آپ کو ایک دوسرے کے بہت قریب پاتے ہیں اسی طرح دو ہمسایہ ملکوں کے رہنے والے جب دنیا کے اس سرے پر ایک دوسرے سے ملے تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے چین اور جاپان ایک دوسرے میں پیوست تھے اُسی طرح جیسے دو دانق کے پاس دو درخت ایک دوسرے سے فاصلے پر ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے گتھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور امریکا جیسے ملک میں بیٹھ کر انہوں نے ایک دوسرے کو اپنا ہمسایہ محسوس کیا۔ کائی سو جاپان سے امریکا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آیا ہوا تھا اور لوسی اپنے باپ کے ساتھ جو ایک چینی تاجر تھا نیویارک میں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ دونوں کلب میں اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے اور دوستوں کی طرح وہاں سے نکلے۔ کچھ دنوں میں دونوں کی فرصتیں ایک دوسرے کے لئے وقف ہو گئیں اور جب وہ اپنے وطن کی باتیں کرنے لگتے تو معلوم ہوتا کہ انہوں نے دو ہمسایہ ملکوں میں نہیں ہمسایہ گھروں میں جنم لیا تھا۔

اور ایک دن دبی زبان سے کائی سو نے لوسی پر اپنی محبت بھی ظاہر کر دی۔ ایک مشرقی لڑکی جس طرح بے صبری سے اس دبے پاؤں آنے والی محبت کا انتظار کرتی ہے اور اشتیاق اور شرم کے جن ملے جلے جذبات سے اس کا استقبال کرتی ہے لوسی نے بھی کیا اور لمبے چہروں اور ستواں ناک والوں کے ماحول میں رہ کر جو اسے غلط فہمی ہو گئی تھی کہ چپٹی ناک اور گول چہرہ بدصورتی کی علامتیں ہیں دور ہو گئی اور اس نے بھری محفل میں جلتی ہوئی اس شمع کی طرح جس کے گرد کوئی پروانہ نہ ہو اپنے اس ایک ہی پروانے کو بڑی فراخدلی سے اپنی آغوش میں جگہ دی۔ انہوں نے سول میرج کر لی۔

اور جب کائی سو وطن روانہ ہونے کی تیاریاں کرنے لگا اور اس نے لوسی کو بھی اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا تو اُس نے بالکل اس مشرقی عورت کی طرح جو اپنے شوہر کی بات نہ ماننا گناہ سمجھتی ہے ہامی بھر لی اور اپنے والد کے روکنے کے باوجود تیار ہو گئی۔

جاپان پہنچ کر کائی سو کے رشتہ داروں اور والدین نے بڑی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا اور وہ کچھ دن ٹھہر کر ملک کی سیر کو روانہ ہو گئے اسی دوران میں چین جاپان کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور جاپانی نوجوان آ آ کر فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ سینکڑوں روزانہ بھرتی ہوتے۔ تربیت حاصل کرتے اور محاذ پر بھیج دئے جاتے جہاں وہ یہ سمجھے بغیر کہ وہ کیوں لڑ رہے ہیں لڑتے۔ توپوں کی گرج اور سرنگوں میں سے دھوئیں کے ابلتے ہوئے فواروں میں ان کی روحیں تلملاتیں اور بموں کے دھماکوں میں ان کی روحیں چیخ چیخ کر ریزہ ریزہ ہو جانے والے جسموں میں سے نکل جاتیں۔ سپاہیوں کے سامنے گولے پھٹتے۔ زمین کے پرخچے اُڑتے۔ گولیوں کی باڑھیں چلتیں لیکن وہ ان سب آوازوں کی طرف سے کان بند کئے صرف ایک آواز "بڑھے چلو! بڑھے چلو!" سنتے اور ہولناک مناظر کے لئے بے حس آنکھیں صرف بندوقوں کی نالیں دشمنوں کی طرف سیدھی جمائے رکھنے کا کام دیتیں۔ آگے بڑھنے والے قدم چاہے انہیں موت کے دروازے پر پہنچا دیں چاہے فتح کے دروازے پر۔ وہ ان باتوں سے بے پروا آگے بڑھتے اور کٹ مرتے۔ خون کے فوارے چھوٹتے اور جنگ کے دیوتا کی پیاس اور بڑھتی جاتی۔ وہ شیر بیان جنہوں نے اپنے بچے اسی نیت سے پالے تھے کہ وطن کی آن پر کٹ مریں گے ہنسی خوشی رخصت کرتے ہوئے ان سے کہتیں بیٹا شکر کرو کہ خدا نے تمہیں اپنے وطن کے بہادروں اور شہیدوں میں شامل ہونے کا موقع دیا ہے اور انہیں اپنے بھائیوں کو پرانے بہادروں کے گیت سنا سنا کر اُن کی ہمت افزائی کرتیں۔ بیویاں "تمہارے سوا میرا کوئی نہیں" کہہ کر رونے کی بجائے پھولوں کے ہار پہنا کر بخیر و عافیت فاتح واپس آنے کی دعائیں کرتیں اور اس طرح بہادر سپاہی وطن کی عزت پر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کے لئے جنگ کو روانہ ہو جاتے۔ ہوائی جہاز فضا میں چیلوں کی طرح پرواز کرتے ہوئے غراتے اور آگ کی بارش سے دشمن کے اوسان خطا کر دیتے اور جب ملک کو نوجوانوں کی ضرورت پڑ گئی تو کائی سو نے بھی فوج میں بھرتی ہو کر ایک دستے کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔

میدانِ جنگ میں لوسی بھی جسے موجودہ فنونِ حرب سے کافی واقفیت تھی کائی سو کے ساتھ تھی۔ وہ اس سے لمحہ بھر کے لئے بھی جدا ہونا نہ چاہتی تھی۔ کائی سو کا دستہ کئی جگہ فتوحات حاصل کر چکا تھا۔ اس کے دستے نے چینی گبھروں کے پرخچے اُڑا دئے تھے۔ کئی گاؤں کو لوٹا تھا۔ لڑائی شروع ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ چینی مغلوب ہوتے جا رہے تھے مگر ایک سرکش چینی سردار اب تک جاپانیوں کو ناک چنے چبوا رہا تھا اور یہ تھا جنرل جان نانگ ٹنگ کائی سو تک خبر پہنچی تھی کہ جنرل جان سامنے والی پہاڑیوں میں فوج جمع کر رہا ہے اور وہ ایک دو دن میں حملہ کیا ہی چاہتا ہے وہ جنرل جو چین

کی آزادی کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہا تھا جس کا احسان چین کے بچے بچے کی گردن پر تھا اور جس کا نام لے کر ہر چینی کا سر احترام سے جھک جاتا تھا۔ وہی جنرل جس کے خلاف جاپانی اخبار دن رات زہر اگلتے رہتے تھے اور بعض اسے پہاڑی چوہا جیسے خطاب سے بھی سرفراز کرتے تھے وہی جنرل چان جس نے چین کی آزادی کے گلے میں پڑے ہوئے پھندے کو کاٹ کے رکھ دیا تھا اور جس نے چینی عظمت کے ڈھلکتے ہوئے سر کو ایک بار پھر سنبھال لیا تھا۔ وہی چینیوں کی عظمت ہستی اور جاپانیوں کا پہاڑی چوہا، سامنے والی پہاڑی میں فوج جمع کر رہا تھا تاکہ کائی سو کے دستے پر حملہ کر کے ان توقتاک دشمنوں کو اپنی سرحد سے باہر بھگا دے۔

کائی سو نے یہ خبر سنی تو شام ہی سے اپنے دستے کو تیاری کا حکم دے دیا اور سامنے کے ٹیلے پر ایک مشین گن لگا کر لوسی سے کہا کہ جب اُدھر سے میں اشارہ کروں اور تمہیں کوئی شخص گھوڑے پر سوار بھاگتا ہوا نظر آئے تو اس پر باڑھ مار دینا۔ اور اسے کچھ دستہ دے کر خود صبح ہی صبح دوسری طرف سے ہو کر پہاڑی کے عقب سے جنرل پر حملہ کر دیا۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا اور اس کی فوج ہلکی سی مدافعت کے بعد تتر بتر ہو گئی۔ جنرل سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا پہاڑی کے پیچھے سے نکلا اور بڑھتا چلا گیا۔ دور سے سیٹی نے بج کر اور جھنڈی نے ہل کر لوسی کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ لوسی کے ہاتھ مشین گن کی طرف بڑھے اور اس کی آنکھیں چینی سردار کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ ہستی اس کے سامنے تھی جسے چینی پوجتے تھے۔ جس نے چین کی بدنصیب ماؤں کے بیٹوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جانے سے بچا لیا تھا جس کی آزادی کے لئے جدوجہد قابل احترام تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی ایک چینی لڑکی ہے اور احترام سے اس کی گردن جھک گئی جن آنکھوں سے اس نے جنرل چان کو دیکھا اُن میں سے ایک چینی لڑکی کی روح جھانک رہی تھی۔ یہ وہ آنکھیں تھیں جو سب سے پہلے چین ہی میں کھلی تھیں جنہوں نے سب سے پہلے اسی کی فضا کو دیکھا تھا۔ انہیں کانوں سے اس نے اپنے ہموطنوں کی فریادیں اور کراہیں سُنی تھیں جن سے کبھی اُس نے اسی سرزمین میں میٹھی میٹھی لوریاں سنی تھیں۔ وہ انہیں پاؤں سے اپنے وطن کی آزادی کچل رہی تھی جنہوں نے سب سے پہلے نقش اسی سرزمین پر چھوڑے تھے۔ اور انہیں ماؤں کی گودیں خالی ہوتے دیکھیں جن میں سے ایک کی گود میں اُس نے خود ایڑیاں چلائی تھیں اور وہ اُسی وطن کی آزادی کا ایک زبردست ہاتھ توڑ دینے والی تھی جس کی آغوش میں وہ پلی تھی۔ وہ خیالات کی رَو میں ایک بے بس تنکے کی طرح بہ گئی اور جذبات نے اسے حواس باختہ کر دیا۔ اس کا ہاتھ مشین گن کی طرف اُٹھا۔ بڑھا۔ دُور پہاڑی پر ایک جھنڈی اپنی محبت کا واسطہ دے دے کر اُسے گولی چلانے کی ترغیب دے رہی تھی اور اس نے گولی چلا بھی دی لیکن مشین کا رُخ اپنے ہی دستہ کی طرف تھا۔ چینی سردار دُور پہاڑیوں کے سلسلے میں غائب ہو گیا۔ پہاڑی سے ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور لوسی لڑکھڑا کر گر پڑی۔ کائی سو نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

"لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں کیا آخر؟" کائی سو نے خون سے تر لوسی کو اپنی گود میں اُٹھا کر کہا

"مجھ سے اس کے متعلق کیا پوچھتے ہو۔ کائی سو! میں کچھ نہیں جانتی۔ میں کچھ نہیں جانتی کہ کیا ہُوا۔ تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں نے دغا کی۔ غلط کہتے ہو تم۔ وہ جس نے گولی چلائی وہ میں تو نہیں ہوں۔ وہ تو ایک چینی لڑکی تھی۔ جس نے چین میں پرورش پائی تھی۔ جسے اس کے فرض نے بُلایا تھا اور اس نے اپنے فرض کی آواز پر قدم بڑھا دیا۔ میں تو نہیں ہوں جس نے گولی چلائی۔ وہ چلی گئی — وہ لڑکی — وہ چینی لڑکی جس نے تم پر ہی گولی چلا کر تمہارا شکار تمہارے ہاتھ سے بچا لیا۔ اس چینی لڑکی نے اپنا فرض ادا کر دیا مگر افسوس کہ میں اپنا فرض ادا نہ کر سکی اب تم مجھ سے بھلا کیا پوچھتے ہو۔ میں تو وہی تمہاری محبوبہ ہوں لوسی! وہ چینی لڑکی جس نے گولی چلائی وہ تو معلوم نہیں کون تھی۔ لیکن اتنا جانتی ہوں کہ وہ مجھ میں رہتی تھی۔ اس کی موجودگی سے میں بے خبر تھی ——!" (لوسی کی سانس اکھڑنے لگی)

"مجھے معاف کر دو لوسی۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا۔ تم نے میرے لئے وطن چھوڑ دیا۔ والدین چھوڑ دیئے۔ اور پھر میرے ہی ہاتھوں تمہاری یہ حالت ہو۔ معاف کر دو مجھے لوسی!"

"لیکن تم نے تو ایک چینی لڑکی کو مارا ہے۔ کائی سو! جسے مارنا تمہارا فرض تھا۔ اور اپنی محبوبہ کو تو تم گود میں لئے بیٹھے ہو۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا میں خوش ہوں کہ تم نے اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کی۔ افسوس کہ میں ایک چینی لڑکی کے وجود کو اپنے وجود سے کبھی الگ نہ کر سکی۔" (لوسی کا دم ٹوٹنے لگا)

"فرض اور محبت یکجا نہیں رہ سکتے۔ ہم نے انہیں اکٹھا رکھنے کی ناکام کوشش کی۔" (اس کی حالت متغیر ہو گئی۔

"مجھے تم سے ویسی ہی محبت ہے لوسی۔ جیسی ہمیشہ تھی!"

"میں بھی خوش ہوں کہ تمہاری آغوش میں جان توڑ رہی ہوں!"

اور جب کائی سو نے بھیگی ہوئی پلکوں سے لوسی کو گود میں اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو دور دور تک کسی سپاہی کا پتا نہ تھا اور وہ اس عزیز جسم کو اُٹھائے ہوئے یہ سوچتا ہُوا خیمے کی طرف چل پڑا کہ گیا اِس عورت کو مار کر جس نے اس کا ہر مصیبت میں ساتھ دیا اِس نے انتہائی سفاکی کا ثبوت نہیں دیا اور کوئی اندرونی آواز اس سے یہی کہتی رہی کہ اگرچہ انسان محبت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے مگر موقع پر فرض اپنا کام کر جاتا ہے اور محبت ہاتھ ملتی رہ جاتی ہے۔ اگر تم صحیح وطن پرست ہو تو لوسی جیسی سینکڑوں لڑکیوں کی محبت سر پٹکتی رہ جائے گی اور تم انہیں گولی کا نشانہ بنا دو گے اور تمہیں بنانا بھی چاہئے۔ اور پھر یہ سوچ کر کہ لوسی بھی اِس جذبے میں اُس سے کچھ کم نہیں تھی اُس نے لوسی کے مُردہ جسم کو سینے سے لگا لیا اور اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا جس سے یوں ظاہر ہوتا تھا گویا لوسی نے اس کے دماغ میں گونجنے والے تمام خیالات سن لئے ہوں اور میدان سے لے کر خیمے تک جاتے ہوئے اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اُس نے لوسی کو گود میں اُٹھائے ہوئے امریکہ سے جاپان تک پیدل سفر کیا ہو۔ اس کی باہیں شل ہو گئیں۔ ٹانگیں شل ہو گئیں۔ دماغ شل ہو گیا۔ اور وہ خیمے کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے گر پڑا۔

اسعد گیلانی

مطلعتان

(بزمِ گرامی ہوشیارپور کے تیرھویں سالانہ مشاعرے کی غزلیات سے انتخاب)

داغِ غم، داغِ الم، داغِ تمنا دل میں	جوش	اتنی شمعوں سے بھی رہتا ہے اندھیرا دل میں
بن گیا پھول ہر اک داغِ تمنا دل میں	منوّر	کون ہے یہ چمن آرا چمن آرا دل میں
کون سے غیرتِ مہ کی ہے تمنا دل میں	تبسّم	اک تموّج ہے دلِ دیدۂ دریا دل میں
لے کے پہنچے تھے جو اک جوشِ تمنا دل میں	عیش	رہ گئے انجمنِ ساقیٔ دریا دل میں
شوق دل میں ہے طلب دل میں تمنا دل میں	قیصری	ہم لئے پھرتے ہیں بستی ہوئی دنیا دل میں
نور افگن ہے جو وہ نور سراپا دل میں	مذاق	شعلۂ طور ہے ہر داغِ تمنا دل میں
شمع رو کون سا آئے گا خدایا دل میں	شاکی	داغ روغن ہیں مثالِ یدِ بیضا دل میں
جلوہ گر جب سے ہے وہ جانِ تمنا دل میں	ساگر	فکرِ عقبیٰ ہے نہ اندیشۂ دنیا دل میں
مشتعل ہوتے ہیں جذباتِ تماشا دل میں	فیضی	رکھ دیا تم نے یہ کیا آگ کا ٹکڑا دل میں
کشتیٔ صبر نہ کیوں ہو تہ و بالا دل میں	شاغل	شوق ہے یا کوئی اُمڈا ہوا دریا دل میں
اب نہ وہ شوق نہ وہ ذوق کی دنیا دل میں	فدا	ہو گئی دفن مرے دل کی تمنا دل میں
رونق افروز ہُوا وہ گلِ رعنا دل میں	نشتر	کوئی ارماں ہے نہ اب کوئی تمنا دل میں
نت نئی معرفتی کی ہوتی ہے پوجا دل میں	قتل	نت نئے ڈھب کا لگا رہتا ہے میلا دل میں

مرسلہ امر چند قیس جالندھری

اصغر کی یادیں

اس وقت میرے سامنے دو چھوٹی سی کاپیاں پڑی ہیں ایک میں اصغر کے متعلق واقعات کا نقشہ ہے دوسری میں کاغذات و اشیاء کی فہرست ہے۔ ان بنیادوں پر میں اُس کے سوانح حیات تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے اصغر کے چمن سے چند سدا بہار کلیاں لے کر میں ہمایوں کی بزم میں اِدھر اُدھر بکھیرتا رہا ہوں۔ جو کچھ اب کرنا چاہتا ہوں نہیں معلوم آخر کار وہ کیا صورت اختیار کرے لیکن میرے لئے کافی ہے کہ فی الحال کبھی کبھی اس سلسلے میں ہمایوں میں کچھ لکھتا رہوں۔ ہمایوں جو اصغر کے دادا کی یادگار ہے اس میں اُس کا بھی کچھ حصہ ہے! بعض پڑھنے والے شاید بعض باتیں بھول گئے ہوں اس لئے انہیں دہرا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

اصغر ۱۱ر اگست ۱۹۲۰ء کو اپنی امی کی اکیسویں سالگرہ کے دن شملے میں پیدا ہوا۔ شروع ہی سے ذہانت اور تیزی اُس کی ایک ایک ادا سے ٹپکتی تھی۔ وہ چھ برس کی عمر میں لاہور میں کوئین میری سکول میں داخل ہوا۔ گیارہ برس کا ہوا تو اُسے بشپ کاٹن سکول شملہ میں بھیج دیا گیا۔ دو سال کے بعد وہ لاہور میں سینٹ اینتھنی سکول میں پڑھنے لگا۔ جہاں سترہ سال کی عمر میں اُس نے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ ۲ر اپریل ۱۹۳۸ء کو وہ ہندوستان کو خیرباد کہہ کر انگلستان کو سدھارا جہاں اعلیٰ تعلیم پانے کی غرض سے وہ واڈھم کالج آکسفورڈ میں داخل ہوا۔ ولایت میں دو سال رہ کر اُس نے مختلف علوم و فنون میں خوب دسترس حاصل کی اور مغربی زندگی کے مختلف شعبوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ حصہ لیا۔ آخر ۲۴ر مئی ۱۹۴۰ء کو یہ روشن ستارہ آکسفورڈ کے ایک چھوٹے سے دریا میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہوگیا!

اصغر میں گوناگوں خوبیاں تھیں جو بہت کم نوجوانوں میں یکجا پائی جاتی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اُس کے دادا (جسٹس شاہ دین ہمایوں مرحوم) اور اُس کے نانا (سر محمد شفیع مرحوم) کے بعض متضاد اوصاف اُس میں آکر جمع ہوئے۔ قابلیت اور خلق کا مظہر، دماغ میں تفکر کی قوت اور چہرے پر تبسم کی کشش، حسین، توانا، بلا کا ذہین اور پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ اپنی سرگرمی اور تیزی کے ساتھ دوسروں سے انتہائی ہمدردی اور محبت! "فلک پیما" نے اُسے دو لفظوں میں بیان کیا ہے "ہمہ تن شوق"، یہ تھا اصغر!

میرے قریب ہی الماری میں ترتیب دی ہوئی اُس کی چیزیں پڑی ہیں۔ "واقعات" اور "کاغذات" کی فہرستوں کی دو چھوٹی کاپیاں تو میرے پاس میز کی دراز میں رہتی ہیں جس پر بیٹھے دن رات میری زندگی گزرتی ہے۔ ان کے ساتھ اُس کی ایک ننھی سی تصویر ہے۔ الماری کچھ دُور نہیں پھر بھی غنیمت ہے کہ وہ بند رہتی ہے۔

کاغذات اور اشیاء کی مختصر کیفیت یہ ہے:۔ سکول کی رپوٹیں۔ انگریزی میں ایک نا تمام کہانی جو اصغر نے ولایت جانے سے پہلے لکھی اور جس کا ہمایوں میں ترجمہ چھپ چکا ہے۔ انگریزی میں بیس بائیس نظمیں کچھ ہندوستان اور کچھ انگلستان میں لکھی ہوئی۔ آکسفورڈ کی بارہ کاپیاں جس میں فارسی فرانسیسی تاریخِ انگلستان اور سیاسیات وغیرہ پر مختصرات ہیں۔ اصغر کی کتابیں، اس میں ۱۱۹ تو ہمیں مل چکی ہیں ۵۷ سنسر صاحب نے انگلستان میں روک لیں، تاریخ فرانسیسی فارسی انگریزی ادب موسیقی شطرنج ٹینس شعر و شاعری سیاسیات وغیرہ کے متعلق کتابیں ہیں گلستان، دیوانِ حافظ، بانگِ درا، جذباتِ ہمایوں بھی نکلیں، ضبط شدہ کتابیں سوشلزم اور موجودہ تحریکات کے متعلق تھیں، بعض کی ضبطی پر عقل زیادہ ہی حیران ہے مثلاً ہندوستان کے متعلق دو چار ایسی کتابیں جو میں نے یہاں سے لے کر بھیجی تھیں۔ آکسفورڈ کی مجالس یونین سوسائٹی اور راؤنڈ ٹیبل مجلس میں اصغر نے بعض مباحثوں میں حصہ لیا، ان کے مختصرات ہیں۔ ہندوستان کی سیاسیات پر چند نوٹ ہیں۔ تین چار مختصر روزنامچے ہیں۔ مغربی موسیقی پر علاوہ بہت سی کتابوں کے اصغر کا گراموفون اور بعض لاجواب ریکارڈ ہیں۔ ریڈیو ہے جسے اُس کے بھائی بہن اور ہم ہر روز استعمال کرتے ہیں۔ شطرنج، ایک پاکٹ شطرنج بھی ہے ٹینس کے بلے تھے جو سب تقسیم کر دیئے گئے۔ اصغر کے اُتارے ہوئے فوٹو جن میں آکسفورڈ کے دوستوں اور دریاؤں اور کالجوں کی اور پیرس اور سوٹزرلینڈ کی تصویریں ہیں۔ ایک ننھی حمائل جو اُس کی امی نے رخصت کے وقت اُس کے گلے میں ڈالی تھی۔ اُس کی مُہر۔ پاس پورٹ۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی ٹوپی اور گاؤن۔ سگرٹ کیس جس میں دو سگرٹ موجود ہیں۔ سگرٹ جلانے والا جو کسی دوست نے تحفہ دیا تھا۔ ایک فونٹن پین جس سے اصغر لکھا کرتا تھا۔ اصغر کی گھڑی جس میں دس بجنے میں پانچ منٹ ہیں (شاید یہ اُس کی آخری رات کی آخری ساعت ہے جب اُس نے تاریک دریا کی کھلی آغوش میں جگہ پائی تھی!) گھڑی کچھ آب زدہ اور کچھ زنگ خوردہ معلوم ہوتی ہے چند بٹن۔ چند کپڑے۔ ہماری طرف اُس کے زندگی بخش بے نظیر خطوط۔ اصغر کے انجام کے متعلق خط و کتابت اور معلومات، قبرستان کی تصویریں، اُس کے جنازے اور قبر کی تصویریں، قبر پر حلقۂ احباب کی تصویر، خطوطِ تعزیت میں سے چند خطوط۔ اصغر کے دوستوں کے بعض خطوط جن میں اُس کی سیرت کا نقشہ کھینچا ہے یا بعض واقعات بیان کئے ہیں۔ چند مرثیے اور تاریخیں۔ اصغر کی تصویریں بچپن سے لے کر جوانی تک۔ (اوراق) کے علاوہ اپنے بیٹے کی وہ موہنی تصویر جو دل میں ہے اور جو آنکھیں بند کئے پر بھی لگا ہے گاہے نظر آجاتی ہے!

بشیر احمد

غزل

یہی دل رشکِ گُل نقاب جسے کانٹا سمجھتے ہیں
کہ تم اپنا سمجھتے ہو نہ ہم اپنا سمجھتے ہیں

قیامت پر یقیں ہے معنیٔ فردا سمجھتے ہیں
محبت میں مگر جھوٹے کو بھی سچا سمجھتے ہیں

کسی کا ناز سے چلنا قیامت زا سمجھتے ہیں
قدِ موزوں کو گویا فتنۂ برپا سمجھتے ہیں

وہ جتنی دیر ٹھہرا آ کے آغوشِ تصوّر میں
اُنہیں لمحوں کو عاشق حاصلِ دنیا سمجھتے ہیں

مجھے تڑپا دیا شوخی سے یہ کہہ کر تصوّر میں
چلے آتے ہیں تجھ کو جب کبھی تنہا سمجھتے ہیں

نہ ہونا بدگماں اے دل یونہی پیش آتے ہیں اُس سے
جسے وہ دل سے اپنا چاہنے والا سمجھتے ہیں

یہ کہتے اپنے غم خواروں سے ہم کو شرم آتی ہے
کہ ہم بیمار اُس کے ہیں جسے عیسیٰ سمجھتے ہیں

جو دلِ لُطف آشنا ہیں لذّتِ دردِ محبت سے
وہی کچھ صدق کے اشعار کو اچھا سمجھتے ہیں

صدق جائسی

اندیشہ

آرٹسٹ! اپنی یہ تصویر مکمل کر لے
ہاں، یہ ہونٹ اور بھی پتلے ہوں، یہ آنکھ اور بھی مست!
لیکن اِن گالوں کی سرخی کو ذرا کم کر دے
میں نے شاید انہیں مرجھایا ہوا پایا ہے
ہلکے اشکوں سے ان آنکھوں کو ذرا نم کر دے
میں نے افسردہ نگاہوں سے یہی سمجھا ہے
آج بھی میں نے سرِ راہ اُسے دیکھا ہے
ایک شہ کار اسے جلد بنا لے اے دوست!
ورنہ تصویر کا خاکا ہی بدلنا ہوگا ——— !!!

سلام مچھلی شہری

محفل ادب

اُردو ہندی کی پُرانی کش مکش

اُردو ہندی کی باقاعدہ کش مکش جس نے ہمارے زمانہ میں بڑی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے اس کے آثار انیسویں صدی کے اخباروں میں ملتے ہیں گارساں دتاسی[1] اپنے ایک مقالہ (۱۸۶۹ء) میں اس کا ذکر کرتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ ۱۸۶۹ء کے اُردو اخباروں میں اُردو ہندی کی کش مکش کا زور صاف صاف نظر آتا ہے، اس سال الہ آباد انسٹیٹیوٹ میں ایک خاص جلسہ منعقد ہوا اور لُطف یہ ہے کہ وہ لوگ جو اُردو کی مخالفت اور ہندی کی موافقت میں کھڑے ہوتے تھے خود اُردو میں تقریریں کر رہے تھے، اودھ اخبار نے اس جلسہ کی کارروائی پوری تفصیل کے ساتھ شائع کی جس سے ہندی کے علمبرداروں کی ہٹ دھرمی اور زیادتی اور اس لسانی رسہ کشی کی ابتداء کا پورا پورا حال معلوم ہوتا ہے، علی گڑھ کے اخبار سین ٹیفک سوسائٹی میں بھی اسی موضوع پر ایک مضمون شائع ہوا تھا جسے اودھ اخبار نے دوبارہ نقل کیا۔

۵ مارچ ۱۸۶۸ء کو پھر ایک مضمون علی گڑھ گزٹ میں اُردو کی تائید و حمایت میں شائع ہوا اور ۱۲ مارچ ۱۸۶۸ء کے اخبار میں خود سر سید احمد خاں نے اس موضوع پر قلم اٹھا، میرٹھ کے اخبار جلوۂ طور میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا جس میں لکھا گیا تھا کہ چونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اس لئے وہ اپنے حسبِ خواہش تبدیلیاں کر سکتے ہیں، اودھ اخبار نے اس سلسلہ میں بڑی دیانتداری سے کام لیا اور وہ تمام مضامین جو اس سلسلہ میں اُردو کی حمایت یا مخالفت میں شائع ہونے کے لئے موصول ہوئے انہیں چھاپ دیا، چونکہ یہ مسئلہ آج اور بھی اہم ہو گیا ہے اس لئے مذکورہ بالا مضامین میں سے بعض کے اقتباسات ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:-

ان اخباروں میں اس بحث کی ابتداء گورنمنٹ کی اس تجویز پر ہوئی کہ ہندوستان کی عدالتوں میں کونسی زبان اور کون حروف رواج پانے کے مستحق ہیں، اس سلسلہ میں گارساں سب سے پہلے بنارس گزٹ کے ایک مضمون کا ذکر کرتا ہے چنانچہ پہلے ہم وہی اصل مضمون لے کر اس بحث کی ابتداء کرتے ہیں۔

نمونہ بنارس گزٹ[2] جنوری ۱۸۶۹ء

"واضح ہو کہ جس وقت سے مسلمان اس ملک میں آئے اور ان کی قوت اور حکومت کو وسعت ہوئی تو انہوں نے ہندی حروف کو یک قلم اپنی سرکار سے دور رکھا بلکہ زبان بھی فارسی ہی قائم کی .... اسی وجہ سے بہتیرے ان میں (یعنی اہل ہند) سے ایسے ہو گئے کہ اب وے اپنی دیسی زبان اور حروف پڑھ اور لکھ نہیں سکتے .... خیال کرنا چاہئے کہ اُردو زبان اگرچہ کم تاہم بیشتر عام میں جاری ہے لیکن یہ زبان نہ تو حاکم کی ہے اور نہ ہندوستان کی دیسی زبان سے تعلق رکھتی ہے اور وضع تحریر اس کی فارسی ہے اور یہ سبب اس کے کہ فارسی میں ایسے حروف بہت کم ہیں جن سے ہندی لفظوں کو ٹھیک ٹھیک لکھ سکیں اس وجہ سے ان کے پڑھنے میں نہایت قباحت ہوتی ہے اور ان کے لکھنے میں بیشتر غلطی واقع ہوتی ہے جس سے بڑی دقت اور خرابی ہوتی ہے ...... اُردو زبان کو فارسی سے مدد مل سکتی ہے۔ اور چونکہ فارسی خود ہی ایک محتاج کم مایہ ہے تو بقول اس کے "عیسٰی آپ ہی بیمار ہے دوسرے کو کیا صحت بخشے گا" اس سے بدرجہ لاچاری عربی سے مدد لی جاتی ہے، اب اوّل تو فارسی ہی ہم سے غیر مانوس ہے دوم عربی کہ ہم سے بالکل غیر مخلوط ہے .... حقیقت میں ہندی زبان ہمارے ملک میں بہ نسبت اُردو کے کہیں زیادہ مروج ہے اور اگر اوسط نکالا جاوے تو غالب ہے کہ فی صدی بیس اُردو کے خواہاں پائے جاویں گے اور فی صدی اسّی ہندی کے خواستگار پائے جائیں گے .... اس زبان (یعنی ہندی) کو زیادہ تر مدد سنسکرت سے مل سکتی ہے .... اور یہی سبب ہے کہ ہندی میں سنسکرت ملنے سے اس کو زیبائش ہوتی ہے اور علاوہ اس کے سنسکرت نہایت پُرمایہ زبان ہے، نظر بران ہماری دانست میں ہندی زبان اور حروف سرکاری اور نیز عوام کے کاروبار میں استعمال کرنا چاہئے .... لیکن اب جو ہم دیکھتے ہیں کہ جابجا یہ تجویز ہو رہی ہے کہ اُردو کی یونیورسٹی قائم ہو، اور یہی زبان اور یہی وضع تحریر بالعموم جاری کی جائے تو ہم کو نہایت افسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حق میں لوگ کیا کر رہے ہیں .... اور اس پر افسوس کرنا چاہئے کہ بیشتر

---

[1] بحوالہ مقالات گارساں دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اُردو،
[2] مقام اشاعت بنارس،

ہنود اس کی ترقی کو روک کر اُردو کی ترقی پر دل لگاتے ہیں۔"

مضمون اخبار الابصار، فروری ۱۸۶۹ء

مضمون مولوی تفضل حسین، بحث اس باب میں کہ رواج تحریر اُردو کا سررشتہ جات سرکاری میں بحال رہنا چاہئے یا نہیں، "ان ایام میں بعض صاحب اہل ہنود نے تحریک اس امر میں کی ہے کہ جو رواج اُردو زبان کا سررشتہ جات سرکاری میں ہے وہ موقوف ہو کر بجائے اس کے زبان ہندی بخط ناگری رواج پائے۔ ...... ایسی تحریک اہل ہنود کی بجائے خود ہے اور علیٰ ہذا القیاس اگر اہل اسلام اس کے بالعکس تائید اُردو کی کریں تو وہ بھی بے محل نہیں، لیکن اوّل یہ بات غور طلب ہے کہ قوت باعثہ اس بات کی کہ وہ ایک جزو تحریک کا ہے کوئی شئے دینی اور مذہبی ہے یا غیر اس کے سوا امر مذہبی اور دینی کی موثریت تو اس میں نہیں پائی جاتی کیونکہ دینی زبان مسلمانوں کی عربی ہے ...... پس اگر امر مذہبی یا فوائد علمی پر نظر ہو تو مسلمانوں پر تحریک رواج زبان عربی کی اور ہنود پر سنسکرت کی ضروری ہے نہ اُردو یا ہندی کی، اور اگر کہیں کہ اُردو کو عربی سے اور ہندی کو سنسکرت سے تعلق ہے تو یہ وجہ موجہ نہیں کیونکہ تعلق اُردو و ہندی کا عربی سنسکرت سے بر سبیل فرعیت ہے اور اصل کو چھوڑ کر فرع پر رجوع لانا مزیت فرع کی اصل پر لازم کرتا ہے جو عقلاً ممتنع ہے۔"

نمونہ مضمون رتن پرکاش الہ آباد

"ہماری رائے میں تمام ہندوستان کے قصبات اور بلاد میں اُردو زبان کا اس قدر رواج ہے کہ خواص و عوام کے محاورہ میں یہی زبان رائج و شائع ہے گو قریات میں اور زبانیں بھی بولی جاتی ہوں، علی الخصوص ممالک مغربی شمالی و اودھ کے قریات و دیہات میں فقط اُردو زبان سے کارروائی ہوتی ہے، علاوہ اس کے اردو زبان لب لباب چند زبانوں کی ہے اس میں الفاظ مستکرہ و شدید التلفظ سے بہت اجتناب ہے اُردو کی تحریر میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ تھوڑے حرفوں میں بہت مضمون سما جاتا ہے، اور پڑھنے میں کسی قسم کا تکلف و تردد نہیں واقع ہوتا، اُردو کی ایک سطر کا مضمون ہندی کی تین سطر سے کم میں نہیں آسکتا ...... غرض عموماً ہندی کے رواج سے نوع بنوع کی دقتیں پیش آئیں گی اور کارروائی میں بہت ہرج واقع ہوا کرے گا، اس لئے کہ ہندی زبان مدت سے متروک ہے اس کے رواج و اشاعت کے واسطے زمانہ دراز چاہئے۔

"مصنف"

...... کا سالنامہ دیکھ کر

ہمارا سماج بڑا روگی ہے۔ اور برسوں سے چند در چند روگ اُسے اندر ہی اندر کھا رہے ہیں۔ ڈر یہ تھا کہ اگر ان روگوں کی روک تھام نہ ہوئی تو سماج کی اصلی روح بھی کہیں مسخ نہ ہو جائے۔ عرصہ سے ہمارے ہاں کئی اصلاحی تحریکیں چل رہی ہیں۔ کسی کا مقصد سیاسی بیداری ہے کوئی اقتصادی آسودہ حالی کے درپے ہے۔ اقبال اور ٹیگور نے ادب و شعر کی دنیا بدل دی گاندھی جی، محمد علی اور جواہر لال نے سیاسی آزادی کا صور پھونکا۔ لیکن سماج کے وہ روگ جو اس کے سرچشمۂ زندگی کو خشک کر رہے تھے وہ ان رہنماؤں اور فلسفیوں کی بلند نظروں سے اوجھل ہی رہے۔ اور عملاً ان کو بے نقاب کرنے اُن کو مٹانے کی طرف ہماری کسی سیاسی اور اجتماعی تحریک نے توجہ نہ کی اور حقیقت میں یہ اُن کا کام بھی نہیں تھا۔ ادب کا کام سماج کے ان جوہڑوں کو کھنگالنا ہوتا ہے اور ظاہر داری اور ریاکاری کے پردوں کے پیچھے دنیا جو کرتی ہے وہ اسے کھلم کھلا نظروں کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ سماج کو اپنے کرتوتوں سے گھن آئے۔ فریب اور ریا کا طلسم ٹوٹے۔ اور طمع کی زندگی کا بھرم کھلے اس سلسلہ میں ترقی پسند ادیبوں کی جدوجہد واقعی اس قابل ہے کہ انہیں سراہا جائے۔ اور اُن کے مشن کی خواہ وہ بظاہر گھناونا ہی کیوں نہ ہو، داد دی جائے۔ آخر چھپنے پھاڑنے کا کام بھی کسی نہ کسی کو کرنا ہی پڑتا ہے۔

لیکن ترقی پسند ادیبوں کی یہ ساری جراحی لے دے کے صرف جنسی خواہشات تک محدود کیوں ہے؟ جنسی خواہشات اور اُن کی گوناگوں کارفرمائیوں کے سوا کچھ بھی ہو۔ اگر انہیں عورت کی مفلسی کی طرف اشارہ کرنا ہوگا تو اس سے پیشہ کرائیں گے۔ مرد کی کش مکش روزگار میں ناکامی دکھانا ہوگی تو اس سے چکلہ کھلوائیں گے۔ کسی نوخیز رئیس زادے کی بدعنوانیاں جتلانا مقصود ہو تو کسی خادمہ لڑکی کو اس کے جنگل میں پھنسا دیں گے اور کسی زمانہ دار یا زمیندار کا جور و ستم اور اس کا تسلط دکھانا ہو تو مزدور اور کسان عورتوں کو اس کی خلوت گاہ میں دھکیل دیں گے۔ ان افسانوں کے پڑھنے سے تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سماج کے جسم پر صرف ایک ہی پھوڑا ہے اور وہ ہے جنسی مسئلہ۔

کیا ہمارے ادیبوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ ہمارا نظامِ تعلیم ناقص ہے اور ہمارا طریقۂ تعلیم طالب علموں کی صلاحیتوں کو اُبھارتا نہیں بلکہ دفن کرتا ہے۔ ہمارے مدرسوں اور کالجوں کے معلم استادانہ شفقت اور عالمانہ خلوص سے محروم ہیں۔ اور ہمارے طالب علم علمی شوق اور سماجی محبت سے بے گانہ ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہماری نمایندہ حکومتوں کے عہدے دار اور وزراء رشوت خوار ہیں اور ہمارے قومی رہبر اپنے فرقے اور طبقے کے علاوہ دوسرے فرقوں کو کتوں کی طرح کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ چاہے اس کتے کی طرح جو کاٹنے سے پہلے علانیہ بھونکتا ہے اور چاہے اس کتے کی طرح جو بغیر بھونکے ہی چپکے سے کاٹ کھاتا ہے۔ کیا اس کو نظرانداز کیا جاسکتا ہے کہ بورژوا سماج کے خلاف آواز اُٹھانے والوں کی اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ وہ بورژوا اقدار پر خود عمل پیرا ہیں اور نچلے طبقوں سے آنے والے ذہین نوجوانوں کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہے کہ وہ بورژوا کی سی لایعنی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی ساری جدوجہد کا حاصل یہی ہوتا ہے کہ وہ بورژوا بن جائیں۔ کیا یہ حقیقت تلخ نہیں ہے کہ ہمارے ادیب جس سماج کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اُسی سماج کی سب سے بڑی لعنت کو وہ خود مستحکم کرنے میں پیش پیش ہیں۔ یہ اور بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا سامنا ہمیں کرنا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں نے ان کی طرف سے آنکھیں کیوں بند کر لی ہیں۔ اُن پر اُن کا قلم کیوں نہیں اُٹھتا۔ کیا ان امراض سے ہمارا سماج دکھی نہیں ہے۔

ایک بات اور کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ ترقی پسند ادیب طبقۂ نسواں کے زیادہ تر ایسے کردار پیش کرتے ہیں جن کی جنسی بھوک مشتعل ہے اور جن کی آنکھیں عصمت کے نور سے خالی ہیں۔ وہ وفادار بیویوں یا محبت بیٹیوں اور مشفق ماؤں کا ذکر نہیں کرتے۔ حالانکہ ہمارا سماج ان پر جو جو ستم ڈھاتا ہے وہ ایک ترقی پسند ادیب کا موضوعِ تحریر بن سکتے ہیں۔ ان کے اس رویے سے تو ایسا شبہہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب خود جنسی بھوک میں مبتلا ہیں اور وہ عورت کو فاحشہ ہی دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کی تسکین اور حظ کا باعث بنے۔ اور یہ شبہہ اس وقت اور پختہ ہو جاتا ہے جب جب ہم دیکھتے ہیں کہ جنسی مسائل کو ایسے لہجہ میں بیان کیا جاتا ہے جس سے چٹخارے کی آواز آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے لکھنے والے کا مقصد عبرت دلانا نہیں بلکہ ترغیب دلانا ہے۔ اور وہ جنسی مسئلہ کے پھوڑے پر نشتر چلا نہیں رہا بلکہ اس کو نشتر سے آہستہ آہستہ سہلا رہا ہے تاکہ اس کی میٹھی میٹھی کھجلی سے لطف اندوز ہو۔ اسی لذتیت کی روح ہمارے ادیبوں میں کارفرما ہے اور اسی کی بدولت ان کے افسانوں میں جنسی خواہشات کا جا و بے جا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

اس بات کا افسوس کرنا غلط ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے ——— جو اُردو کی اُمیدوں کے مرکز ہیں اور جنہوں نے اُردو ادب کو اپنے پیش روؤں سے زیادہ صحیح رستہ پر ڈالا ہے ——— یہ بے اعتدالیاں کیں۔ ایسا ہونا تو قدرتی امر ہے۔ کسی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے جائز مطالبات پیش کرنے سے روکا جائے تو ہاتھ ہٹنے پر وہ بات کو بڑھا کر بھی کہتا ہے اور زور سے چیخ کر بھی۔ ایسے زور سے کہ سننے والے اس کی بات سمجھ بھی نہ سکیں۔ یہی واقعہ ہمارے ادب پر بھی گزرا۔ اس کو سماج کے جنسی مطالبات کے اظہار سے روکا گیا۔ تو اس کا ردِ عمل بھی سختی سے ہوا۔ لیکن اب اس ردِ عمل کو شروع ہوئے بہت عرصہ گزر چکا۔ اس لئے ترقی پسند ادیبوں سے گزارش ہے کہ وہ جنسی مسائل کو مناسب حدود اور مناسب لہجہ میں بیان کریں اور ادب کے ذریعہ تنقیدِ حیات کریں اور حیات سے مراد صرف جنسی خواہشات نہیں ہیں۔

(رضوان الحق از دہلی)

"کتاب"

ضروری اطلاع

مضمون نگار حضرات کو اپنے مضامین کی صاف اور صحیح طباعت کے لئے اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان کا مسودہ نہایت واضح، صاف اور خوش خط لکھا ہو۔ شکستہ، مبہم اور غیر واضح الفاظ کو کاتب عموماً غلط پڑھتے اور غلط لکھتے ہیں۔ اِس طرح مسودوں اور کاپیوں کی صحت میں نہ صرف غیر ضروری کوفت اٹھانی پڑتی ہے بلکہ طباعت بھی صاف نہیں ہوتی اور غلطیاں بھی کم و بیش رہ جاتی ہے۔

جائنٹ ایڈیٹر

مطبوعات

تمدّنِ اسلام کی کہانی اُسی کی زبانی، مفسّرِ قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی کا وہ بصیرت افروز مقالہ جو انہوں نے انجمن اسلامی تاریخ و تمدّن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیرِ اہتمام پڑھا قیمت ۳ر۔ پتا، معتمدِ نشر و اشاعت انجمن اسلامی تاریخ و تمدّن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

صدبرگِ گلِ جاوید عشرت:۔ حضرت عشرت گیاوی کے سو شعر انتخاب از سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی۔ قیمت ۲ر۔ پتا:۔ سید آلِ نبی حسینین منزل گیا (بہار)

بلقان۔ از حفیظ صدیقی صاحب بی۔ ایس سی قیمت ۳ر پتا۔ ادارۂ ادبیات اُردو حیدر آباد دکن۔ یہ کتاب عام معلومات کی کتابوں کے سلسلے میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا مطالعہ بلقان کے متعلق معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر سکتا ہے۔

شمس الاعراب:۔ مرتبہ پیر محمد اکبر صاحب قیمت ایک آنہ تین پائی۔ پتا:۔ میسرز عطر چند رکپور اینڈ سنز لاہور۔ اس کتاب میں سینکڑوں ایسے الفاظ کا صحیح تلفظ درج ہے جو اُردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ کتاب مفید ہے۔

اُردو اعراب۔ از محمد حمید اللہ صاحب استاذِ جامعہ عثمانیہ۔ اس کتاب میں اُردو زبان کے مستعمل اعراب میں ترمیم و اضافہ کی بعض تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ہے۔ پتا: حبیب کمپنی اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔ قیمت ۱ر

عزم و عمل:۔ محکمۂ پنچایت پنجاب نے اپنے پروپیگنڈے کے سلسلے میں جو لکچر کرائے اُن کا مجموعہ ۱۶۰ صفحات میں شائع کیا ہے۔ مقرّروں میں سر سکندر حیات، سر عبدالقادر، مسٹر الف ایل برین، نواب فضل علی، پروفیسر تاج محمد، راجہ حسن اختر، میاں عبدالحی، مولوی فتح دین، شیخ نور الٰہی وغیرہ شامل ہیں۔ تقریریں پر از معلومات ہیں اور دہاتیوں کے علاوہ شہریوں کے لئے بھی مفید ہیں۔ محکمۂ پنچایت پنجاب سے ملتی ہے۔

رہبرِ املا:۔ از جناب پوکرمل صاحب گپتا وکیل ہائی کورٹ الور قیمت ۵ر۔ پتا:۔ لالہ دیا شنکر نقشہ نویس لادیا دروازہ الور۔ اس کتاب میں اُردو الفاظ کا املا سیکھنے کے لئے مفید طریقے درج ہیں۔

اُردو زبان کی نئی تحقیق۔ از پروفیسر اویس احمد ادیب۔ قیمت ۳ر پتا:۔ دفتر پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبۂ متحدہ۔ بدایوں

ناکام:۔ از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی مصنفِ دلّی کا سنبھالا، گناہ، ہم اور وہ، روپ متی۔ سو صفحے کا ایک دلچسپ اور نکتہ آموز ناول ہے۔ قدرتِ زبان قابلِ تعریف ہے قیمت ۱۲ر پتا:۔ اُردو مجلس پبلشرز مٹیا محل دہلی۔

بتّیسی:۔ بچوں کے لئے بتّیس کہانیوں کا مجموعہ ہے جسے وقار احسن صاحب نے مرتب کیا ہے اور جعفری برنرز۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ ہر کہانی ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ قیمت ۸

ادبی تاثرات:۔ مرزا قدرت اللہ صاحب ایم اے نے اس کتاب میں ڈاکٹر محی الدین زور قادری کے چند مختصر مقدمے اور تبصرے جمع کئے ہیں۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے اس سے بہت سی نئی اُردو کتابوں کا پتا چل جاتا ہے اور اُن کے مضامین کے متعلق بھی کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں قیمت عہ۔ پتا:۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد دکن

تقویمِ ہجری و عیسوی:۔ مرتبہ ابوالنصر خالدی صاحب ایم اے عثمانیہ بہ نظرِ ثانی پروفیسر محمود احمد خاں صاحب پتا :۔ انجمن ترقیِ اُردو (ہند) دہلی۔ قیمت درج نہیں۔ اس تقویم سے ہجری اور عیسوی سنوں تاریخوں اور دنوں کی مطابقت معلوم ہو سکتی ہے۔ اُردو میں پہلے اس قسم کی کوئی تقویم نہ تھی۔ انجمن ترقیِ اُردو نے اس کی اشاعت سے ایک مفید خدمت سرانجام دی ہے۔

تاریخی اٹلس:۔ از انوار احمد صاحب علوی بی اے۔ بی ٹی۔ پتا:۔ سلطانیہ بک ایجنسی ۹۸ نظیر آباد لکھنؤ قیمت ۲ر اس اٹلس میں آریوں کی آمد سے لے کر اس وقت تک کے متعدد نقشوں سے سنہ وار ہندوستان کی سیاسی حیثیت کی تاریخ واضح کی گئی ہے۔ ہر نقشے کے سامنے تشریحی مضمون ہے۔ تاریخِ ہندوستان سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے بہت سادہ آسان اور دلچسپ طریقہ ہے۔

بہن:- از حضرت محبوب کنی، دیباچہ از حضرت ماہر القادری - روزنامچے کی صورت میں ایک افسانہ ہے۔ قیمت ۸ر پتا:- عابد شاپ حیدر آباد دکن

گردھاری:- ایک فلمی ڈراما از شبیر حسین صاحب نفیس۔ قیمت ۶ر پتا:- حیدر آباد بک ڈپو۔ سانچہ توپ حیدر آباد دکن

خطابیات:- از شیخ رحیم الدین کمال۔ مقدمہ از نواب بہادر یار جنگ۔ قیمت ۱۲ر پتا:- ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد (دکن) یہ کتاب فن تقریر کے متعلق لکھی گئی ہے۔ بعض عنوانات یہ ہیں (۱) گروہی تقریر (۲) ضیافتی تقریر (۳) نشری تقریر وغیرہ۔ ہر قسم کی تقریر کے متعلق فنی نکات بیان کرنے کے بعد کسی مشہور مقرر کی تقریر بطور نمونہ پیش کی گئی ہے۔ آخر میں اردو کے ان مشہور مقرروں کے متعلق مختصر مضامین درج کئے گئے ہیں۔ سر سید احمد خاں، محسن الملک، عزیز مرزا، عطاء اللہ بخاری، ابو الکلام آزاد، بہادر یار جنگ، مولانا محمد علی، ڈاکٹر نذیر احمد۔ کتاب دلچسپ اور مفید ہے

قابیل:- اس نام سے لارڈ بائرن کے ایک ڈرامے کا ترجمہ اردو کے مشہور ادیب اور شاعر حضرت مجنوں گورکھپوری نے کیا ہے۔ ڈراما دلچسپ اور خیال آفریں اور ترجمہ بہت صاف اور شستہ ہے۔ قیمت مجلد عہ پتا:- ایوان اشاعت گورکھپور۔

نغمۂ زندگی:- یہ سید نفیس احمد کریم فضلی بی لٹ (آکسن) آئی سی۔ ایس (بنگال) کا مجموعۂ کلام ہے جو جیبی تقطیع ہے اور نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ کے حروف میں چھپا ہے۔ کلام قابل مطالعہ ہے قیمت جلد چرمی عه ر جلد پارچہ ولایتی عہ۔ پتا:- فضلی برادران لمیٹڈ کنٹ ہاؤس کلکتہ و دفتر انجمن ترقی اردو دہلی

بہ حسین طلعت:- ایک نوجوان لڑکی کی آپ بیتی ہے۔ اس اوسط درجے کے ناول کی مصنفہ بلقیس ضیا صاحبہ ہیں حجم ۲۰۹ صفحات قیمت عہ پتا:- انڈین پریس الہ آباد

۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں:- یہ مجموعہ حلقۂ ارباب ذوق لاہور نے شائع کیا ہے۔ حلقۂ مذکور نوجوان اور ترقی پسند ادیبوں کی ایک جماعت ہے جو بہ خاموشی سے مفید ادبی کام کر رہی ہے۔ اس سال کے شروع میں حلقے کی طرف سے یہ مجموعۂ نظم شائع ہوا جس میں پنجاب اور بیرون پنجاب کے شعراء کی ۴۲ ایسی نظمیں جمع کی گئی ہیں جنہیں حلقے کے ارکان نے گزشتہ سال کی بہترین نظمیں قرار دیا۔ مجموعہ قابل مطالعہ ہے قیمت ۸ر پتا:- حلقۂ ارباب ذوق لاہور

میر محمد مومن:- (حیات اور کارنامے) یہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم میر محمد مومن کی سوانح عمری ہے۔ میر صاحب زبردست ماہر سیاست، مصلح اور تعمیر کار تھے۔ اس کتاب کے مولف ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہیں۔ اردو میں اچھی سوانح عمریوں کی کمی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اہل اردو کے شکریئے کے مستحق ہیں جنہوں نے اردو سوانح عمریوں میں ایک اچھا اضافہ کیا۔ حجم ۲۱۱ صفحات ہے اور کاغذ کتابت و طباعت بہت نفیس ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ ہاف ٹون عکسی تصویریں بھی دی گئی ہیں جن کی مجموعی تعداد ۴۳ ہے۔ قیمت مجلد عه پتا۔ سب رس کتاب گھر حیدر آباد دکن

مسز سید احمد پاشا (یا قاف کی پری) مصنفہ سید علی عباس حسینی صاحب۔ یہ ایک دلچسپ ناول ہے جو اب دوسری مرتبہ شائع ہوا ہے۔ یہ ناول واقعات یا تاریخ پر مبنی نہیں بلکہ تخیلی ہے۔ حجم ۸۸ صفحات قیمت مجلد عہ پتا:- معیار بک ڈپو امین آباد لکھنؤ۔

نقش اول:- یہ بیگم صالحہ عابد حسین کے چند معاشرتی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے لکھا ہے اور بیگم صاحبہ نے اس کو اپنے بھائی خواجہ غلام السیدین کے نام معنون کیا ہے۔ افسانے قابل مطالعہ ہیں۔ حجم ۲۳۲ صفحات۔ قیمت مجلد عه پتا:- حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

تصورات:- ملک سلمان الارشد صاحب کے چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ملک صاحب نوجوان ہیں۔ امید ہے کہ ان کا آئندہ مجموعہ اس سے بہتر ہوگا۔ قیمت مجلد عہ پتا:- عتیق الرحمن ذکر الرحمن تاجران کتب چوک بازار بھوپال۔

بھگوت گیتا (بزبان فارسی) از فیضی۔ گیتا کے اس منظوم فارسی ترجمے کے متعلق خیال ہے کہ یہ فیضی کے قلم کا رہین منت ہے۔ زبان سادہ اور شستہ اور عام فہم ہے۔ امید ہے کہ شائقین اس کی قدر کریں گے۔ اس ترجمے کے دنیا بھر میں صرف دو تین قلمی نسخے تھے۔ محمد شفیع صاحب کیوہ نے بڑا کام کیا کہ اس کتاب کو چھپوا کر شائع کر دیا۔ مسٹر پی۔ کے۔ دائل اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب نے اصل مسودہ کو بغور پڑھ کر کتابت وغیرہ کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ کتاب صاف ستھری رنگین چھپی ہے۔ قیمت مجلد سے ر پتا:- دفتر نشر و اشاعت۔ شرمید بھگوت گیتا۔ بزبان فارسی۔ کوچہ چراغ شاہ گڑھی شاہو لاہور

داستان تاریخ اردو:- اردو نثر کے متعلق یہ ساڑھے آٹھ سو صفحے کی کتاب ابتداء سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک کی مفصل تاریخ ہے۔ جابجا اور عہد بہ عہد نثر کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ اتنی کثرت سے تصانیف کے نمونے اور کسی کتاب میں نہیں ملتے۔ نمونوں کے ساتھ مصنفین کے حالات زندگی بھی درج کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے فاضل مولف جناب حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانز کالج آگرہ اہل اردو کے شکریئے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت سے ایک بڑی ضرورت پوری کر دی ہے۔ کتاب بہت اچھی چھپی ہے۔ مجلد ہے۔ قیمت درج نہیں پتا:- لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ۔

روحِ اقبال ۔ مؤلفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ علامۂ اقبال کے متعلق یہ بہت جامع کتاب ہے۔ اقبال کے آرٹ اُن کے فلسفۂ تمدن، اُن کے مذہبی اور مابعد الطبیعی تصورات پر نہایت قابلیت سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اور ہر ایک کے ہر عنوان کے ماتحت نہایت نکتہ آموز بحثیں کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کے آرٹ کے زیرِ عنوان حسبِ ذیل مباحث ہیں:۔ (۱) اقبال کی شخصیت (۲) آرٹ اور زندگی (۳) خلوصِ شعر (۴) شاعر اور عالمِ فطرت (۵) اقبال کا شاعرانہ مسلک (۶) رومانی آرٹ (۷) تخئیلی پیکر (۸) فنی تجزیہ (۹) شاعرانہ مصوری (۱۰) اقبال کی غزل وغیرہ حجم ۳۷۶ صفحات۔ کتابت، طباعت کاغذ نفیس۔ قیمت درج نہیں۔ پتا:۔ سید عبدالقادر اینڈ سنز گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن۔

اُردو شاعری کی مختصر تاریخ:۔ از محمد جمیل صاحب ایم۔اے (بریلوی) یہ کتاب ابتداء سے لے کر عہدِ حاضر تک کے شعراء کے حالات و نمونۂ کلام پر مشتمل ہے طلبہ اور دیگر شائقین اردو کے لئے پُر از معلومات ہے۔ حجم ۲۰۶ صفحات قیمت ؏ پتا:۔ نولکشور پریس لکھنؤ

مضامینِ عظمت۔ (حصّہ اوّل) مرزا عظمت اللہ خاں مرحوم سابق مددگار ناظمِ تعلیمات حیدرآباد دکن اُردو شاعری میں ایک الگ مسلک قائم کرنے کے لحاظ سے تاریخ ادبِ اُردو میں ایک خاص جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ مرحوم بہت ذہین اور عالم تھے اور اُن کی ادبی تنقید خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی کچھ عرصہ قبل بیگم عظمت اللہ خاں نے اُن کی نظموں کا مجموعہ شائع کیا تھا ہمیں مسرت ہے کہ اب بیگم صاحبہ نے مضامین فرحت کا یہ مجموعہ شائع کر کے ایک بڑا فرض ادا کر دیا۔ ان مضامین میں بعض ترجمے ہیں اور بعض خود نوشتہ۔ مرحوم کو اُردو نثر پر بہت اچھی قدرت تھی۔ اُن کے ترجموں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس فن سے اُن کو خاص مناسبت تھی۔ اِن سے بہتر مترجم اُردو میں کم ہوں گے۔ اس مجموعے میں علاوہ حالاتِ عظمت کے حسبِ ذیل مضامین ہیں:۔ (۱) زندہ بدست مردہ (۲) ٹوانی کھٹواتی (۳) انگریس (۴) خوش مذاقی (۵) کتاب کے کیڑے (۶) علم دوست خواتین (ڈراما از مولیئر) (۷) گڑیا خانہ (۸) سورما چنار (۹) بھیڑیا چال۔ اس مجموعے میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں نظر آتی ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ قیمت مجلد عہ۔ پتا:۔ علی اسد اللہ خاں صاحب بی ایس سی (عثمانیہ) برکت بنگلہ۔ ٹھگی جبل قدیم حیدرآباد دکن

راہگذر:۔ یہ حضرتِ عاشق بٹالوی کے تقریباً پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل اُن کے افسانوں کا ایک مجموعہ سوزِ ناتمام کے نام سے چھپ کر بہت مقبول ہو چکا ہے۔ موجودہ مجموعے کا دیباچہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ایم۔اے ڈی لٹ لکچرار پنجاب یونیورسٹی نے لکھا ہے۔ دیباچہ بہت سیر حاصل اور قابلِ تعریف ہے۔ حضرتِ عاشق افسانے میں اپنی جس مہارتِ فن کے لئے مشہور ہیں موجودہ مجموعہ اس کے کمال کا آئینہ دار ہے جہاں تک صحتِ زبان اور حسنِ بیان کا تعلق ہے پنجاب کے نوجوان ادباء میں حضرتِ عاشق کا ہم پایہ دوسرا نظر نہیں آتا۔ موجودہ مجموعے میں جگہ جگہ سحرِ تحریر کے بدیع المثال نمونے ملتے ہیں۔ تمام افسانے نوجوانوں کی زندگی کے حقائق کا دلاویز مرقع ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب سوزِ ناتمام سے بھی زیادہ مقبول ہوگی۔ قیمت مجلد ۲؍۔ پتا:۔ لاہور بک شاپ۔ نسبت روڈ لاہور

رسالہ حیوانیات:۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا یہ رسالہ خالص علمی ہے اور شعبۂ حیوانیات سے متعلق ہے۔ اُردو میں بمشکل ایک آدھ رسالہ اور ایسا ہے جو خالص علمی تحقیق کے لئے وقف ہو۔ اس رسالے کا معیار کافی اچھا ہے اور چونکہ اسے عام خریدار نہیں مل سکتے اس لئے اہلِ ذوق کا یہ فرض خاص ہونا چاہیئے کہ وہ اس کی اعانت کریں۔ ہمارے پیشِ نظر فروری ۱۹۴۲ء کا پرچہ ہے جس کے بعض مضامین کے عنوانات یہ ہیں:۔ (۱) پرندوں میں گانے کے مقاصد (۲) ذیابیطس کے اسباب اور اُس کا علاج (۳) جانوروں کے اخلاق و آداب (۴) حیاتین (۵) جانوروں کی جنس کی ابتداء، ارتقا اور عروج وغیرہ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے طلب فرمایئے۔ (حامد علی خاں)

کشتیٔ نوح:۔ مترجمہ پریتم سنگھ ایم۔اے۔ پروفیسر صاحب نے ایچ جی ویلز کی ایک تمثیل کا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ خاصا ہے مگر اکثر جگہ انگریزی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر دیا گیا ہے قیمت ۱۰؍ ملنے کا پتہ۔ پروفیسر پریتم سنگھ ایم۔اے ۳۹ ٹمپل روڈ لاہور "ن"

ہندو دھرم اور اصلاحی تحریکیں:۔ از پروفیسر پریتم سنگھ صاحب۔ اس کتاب میں برہمو سماج تھیوسافیکل سوسائٹی۔ آریا سماج۔ رام کرشن مشن۔ رادھا سوامی مت اور دیو سماج کے متعلق مفید معلومات درج ہیں قیمت ۸؍ مصنف سے ملے گی "ن"

کلمہ طیبہ:۔ از قاری محمد طاہر صاحب۔ یہ مختصر سا رسالہ کلمہ طیبہ کے اسرار و غوامض کے متعلق ہے اور واقعی پڑھنے کی چیز ہے قیمت ۳؍ ملنے کا پتہ: انجمنِ اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ "ن"

تعلیمِ جدید: محمد صدیق میمن صاحب کا مقالہ ہے۔ تعلیم جدید پر مولویانہ رنگ میں تنقید ہے۔ مقالہ نگار کا نقطۂ نگاہ انتہا پسندانہ ہے۔ قیمت ۳ر پتا:۔ انجمن اسلامی تاریخ و تمدّن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ "ن"

پریم مندر: از سید شبیر حسن صاحب۔ فلمی طرز کا ایک قصہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! قیمت ۵ر۔ پتا:۔ حیدر آباد بک ڈپو سانچہ توپ حیدر آباد دکن۔ "ن"

سلیس اُردو: ۔ مرتبۂ انجمنِ ترقی اردو حیدر آباد دکن۔ یہ کتاب بالغ مبتدیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ہے۔ اس میں معلوماتی مضامین اور کہانیوں کے علاوہ نظمیں بھی شامل ہیں۔ مضمون نگاروں میں سجاد مرزا صاحب غلام السیدین صاحب اور آغا حیدر حسن صاحب شامل ہیں۔ زبان نہایت شستہ اور سلیس ہے۔ حجم ۲۲۲ صفحے۔ پتا:۔ انجمنِ ترقیٔ اُردو حیدر آباد دکن۔

زندہ چین: ۔ مرتبہ و مترجمہ تمنائی۔ یہ خوبصورت کتاب گیارہ چینی افسانوں کے تراجم کا مجموعہ ہے۔ تمام افسانہ نگار چین کی انقلابی تحریک سے متاثر ہیں۔ اِن افسانوں کے کرداروں میں زندگی کی حرارت معلوم ہوتی ہے۔ اُردو کے نو آموز افسانہ نویسوں خصوصاً نئے ادب کے پرستاروں کو ان افسانوں کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔ قیمت درج نہیں۔ پتا:۔ نیا سنسار کتاب گھر بانکی پور "ن"

سازِ شکستہ: ۔ یہ مختصر ناول مولانا رشید اختر ندوی کی تصنیف ہے۔ مولانا کو ناول کی ٹیکنک سے قطعاً کوئی واقفیت نہیں۔ اور سماج کے جس طبقے سے انھوں نے اپنے کردار منتخب کئے ہیں اس سے بھی وہ ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ناول محض ایک مضحکہ خیز افسانہ بن کر رہ گیا ہے۔ ندوی صاحب نے انڈین پولیس کے ایک سابق رکن کو لارڈ بنا کر دارالامرا میں پہنچا دیا ہے۔ کیمبرج میں جرنلزم کا ایک کالج کھول مارا ہے لارڈ کی لڑکی کا ہیرو سے عشق بالکل بےمعنی اور مایوسی کے بعد اس کا انتقام اس سے زیادہ بے معنی ہے۔ کردار اتنے غیر قدرتی ہیں کہ ایک انٹرنس پاس انگریزی میں اہم سیاسی اور دستوری مسائل پر اتنے تھوڑے دنوں میں ایک کتاب لکھ دیتا ہے کہ اس مختصر عرصے میں انگریزی زبان کا کوئی فاضل اتنے اہم موضوع پر ایک مقالہ لکھ دینے کی ہامی بھی نہ بھرے۔ انجام بہت پست ہے۔ ادرفضل بک ڈپو کے اکثر ناول اسی طرح ختم کئے گئے ہیں کہ ایک کردار ناچ دیکھنے یا بازارِ حُسن کی سیر کرنے جاتا ہے اور وہ دخترِ گناہ جس کی کشش اسے وہاں تک کھینچ لائی اس کی حقیقی بہن ہوتی ہے! مولانا عبدالمجید سالک اپنے تعارف میں فرماتے ہیں۔ "مجھے یقین ہے کہ اہلِ ذوق کے حلقے میں اس افسانے کی قدر کی جائے گی۔ اور مولانا رشید اختر اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ ان کی طبیعت میں بہترین افسانہ نگاری کے ممکنات مضمر ہیں۔ جن کے اظہار کے تقاضے کو روکنا بہت بڑا ظلم ہوگا۔" ناطقہ سر بگریباں اسے کیا کہئے! قیمت ایک روپیہ۔ پتا:۔ اُردو بک سٹال لاہور۔ "ن"

دفترِ دیوانی و مال و ملکی سرکارِ عالی: ۔ یہ کتاب حکومتِ حضورِ نظام نے شایع کی ہے۔ نہایت مفید معلومات کا مجموعہ ہے۔ ساری کتاب نفیس آرٹ پیپر پر چھپی ہے بعض نہایت اہم فرمانوں اور خطوط کے فوٹو بھی شاملِ کتاب ہیں۔ قیمت درج نہیں۔ "ن"

تبویب حیدری: ۔ از فضل اللہ احمد بی۔اے۔ مؤلف نے اس مختصر سے رسالے میں بڑی محنت کے ساتھ کتابوں کی ترتیب اور فہرست بنانے کے لئے علوم و فنون کی تقسیم کی ہے۔ اس تالیف میں اُردو زبان کی ہیئتِ ترکیبی ماحول، موجودہ سرمایہ اور آئندہ ترقی کے امکانات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کتابوں کی تقسیم و ترتیب کے متعلق غالباً اُردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ لائبریریوں کے لئے یہ کتاب خاص طور پر مفید ہے قیمت ۸ر پتا:۔ مہتمم حیدری گشتی کتب خانہ حیدر آباد دکن "ن"

تاریخِ وطنیت: ۔ از شبلان۔ یہ کتاب وطنیت پر ایک علمی مقالہ ہے۔ مؤلف نے نظریۂ وطنیت کے آغاز و ارتقا پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور یورپ و ایشیا میں وطنیت نے جو گُل کھلائے ہیں اِن سب کا جائزہ لیا ہے۔ ہندوستان میں تحریکِ وطنیت پر جو باب ہے وہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کتاب میں کافی معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ مگر کتابت و طباعت پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ پتا:۔ ادارۂ تجدیدِ علم حیدر آباد دکن۔ "ن"

فتحِ مبین: ۔ از حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب۔ اس کتاب میں سنہ ۶ ہجری سے وفات تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اسلوب تحریر پرانا ہے مگر کتاب انتہائی خلوص سے لکھی گئی ہے اور مؤلف نے واقعات کی چھان بین میں بڑی محنت سے کام لیا ہے۔ قیمت درج نہیں۔ پتا:۔ شروانی بک ڈپو علی گڑھ۔ "ن"

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "ہمایوں" ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔
صرف سرورق نافٹون پریس رام نگر لاہور میں چھپا۔
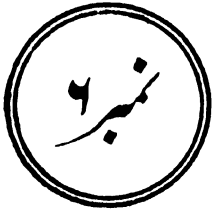
فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ جون ۱۹۴۲ء

چندہ سالانہ صہ۔ ششماہی سے (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸ر

جہاں نما

فنِ طباعت

اب سے چند صدیاں قبل ہر کتاب قلمی ہوتی تھی۔ یورپ میں ٹائپ کے حروف کی ایجاد کو بہت زیادہ مدت نہیں گزری۔ ۱۴۴۰ء میں ایک جرمن موجد گتھن برگ نے سٹراسبرگ میں ٹائپ کے حروف بنائے۔ اس کے بعد اس فن نے بہت سرعت کے ساتھ ترقی شروع کی۔ بنارس یونیورسٹی کے رسالے میں ایک مضمون نگار لکھتا ہے:۔

طباعت کی ایجاد نے دنیا کے تمدن پر ایک انقلابی اثر ڈالا ہے۔ تہذیب و معاشرت پر اس کے وسیع اثرات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

فنِ طباعت کی ترقی سے، پہلے اظہارِ خیال کا ذریعہ زیادہ تر نظم ہی تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ نظم کو انسانی حافظہ بہ آسانی محفوظ رکھ سکتا تھا اور نثر کے مقابلے میں اس کے زبانی دہرانے میں بھی آسانی رہتی تھی۔

فنِ طباعت نے ناخواندگی کو دور کرنے میں جادو کا کام کیا ہے۔ پہلے زمانے میں لوگ عالموں کی تقریریں سننے کے لئے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اب یہی کام کتابوں کے مطالعہ سے لیا جاتا ہے۔ آج کل سامعین میں زیادہ تر صرف ریڈیو کی تقریریں سننے والے ہیں ورنہ مطبع نے سامعین کو گھٹا کر قارئین کی تعداد میں لاکھوں کروڑوں کا اضافہ کر دیا ہے۔

مطبع نے ایک اور اہم کام کیا ہے۔ اس کی وجہ سے نثر کو بہت ترقی ہوئی ہے اور دنیا کا علم و ادب گزشتہ ۵۰۰ سال میں اچھی کتابوں سے مالا مال ہو گیا ہے۔

فنِ طباعت کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے جمہور نے بے حد ذہنی ترقی کی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشینوں کی ایجاد انسان کے لئے وبالِ جان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسانی ایجاد بجائے خود مفید یا مضر نہیں بلکہ اس کا طریقِ استعمال اس کو مفید یا مضر بناتا ہے۔ طباعت کی مشین بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ طباعت نے علم کے خزانوں کو محفوظ بھی کر دیا ہے اور ان کو وسیع پیمانے پر بنی نوعِ انسان میں تقسیم بھی کیا ہے لیکن اس طباعت کے طفیل ہی دنیا میں تباہی کے جراثیم پھیلے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ مشینوں کے استعمال کے متعلق مذکورۂ بالا مضمون نگار کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:۔

سائنس کے کارناموں پر ایک نظر ڈالو۔ انسانی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے بجائے کچھ مدت سے یہ انسانیت کی بربادی کے ذرائع پیدا کرنے میں بہت سرگرم ہے۔ ادیور شر میز نے سچ کہا ہے:۔

"ریل گاڑی بیل گاڑی سے صرف اسی صورت میں بہتر کہلا سکتی ہے کہ اس پر اچھے آدمی سوار ہوں اور تیز رفتاری صرف اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے کہ ہم حسن و صداقت کی منزل کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ ہر حرکت کا نتیجہ ترقی نہیں نہ ہر تبدیلی اصلاح پر منتج ہوتی ہے۔"

اسی سلسلے میں مضمون نگار نے بدھ کا یہ دو ہزار سال پرانا قول پیش کیا ہے جو آج بھی اس قابل ہے کہ آبِ زر سے لکھا جائے:۔

"اگر کوئی نظم دو ہزار ایسے اشعار پر مشتمل ہو جو مفہوم کے لحاظ سے بے مایہ ہوں تو اس کے مقابلے میں صرف ایک ایسا معنی خیز شعر بہتر ہے جسے سن کر کسی کے دل کو سکون حاصل ہو جائے۔"

چینی ٹکٹ

چین میں غیر ملکی سیاح عموماً ایک عجیب نظارہ دیکھتا ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک میں ریل گاڑی پر سوار ہونے کے لئے بچوں کا ٹکٹ ان کی عمر کے لحاظ سے نصف یا پورا لیا جاتا ہے۔ لیکن چین میں یہ عجیب رواج ہے کہ وہاں بچوں کا قد ناپ کر ٹکٹوں کے متعلق اندازہ کیا جاتا ہے چنانچہ

غیر ملکی سیّاح عموماً یہ منظر دیکھتا ہے کہ ریلوے کے ملازم گاڑی میں یا اسٹیشن پر کسی بچے کے قد کو اپنے پیمانے سے ناپ رہے ہیں۔ یہ واقعہ عموماً ایسے موقعوں پر پیش آتا ہے جب بچے کے ماں باپ اور ریلوے کے ملازموں کے درمیان اس کے قد کے طول کے متعلق اختلاف ہو۔ بچوں کے ٹکٹوں کے متعلق قواعد حسبِ ذیل ہیں:۔

دو فٹ چھ انچ سے کم لمبے بچوں کے لئے ۔۔۔۔۔ ٹکٹ کی ضرورت نہیں
چار فٹ چار انچ قد تک ۔۔۔۔۔ نصف کرایہ
چار فٹ چار انچ سے اوپر ۔۔۔۔۔ پورا کرایہ

ہندوستان میں ڈاک اور تار کا محکمہ

ڈاک اور تار کے محکمے کے عظیم الشان کام کا کچھ اندازہ حسبِ ذیل اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے جو ۱۹۴۰-۴۱ء کی سالانہ رپورٹ سے حاصل کئے گئے ہیں۔

گزشتہ سال محکمۂ ڈاک کے ہاتھ سے ۱۲۱۵۰۰۰۰۰ اشیاء گزریں جن میں خطوط، پارسل، منی آرڈر بیمے وغیرہ شامل ہیں۔

گزشتہ سال ڈاک خانے کے ملازمین کی کل تعداد تقریباً ۱۲۱۰۰۰ تھی اور ڈاک خانوں کی کل تعداد ۲۵۲۳۸ تھی۔

ڈاک کے ذریعہ سے گزشتہ سال جو رقوم بھیجی گئیں اُن کی کل میزان سالِ ماسبق کی طرح تقریباً ۲۹۸۰۰۰۰۰۰ روپے تھی۔

۳۹۰۰۰۰۰ رجسٹریاں بھیجی گئیں جن میں ۲۵۰۰۰۰ سے زاید بیمے شامل تھے۔

۳۴۰۰۰۰۰ منی آرڈر بھیجے گئے جن کے ذریعہ سے ۸۰۰۰۰۰۰۰ سے زائد روپے کی ترسیل ہوئی

۱۹۰۰۰۰۰ تار محکمۂ ڈاک کے ہاتھوں سے گزرے۔

۲۸۰۰۰۰۰ کامیاب ٹیلیفون ٹرنک کال ہوئے۔

وی۔ پی کے ذریعے سے بھیجی ہوئی اشیاء کی قیمت کے طور پر سولہ کروڑ روپے جمع کئے گئے۔

سیونگ بنک میں جمع شدہ رقم کی میزان ۵۹۰۰۰۰۰۰۰ روپے تھی۔

گزشتہ سال کے خاتمے پر بہ مقابلۂ سالِ ماسبق ڈاک خانوں کی تعداد میں ۲۲۳ کا اضافہ معلوم ہوا۔

ہندوستانی موٹر کار

مسٹر والچند ہیراچند نے جہازوں اور طیاروں کی ساخت کا کام شروع کر کے ہندوستان کی صنعتی تاریخ میں اپنا نام زندۂ جاوید کر لیا ہے۔ باوجودیکہ حکومت کی طرف سے اُن کی کچھ قابلِ ذکر حوصلہ افزائی نہیں ہوئی اب انہوں اپنی ہمت سے موٹر سازی کے کام کی طرف بھی توجہ شروع کی ہے۔ اپنے اس منصوبے کی منظوری کے لئے انہوں نے حکومتِ ہند کو جو درخواست بھیجی ہے اس میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اُن کے اِس کام کو مساعیٔ جنگ کا ایک جزو سمجھا جائے۔

مسٹر والچند اور اُن کے رفقائے کار کا خیال ہے کہ دورانِ جنگ میں حکومت کی طرف سے اگر موٹر گاڑیوں کے لئے انہیں باقاعدہ فرمائشیں وصول ہوتی رہیں تو وہ اس کام کو بہت اچھی طرح چلا سکتے ہیں اور انہیں سرمائے وغیرہ کے متعلق کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے گی۔

حکومت کے نام مذکورۂ بالا درخواست میں یہ یقین ظاہر کیا گیا ہے کہ جنگ کے بعد ہندوستانی موٹر سازی کا یہ کارخانہ تجارتی تحفظ کے بغیر غیر ملکی کارخانوں کا مقابلہ کر سکے گا۔

برقی قفل

جان۔ ایل۔ ادسگڈ نے موٹر کاروں کی حفاظت کے لئے ایک نیا پرزہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے سڑک وغیرہ کے کنارے ٹھہری ہوئی موٹر کاروں کی حفاظت کے لئے کوئی آدمی کھڑا کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ ایک قفل ہو گا جو موٹر کے دروازے کو بند رکھے گا اور جس کی مدد سے موٹر کار کے

جسم میں ایک ایسی برقی رو دوڑا دی جائے گی کہ اگر کوئی شخص اس کو ہاتھ لگائے گا تو اُسے سخت برقی جھٹکا محسوس ہوگا۔ مالک کی حفاظت کے لئے ایسی کنجی مہیا کی جائے گی جس کے استعمال سے جھٹکا وغیرہ محسوس نہ ہوگا اور برقی رو بند ہو جائے گی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اس قفل کے استعمال سے موٹروں کی بیٹری کی بہت طاقت صرف ہو جایا کرے گی۔

قدرت کا محکمۂ صفائی

سانپ قدرت کا توازن پیدائش و مرگ قائم رکھنے کے لئے چوہوں کیڑوں کوڑوں اور دیگر حشرات الارض کا شکار کرتے رہتے ہیں اگر سانپ وغیرہ یہ کام نہ کریں تو دیہات اور شہر حشرات الارض میں دب جائیں۔ بلیاں اور اُلو بھی یہی کام کرتے ہیں۔ بلی اور چوہے کی دشمنی تو مشہور ہے ہی مگر اُلو بھی اس سلسلے میں چھپا رستم ہے۔

سؤر خوراک کے معاملے میں عموماً صفائی پسند رہنا چاہتے ہیں لیکن اگر کوئی کیڑوں سے بھری، سڑی ہوئی لاش مل جائے تو یہ تر نوالہ بھی چھوڑا نہیں جا سکتا۔

ریچھوں کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔ اُن کی عام خوراک پھل پھول ہے لیکن بُسا ہوا گوشت کون چھوڑے۔

کتے کا رات کو بھونکنا عموماً ناگوار معلوم ہوتا ہے لیکن عام کتے جہاں چوکیدار کا بہت اچھا کام کرتے ہیں اور مالک کو خطرے سے آگاہ کرتے رہتے ہیں وہاں صفائی کے کام میں بھی بہت مدد دیتے ہیں۔ فراغت کے وقت عموماً وہ کوڑے کرکٹ کو سونگھتے رہتے اور سڑی بُسی چیزوں کا حتی الامکان صفایا کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستانی فلمیں

حال میں ایک فلمی رسالے "فلم انڈیا" کے خاص نمائندے نے سر رادھا کرشنا سے ملاقات کی۔ سر رادھا کرشنا نے اس ملاقات کے دوران میں ہندوستانی فلموں کے متعلق بہت مفید اور قابلِ عمل خیالات کا اظہار کیا۔

"پرکاش پکچرز" کی فلم "بھرت ملاپ" کا ذکر آیا تو سر رادھا کرشنا نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا:-

مجھے یہ علم ہے کہ عام ہندوستانیوں کے مذہبی رجحان اور مذہبی ماحول کی وجہ سے ہندوستان میں ایسی فلمیں زیادہ پسند کی جاتی ہیں جو مذہبی روایات پر مبنی ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں اس خیال کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہم لوگ روایات پسندی کے شوق میں حد سے آگے نکل گئے ہیں۔ ہمیں اپنی قدیم روایات کو محفوظ رکھنا چاہئے لیکن اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی روزانہ زندگی میں اُن کی ملتی جلتی مثالیں تلاش کریں۔ موجودہ لوگ اور موجودہ حالات بہرحال ہمارے پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔

ہمارے ملک کی فلمی صنعت کو یا کم از کم اس کے ایک حصے کو قدیم روایات اور سادھوؤں وغیرہ کی فضا سے نکل آنا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبے کی فلمی صنعت کے کار پرداز اس معاملے پر غور کریں۔ یہ صنعت اب بیس سال کی عمر کو پہنچ چکی ہے اب اس کو زندگی کے حقائق سے دوچار ہونا چاہئے اور ملک کے موجودہ معاشری اور اقتصادی مسائل پر توجہ کرنی چاہئے۔

حامد علی خاں

"ہمایوں" کے لئے بہتر کاغذ کا انتظام

فروری کے پرچے میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ اب "ہمایوں" پہلے کے مقابلے میں گھٹیا کاغذ پر چھپا کرے گا اگرچہ یہ گھٹیا کاغذ بھی زمانۂ جنگ سے پہلے کے بڑھیا کاغذ سے تقریباً تین گنا مہنگا تھا۔

جس وقت ہم نے اُس کاغذ کا انتظام کیا اُس کے بعد لاہور میں تقریباً دو مہینے تک ہڑتال رہی اور کاغذ قطعاً نایاب ہو گیا۔ اسی وجہ سے دو مہینے تک بعض مقامی رسائل کے پرچے شائع نہ ہو سکے۔ یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ ہم نے ہڑتال سے پہلے کاغذ کا انتظام کر لیا تھا اور "ہمایوں" حسبِ معمول باقاعدہ نکلتا رہا۔

فروری مارچ، دو مہینے وہ کاغذ ہم نے استعمال کیا۔ اپریل سے ہم پھر بیش قیمت سفید کاغذ استعمال کر رہے ہیں اور اُمید ہے کہ آئندہ ہمیں یہ کاغذ ملتا رہے گا۔

تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ حجم کی تخفیف سے "ہمایوں" کے مضامین میں کمی نہیں ہوئی موجودہ باریک خط اور ۲۳ سطریں بھی بحالاتِ حاضرہ عموماً پسند کی گئی ہیں۔ ج. و

اندھیرا

ہندی میں کہاوت مشہور تھی اندھیر نگری چوپٹ راج۔ مگر آج کل جن شہروں اور آبادیوں میں باشندوں کی حفاظت کے خیال سے اندھیرا رکھا جاتا ہے اُن پر یہ مثال صادق نہیں آتی۔ اندھیر اور اندھیرا یہ دو الگ الگ لفظ ہیں اور ان کے معانی بھی الگ ہیں۔ اگرچہ اندھیر اندھیرے کا ہم شکل ہے لیکن ہم مشرب نہیں ہے۔ عربی میں اندھیر کو ظلم اور اندھیرے کو ظلمت کہتے ہیں۔ فارسی میں اس کا نام تاریکی ہے۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے میرے مضامین کے مجموعہ سی پارۂ دل میں ایک موزوں فقرہ شائع ہوا تھا تو اگر عہد دفا باندھ کے میرا ہو جائے۔ گورے ملکوں کے اجالوں میں اندھیرا ہو جائے۔ اُس وقت یہ بات کسی ایسے آدمی کے خواب میں بھی نہیں آ سکتی تھی جس کو معدہ کی خرابی کے سبب بُرے خواب دکھائی دیتے ہوں کہ گورے ملکوں کی برقی روشنیاں کبھی اندھیرے سے بدل سکتی ہیں۔

۱۹۱۱ء میں مصر و فلسطین اور ملک شام کا سفر کیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ جہاں جہاں ترکوں کی حکومت تھی وہاں سورج چھپنے سے پہلے بازار بند ہو جاتے تھے اور رات بھر بازاروں میں اندھیرا رہتا تھا اور قاہرہ اور اسکندریہ میں جہاں انگریزی حکومت تھی وہاں رات بھر بجلی کی روشنی رہتی تھی۔ اس کی وجہ بتائی گئی تھی کہ ترکی حکومت کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ ڈاکوؤں اور چوروں کے ڈر سے سرِ شام بازار بند ہو جاتے ہیں

اہلِ تصوف تاریکی کو خدا کا نور سمجھتے ہیں کیونکہ تاریکی دلوں کو تسکین دیتی ہے اور عیبوں کو چھپاتی ہے۔ رات کو جب سونا چاہتے ہیں تو روشنی خاموش کر دیتے ہیں جب نیند آتی ہے کعبہ کا غلاف بھی اسی واسطے ہمیشہ سے کالے رنگ کا ہے کہ خدا کا نور تاریکی میں ہوتا ہے۔ ۱۳ اپریل ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ لاہور کے چنگڑ محلہ سے یہ کالے حروف لکھنے والا ایک تانگے میں سوار ہوا تا کہ دہلی جانے والی ریل اُس کو مل جائے۔ راستے میں بلیک آؤٹ کے سبب ایسا اندھیرا تھا کہ قدم قدم پر ڈر لگتا تھا کہ تانگہ کسی موٹر یا تانگے سے ٹکرا جائے گا۔ اُس وقت لکھنے والے کے دل میں یہ بات آئی تھی کہ تاریکی تسکین دینے والی چیز ہے مگر مجھے تو اس وقت یہ بے اطمینان کر رہی ہے اور جب اندھیرے کی گود میں میرا تانگہ بمشکل تمام لاہور اسٹیشن پر پہنچا اور ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کے سائے میں فرنٹیئر ایکسپریس کے قریب گیا تو ریل نے یہ کہہ کر چلنا شروع کیا کہ نئی روشنی کے زمانے میں کوئی ریل مسافروں کا انتظار نہیں کیا کرتی۔ میں نے کہا تم چلیں۔ جان چلی۔ دونوں برابر کھسکے۔ تم کو تھاموں۔ یا اسے۔ پاؤں پڑوں کس کس کے۔ مگر ریل نے میری شاعری کی داد نہ دی اور مجھے پلیٹ فارم کے اندھیرے میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔

پس اندھیرا باوجود اس یقین اور اعتقاد کے کہ وہ اللہ کا نور ہے ۱۳ اپریل کی منحوس تاریخ کی رات کو میرے لئے باعثِ تسکین نہ تھا۔

حسن نظامی دہلوی

تصوّرِ شباب

بوندوں کی مچلتی صہبا سے سرشار ہُوا بُوٹا بُوٹا
گھنگھور گھٹا کا سناٹا، پانی کی ٹپاٹپ سے ٹوٹا

دروازوں کے دُھندلے شیشوں پر برسات کے گُھنگرو بجتے ہیں
کانوں کے کھنکتے پردوں پر جذبات کے گُھنگرو بجتے ہیں

سبزے کی لچکتی ٹہنی پر یوں مست ہوائیں چلتی ہیں
جس طرح سے برقی تاروں پر تیزی سے صدائیں چلتی ہیں

یہ سب تو ہے کمرے کے باہر اور کمرے میں تنہائی ہے!
پلکیں ہیں تمنّا سے بھاری، جیسے کہ مجھے نیند آئی ہے

کیا جانے جہاں تم رہتی ہو اِس وقت وہاں کیا موسم ہے؟
ایسی ہی وہاں بھی بارش ہے یا اس سے بہت ہی مدھم ہے؟.........

.... لیکن، میں کسے "تم" کہتا ہوں اِس دور میں اپنی ہستی کے
تخئیل کی یہ ایجادیں ہیں یہ سب ہیں کرشمے مستی کے

علی جواد زیدی

"ریاکار"

(لندنی دوست کے نام خط)

تم ٹھیک کہتے ہو میں بھی ریاکار ہوں۔ مسوری میں بیٹھ کر مسوری آنے والوں پر پتھر پھینکتا ہوں۔ پنجاب کے جھلستے ہوئے میدانوں اور تپتے ہوئے صحراؤں کی مخلوق سے منہ موڑ کر پہاڑ پر آ کر گرد ہوائی قلیوں سے اظہارِ ہمدردی کرنا تمہارے نزدیک ریاکاری ہے۔ میرا ضمیر تمہاری ملامت سے نادم ہے لیکن تم نے وطن پرستی کا جو معیار مقرر کیا ہے اُس پر تو یہاں کوئی بھی پورا نہیں اترتا۔ تم نے مجھے "آئرش ریپبلیکن آرمی" کے اُن ارکان کی یاد دلائی ہے جنہوں نے ایک دن لندن کے ٹاٹنہم کورٹ روڈ کے زمین دوز سٹیشن کو بم سے اُڑا دیا تھا اور اُن کے گرفتار ہونے پر ہم دونوں مقدمے کی تفصیل سننے کے لئے عدالت میں گئے تھے۔ تمہاری یاد دہانی سے اُن تمام ملزموں کی شکلیں میری آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی سولہ سال کی تھی اور سب سے بڑا لڑکا بائیس سال کا۔ ہم تماشائیوں کی گیلری میں بیٹھے ہوئے جج کے خشمناک چہرے، اور ملزموں کی پُرسکون طمانیت کا مقابلہ کر رہے تھے۔ لڑکی کا بیان سب سے پہلے ہوا تھا وُہ باوقار انداز میں چھچے تلے الفاظ میں کہہ رہی تھی:—

(میں اپنے ذمّے صرف تین فرائض سمجھتی ہوں اور اِن فرائض کے ادا کرنے میں مَیں اپنی عمرِ عزیز کا تمام سرمایہ صرف کر دینا چاہتی ہوں۔

سب سے پہلا فرض میرے ذمّے خدا کی اطاعت ہے جس میں مَیں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔

دوسرا فرض وطن پرستی ہے جس کی پاداش میں آج مجھے اس کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑا ہے۔

تیسرا اہم فرض میرے ذمّے والدین اور متعلقین کی خدمت ہے۔ جب میں اپنے اولین فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں گی تو اِس فرض کو بھی ادا کروں گی:

جج نے چھ سال سے لے کر بارہ سال تک قیدِ بامشقت کی سزائیں سنائیں۔ تماشائی دم بخود رہ گئے۔ مجرم اُنہی پرسکون چہروں سے جج کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی جوانی کو قید و بند کے مصائب کی نذر کرنے کے لئے روانہ ہو گئے جن سے وہ عدالت میں داخل ہوئے تھے۔ یہاں یہ بات ممکن نہیں۔ میں وطن کو پیچھے چھوڑ کر اپنے اہل و عیال کو گرمی سے بچانے کا فرض ادا کرنے کے لئے پہاڑ پر چلا آتا ہوں۔ اور اُس وقت یہ بالکل فراموش کر دیتا ہوں کہ کسی زمانے میں (اور یہ کتنا خوشگوار زمانہ تھا) تپتے ہوئے لاہور کی جون اور جولائی کی گرمی میں ہم چھ دوست عنایت منزل کا ایک کمرہ چار روپے ماہوار کرایہ پر لے کر دن گذارا کرتے تھے اور رات کو بارش ہونے پر چارپائیوں کا پُل بنا کر اس پُل کے نیچے چٹائیاں بچھا کر سویا کرتے تھے۔ یہ ساری انجنیئری صادق کی ہوتی تھی جو غالباً ایسے ہی کام کر کر کے اب امپیریل سروس میں آ گیا ہے۔ پانی رات بھر ہماری چٹائیوں کے نیچے چلتا رہتا لیکن ہم اپنے ہمسایہ دھوبیوں کو دیکھ کر مطمئن ہو کر سوئے رہتے۔ اِن دھوبیوں کے پاس پُل بنانے کے لئے چارپائیاں بھی نہ ہوتی تھیں اور سر چھپانے کے لئے کمرہ بھی نہ ہوتا تھا۔ مجبوراً بیچارے بارش کی رات اپنے بیلوں کے ساتھ گذارتے جو سرکنڈوں کی ایک چھت کے نیچے بندھے ہوتے تھے۔

اب میں، تم اور صادق سب وُہ زمانہ بھول چکے ہیں۔ تم لندن سے اِس لئے نہیں آنا چاہتے کہ تمہارا ملک آزاد نہیں اور تمہاری قوم غلام ہے صادق کہہ رہا تھا "شادی کر لوں دو سو روپے ماہوار میں بیوی کے کپڑے بن جایا کریں تو کسی جدید لڑکی سے نباہ ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ فی الحال میں کپڑوں کے لئے بیوی کو نہیں دے سکتا" میں اپنے ضمیر کو فرض کی بجا آوری کا دھوکا دے کر ہر سال پہاڑ پر چلا آتا ہوں۔ لیکن غور کرو۔ میری ریاکاری صرف اپنی ذات تک محدود ہے۔ میں اپنی حلال کی کمائی (اِس میں شبہ کرنے کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ میرا محکمہ ہی بدقسمتی سے ایسا ہے جس میں حرام کا مال کمایا نہیں جا سکتا ورنہ ہم کبھی اِس کوشش سے باز نہ رہتے) سے یہ سب کچھ کر رہا ہوں اور اپنے مجرم ضمیر کو خاموش کرنے کی توجیہہ تلاش کر لیتا ہوں۔ پھر بھی نہیں تمہارے ملامت کرنے پر یہ ندامت بھی محسوس کر رہا ہوں کہ نوجوان آئرش لڑکی کے مقابلے میں میرا جذبۂ وطن پرستی کتنے ادنٰے درجے کا ہے۔ لیکن غلام آبادِ ہند کے اُن قوم پرستوں کو دیکھو جو دن رات قوم فروشی اور وطن دشمنی میں مصروف رہتے ہیں تو مجھے میری ریاکاری پر ملامت کرنا بھول جاؤ۔ کیونکہ یہ لوگ جب ریاکاری سے کام لیتے ہیں تو اُس وقت اِن کا ضمیر

انہیں ملامت بھی نہیں کرتا۔ یہ تسلیم کہ ہر ایک آدمی کا ضمیر اُسے بدی کرنے سے روکتا ہے اور بدی کرنے پر ملامت کرتا ہے لیکن وطن پرستوں اور قوم پرستوں کا ضمیر کہیں ہو تو بدی سے روکے یا بدی کرنے پر ملامت کرے۔ ان کا ضمیر آغازِ شعور سے ہٹ دھرمی اور ہوس کاری کے کچوکے کھاتا ہُوا آخر کار مندمل نہ ہونے والے گھاؤ کا شکار ہو کر مر جاتا ہے اور اِس ضمیر کے خلا پر پھر کئی طرح کے شیطان قبضہ پا لیتے ہیں جو دن رات قوم پرست کو ریاکاری اور منافقت کی نئی سے نئی راہیں سمجھاتے رہتے ہیں۔ ان کی تفصیل سنو تو دنگ رہ جاؤ۔

یہ لاہور کے ایک قہوہ خانے کا ذکر ہے۔ حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ واپس آؤ گے تو لاہور کا حلیہ بدلا ہُوا پاؤ گے۔ دربعض جگہوں پر تو بالکل لندن کا نقشہ نظر آئے گا۔ اب لاہور میں جگہ جگہ قہوہ خانے کھل گئے ہیں اور ان میں سے بعض میں ہر اُس چیز کی نقل کی جاتی ہے جو فرنگی آقا نے غلام آباد کو لُوٹ لُوٹ کر اپنے ملک میں مہیا کر لی ہے۔ چنانچہ جس قہوہ خانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اِس میں بیشتر فرنگی رنگ ہی نظر آتا ہے۔ ہم ایک چائے پر مدعو تھے۔ ایک غلام اپنی سعید اور پاک روح کے غلام جسم میں گرفتار ہونے کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ وہ اِسے فرنگی آقا کی پیروی میں (Birthday) (برتھ ڈے) پکارتا تھا۔ اور ہم اُسے اُس کی عمر کے پچیس سال کامیابی سے غلامی کی نذر ہو جانے پر مبارکباد دینے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ ہمارے قریب ایک میز پر ایک ادھیڑ عمر کے قوم پرست اور اسی گروہ کی ایک نوجوان خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ قوم پرست حسبِ معمول سر تا پا کھدر میں ملبوس تھے صرف سیاہ اچکن کے ساتھ میل کھانے والی سیاہ بدیشی جرابیں پہنے ہوئے تھے اور یہ بات نظرِ غائر کے بغیر معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ہر لحاظ سے بظاہر قوم پرست اور بباطن مسلمان معلوم ہوتے تھے۔ خاتون بھی گاڑھے کی ساری زیبِ تن کئے ہوئے تھیں۔ البتہ گردن کے زیریں حصّے پر جمپر کی قوس کے نیچا ہونے کی وجہ سے اُن کی سلک کی بدیشی شمیز کے پھول بار بار باہر نکل آتے جن کو وہ کیوٹکس سے رنگے ہوئے نوکدار ناخنوں سے بار بار جمپر کے نیچے دبانے کی کوشش کرتیں۔ اِن دونوں قوم پرستوں کے بظاہر سودیشی اور بجسم بدیشی کپڑے دیکھ کر پہلے تو تعجب ہُوا لیکن معاً خیال آیا کہ آخر اِن بیچاروں کا کیا قصور ہے اگر سودیشی کارخانوں والے نازو نعمت میں پلے ہوئے جسموں (اور بیشتر معزز قوم پرستوں کے جسم ناز و نعمت ہی میں پلے ہوئے ہوتے ہیں) کے لئے سلک کے موزے، سلک کی شمیزیں اور کیوٹکس نہیں بناتے تو یہ لوگ مجبوراً بدیشی چیزوں کی طرف رجوع نہ کریں تو کیا کریں۔ آخر انسانی جسم پتھر کا تو ہے نہیں جو گاڑھے اور سلک میں فرق محسوس نہ کرے۔ دونوں کے لمس میں اذیت اور لطف کا جو فرق ہے اُس کو معزز قوم پرستوں کے منجھے ہوئے جمالیاتی ذوق سے بہتر اور کون محسوس کر سکتا ہے۔ پھر جب شمیز، موزے اور کیوٹکس ضروریاتِ زندگی ٹھہرے تو انسان بدیشی سے بھاگ کر کہاں جائے۔ خود گاندھی جی ہی کو دیکھ لو۔ سودیشیوں کی سستی سے مجبور ہو کر وقت دیکھنے کے لئے بدیشی گھڑی استعمال کر ہی لیتے ہیں۔ اور وقت کم ہو تو تھرڈ کلاس میں بیٹھنے کی بجائے فسٹ کلاس موٹر کار میں بھی سفر کرتے ہیں۔ اب ہر ایک آدمی کی ذاتی ضروریات میں فرق ہے۔ سب لوگ نیم برہنہ رہ کر تو زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اگر گاندھی جی ذاتی ضروریات کی وجہ سے بدیشی مشینیں استعمال کرنے پر مجبور ہیں تو اِن قوم پرستوں کا کیا قصور ہے جو بدیشی مشینوں کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کر رہے ہیں۔ تم اِسے ریاکاری کہہ لو لیکن میں تو انسانی کمزوریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اِس سے درگذر ہی کروں گا۔ یوں بھی اِن سطحی باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے تمہیں قوم پرستوں کے خیالات اور جذبات پر غور کرنا چاہیئے۔ اس کی ایک مثال تمہیں انہیں قوم پرستوں کی اِس گفتگو میں مل جائے گی جس میں وہ اس وقت مشغول تھے۔

اچکن پوش قوم پرست کہہ رہا تھا "شراب بالخصوص تو ہمارے مذہب میں منع نہیں۔ ہر ایک چیز جو نشہ دیتی ہے، وُہ منع ہے۔ زیادہ کھانا کھانا بھی منع ہے کیونکہ اُس سے بھی نشہ سا ہو جاتا ہے۔ (یہ "خمر" کی تعریف ہو رہی تھی) اور اگر کسی چیز سے نشہ نہ ہو تو وہ حلال ہے"

ساری نے جواب دیا "میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ شمپین سے بالکل نشہ نہیں ہوتا۔ یہ بالکل ہلکی شراب ہے۔ اور رنگ بھی پانی کا سا۔ غالباً آپ نے کبھی [illegible] نہیں کی"

اچکن: "یہ تو میں دعوے نہیں کرتا کہ میں نے شراب کبھی چکھی نہیں کیونکہ مَیں اتنا متعصب مسلمان نہیں۔ نیشنل کاموں میں حصّہ لینے کے لئے ایسے prejudices کو ایک طرف ہی رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن کھلے بندوں ایسے مجمع میں ایسی باتوں میں indulge کرنے سے شہرت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ آپ پسند کریں تو آپ شوق فرما سکتی ہیں۔ میں سوڈا منگوا لوں گا اور آپ کی رفاقت رہے گی!"

ساری: بہتر۔ اگر آپ کی یہی رائے ہے تو اسی طرح سے سہی۔ (ملازم کی طرف مخاطب ہو کر) ویٹر! ایک شمپین اور ایک سوڈا،

ویٹر جانے لگا تو ساری نے پھر اُسے پکارا۔ "اور ہاں دیکھو۔ دونوں پانی پینے کے ٹمبلر میں لاؤ۔ وائن گلاس نہیں چاہئیں۔"

ویٹر "بہتر حضور" کہہ کر مسکراتا ہوا چلا گیا اور تھوڑی دیر میں دو سفید گلاسوں میں دو سبز رنگ مرکب ڈال کر لے آیا۔ ایک بھرا ہوا تھا اور ایک میں پیندے سے لگی ہوئی سیّال شے تھی۔

ساری اور اچکن نے گلاس ختم کئے۔ ساری نے تھرمس کو جمپر کے نیچے چھپایا۔ اچکن نے دو پلی ٹوپی سر پر رکھی۔ اور وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں جلد چلنا چاہئے۔ مہاتما...... تو اب تک آچکے ہوں گے۔ لیکچر شروع ہونے والا ہوگا اور اگر کہیں اُن کے لیکچر کے درمیان ہم وہاں پہنچے۔ تو مجمع میں گڑبڑ ہو جائے گی کیونکہ آپ پہلی دفعہ یہاں تشریف لائی ہیں اور آپ کے درشن کے لئے لوگ ضرور اٹھ کھڑے ہوں گے اور پھر نعرے بھی ضرور لگیں گے۔"

ساری نے لجاتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔ میں کوئی اتنی بڑی قومی سیوک تو ہوں نہیں جس کے درشن کے لئے لوگ بے تاب ہو رہے ہوں"

اچکن نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا "آپ کی قومی سیوا میں تو شبہ کرنے کی گنجائش نہیں لیکن لاہور بھر میں آپ کے Personal charm کی بھی تو دھوم مچ رہی ہے"

کھدر پوش شوفر نے دروازے پر کھڑی ہوئی لیموسین کار کا دروازہ کھول دیا۔ ساری نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا "آپ بڑے شریر ہیں" اور کار ہال روڈ سے گزرتی ہوئی پنڈال کی طرف چلی گئی۔ بھلا کیا سمجھے ؟ اقبال کی زبان سے ایک اشارہ کردوں۔

مے خانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

قوم پرست غیر مسلم مسلمان کو قوم پرست بنانے کے لئے "مے خانۂ یورپ کے دستور" کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ حکیمِ اُمت نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

کیا دبدبۂ نادر کیا شوکتِ تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مے ناب آخر

اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس شعر کی تعبیر دیکھی ہے۔ جب اس قوم پرست مسلمان کی تقریر ختم ہونے لگی تو جانتے ہو وہ کیا کہہ رہا تھا !

"بھائیو۔ اب آپ شریمتی...... کی تقریر سنیں گے۔ آپ ان کا درشن آج پہلی مرتبہ کر رہے ہیں، میں انہیں اُس وقت سے جانتا ہوں جب چند سال پہلے میں قومی وفد کے ساتھ انگلستان گیا تھا اور آپ وہاں کیمبرج میں تعلیم پا رہی تھیں۔ آپ وہاں قومی جماعت کی سرگرم کارکن تھیں۔ آپ کے پریم، خلوص، اور قومی خدمت کے جذبہ کی دھوم انگلستان بھر میں مچی ہوئی تھی۔ چند مہینوں کے قیام میں میں بھی آپ کی گوناگوں خوبیوں کا قائل ہوگیا۔ ایک orthodox ہندو گھرانے میں تربیت پانے کے باوجود آپ کے دل میں ذرہ بھر بھی تعصّب نہیں بلکہ جب میں ان کو دیکھتا ہوں تو جہاں مجھے یہ فخر ہوتا ہے کہ ہماری قوم میں ایسی ایسی شریف اور سمجھ دار دیویاں موجود ہیں وہاں مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ قومی میدان میں مسلمان خواتین ایسی دیویوں سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مسلمان عورتیں قومی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گی۔ اسلام......"

اسلام کا نام سنتے ہی کوئی بھولا بھالا مسلمان اپنا پورا گلا کھول کر پکارا "نعرۂ تکبیر"

پنڈال کے تمام مسلمانوں نے بیک وقت "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا جس کی فلک بوس صدا آس پاس کے مکانوں سے ٹکرا کر گونجنے لگی اور اس شور کے درمیان مقرر کا فقرہ گم ہو کر رہ گیا اور شریمتی...... صوفے سے اُٹھ کر مائیکروفون کے سامنے آکر کھڑی ہوگئیں۔

دوست اگر مجھے ریاکار کہتے ہو تو اس قوم پرست کے لئے کون سا نیا لفظ ایجاد کرو گے ؟

مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک درس گاہ کا افتتاح ہو رہا تھا۔ فرنگی آقا کے بڑے بڑے خطاب یافتہ اور خطاب کی اُمید پر جینے والے غلام جمع تھے۔ پلاؤ، قورمہ، بریانی اور ہر طرح کے ایسے کھانے میزوں پر چنے جا رہے تھے جن میں گھی بکثرت موجود تھا جس کو دیکھ دیکھ کر کھانے والوں کی

توندوں اور چربی کے منہ میں پانی آرہا تھا۔ رسمی افتتاح سے پہلے کھانے سے فراغت پانا ضروری سمجھا گیا تھا تاکہ افتتاح کی رسم پر کافی وقت صرف ہو سکے اور وہ لوگ آسانی سے جلد گھر واپس جا سکیں جنہیں افتتاح کے مقابلے میں اکل و شرب میں زیادہ دلچسپی تھی اور جنہیں ذاتی طور پر ممنون کرنے کے لئے منتظمین نے یہاں جمع ہونے کی دعوت دی تھی۔ کھانے کے دوران میں ایک سوٹ پوش نوجوان نے پاس بیٹھے ہوئے ایک اچکن پوش بزرگ سے پوچھا۔

"اس شہر میں لڑکیوں کے لئے اور بھی بہت سی درس گاہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے موجود ہیں۔ آخر اس قدر صرفِ کثیر سے ایک نئی درس گاہ کے افتتاح سے آپ کا مقصد کیا ہے؟"

اچکن پوش نے جواب دیا "حضرت مقصد تو بالکل واضح ہے۔ شہر میں لڑکیوں کے لئے درس گاہیں تو بہت موجود ہیں لیکن اسلامی درسگاہ کوئی نہیں"

سوٹ پوش نے پُرمعنی انداز میں کہا "تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس درس گاہ میں لڑکیوں کے لئے اسلامی نصاب اور اسلامی نظامِ حیات رائج کریں گے"

اچکن پوش اسلامی درسگاہ کی اس تشریح پر کچھ کھٹکے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اسلامی درس گاہ کا تخیل منطقی رو سے صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہاں اسلامی نصاب اور اسلامی نظامِ حیات کی تعلیم دی جائے۔ کچھ گھبرا کر کہنے لگے،

"جی ہاں قرآن کی تعلیم اور نماز کی پابندی لازمی ہوگی لیکن نصاب تو یونیورسٹی کا مقرر کردہ ہی ہوگا کیونکہ اس کے بغیر یونیورسٹی سے درس گاہ کا الحاق نہیں ہو سکے گا"

سوٹ والے نے پوچھا "لیکن قبلہ آپ کو اتنی مصیبت کیا پڑی ہے کہ درس گاہ کا الحاق یونیورسٹی سے کرایا جائے۔ اگر آپ کا مقصد لڑکیوں کو ڈگریاں دلانا ہے تو اس کے لئے اور کالج بھی موجود تھے اور یہ کہئے کہ لڑکیوں کو ڈگریاں دلا کر آپ کیا کریں گے۔ آپ کے لڑکے تو ڈگریاں لے لے کر کھوکوں مرنا شروع ہو گئے ہیں۔ اب کیا آپ لڑکیوں کے لئے بھی اسی مستقبل کا سامان پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ دھوبی کے کتے کی طرح نہ گھر کی رہیں نہ گھاٹ کی؟"

اچکن پوش نوجوان کے انقلابی خیالات سے کچھ برہم سا ہو گیا۔ بولا "آپ تو سوشلسٹ معلوم ہوتے ہیں۔ سوشلسٹوں کا تو یہ وطیرہ ہے کہ وہ ہر ایک بات پر اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ اب آپ ہی کہئے کہ ایک اسلامی درس گاہ قائم کرنے میں کیا حرج ہے"

اب نوجوان نے بھی اپنے تیور بدلے۔ کہنے لگا "قبلہ گستاخی معاف۔ یہی تو میں آپ سے پوچھ رہا تھا کہ یہ درس گاہ اسلامی درس گاہ کیسے ہو گئی۔ اس لئے کہ ہم اور آپ یہاں بیٹھے ہوئے پلاؤ قورمہ کھا رہے ہیں یا اس لئے کہ آپ نے یہاں قرآن کی تعلیم اور نماز کی پابندی لازم قرار دے کر اس کی نگرانی ایک ہندو عورت کے سپرد کر دی ہے جس نے درس گاہ کی صدر کی حیثیت سے آج یہ افتتاحی رپورٹ مرتب کی ہے جو ہم لوگوں کے سامنے ہے اور جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ درس گاہ میں دن رات مقیم رہنے والی لڑکیوں کی نگرانی مس ــــــ کے سپرد کی گئی ہے جو اس درس گاہ میں آنے سے پہلے ہزہائی نس ــــــ کی حرم سرا کی منتظم تھیں۔"

ایک اور ڈاڑھی والے بزرگ درمیان میں بول اٹھے "صاحب آپ حقیقت بیانی سے کام نہیں لے رہے۔ درس گاہ کی صدر ہندو خاتون نہیں بلکہ عیسائی ہیں۔"

اچکن پوش نے دیکھا کہ معاملہ حد سے بڑھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی اور گل کھلے اس لئے بے تاب ہو کر بولے "دیکھئے صاحب ہم ہندوستانیوں میں یہی تو نقص ہے کہ ہم مجلس میں بیٹھ کر بھی ذاتیات کی بحث سے گریز نہیں کرتے۔ ہم میں سے جب بھی کوئی آدمی اچھا کام کرے ہم اس کے کام کو دیکھنے کی بجائے اس کی ذات کے نقائص نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ ذاتیات کو چھوڑیئے۔ کام کو دیکھئے۔"

سوٹ پوش نوجوان اس منطق سے مطمئن ہونے کے لئے تیار نہ تھا پھر بول اٹھا "تو حضرت پھر اسلامی درس گاہ قائم کرنے کی تکلیف ہی کیوں کی گئی۔ یونیورسٹی کی غلام ساز تعلیم دینے والی تو اور درس گاہیں بہتری ہیں آپ سے کوئی حکیم نے تھوڑا ہی کہا ہے کہ پلاؤ کھا کر ایک نئی درس گاہ کا افتتاح کریں۔ ـ ـ ـ ـ ـ"

یکایک نعرۂ تکبیر کی صدا پر اللہ اکبر کے نیم جان نعرے بلند ہوئے۔ سب لوگ کھانا کھاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ حسن صاحب

کو درس گاہ کا افتتاح کرنا ہے وُہ آ پہنچے ہیں۔ بجلی کی روشنی میں چند سفید طرّے عام سروں سے بلند نظر آ رہے تھے۔ طرّوں کے مختصر سے جلوس کے پیچھے پیچھے بیڈول جسم اور بھاری توندوں والے چند اور آدمی ہندوستان میں دستیاب ہونے والے بہترین سوٹ زیب تن کئے ہوئے آہستہ آہستہ ایسے ہی چل رہے تھے جیسے بطخیں پانی پر تیر رہی ہوں۔ میزوں سے اُٹھ کر ہی چند آدمی پیشوائی کے لئے لپکے۔ کچھ اِس نفسا نفسی میں جلد جلد کلّیاں کرتے ہوئے لوگوں سے نظر بچا کر اپنی موٹروں میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ طرّوں اور بطخوں کے تھم جانے پر جلسے کی کارروائی شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے معتمد صاحب نے ایک طرّے دار صدر کی اجازت سے اپنی رپورٹ پڑھی۔ جس کا اقتباس یہاں درج ہے :-

'حضرات اور محترم خواتین! (یہ قناتوں کے پیچھے گپ شپ میں مصروف تھیں اور ان کے قریب بیٹھے ہوئے ایک مولوی صاحب انہیں بار بار خاموش رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ مگر جب مولوی صاحب ڈانٹتے اور محترم خواتین کچھ عرصے کے لئے خاموش ہو جاتیں تو کوئی بچہ وہاں رونے لگتا اور مولوی صاحب اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے اور کہتے "خدا کے لئے اسے چپ کر دو") خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہم یہاں ایک اسلامی درس گاہ کے افتتاح کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم جس کس مپرسی کی حالت میں ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر یہ درس گاہ قائم کی گئی ہے کہ مسلمان لڑکیاں بھی یونیورسٹی کی تعلیم سے بہرہ ور ہو سکیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس درس گاہ کے انتظام کے لئے ہمیں مس ـــــ دستیاب ہوئی ہیں۔ آپ فارن (ولایتی) درس گاہوں کی تعلیم یافتہ ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ تہذیب یافتہ اور متمدن ممالک کے ذاتی تجربوں کی مدد سے وہ ہماری لڑکیوں کی زندگی کو بدرجۂ اتم سدھار سکیں گی اور اُن کے عادات و اطوار میں یورپ کی ترقی یافتہ عورتوں کی سی خوبیاں پیدا کر سکیں گی۔ (ہیئر ہیئر کی آوازیں) . . . . اس درس گاہ میں لڑکیوں کو اسلامی تعلیم بھی دی جائے گی۔ گو ابھی تک اِس کی تدریس کا انتظام نہیں ہو سکا لیکن منتظمین کی کمیٹی کے سامنے یہ اہم مسئلہ پیش ہے۔ انشاء اللہ اس کا حل جلد سوچا جائے گا۔ فی الحال ہوسٹل میں رہنے والی طالبات پر باقاعدہ نماز پڑھنے کی پابندی عاید کی گئی ہے اور اس کی نگرانی کا کام مس ـــــ کے سپرد کیا گیا ہے جو نہایت صالح عورت ہیں اور ایک عرصے تک ہز ہائی نس ـــــ کے حرم کی نگران رہی ہیں . . . .

آخر میں مجھے سر ـــــ کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی خاص عنایتوں کی وجہ سے اور جن کے مفید مشوروں کے باعث ہم یہ درس گاہ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آپ نہ صرف ہمارے قومی رہنما ہیں بلکہ ہمارے مذہبی امور میں بھی از حد دلچسپی لیتے ہیں۔ یہی دلچسپی آج انہیں صدارت کے لئے یہاں کھینچ لائی ہے۔ میں اِن کا آپ کی طرف سے اور ساری قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اب آپ کے سامنے اِس درس گاہ کی صدر مس ـــــ چند کلمات عرض کریں گی۔'

مہتمم کی تقریر ختم ہونے پر تالیوں نے سائبان کے پردے ہلا دیئے۔ اور مس ـــــ ایک خوشگوار تبسم کے ساتھ صدر کی اجازت سے تقریر فرمانے لگیں۔ صدر جو ابھی تک اونگھ رہے تھے یکایک جاگ اُٹھے۔ یہ مس ـــــ کی جارجٹ کی ساری کی سرسراہٹ کا اثر تھا یا اُن کے معطر جسم سے ہوا میں پھیلنے والی عطر کی لپٹوں کا کرشمہ تھا کہ صدر اُن کی تقریر کے دوران میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ اونگھے بلکہ سارا عرصہ اُن کی طرف تکتے رہے۔ تالیوں کے شور کے درمیان درس گاہ کی صدر کی تقریر ختم ہوئی۔ جلسے کے صدر نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور درسگاہ کی بقا کے لئے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی، جس کا اختتام اُن آیات پر کیا جو میاں صاحب کی مسجد کی محراب کے اوپر لٹکے ہوئے بورڈ پر لکھی ہوئی ہیں۔ جلسہ برخاست ہُوا۔ مہتمم صاحب نے لپک کر درسگاہ کی صدر اور ہوسٹل کی نگران کا تعارف صاحب صدر سے کرایا۔ تبسموں کا تبادلہ ہُوا۔ ملاقات کی تقریب سے موضوع بدل کر موسم کی باتوں تک پہنچا۔ اور پھر مس ـــــ نے یورپ سے سیکھے ہوئے ہتھیاروں کی مدد سے باتوں باتوں میں صاحب صدر کو سینما کے سیکنڈ شو میں چلنے پر آمادہ کر لیا بلکہ صاحب صدر نے صدر درس گاہ اور ہوسٹل کی نگران سے درخواست کی کہ وہ اُس کے ساتھ سینما چلیں۔ دیگر طرّوں نے موقع شناسی کا ثبوت دیا اور اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ صرف ایک طرّہ موٹر کی پچھلی نشست پر اپنے دونوں پہلوؤں کو علم و حسن کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے گرماتا ہُوا سینما کو روانہ ہو گیا۔

سنتے ہو انسان نے ہوس کاری کے وہ وہ دلفریب اور پاکیزہ طریقے ایجاد کئے ہیں کہ شیطان بھی ششدر رہ گیا ہے۔ اسلامی درس گاہ کے افتتاح کی جو تصویر میں نے دیکھی ہے اس کو اگر ہٹلر اور مسولینی دیکھ پائے تو برطانوی وزرا کو اُن کی ریاکاری پر کوسنے کی بجائے انہیں ہندی

مسلمانوں سے ریاآموزی کے لئے زانوئے ادب تہ کرنے کی تلقین کرے۔ کیونکہ فرنگی مدبر جب اپنی حماقت سے قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں بھی دھکیل رہا ہوتا ہے تو ایک جذبہ ضرور اُس کے دل میں موجزن ہوتا ہے اور وہ جذبہ تحفظِ قوم اور تعمیرِ قوم کا ہوتا ہے۔ یہاں تحفظِ قوم اور تعمیرِ قوم کا جذبہ پیدا ہی اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی قومی رہنما ریاکاری سے ہوس رانی میں مشغول ہونا چاہتا ہے۔ تحفظِ قوم اور تعمیرِ قوم کی آڑ صدیوں پُرانی ہونے کے باوجود اب تک اِس قدر مفید اور کارآمد ہے کہ اِس کی پناہ میں ہر اُس گناہ کا ارتکاب کیا جا سکتا ہے جس کے خیال سے دنیا کے بدترین قاتلوں اور سفاکوں کے بھی دل کانپ کانپ جاتے ہیں۔ کیونکہ قاتل اور سفاک ایک کردار کا مالک ہوتا ہے اور اُس کا بھی ایک ضمیر ہوتا ہے۔ یہ ضمیر اُسے ذاتی منفعت کے لئے انفرادی جان و مال کے نقصان پر اُکساتا ہے اور مہم کے تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے جرأت دلاتا ہے۔ لیکن تمہارے قوم پرستوں اور قومی رہنماؤں کا حال مختلف ہے۔ اِن کے ہاں اوّل تو ضمیر ہے ہی نہیں اور جو ہے وُہ انہیں خطرات سے پرے رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہاں تک کہ قوم کے روتے ہوئے چہرے کے سامنے ریاکاری سے ہنسنے کے گُر سکھاتا ہے اور قوم کی افلاس اور مشقت سے دبی ہوئی پیٹھ میں خنجر بھونکنے کے داؤ سکھاتا ہے۔ تمہارا سماجی قاتل دلیر ہے اور تمہارا قومی رہنما بزدل ہے اور اِن دونوں میں وہی فرق ہے جو ابلیس اور مُلا میں ہے۔

مجھے میری ریاکاری پر مطعون کرتے ہوئے اب یہ تم فیصلہ کر لو کہ اِس فن میں ہندی مسلمان رہنما کا درجہ کس قدر بلند ہے!

اور سنو۔ ہم پہاڑوں کی ملکہ مسوری میں مقیم تھے۔ ایک دن صبح صبح اُٹھا ہی تھا کہ ڈاکٹر سوہن سنگھ کا ٹیلیفون آیا۔ ٹیلیفون پر پہنچا تو ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ بالوں والا سکھ نہ ہونے کے باوجود وہ حکومت کے چند ارکان کی مدد سے بے وقوف بنائے گئے تھے۔ اور انہیں ساوؤے (Savoy) میں اُسی شام منعقد ہونے والے ناچ کے لئے دو ٹکٹ خریدنے پر اس لئے مجبور کیا گیا تھا کہ تمام gate Proceeds (ٹکٹوں کا روپیہ) وار فنڈ کی نذر ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی کہ اُن کے فالتو ٹکٹ کے بجا مصرف کے لئے میں اپنے آپ کو پیش کردوں کیونکہ فرنگی کے ایک مسلمان چیلے اور رُکنِ سلطنت ہی نے اُن کی جیب تراشی تھی لہٰذا روزِ روشن میں ڈکیتی کی اِس واردات کو مکمل کرنے کے لئے بھی ایک مسلمان ہی کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ بزرگ اور کچھ ضرورت سے کم سکھ ہیں۔ اس لئے معذرت کے باوجود مجھے شام کو ساوؤے میں پہنچنا ہی پڑا۔

پہاڑوں کی اِس ملکہ کے مکانات میں ساوؤے کی حیثیت بادشاہ کی سی ہے۔ بازاروں اور شہر سے الگ ہٹ کر ایک اونچے ٹیلے پر اس ہوٹل کے لئے جگہ منتخب کی گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہاں ہندوستان کے عوام سے الگ رہنے والے لوگ ہی آکر رہتے ہیں۔ ناچ دس بجے رات کو شروع ہونے والا تھا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے رات کا کھانا بھی ناچ کمرے میں کھایا۔ ساوؤے کے ناچ کمرے میں ایک جانب آرکسٹرا کے لئے جگہ بنی ہوئی ہے اور چوبی فرش پر تین طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ میزیں چُنی ہوتی ہیں جن کو ناچنے والے اور والیاں اکل و شرب کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ جس وقت میں اور ڈاکٹر صاحب پہنچے اس وقت کھانے والے تو تقریباً فارغ ہو چکے تھے، البتہ شراب پینے والے اور پی کر ناچنے والوں اور والیوں کی فرمائشیں شروع ہی ہوئی تھیں۔ ناچ کمرے میں بیشتر جوڑے جوڑے ہی داخل ہو رہے تھے۔ اور جوڑے بھی مخلوط (Mixed) تھے یعنی ایک مرد اور ایک عورت۔ مستثنیات میں عورتیں زیادہ اور مرد کم تھے۔ سوائے میرے اور ڈاکٹر صاحب کے۔ آرکسٹرا کے قریب ہم دونوں نے بھی ایک میز سنبھال لی۔ ٹھیک دس بجے آرکسٹرا والے آن موجود ہوئے اور ناچ کی فرنگی دُھن فاکس ٹراٹ بجانے لگے۔

پہلے پہل صرف فرنگی جوڑے اُٹھے۔ دُم دار کوٹوں والے مردوں نے بائیں ہاتھ اُن لڑکیوں کی کمر پر رکھے جن کے فرش کو چُومنے والے سائے پشت پر کمر سے ذرا اوپر آکر ختم ہو گئے تھے اور سامنے سے سینہ کے اُبھار تک بمشکل پہنچ رہے تھے۔ اور دائیں ہاتھوں کی اُنگلیوں کو لڑکیوں کی اُنگلیوں میں ڈالے ہوئے ہوا میں بلند کر کے ناچنے لگے۔ آرکسٹرا کی آواز کے ساتھ ساتھ جوڑوں کے پاؤں حرکت کرتے رہے۔ ایک ناچ ختم ہوا۔ ناچنے والوں اور والیوں نے رُک کر اور تالیاں بجا کر آرکسٹرا کو داد دی۔ فضا میں ہنستی ہوئی نگاہوں اور نقرئی قہقہوں سے انبساط و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستانیوں کا بھی حجاب دُور ہوا۔ آرکسٹرا نے جب دوسرے ناچ کے لئے کوئیک سٹیپ (Quick Step) بجایا

تو بھڑکیلے فرنگی سایوں اور دُم دار کوٹوں کے درمیان کئی زرتار ساریاں اور سیاہ اچکنیں ناچنے لگیں۔ فرنگی عورت نے جسمانیت کو عریاں سے عریاں طریق پر دنیا کے سامنے پیش کر کے خراجِ تحسین وصول کیا ہے لیکن مشرقی عورت کو تن ڈھانپ کر دل برمانے کا جو فن آتا ہے اُس تک ابھی تک مغربی عیش پسند نگاہ کی رسائی نہیں ہوئی۔ اور یا میں قدامت پسند ہونے کی وجہ سے مشرق کو یہ داد دے رہا ہوں۔ بہرحال لندن کے ہنگاموں کو دیکھنے کے بعد ساوڈے کا ناچ کمرہ دیکھ کر تم بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے کہ مشرقی سونے پر جب مغربی سہاگہ چڑھتا ہے تو اِس کُندن کی جلا دو بالا ہو جاتی ہے۔

رات کے بارہ بجے تک شراب اور ناچ کا ہنگامہ گرم رہا۔ اِس وقت اِس محفل کو منعقد کرنے والے صاحب طرّہ دار دستار کے ساتھ آموجود ہوئے۔ اِن صاحب کی آمد پر میزوں سے ایک خفیف سا شور بلند ہُوا۔ اور طرّہ بند صاحب تمام میزوں کے سامنے سے گذرتے ہوئے اور ایک گھٹاؤنے تبسم کے ساتھ نوجوان لڑکیوں کے سامنے جھکتے ہوئے ایک ایسی میز پر جا بیٹھے جہاں دو لڑکیاں ایک نوجوان سمیت اُن کا انتظار کر رہی تھیں۔ آرکسٹرا نئے سے نئے ناچ کے سُر نکالنے کے بعد کونگا (conga) بجا رہا تھا۔ طرّے نے سامنے بیٹھی ہوئی ساری کی طرف متبسّم ہو کر دیکھا۔ ساری تھرکتی ہوئی میز سے اُٹھی اور طرّے کے سینے سے سینہ لگا کر فرش پر تھرکنے لگی۔ رفتہ رفتہ آرکسٹرا کی صدا بلند اور تیز ہوتی گئی۔ آرکسٹرا کا کنڈکٹر (conductor) ہاتھ میں لکڑی کا ایک ساز (castanets) لے کر مائیکروفون کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور تھرکتا ہوا اُسی لَے میں گانا گانے لگا۔ ساری کا پلو سر سے ڈھلک کر شانے پر آ رہا اور شانے سے گر کر کمر تک آ پہنچا۔ آرکسٹرا کی تیزی کی نسبت سے پاؤں اور پنڈلیوں کی سریع حرکت کے ساتھ ساری کا سر بھی ہلنے لگا۔ طرّہ بھی ساری کی بڑھتی ہوئی وحشت کا ساتھ دے رہا تھا۔ دوسرے جوڑے اِس جوڑے کا ناچ دیکھ کر رفتہ رفتہ فرش سے ہٹ گئے اور اب سارے کمرے میں آرکسٹرا کے ساتھ صرف یہی طرّہ اور ساری ناچ رہی تھی اور تمام لوگ تحسین آمیز نگاہوں سے اِن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یکایک آرکسٹرا نے سُر ختم کیا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ طرّہ اور ساری پسینہ پسینہ ہو کر رُک گئے۔ سارے ہال سے بیک وقت صدا بلند ہوئی کہ آنریبل سر —— خاں صاحب اور مس —— ایک دفعہ پھر ناچیں۔ واہ واہ کے شور میں آرکسٹرا پھر بجنے لگا اور طرّہ اور ساری ناچنے میں مشغول ہو گئے۔ سارا ہال بُت بنا ہُوا اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا آرکسٹرا کے سروں نے متحرک ساری اور طرّے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ناچ ختم ہُوا۔ آرکسٹرا کے خاموش ہونے پر مردوں نے تالیاں بجائیں اور لڑکیاں اور عورتیں ساری اور طرّے کی طرف داد دینے کے لئے دوڑیں۔ کنڈکٹر نے بجلی کی روشنی چند ثانیوں کے لئے گل کر دی۔ کس مقصد کے لئے یہ تم سمجھ ہی سکتے ہو۔ تاریکی بڑے بڑے جرائم کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اور یہاں تو آنریبل سر —— خاں صاحب کا ظاہر و باطن تاریک تھا۔ بہرصورت جب روشنی ہوئی تو مرد بدستور تالیاں بجا رہے تھے اور آنریبل سر —— رومال سے منہ صاف کر رہے تھے۔ پسینہ پونچھنے کے لئے یا کسی اور خیال سے۔

اِسی طرح رات کے دو بج گئے۔ اب بیشتر مردوں کے پاؤں لڑکھڑانے لگے ناچ کی تھکان سے یا شراب کی بدمستی سے یہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن ٹھیک ڈھائی بجے آنریبل سر —— ڈگمگاتے ہوئے پاؤں کے ساتھ بغل میں لی ہوئی دو فرنگی لڑکیوں کا سہارا لے کر فرش کی ایک جانب رُک گئے اور حاضرین کو مخاطب کر کے بولے:۔

"خواتین اور حضرات! مَیں آج اپنے پاس آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کافی الفاظ نہیں پاتا۔ آپ نے میری ناچیز استدعا پر دار فنڈ میں چندہ دینے کے لئے جس خوش دلی سے آج کے (gathering) میں شرکت کی ہے اُس کا اجر میں تو دے نہیں سکتا لیکن مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انگلستان آج کل جس موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے اُس سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو یقیناً اِس قربانی کا صلہ دے گا جو آج آپ نے کی ہے اور میرا تو خیال ہے کہ اس کا صلہ ہمیں ابھی سے مل رہا ہے۔ ہندوستان کی آزادی انگلستان کی آزادی سے وابستہ ہے۔ اگر انگلستان آزاد رہے گا تو ہندوستان کو آزاد کرے گا۔ ورنہ ہندوستان کے آزاد ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ بلکہ اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ انگلستان کے آزاد ہونے کی وجہ سے ہندوستان اس وقت بھی آزاد ہے۔ ہم سب لوگ آزاد ہیں اور اُن ملکوں سے ہزاروں درجے زیادہ آزاد ہیں جہاں نازیوں کی حکومت ہے۔ دوسرے لوگوں کے متعلق میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں بالکل آزاد ہیں۔ وہ ہندوستان میں قرآن پڑھ سکتے ہیں۔ نماز ادا کر سکتے ہیں مسجدیں بنا سکتے ہیں اور مسجدوں میں اذان دے سکتے ہیں۔ یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے اگر ہم آزاد نہ ہوتے اور انگریزوں کی حکومت کے علاوہ کسی اور قوم یا مذہب کی حکومت ہوتی تو آج ہم اِس آزادی سے یہاں

جمع نہ ہو سکتے جس کا نمونہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ سب لوگوں کی شرکت کی خوشی میں شکریہ کے طور پر میں اپنی جیب سے آج سے پانچ سو روپیہ ماہوار دار فنڈ میں دیا کروں گا۔ آپ سب کا مکرر شکریہ۔"

ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ مردوں نے عورتوں کو کوٹ پہنوائے اور بازو میں بازو ڈال کر ہال سے نکلنا شروع ہوئے۔ کچھ جوڑوں نے جاتے جاتے طرّے کو اُس کی سخاوت پر مبارکباد دی۔ سب لوگوں کے جانے پر طرّہ ہال سے باہر نکلا۔ دو ملازموں نے بڑھ کر پگڑی سنبھالی اور فیلٹ ہیٹ سر پر پہننے کے لئے پیش کی۔ آنریبل سر ـــــ نے ہیٹ لگاتے ہوئے کہا:۔

"یہ پگڑی بھی کتنی بڑی مصیبت ہے۔ مجھے تو اس سے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔"

ایک ملازم نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "حضور درست فرماتے ہیں لیکن آپ ہی تو کہا کرتے ہیں کہ پبلک کے سامنے اس کا پہننا ضروری ہے۔"

آنریبل سر بڑھ کر رکشا میں بیٹھ گئے۔ چند گڑھوالی قلی رکشا کو دھکیلنے لگے۔ ساوئے کی ڈھلوان پر ساٹھ درجے کی سردی میں کچھ اور قلی پھٹی پُرانی شالیں اوڑھے ہوئے سنگریزوں والی سڑک پر سو رہے تھے۔ رکشا کی گڑگڑاہٹ سے کچھ قلی گھبرا کر جاگ گئے اور دو نے بڑھ کر پکارا "رکشا چاہیے حجور؟" "رکشا چاہیے حجور؟"

آنریبل سر غریب قلیوں کے آواز دینے سے جھلّا گئے۔ اپنے قلیوں سے للکار کر بولے "رکشا کھڑی کرو۔" رکشا کے رکتے ہی ایک زمین کو بستر بنا کر سونے والا فقیر آگے بڑھ کر بولا "صاحب رام کے نام کا ایک پیسہ دو" اس صدا نے صاحب کے بڑھتے ہوئے غصے پر تازیانے کا کام دیا۔ اپنے قلیوں سے بولے "مارو ان سالوں کو۔ یہ سڑک پر کیوں پڑے ہیں۔ ان سے راستہ صاف کر دو۔" اتنے میں آنریبل سر تم صاحب کے ملازم بھی آ پہنچے انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنی آہنی نوک والی لاٹھیوں سے قلیوں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ نیند کے ماتے اور نیم بیدار قلی اپنی پھٹی ہوئی چادریں سنبھالتے ہوئے سڑک پر بھاگنے لگے اور صاحب نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔

"یہ تو پاگل معلوم ہوتے ہیں۔" رکشا کی گڑگڑاہٹ میں صاحب کا شیطانی قہقہہ اور فقرہ دونوں گم ہو کر رہ گئے۔

ڈاکٹر صاحب اور میں یہ غور کرتے ہوئے ساوئے کی ڈھلوان پر سے اُترنے لگے کہ پانچ سو روپے ماہوار خیرات کرنے والے مسلمان بھی اس ملک میں موجود ہیں جہاں بعض مسلمانوں کی ماہوار آمدنی پانچ سو کوڑی بھی نہیں۔ تم ہی کہو اُس ملک کے غلاموں کا کیا حال ہوگا جس کے آقاؤں نے بھیک مانگنا شروع کر دیا ہے اور جس کے عام غلاموں کو بھیک دینے کی توفیق نہیں اور اس جذبے کو کس لقب سے یاد کرو گے جس سے کام لے کر تمہارے سربرآوردہ لوگ عوام کے سامنے طُرّہ دار پگڑی باندھ کر جاتے ہیں اور عوام کے پیٹھ موڑتے ہی ہیٹ پہن لیتے ہیں۔ پھر بھی پانچ سو روپیہ ماہوار خیرات کرنے والے لیڈر پانچ کوڑی بھی اُن فقیروں کو نہیں دے سکتے جن کے پیٹ کی جلد فاقوں سے کاغذ کی مانند پتلی ہو رہی ہوتی ہے۔ بلکہ خیرات کے عوض اُس جلد پر کوڑے برساتے ہیں جس میں سے اُن کے اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے خون بھی نہیں گرتا۔ اگر میں ریاکار ہوں تو ان لوگوں کے لئے تمہیں کوئی نئی اصطلاح ہی وضع کرنی پڑے گی۔

مسوری۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۴۱ء

محمد باقر

ضروری اطلاع

جواب طلب امور کے لئے اپنا پتا لکھ کر جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی اطلاع یا واپسی کے لئے اپنا پتا لکھ کر ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بہ صورتِ دیگر دفتر "ہمایوں" خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کئے جائیں گے۔

"مینیجر"

احساس

احساسِ محبت نے یہ احساس بڑھایا
ہر بات کے، ہر چیز کے احساس کو پایا:—

پربت سے چٹانوں کا اُبھرنا نظر آیا
ریزوں کا خلا بھر کے سُدھرنا نظر آیا
ذرّے جو بغلگیر ہوئے جذب کشش سے
وہ آئے نظر ہم کو اُسی خاص روش سے
بڑھتے ہوئے اشجار کا بڑھنا نظر آیا
دیوار پہ بیلوں کا بھی چڑھنا نظر آیا
پانی جو پیا گھاس نے آواز سی آئی
خوشبو جو اُڑی پھول سے دی ہم کو دکھائی
چیونٹی نے لیا بوجھ تو ہنپنا بھی لیا سُن
ٹانگوں کا اسی بوجھ سے کپنا بھی لیا سُن
مکڑی نے تنے تار صدا آئی پھر ابھر
بُھنگا جو پھنسا ہم نے سُنی چیخ برابر
مکڑی نے اُسے داب لیا خوب جکڑ کر
اک آہ بھری اُس نے جو کانوں میں گئی بھر
کس طرح چلی روح، وہ چلنا نظر آیا
گھبرا کے شہ رگ سے نکلنا نظر آیا
وُہ شے جسے سب جی کی خلش آئے ہیں کہتے
ہم اُس کی بھی آواز سے غافل نہیں رہتے
مُخیلہ کی تنجیر بھی دی ہم کو دکھائی
غُصّوں کی اُمس صورِ سرافیل سی پائی
کانوں میں ہے گونج خیالات کی ہر دُھن
الفاظ ابھی منہ سے نہ نکلے تھے لئے سُن
پردے میں رکھو لاکھ خیالات کو اپنے
ہم سے نہ چھپا پاؤ گے جذبات کو اپنے

احساسِ محبت نے یہ احساس بڑھایا
ہر چیز کے، ہر بات کے احساس کو پایا!

(رابرٹ گریوز) مترجمہ مقبول حسین احمد پوری

ڈاکو

بہت کچھ پڑھا، بہت کم سیکھا۔ جو کچھ پڑھا، جو قدرے قلیل سیکھا وہ جزواً تو ہٹلر نے اور تمام تر ایک لڑکی نے غلط ثابت کر دیا۔ لڑکی کا نام تھا تاج
مگر پیار سے سب تجو تجو کہتے تھے۔ پڑھی لکھی تھی، ذہین تھی، بے دھڑک تھی مگر ضرورت سے زیادہ خاموش۔ یہ ہے وہ قصہ، قصہ نہیں واقعہ جس نے دانشمندی اور تجربے کو غلط ثابت کر دیا۔

میں:۔ تجو تم آخر کچھ تو کہو!

تجو۔ کیوں؟

میں۔ تمہاری زندگی کی فلاح کا سوال درپیش ہے اور تم ہو کہ چپ کا روزہ۔ تمہارے والدین نے مجھے تمہارا ولی مقرر کیا۔ اس ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے تم سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ صاحبزادہ علی نقی کے سوال کا کیا جواب دوں؟ چلن اچھا، گھر اچھا، شکل تمہاری دیکھی ہوئی ہاں یا نا کچھ تو کہو۔

تجو۔ (بہت دیر خاموش رہ کر) اپنی گارڈین (guardian) میں خود بننا چاہتی ہوں۔ آپ کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کرتی ہوں۔ جو لڑکی خود اپنی گارڈین نہیں وہ لڑکی نہیں گدھی ہے۔

میں۔ الحمدللہ مگر یہ تو فرمائیے کہ علی نقی کو کیا جواب دوں؟

تجو۔ یا تو آپ مجھے تعلیم نہ دیتے یا اب اس کا خمیازہ بھگتیں۔

میں۔ کیا مطلب؟

تجو۔ یہ مطلب کہ سو دفعہ نہیں ہزار دفعہ آپ مجھے سمجھا چکے ہیں کہ انسان وہ ہے جو لغو سے پرہیز کرے۔ نہ صرف پرہیز کرے بلکہ لغو کو رد کرے۔ آپ اس تعلیم سے پھر جائیں میں نہ پھروں گی۔ کیوں آپ نے مجھے یہ سکھایا؟

میں۔ تو کیا علی نقی کا سوال لغو ہے؟

تجو۔ ہرگز نہیں۔ نہایت معقول سوال ہے مگر آپ مرد ہو کر تجاہلِ عارفانہ کا بُرقع کیوں پہنتے ہیں۔ کہاں لکھا ہے کہ ہر معقول سوال کا جواب ہاں یا ناہیں دینا فرض ہے؟

میں۔ تمہاری رائے درست ہوگی مگر اخلاق کا تقاضا ضرور ہے کہ صاف گوئی کوئی عیب نہیں۔

تجو۔ تو کیا پاکیزہ خاموشی عیب ہے؟

میں۔ ہرگز نہیں

تجو۔ پھر کیسا سوال کیسا جواب۔ جس بات پر میں غور کرنے کے لئے تیار نہیں گو اس میں لاکھ خوبیاں ہوں مجھے کیوں مجبور کیا جائے کہ میں اس پر رائے دوں بالخصوص یہ جانتے ہوئے کہ مجھے اپنی رائے پر وثوق نہیں؟ شادی مرد اور عورت کی ہوتی ہے۔ علی نقی بظاہر تو مرد معلوم ہوتا ہے مگر مجھے کیا پتا کہ دل کا بھی مرد ہے یا محض ہندوستانی ڈرپوک۔ بہرحال میں اس الجھن میں کیوں پڑوں؟ جب مجھے کوئی مرد نظر آئے گا میں اس کی لونڈی بن جاؤں گی۔ محض روٹی کپڑے کے لئے ایمان فروشی کے لئے تیار نہیں ہوں۔

میں۔ تمہارے خیال میں دل کا مرد کیسا ہوتا ہے؟

تجو۔ سیدھی سی بات ہے۔ انگریز سے، مولوی سے، ہندو سے، کسی سے نہ ڈرے۔ مرنے کے لئے ہر وقت تیار ہو۔ جہاں لوگ جیتے رہنے پر مرتے ہوں، جہاں یہ کمزوری ہو کہ دولت بھی ہو، عزت بھی ہو، آرام بھی ہو وہاں دل کے مرد کم ہوتے ہیں۔

میں۔ میرے علم میں دو ایک ڈاکو ضرور ایسے ہیں جن پر تمہاری تعریف کسی حد تک صادق آتی ہے۔

نجو۔ مجھے ضرور اُن سے ملا دیجئے۔

بیں۔ (چونک کر) سچ کہتی ہو؟

نجو۔ قطعی یعنی اگر کوئی ڈاکو واقعی نڈر ہے مگر اس بدقسمت ملک میں آج کل ایسے ڈاکو کہاں ہوں گے؟ محض لٹیرے ہوں گے۔ ڈاکو ہونا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

بیں۔ اور جب تک کسی ڈاکو سے تمہاری ملاقات نہ ہو کیا کرو گی؟

نجو۔ لڑکیوں کو یہ سکھاتی رہوں گی کہ ہاں نا کرنے سے پہلے کھرے کھوٹے کی پہچان سیکھو۔

(علی نقی داخل ہوتا ہے)

علی نقی۔ آداب چچا۔ کہو نجو کیسی ہو

بیں۔ تم کیسے آنکلے؟

علی نقی۔ چچا جان نجو سوار اچھی ہے اسے گھوڑا دکھانے لایا ہوں یہ تھوڑی دیر سواری کر کے دیکھ لے تو مجھے اپنی رائے پر اطمینان ہو جائے۔ چڑھو گی نا نجو؟

نجو۔ ضرور۔

علی نقی۔ بسم اللہ آئیے۔ (دونوں باہر نکلتے ہیں)

(۲)

نجو۔ (ایک دو میل کی سواری کے بعد گھوڑے کو ردکتے ہوئے) سینکڑوں میں ایک ہے۔ کہاں سے ملا؟

علی نقی۔ یہ تو پھر بتاؤں گا پہلے یہ کہو کہ بھوک تو نہیں لگی؟

نجو۔ ہرگز نہیں اور اب شام ہونے کو ہے گھر لوٹوں گی۔

علی نقی۔ کیا جلدی ہے ایک دوڑ اور لگا لیں آؤ اسی گاؤں کی طرف چلو۔

نجو۔ بہتر۔

(۳)

نجو۔ (دس منٹ کے بعد) واقعی بلا کا تیز جانور ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ یہ فوجی پستول رکھنے والی [illegible] تمہیں کہاں سے مل گئی

علی نقی۔ کہیں سے مل گئی۔ (جیب میں سے پستول نکال کے) یہ لو اس پستول کو رکھ لو loaded ہے۔

نجو۔ (حیران ہو کر) بہت بہتر۔

علی نقی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکا مارنے کا بہترین وقت کونسا ہوتا ہے؟

نجو۔ جی نہیں۔

علی نقی۔ عین غروب آفتاب کے بعد۔ جو کچھ ملے اسے لے جانے اور جائے پناہ تک پہنچنے کے لئے ساری رات مل جاتی ہے۔ وہ نہایت بے وقوف ہیں جو آدھی رات کو ڈاکا مارتے ہیں۔ یہ لو وہ گاؤں آ گیا جہاں میرے آدمی ڈاکے کے لئے تیار ہیں۔ تم میرے پیچھے رہو اگر میری پیٹھ کی طرف سے کوئی حملہ کرے تو اس پر پستول چلا دینا۔ اور تمہارا کچھ کام نہیں۔

نجو۔ اور اگر کوئی مجھ پر حملہ کرے؟

علی نقی۔ یہ تمہاری قسمت

نجو۔ اور اگر میری گولی تمہیں لگ گئی؟

علی نقی۔ یہ میری خوش قسمتی۔

حق سے بغاوت

چرندوں میں کیا ذکرِ وحدت نہیں ہے؟ پرندوں میں کیا اس کی کثرت نہیں ہے؟
ہر اک شے ہے کونین کی سر بسجدہ فقط تجھ کو ذوقِ عبادت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

خدا کرتا ہے منکروں سے محبت خدا کو نہیں کافروں سے شکایت
خدا ڈھونڈتا ہے محبت جہاں میں کسی سے مگر تجھ کو الفت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

ترا شغل ہے بیکسوں کو ستانا ستم کو ترے رو رہا ہے زمانا
خدا محو ہے سب کی دلجوئیوں میں تجھے دل دکھانے سے فرصت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

خدا تو ترے دل کا ہر مدعا دے مگر تو غریبوں کی ہستی مٹا دے
تڑپتے ہیں فاقوں سے تیرے پڑوسی تجھے رحم سے کوئی نسبت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

بتا کس غریقِ الم کو نکالا؟ بتا کتنے گرتے ہوؤں کو سنبھالا؟
بتا بات کس کس کی بگڑی بنائی؟ جواب اِس کا کچھ بے حمیت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

ہواؤں میں آزاد کمزور چڑیاں بیاباں میں آزاد بے عقل حیواں
بشر ہو کے ہے تیرا پیشہ غلامی تجھے اِس کی کچھ شرم و غیرت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے

نمود و نمائش میں لاکھوں لٹا دے جگہ نام کی، آگ گھر میں لگا دے
رئیسوں کی دعوت میں بن جائے حاتم پڑے فاقہ کش تیری دولت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

دغا سے مزیّن ترا آستانہ ترے پاس جبر و ستم کا خزانہ
بہیمی بھی ہے بربریت بھی تجھ میں نہیں ہے تو اک آدمیت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

کہیں یہ نہ ہو، تیری لٹ جائے دولت کہیں یہ نہ ہو، تیری مٹ جائے طاقت
سزا موت ہے تیری قدرت کے باغی کہ تو قائلِ زورِ قدرت نہیں ہے
یہ کیا تیری حق سے بغاوت نہیں ہے؟

ابر احسنی گنوری

چھوٹے بھائی[1]

یوں کہنے کو بھائی تو بیسیوں ہو سکتے ہیں — ممیرے بھائی، خلیرے بھائی، پھپھیرے بھائی اور نہ جانے کتنے ایرے اور غیرے بھائی، اور پھر دوسری طرف پیر بھائی، مسلم بھائی، قانونی بھائی، شاعر بھائی اور کتنے جائیے — لیکن چھوٹتے ہی دو بھائی زبان پر آتے ہیں، چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی۔ سچ پوچھئے تو یہ بھائی ان ایرے غیرے بھائیوں سے کچھ ہیں مقدم ہی، اور وہ یوں کہ تاریخی اعتبار سے ان کی تخلیق ان ممیروں اور پھپھیروں سے پہلے ہوئی۔ آپ شاید جانتے ہوں (اور نہ بھی جانتے ہوں تو ہوا کیا۔ آپ کسی کالج کی پروفیسری کے لئے امیدوار تو ہیں نہیں جو ہر بات جانیں) کہ قابیل اور ہابیل آدم اور حوّا کی پہلی نسل میں سے تھے اور ان کے پوتے جو آپس میں چچیرے اور ممیرے بنے کہیں بعد کو میدان میں آئے اور پھر ان ایرے غیرے بھائیوں کی بات تو یہیں ختم ہو جاتی ہے کہ اکثر ترقی یافتہ زبانیں انہیں بھائی بھی تسلیم نہیں کرتیں اور ان کی شناخت کے لئے انہوں نے ایک خاص لفظ تراش رکھا ہے۔ مبادا حق شفعہ کی آڑ میں دبے پاؤں کہیں بھائیوں کی صف میں سرک ہی نہ جائیں۔ لیکن ہمارے ایک خلیرے بھائی ہیں جو ان سب باتوں کے باوجود ان ممیروں اور پھپھیروں کو اس اعتبار سے قابلِ قدر سمجھتے ہیں کہ ان سے نسلِ آدم پھیلی پھیلی سی محسوس ہوتی ہے، خاندان بنتے ہیں، رشتے ناطے جوڑے جاتے ہیں اور آپ مزید یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ اگر کسی صورت میں کہیں کوئی تعلق بظاہر نظر نہ آتا ہو تو ماموں زاد بھائی کا رشتہ بنا بنایا ہے جب چاہے اعلان کر دیجئے۔

ان چھوٹے اور بڑے بھائیوں میں سے بھی چھوٹے بھائیوں کا کردار اہم تر ہے۔ اس لئے کہ ان کے پیدا ہونے ہی پر بڑے بھائی معرضِ وجود میں آئے، ورنہ کہیں بڑے بھائی کی ترکیب ہی موجود نہ ہوتی۔ آپ کہیں گے، واہ! یہ کیا بات ہوئی بھلا، اور جو بڑے بھائی نہ ہوتے تو چھوٹے بھائی آسمان سے ٹپک پڑتے کیا! لیکن ہم کہیں گے اگر بڑے بھائی نہ ہوتے تو بھائی ہوتے ہی نہیں۔ چھوٹے بڑے کا امتیاز تو بات ہی دوسری ہے اور پھر یہ بھی تو محض اتفاق رہا کہ بڑے بھائیوں کو نسبتہً پہلے پیدا ہونے کا موقع مل گیا اور چھوٹے بھائیوں کے معاملے میں یونہی ہٹو بچو میں کن فیکون صادر ہوتے ذرا دیر ہو گئی، ورنہ چاہیئے تو یہ کہ اگر ایک گھرانے میں تین بھائی بھیجنے کی منظوری ہو تو تینوں ایک ساتھ نازل کئے اور قصہ چکایا۔ چھوٹے بڑے کی کلکل ہی نہ رہی۔ بات پھر پھرا کے وہیں آتی ہے کہ اللہ میاں دور اندیش نہ نکلے آدم کی تخلیق تو کی تھی، بڑا بھائی بھی پیدا کر دیا۔ ہمیں تو یہ سوجھتا ہے کہ خالق کو ان چھوٹے اور بڑے بھائیوں کی فطری کشمکش کا علم ہی نہ تھا اور جب علم ہوا تو اپنے پیاروں اور پیغمبروں کو ہر طرح بڑا بنا کے بھیجا — محمدؐ، عیسیٰؑ، بدھ کسی کو لیجئے۔ تھا ان میں کوئی چھوٹا بھائی؟ اور جو تنوع کے شوق میں ایک پیغمبر کو چھوٹا بھائی بنا بھی دیا تو اس پر بڑے بھائیوں کا قہر بھی ملاحظہ فرما لیا اور اسے کنوئیں میں لٹکواتے دیکھ لیا۔

تو میں یہ کہنے کو تھا کہ یہ اتفاقیہ پہلے پیدا ہونے والے بس اتنی سی بات پر فوقیت جتانے بیٹھ جاتے ہیں کہ وہ پیش رو ہیں اور بدیں اعتبار جسمانی اور ذہنی طور پر بلند ہیں جسمانی طور پر بلند ہوں گے۔ حالانکہ ہم یہ بھی نہیں مانتے اس لئے کہ اکثر چھوٹے بھائی بڑے بھائیوں سے سر نکالتے دیکھے گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک ذہنی بلندی کا تعلق ہے ماہرینِ فن تاڑ گئے ہوں گے کہ بڑا بھائی دو مبتدیوں کا ایک تجربہ ہے اور بس — پہلی کوشش، اور خلاف اس کے ایک چھوٹا بھائی فن کاروں کی پختہ تر تخلیق ہے — نقاشِ نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل — جوں جوں فن کار کی عمر بڑھتی ہے ذہنی پختگی آنے کی وجہ سے تخلیقات میں بھی پختگی آتی ہے۔ یہاں تک کہ شاہکار کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ چھوٹے بھائی بڑے بھائیوں سے ہیٹے ہیں، منطقی طور پر تو درست معلوم نہیں ہوتا۔

ریاست میں جو سماجی اور سیاسی تفاوت اعلیٰ طبقوں اور نچلے طبقوں کے درمیان پایا جاتا ہے وہی ایک گھرانے میں بڑے اور چھوٹے بھائیوں میں نظر آتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ (اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے) اپنی برتری اور فوقیت جتانے کو پیدائشی اور ابدی حق تصوّر کرتا ہے۔ اسی فلسفے کے ماتحت بڑے بھائیوں کا ٹھینگا چھوٹے بھائیوں کے سر رہتا ہے۔ سچ پوچھئے تو بعض سماجی نظاموں کے قوانینِ وراثت نے بڑے بھائیوں کو ضرورت سے زیادہ ہی ڈھیل دے رکھی ہے اور نادانستہ طور پر ان کی اہمیّت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ یورپ کے Law of Primogeniture نے چھوٹے بھائیوں کے حقوق پر ایسی ضرب لگائی ہے کہ صدیوں تک اٹھ نہیں سکتے۔ بڑا بھائی ہر طریق پر والدِ مرحوم کا جانشین، ان کے ورثے کا وا

[1] یہ مضمون حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں پڑھا گیا۔

حق دار اور چھوٹا بھائی کلی طور پر اس کا دست نگر۔ نتیجہ یہ کہ یورپ میں بیشتر زمیندار اور فرموں کے مالک بڑے بھائی ہیں اور کارخانوں کے مزدور، دفتروں کے کلارک، فوج کے سپاہی اور گرجوں کے پادری چھوٹے بھائی۔ اس لئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یورپ میں اقتصادی جنگ سرمایہ دار اور مزدور کی نہیں بلکہ بڑے اور چھوٹے بھائیوں کی ہے۔ بڑا بھائی والد کے وفات پانے پر مارکوئس یا کاؤنٹ بن گیا۔ چھوٹے بھائیوں کے سینگ کہیں اور نہ سمائے تو آبادیات کا رخ کیا۔ ذہانت تھی، محنت کر سکتے تھے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا پڑا تھا، سلطنتوں کی بنیادیں رکھ دیں۔ اور یہ سلطنتِ برطانیہ جو آج سورج کو غروب ہونے نہیں دیتی، انہی چھوٹے بھائیوں کی محنتوں پر استوار ہوئی۔ جہاں تک خاندان تیموری کے قانونِ وراثت کا تعلق ہے وہاں تو قصہ ہی اور تھا۔ نوابی دور ـــ چھوٹے بڑے کی تخصیص ہی نہیں جس کے ہاتھ لاٹھی رہی وہی بھینس ہانکتا رہا۔

آنکھیں بند کرتے ہوئے غور کرنے کی کوشش کی جائے تو اوسط درجے کے ہندوستانی چھوٹے بھائی کی تصویر کچھ ایسی ہی ذہن میں آئے گی۔ چھریرا بدن، ناک بالعموم بہتی، ڈھیلا لباس، ننگا سر، شلوار پر جا بجا نیلی سیاہی کے دھبے، اکثر ایک پائنچہ کا بخیہ ادھڑا ہوا، اچھلتا، ناچتا، فلمی گانے گنگناتا کبھی گلی میں کبھی سڑک پر اور سرِ راہوں میں عموماً گھر کی چھت پر نظر آتا ہے۔ فراغت ہو تو دانتوں سے ناخن کاٹتا ہے۔ یہاں آپ کے کان کھڑے ہو سکتے ہیں کہ یہ تصویر ایک کم سن بھائی کی پیش کی گئی ہے۔ چھوٹا بھائی بڑی عمر کا بھی ہو سکتا ہے جس کی شلوار پر نیلی سیاہی کے دھبے نہ ہوں بلکہ ایک باپ بھی ہو سکتا ہے ـــ بجا۔ لیکن جیسے ایک جوان دادا ابا کو ذوقِ سلیم برداشت نہیں کرتا۔ دادا ابا کی تصویر سفید داڑھی اور ہلتے ہوئے سر ہی کے ساتھ ذہن میں اترتی ہے اسی طرح ایک بڑی عمر کا چھوٹا بھائی بھی ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اگر ایک چھوٹا بھائی قد اور عمر میں چھوٹا نہیں رہا تو اسے کچھ اور کہہ لیجئے۔ آپ بھی "لانگ شارٹ سٹوری" کے مصداق اسے "بڑا چھوٹا بھائی" کہہ سکتے ہیں۔ کون روکتا ہے بلکہ ایک ادبی ترکیب کا اضافہ ہوگا بہرحال ہمارے نزدیک ضروری ہے کہ ایک سچا چھوٹا بھائی قد اور عمر میں فی الحقیقت چھوٹا ہو۔ اور اگر ایک چھوٹا بھائی قد اور عمر میں چھوٹا نہ ہو تو آپ چار دوستوں میں بیٹھ کر اس کی ذہانت کی کبھی تعریف نہ کر سکیں گے اور ساتھ ہی مسکرا کے یہ بھی نہ کہہ سکیں گے ـــ "شریر بہت ہے، ہی، ہی، ہی"ـــ

ہمارے والد کے ایک ملنے والے ہیں۔ ان کا ہر چھوٹا بھائی ذہین اور شریر ہے۔ کمرے میں داخل ہوں گے اور چھٹتے ہی ارشاد فرمائیں گے ـــ "ارے میاں کیا مصیبت ہے، عجیب چکر میں ہوں" ہم پوچھیں گے ـــ "کیا ہوا پیر صاحب۔ کیا مصیبت ہے، کیا چکر ہے" تو کہیں گے ـــ "اجی وہ چھمو ہے نا بدبخت، ماسٹر سے عجیب اٹ پٹانگ سوال کرتا ہے، ماسٹر غریب بوکھلا جاتا ہے" ـــ اور یہ کہہ کر خود بھی بظاہر بوکھلا جائیں گے گویا چھمو میاں کی ذہانت نے ایسا ناک میں دم کر رکھا ہے کہ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں پھر ہماری طرف یوں دیکھیں گے گویا اس الجھن کا حل پوچھ رہے ہوں۔ تو ہم کہیں گے۔ "اجی بچہ ہے ذرا بڑا ہو کر رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گا" اور اس کے بعد جو شرارتیں سنانے پر اترتے ہیں تو سنتے سنتے دم گھٹنے لگتا ہے۔ شامتِ اعمال یہ کہ آپ کے چھوٹے بھائی ہر روز، آندھی ہو یا طوفان ضرور آپ سے ایک ذہانت کی بات اور نت نئی شرارت کر بیٹھتے ہیں۔ خواہ آپ کے موزے کا ایک سرا ہی چارپائی کی ادوائن میں ٹانک کر سکول جائیں۔

چھوٹا بھائی اعلیٰ طبقے کا ہو یا نچلے طبقے کا روایتہً ذہین ہوتا ہے۔ ذہانت اور محنت (بڑے بھائیوں کے عقیدے کے مطابق) چونکہ دو متضاد خواص ہیں لہذا لکھنا پڑھنا کچھ کم ہے۔ تضیعِ اوقات کے لئے اعلیٰ طبقے کا چھوٹا بھائی یا تو فوٹو گرافی کی مشق کرتا ہے، یا ڈاک کے ٹکٹ اور تصویریں اکٹھی کرتا ہے، یا پھر تیتریاں پکڑ کر ان کے رنگین پروں کو جوڑتا ہے اور نہیں تو بڑی بہن کے ساتھ آواز ملاتے ہوئے ہارمونیم پر انگلیاں چلاتا ہے اور نچلے طبقے کا چھوٹا بھائی سردی ہو تو کنکوے اڑاتا ہے اور گرمی ہو تو گولیاں کھیلتا ہے کبھی کبھی بڑی بہن پر کڑکتا بھی نظر آتا ہے۔ کنکوؤں اور گولیوں سے قطع نظر مذکورہ بالا حرکات کو Hobby کہا جاتا ہے۔ ہر پڑھے لکھے گھرانے کے چھوٹے بھائی سے توقع کی جاتی ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی "ہابی" ضرور ہوگی اور اسی توقع کی بنا پر ہر جماعت کے سالانہ امتحان کے انگریزی کے پرچے میں ایک مضمون بعنوان "مائی ہابی" ضرور لکھنے کو کہا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ ہمارے ایک نارمل پاس استاد بچپن میں کنکوے اڑاتے اور گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھ پانے پر ہمیں دھمکایا کرتے پھر ساتھ ہی مختلف ہابیوں کے متعلق باتیں سنایا کرتے اور ہم ان انگریز بچوں پر رشک کیا کرتے جن کی ایک نہ ایک ہابی ہوا کرتی ہے۔ مدتوں ہماری یہ خواہش رہی کہ کاش ہماری بھی کوئی ہابی ہو لیکن آج تک ہم تیتریوں کے پر اکٹھے نہ کر سکے اور نہ بیرونی ملکوں سے ہم تک ٹکٹ ہی پہنچ سکے۔

اگر غور کیا جائے تو ایک اوسط درجے کے چھوٹے بھائی کی ایک ہی "ہابی" ہے ـــ بڑے بھائی سے مار کھانا۔ یہ بات تو خیر مانی ہوئی ہے کہ چھوٹا بھائی گلی محلے کے چھوٹے بچوں کو ضرور پیٹتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ معصوم بچوں کو کسی قسم کی جسمانی تکلیف دی جائے بلکہ فقط اپنی روحانی تسکین کی خاطر

اور یہ بھی نہیں کہ یونہی پیٹنا شروع کردے بلکہ باقاعدہ طور پر ایک بہانہ ہوگا اور اس کے بعد ایک الٹی میٹم بھی، تب جا کے کہیں پیٹا جاتا ہے۔ جتنا ایک چھوٹے بھائی کا کسی بچے کو پیٹنا ضروری ہے اتنا ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس پیٹے جانے کی شکایت بڑے بھائی تک پہنچے۔ بڑا بھائی اس شکایت کے ازالے کے سلسلے میں چھوٹے بھائی کی گردن پکڑتا ہے اور گلی کے ایسے حصے میں لاتا ہے جہاں سے اس کی آواز اس شکایت کرنے والے کی بیوی کے کان تک پہنچ سکے۔ اس کے بعد پہلے ایک کڑ کا سنائی دیتا ہے پھر ایک چپت جمتا ہے، پھر کڑکا — پھر چپت، پھر کڑکا پھر چپت —— اور ایک عرصے تک یہ عمل جاری رہتا ہے — محلے دار اکٹھے ہوتے ہیں، چھوٹے بھائی کو پکڑ لیتے ہیں اور بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی وساطت سے ہمسایوں کو کوستا ہوا گھر واپس چلا جاتا ہے۔ دوسرا منظر کھلتا ہے، مقام وہی گلی، وقت، اگلا روز، چھوٹا بھائی جو پہلے منظر میں شلوار پہنے تھا اب نکر کسے ہوئے ہے اور شکایت کرنے والے ہمسائے کے اسی بچے کو یا اس کے کسی اور بچے کو (ایک ہی بات ہے) جواب گلی کے نکڑ پر بیٹھنے والے بڈھے سے گنڈیریاں یا مونگ پھلی خرید رہا ہے، اپنے بھائی کی سی پاٹ دار آواز میں کڑک کے یہ کڑکا دے رہا ہے اور گھونسے پہ گھونسہ جما رہا ہے۔ یہ چکر پھر چلتا ہے اور دو ہمسایوں کے آپس میں پُر ترنم گالی گلوج پر ختم ہوتا ہے۔

چھوٹا بھائی صبح سویرے اُٹھتا ہے، دہی لاتا ہے، اور اس کے بعد اگر دیا سلائی ختم ہو چکی ہو تو وہ بھی لینے جاتا ہے۔ آدھا پراٹھا اور دہی کھانے کے بعد ننھی کے لئے گوجروں کے ہاں سے گائے کا دودھ لاتا ہے اور پھر ہاتھ منہ دھو کر بستہ باندھتا ہے اور بازار سے سبزی اور گوشت لاتے روانہ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد اگر سکول دیر میں پہنچے تو مار کھاتا ہے۔ شام کو بڑا بھائی دفتر سے تھکا ہارا آتا ہے۔ تمام دن سرخ کھال کی جوتی پہنے ہوئے زرد مونچھوں والے موٹے ہیڈ کلارک کی گھرکیاں سہی ہوتی ہیں۔ طبیعت میں ایک چڑچڑاپن اور جلن ہوتی ہے۔ گھر پہنچنے پر کچھ کھانے کے لئے نہیں ملتا۔ چاہتا ہے کہ غصہ نکالے لیکن اُلجھن درپیش یہ ہوتی ہے کہ کس پر نکالے اور کیسے نکالے۔ چھوٹے بھائی کی بھاوج سے کچھ کہنے کی یوں ہمت نہیں پڑتی کہ بیوی ہے، ماں کو اس لئے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پاؤں تلے بہشت ہے، باپ کے سامنے یوں زبان نہیں ہلتی کہ تیس روپے تنخواہ ہے اور اس نے رہنے کو مکان دیا ہے۔ ماتھا پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب چھوٹا بھائی میدان میں آتا ہے اور بتا کر کہ وہ یہاں کیا کر رہا تھا دھڑا دھم مار کھاتا ہے اور غصہ نکلواتا ہے۔ اور اس کے بعد تمام گھر ایک پُرسکون سی فضا میں ڈوب جاتا ہے۔

بڑے بھائی کی فطرت ہی کچھ عجیب ہے۔ بڑے بھائی معاف فرمائیں تو یہ کسی حد تک احمقانہ کہی جا سکتی ہے۔ خود حُقہ پیتے ہیں، اور چھوٹے بھائیوں سے چلمیں بھرواتے ہیں مگر لطف یہ ہے کہ اگر سن پائیں کہ چھوٹا بھائی سگرٹ پیتا ہے تو اس کی کھال اُدھیڑ کے رکھ دی جاتی ہے۔ خود رات کے گیارہ گیارہ بجے گھر آتے ہیں اور چھوٹا بھائی ہی دروازہ کھولتا ہے، لیکن جو چھوٹا بھائی کبھی سورج غروب ہونے کے بعد آئے تو اس پر جوتیاں برستی ہیں۔ اگر بڑے بھائی نے جھوٹ بولا یا چوری کی تو گھر میں لطیفہ ہوا اور جو چھوٹے بھائی نے یونہی طبع آزمائی کی تو اخلاقی جرم ٹھہرا۔ ہمارے چچا کے ایک صاحبزادے ہیں وہ اپنے بڑے بھائی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ایک روز ہمارے یہاں تشریف لائے اور کلمہ کی انگلی اُٹھاتے ہوئے فرمایا "سنو" ہم اس وقت بیشتر چھوٹے بھائی ہی تھے۔ "سنو۔ بھائی جان ہمیں سگرٹ پینے نہیں دیتے، ہمارے ہاتھ کی صفائی ملاحظہ ہو۔ کوئی منتر نہیں جادو نہیں، یاروں نے انہی کی ڈبیا سے سگرٹ اُڑائے ہیں" — مسعود میاں تو ڈینگ مار کے چلتے بنے۔ اس سے اگلے ہی روز ایک لطیفہ ہوا سننے سے پیشتر یاد رہے کہ لطیفہ پر صرف ہنسا جاتا ہے، غور نہیں کیا جاتا تو ہم چچا کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے، چچا کے بڑے صاحبزادے تشریف لائے اور پاٹ دار آواز میں کڑک کے بولے — "آج میرے کمرے میں کون گیا تھا؟" اور بھولا بھالا چھوٹا بھائی بول اُٹھا — "میں نے بھائی جان آپ کی سگرٹ کی ڈبیا کو ہاتھ تک نہیں لگایا" لطیفہ ختم ہو چکا لیکن اس کے بعد مسعود میاں پر کیا گزری یہ ان سے پوچھ ہی کے بتائیں گے۔

امجد حسین

قطعات

آفاق کو دام و دم میں لانے والے — عاداتِ قبیحہ کو چھپانے والے
کچھوے کی طرح کبھی تو ہوگا ظاہر — اے جسم پہ اِک خول چڑھانے والے

ہر قلب کی آلودگی، اللہ اللہ — ہر روح میں اِک گندگی، اللہ اللہ
عیاریٔ زہّاد تو تھی ہی مشہور — رندوں کی سیہ باطنی! اللہ اللہ

منزل ہے کہیں، راہگذر ہے کہیں اور — جاتے ہیں کسی طرف سفر ہے کہیں اور
اللہ رے اختلافِ منشاء و عمل — دل تو کہیں اور ہے نظر ہے کہیں اور

عیار ہیں چل دے کے مزے لیتے ہیں — ہنستے ہیں کبھی اور کبھی رو دیتے ہیں
دل سے انہیں کچھ کام نہیں ہے زنہار — یہ لوگ گلے سے سوچ بھی لیتے ہیں

یہ خُلق و مروّت، یہ عداوت! افسوس — یہ نوعِ بشر کی طُرفہ سیرت! افسوس
اچھا بھی، برا بھی ایک ہی قد ہیں سب! — افسوس ہے، اے تضادِ فطرت! افسوس

حرماں خیرآبادی

ایک یاد

اے سمندر یاد ہیں؛ وہ دن جب اکثر دن ڈھلے
تیرے ساحل پر بناتا تھا میں ایوان ریت کے
میں اِدھر تعمیر کرتا تھا اُدھر جھلّا کے تو
اُن کو ڈھا دیتا تھا میرے دیکھتے ہی دیکھتے
میرے دل پر چوٹ لگتی تھی مگر شاداں تھا تو
ایک آوازِ حزیں آتی تھی دُور اشجار سے
بعد طفلی کے بھی میں اِس کھیل کو بھولا نہیں
ریگِ دنیا پر بنا ڈالے محل اُمیّد کے
میری اِس تعمیر سے برہم ہوئی سیلِ زماں
دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے وہ مندر ڈھا دیئے
میری صبحِ زندگی اب بن چکی ہے شامِ غم
ایک غم افزا صدا آتی ہے دشتِ روح سے

تاجور سامری

منگھوپیر

ہر نئی جگہ کی ایک الگ خصوصیت ہوتی ہے جو نووارد کو اپنی ایک مبہم اور نامانوس سی فضا میں لپیٹ لیتی ہے۔ یہ فضا جگہ کی نوعیت کے مطابق کچھ لمحوں، گھڑیوں یا دنوں تک قائم رہتی ہے۔ اس عرصے میں آدمی ایک عجز آفریں سے نشے میں ہوتا ہے۔ اُس کے تمام حواس اور اعضاء ڈھیلے پڑ کر نئے اثرات کو اخذ کرنے کے لئے مستعد ہوتے ہیں۔ جیسے کسی دلہن کی حالت شوہر کے لمس سے پہلے ہو یا کسی مرید کی پیر پکڑنے کے وقت۔

میں نیا نیا کراچی پہنچا تھا زندگی میں پہلی مرتبہ سمندر کی گرج میرے کانوں میں پڑی تھی۔ لہروں کی زمردی اور نقرئی ایال کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے پرشکوہ غرور میں پھر رہی ہیں۔ پانی کی وسیع چادر سینکڑوں میلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ دُور اُفق سے بھی پرے تک جہاں پہنچنے سے پہلے پہلے ہی انسانی نظر اور سمجھ بیکار ہو جاتی ہے۔ میری روح کو ایک شاندار خاموشی نے اپنی گود میں لپیٹ لیا تھا۔ ایک پُرامن اور پُرلطف خاموشی نے۔

کوئی گیارہ بجے تک ہم منورا کے ساحل پر خاموش ٹہلتے رہے۔ کبھی کوئی بات شاید ہو جاتی ہو، بالکل نرم اور دھیمی آواز میں جیسے کسی مذہبی فضا کے تقدس کا احترام مدِنظر ہو۔ پھر میں ریت پر لیٹ گیا۔ میرا میزبان بھی میرے نزدیک لیٹ گیا اور اُس کی بیوی اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ ہم سب خاموش تھے۔ میں نے بُوٹ اُتار کر اپنے سرہانے رکھ لئے تھے۔ ہم لوگ لہر کی مار سے پرے تھے۔ پھر بھی کبھی کسی لہر کی پھوار میرے پاؤں کو لطف اندوز کر جاتی، دوپہر ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ کرنوں کے لمحہ بہ لمحہ گھٹتے ہوئے زاویوں سے لہریں نئے نئے رنگ بدل رہی تھیں۔ میری آنکھیں ایک پُرلطف کاہلی کے عالم میں رنگوں کی اِس میلا کو دیکھ رہی تھیں۔

میرا میزبان بھی بالکل خاموش تھا۔ قدرتی طور پر یا شاید میری خاموشی کے احترام میں۔ اُس کی بیوی بھی اِس عرصے میں کچھ نہ بولی تھی لیکن دوپہر ڈھلنے کے بعد اُس نے اپنے شوہر کے کان کے قریب منہ لے جا کر کچھ کہا۔ اُس کے شوہر نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا اور وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد وُہ بے بسی اور اُلجھن کی علامات ظاہر کرنے لگی۔ اور اُس نے پھر شوہر کے کان کے قریب اپنا مُنہ کیا۔ اُس کے شوہر نے پھر اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ میں کوئی بات کر کے اِس متبرک خاموشی کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میرے منہ سے نکل گیا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں!" اُس کا شوہر مبہم طور پر مسکرایا۔

"کچھ تو ہے؟" اس کی بیوی کو مسکراتے اور لجاتے ہوئے دیکھ کر میں نے پھر پوچھنے کی کوشش کی۔

"اسی سے پوچھ لو، رانی سے،" میرے میزبان نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا جو دوسری طرف منہ موڑے انگلیوں سے ریت کرید رہی تھی۔

"کیوں جی؟" میں نے رانی سے پوچھا۔ وہ میری طرف گھوم کر مسکرائی اور پھر دوسری طرف منہ موڑ کر سورج کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیوں جی، کیا بات ہے؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"اگر نہ بتاؤ گی تو پھر مجھے کچھ نہ کہنا۔" اُس کے شوہر نے گویا اپنی ذمہ داری کو گلے سے اُتار کر پرے پھینکتے ہوئے کہا۔

"ہمیں وہاں بھی جانا ہے۔۔۔۔" وہ آہستہ سے بولی

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"منگھوپیر" وہ ساری کے آنچل کو سر پر کھینچتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ دیکھ لیں گے منگھوپیر بھی۔ ابھی مجھے دو ہفتے اور ادھر ہی رہنا ہے" یہ کہہ کر میں لہر کی نقرئی ایال کا نظارہ کرنے لگا۔ کچھ دیر کے لئے پھر خاموشی چھا گئی۔ رانی اُٹھ کر ساحل پر بے بسی اور انتظار کی حالت میں ٹہلنے لگی تھی۔ وُہ بار بار سورج کی طرف دیکھتی تھی۔

"کیا، بات کیا ہے؟" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے اپنے میزبان سے پوچھا۔

"بات یہ ہے۔۔۔۔" وہ مُسکرایا اور پھر رانی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "ہمارے بیاہ کو آٹھ نو سال ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ہمارے ہاں کوئی بچہ نہیں ہُوا۔ میں تو اِس بات کو محسوس نہیں کرتا۔ رانی نے بھی اسے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر پچھلے دو ایک سال سے وُہ اِسے بہت محسوس

کرنے لگی ہے۔"

میں بوٹ کے تسمے باندھ کر کھڑا ہو گیا اور ہم دونوں کشتی کی سمت چلنے لگے۔ رانی شاید ہمیں بات چیت کرنے کا موقع دینے کے خیال سے آگے آگے چل رہی تھی۔ سمندر کی تیز ہوا نے اُس کی ساری کو بدن کے ساتھ دبا کر اُس کے خوبصورت جسم کو نمایاں کر دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میرا میزبان پھر بولا:۔

"اب منگھو پیر کو جاتی ہے ..... ہر جمعرات کے دن"

"ہوں!" میں نے ہنکارا بھرا

"پانچ سیر کا ایک روٹ اور کٹورا گھی کا ساتھ لے جاتی ہے۔ روٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مگرمچھوں کے سامنے پھینک دیتی ہے اور گھی کو بڑے چراغ میں"

"جہاں سے نکال کر مجاور کو ضرور کھا لینا چاہئے" میں نے مسکراتے ہوئے اُس کی بات پر گرہ لگائی " حیران ہوں، پڑھے لکھے لوگ بھی اوہام پرستی سے نہیں نکلتے"

میرے میزبان نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کشتی ہولے ہولے گھاٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ رانی بھی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ وہ اپنے سامنے والے تختے پر بیٹھی ایک بدشکل کالی عورت کی طرف دیکھ رہی تھی جو بچے کو دودھ پلانے میں مصروف تھی اور میں رانی کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا جس پر کئی قسم کے اداس جذبات باریک لہروں کی طرح چڑھ اُتر رہے تھے۔ کشتی میں سے نکل کر ہم موٹر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ رانی پچھلی سیٹ پر اور میں اور میرا میزبان اگلی سیٹ پر۔ موٹر جلد ہی شہر سے نکل کر قلات کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچ گئی۔ آہستہ آہستہ ہموار زمین خشک ٹیلوں کی شکل میں اُبھرنے لگی۔ جہاں تک نظر پہنچتی تھی کسی قسم کی ہریاول کا نشان نہ تھا۔ سڑک کے دونوں طرف پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ خوبصورت اور بانجھ۔ مجھے رانی کا خیال آ گیا۔ میں نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ رانی آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ اُس کے دائیں طرف گھی کے کٹورے پر دھرا ہوا روٹ رومال میں بندھا ہوا ہل رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے میزبان کی طرف دیکھا جو اپنے خیالوں میں مستغرق موٹر چلا رہا تھا۔ وہ کراچی کے سرکاری کالج میں پروفیسر تھا۔ ایک نہایت قابل اور متبحر پروفیسر۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے باہر کی طرف دیکھا اور موٹر کو بالکل آہستہ کر لیا۔ میں نے بھی باہر کی طرف دیکھا۔ ایک بکری سڑک سے چند قدم ہٹ کر بچہ جن رہی تھی۔ ایک میمنا باہر آ چکا تھا بکری ایک قدم آگے ہو گئی۔ چمکدار خون اُس کی ٹانگوں پر سے بہہ کر زمین پر ٹپک رہا تھا۔ درد سے اُس کی پچھلی ٹانگیں ٹیڑھی ہو کر کانپ رہی تھیں مگر جلد ہی اُس نے گھوم کر میمنے کو چاٹنا شروع کر دیا اور اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

میرے میزبان نے پیچھے کی طرف گھوم کر دیکھا۔ رانی آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ پھر وہ بولا۔

اتنا خون! اتنا درد! پھر آنکھوں میں چمک! کچھ پتا نہیں چلتا۔ آخر بنا کیا؟ یہ میمنا پلے گا، بکے گا، کھا لیا جائے گا۔ یہی حال آدمی کے بچے کا ہے، درد، خون، بچہ، پلتا ہے، بکتا ہے اور کھا لیا جاتا ہے ....."

وہ پھر چپ ہو گیا۔ اب پہاڑیاں پھر ہموار زمین میں تبدیل ہو رہی تھیں اور ہریاول کے آثار بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ کچھ دیر کے بعد گندھک کے چشمے شروع ہو گئے اور ہم لوگ گاڑی میں سے نکل کر منگھو پیر کے چشمے کے کنارے پر جا پہنچے، چشمہ چھوٹا ہی تھا اور اُس کے ارد گرد بے ڈھنگے پتھروں کی دیوار سی بنی ہوئی تھی۔ پانی کے درمیان بھی کچھ بڑی بڑی چٹانیں اُبھری ہوئی تھیں جن پر کئی مگرمچھ دھوپ میں لیٹے ہوئے تھے۔ اُن کے بھونڈے اور مکروہ جسم بالکل خشک تھے، شاید پانی میں گندھک ہونے کی وجہ سے۔ اور اگر وہ بیچ بیچ میں ہلنے جلنے نہ لگ جاتے تو یہی نظر آتا کہ پانی میں سڑے ہوئے درختوں کے کچھ خشک تنے پڑے ہیں۔

میں نے کہا "چھوٹے سے چشمے میں اتنے مگرمچھ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے"

"اسی حیرت ہی سے تو مجاور لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ آدمی کے اسی جذبے پر تو پیر پرستی، مذہب، اور اس قسم کے دیگر اوہام کے ڈھانچے کھڑے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان کے ڈر اور اس کی جہالت کو کب تک لوٹا جائے گا۔ منگھو پیر ...... ہیں ہیں ..... منگھو پیر ....."

"پرماتما کے لئے ....." رانی نہایت انکسار سے اپنے شوہر کے بازو سے لپٹتے ہوئے بولی جیسے کسی نے اس کے معبود کی بے ادبی کر دی

ہو"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پرماتما کے لئے اور کچھ نہ کہنا منگھو پیر سب کچھ سنتا ہے۔ اُس کی دیا ہی سے کام چلے گا۔ ناراض ہو جائے تو گودی میں ڈال کر بھی چھین لیتا ہے ٹکی سندھنی کی بات نہیں سنی شاید؟ اُس نے بیٹے کے لئے چالیس جمعراتیں مانی تھیں۔ منگھو پیر نے اُس کی گود ہری کر دی۔ جب وہ ٹھیک ہو گئی تو اپنے لاڈلے کو لے کر منگھو پیر کے درشنوں کو آئی۔ اُس کا پتی بھی اُس کے سنگ تھا۔ بس وہ یہیں کھڑے تھے۔ اُس کے پتی نے کوئی بے ادبی کا لفظ کہہ دیا۔ بس اُس کا کہنا ہی تھا کہ بچہ ٹکی کی گود سے اُچھل کر چشمے میں جا پڑا اور منگھو پیر کے مگرمچھ اُسے ہڑپ کر کے کھا گئے۔"

اتنے میں مجاور نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر ہماری طرف آ رہا تھا۔ رانی شاید یہ سوچ کر کہ کہیں ہم مجاور کے سامنے کوئی بے ادبی کی بات نہ کہہ دیں، خود ہی چشمے کے دوسرے کنارے پر مجاور کے پاس چلی گئی۔ مجاور نے اُس کے ہاتھ سے گھی کا کٹورا لے کر چراغ میں انڈیل دیا۔ رانی روٹ کے ٹکڑے توڑ توڑ کر مگرمچھوں کے آگے پھینکنے لگی۔ مگرمچھ دھڑام دھڑام چٹانوں پر سے پانی میں گرنے لگے۔ چھوٹے سے چشمے میں گویا بھونچال آ گیا تھا۔ مجاور سبز رنگ کا لمبا کرتا پہنے اور کانچ کی موٹی موٹی چوڑیوں والے بازو اوپر کی طرف اُٹھائے رانی کے قریب کھڑا ہو کر دعا مانگنے لگا۔ اُس کے درجن کے قریب چھوٹے چھوٹے لڑکیاں لڑکے بھی رانی کے چاروں طرف چپ چاپ کھڑے روٹ کے ٹکڑے کھا رہے تھے"

منگھو پیر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منگھو پیر۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میرا میزبان ایک کڑوی سی ہنسی ہنسا اور پھر میری طرف منہ موڑ کر بولا" جانتے ہو، یہ منگھو پیر کون تھا؟"

"نہیں تو؟"

"آج سے کئی سو سال پہلے وہ اِدھر آیا تھا۔ سنتے ہیں۔ اس کے ساتھ دو چیلے بھی تھے جو یہاں پہنچ کر پیاس سے نڈھال ہو گئے مگر اِدھر میلوں تک پانی کی بوند نہ ملتی تھی۔ پیر نے زمین پر اپنی ایڑی ماری اور ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ سنتے ہیں۔ پھر اُن لوگوں نے یہیں رہنا شروع کر دیا۔ ایک دن پیر نے اپنی گدڑی کو چشمے میں جھاڑا۔ سینکڑوں جوئیں جھڑ کر پانی میں گر پڑیں اور یہ مگرمچھ وہ جوئیں ہی تو ہیں۔ ۔ ۔ ۔ سنتے ہیں"

میں ہنسنے لگا۔ مگر وہ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا" آپ ہنس رہے ہیں مگر تمام علاقہ اس بات کو سچ مانتا ہے۔ کتنی ہی ماؤں کو یہاں سے بچے مل چکے ہیں اور شاید اسی لئے تمہیں سندھ میں ہزاروں آدمی منگھو رام یا منگھو دین کے نام کے مل جائیں گے۔ نہ جانے آدمی کی جہالت کو کب تک لوٹا جائے گا؟"

میں نے کہا" جب تک اُسے جاہل رکھا جا سکے گا"

"ہاں یہ سب سامان آدمی کو جاہل رکھنے کے لئے ہی ہیں۔ منگھو پیر کیا اور مذہب کیا اور خدا کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مجاور دعا ختم کر چکا تھا۔ اُس کے بچے روٹ کے ٹکڑوں کو جلدی میں کاٹتے ہوئے پیسے مانگنے کے لئے ہماری طرف لپکے۔ وہ ہماری ٹانگوں سے لپٹ کر آنکھیں اوپر کی طرف اُٹھائے ہوئے کتیا کے پلّوں کی طرح ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے لگے۔

بابو ایمان کی سلامتی کریں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بابو ایمان کی سلامتی کریں گا۔ ۔ ۔ ۔ بابو ایمان کی سلامتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

موہن سنگھ

ضروری اطلاع

مضمون نگار حضرات کو اپنے مضامین کی صاف اور صحیح طباعت کے لئے اِس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان کا مسوّدہ نہایت واضح، صاف اور خوش خط لکھا ہو۔ شکستہ مبہم اور غیر واضح الفاظ کو کاتب عموماً غلط پڑھتے اور غلط لکھتے ہیں۔ اِس طرح مسوّدوں اور کاپیوں کی صحت میں صرف غیر ضروری کوفت اُٹھانی پڑتی ہے بلکہ طباعت بھی صاف نہیں ہوتی اور غلطیاں بھی کم و بیش رہ جاتی ہیں۔

"ہمایوں"

تقاضائے زندگی

نہیں کہ دنیائے رنگ و بو میں مرے لئے دلکشی نہیں ہے
نہیں کہ زہرہ جبیں حسینوں سے مجھ کو دلبستگی نہیں ہے
نہیں کہ پابندِ دام ہو کر خیال وارستگی نہیں ہے
نہیں کہ اپنی شکستہ حالی کا مجھ کو احساس بھی نہیں ہے
نہیں کہ بے چارگی ہے لیکن علاج بے چارگی نہیں ہے
نہیں کہ خاکسترِ جوانی میں شعلۂ سرکشی نہیں ہے
نہیں کہ انسان ہو کے انساں کے درد سے آگہی نہیں ہے
نہیں کہ اس آگہی سے دل میں لگی ہوئی آگ سی نہیں ہے
نہیں کہ میرے دلِ خود آگہ پہ یہ حقیقت کھلی نہیں ہے
کہ اس طرح نامراد جینا عذاب ہے زندگی نہیں ہے

مگر یہ احساسِ نامرادی بذاتِ خود اک وبالِ جاں ہے
علاجِ بے چارگی کرے کچھ جنونِ حشر آفریں کہاں ہے؟

نئی طرح پر نئے سرے سے پھر آج آرائشِ جہاں ہو
نہ یہ زمیں ہو نہ آسماں ہو نہ یہ مناظر نہ یہ سماں ہو
ہر اک تجلی ہر ایک جلوہ پھر اک نئے روپ میں عیاں ہو
زمیں پہ پھولوں کی انجمن ہو کہ چرخ پر بزمِ کہکشاں ہو
وفورِ آسودگی ہو ہر سو، بہار ہر سمت حکمراں ہو
چمن کا ہر کنج گل بداماں، چمن کا ہر گوشہ آشیاں ہو
ہر ایک ذرے پہ گلستاں کے تسلطِ اہلِ گلستاں ہو
نہ برق و گلچیں کی چیرہ دستی نہ دخلِ صیاد و باغباں ہو
نہ کفر و ایماں کی الجھنیں ہوں، نہ دین و الحاد کا نشاں ہو
نہ اہرمن سے کسی کو شکوہ، نہ کوئی یزداں سے سرگراں ہو
کسی کو سبقت نہ ہو کسی پر، جو ہم سفر ہو وہ ہم عناں ہو
ہر ایک رہرو ہو اپنا رہبر، ہر ایک سالارِ کارواں ہو

غرض تقاضا ہے زندگی کا کہ منقلب ہو نظامِ ہستی
بنائیں دنیا اک ایسی جس میں نہ بیش و کم ہو نہ اوج و پستی

رشید کیفی

"ادبی تخلیق"

کردار :—

جیرلڈ اسطون ـــ ڈرامانویس
جیک رانڈیل ـــ ایکٹر: اسطون کی لڑکی کا منگیتر
جین اسطون ـــ اسطون کی بیٹی
ڈیل ڈولن ـــ ؟؟......؟؟

—: منظر :—

[جیرلڈ اسطون کا مطالعہ کا کمرہ۔ کمرہ سجا ہوا ہے۔ نرم نرم قالینیں بچھی ہوئی ہیں۔ ان پر آرام کرسیاں سلیقہ سے سجی ہیں۔ ایک کونے میں رکھی ہوئی ڈسک کے برابر کا دروازہ اور ایک فرانسیسی طرز کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ جس میں سے باغ کا منظر نظر آرہا ہے۔ اگست کی ایک چاندنی رات ہے۔ اور دروازے میں سے صرف آسماں کی نیلی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔

جیک اور جین بیٹھے ہوئے جیرلڈ اسطون کے ایک ڈراما کا مطالعہ کر رہے ہیں ـــ یکایک جین کانپتی ہے]

جین۔ اوہ!

جیک۔ اف! مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ لیکن غضب کر دیا ہے کیوں؟ کیا خیال ہے؟

جین۔ سچ مچ۔ حیرت انگیز ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ابّا جیسا شخص اس قسم کی چیز کیسے لکھ سکتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

جیک۔ تم سمجھتی تو ہو نہیں۔ ان کے خیالات بہت بلند ہیں۔ اور ان کا دماغ نئے نئے تخیلات کا منبع ہے۔ منبع! کیا تم ان کی حیرت انگیز قابلیت سے ناواقف ہو؟

جین۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ابّا جان کی قابلیت کا اچھی طرح سے اندازہ نہیں کر سکتی اور ڈراما نگار کی حیثیت سے میں ان کے مرتبہ کو نہیں پہچانتی ـــ لیکن تم ذرا ابّا کی عادات و خصائل کو دیکھو کہ وہ کتنے شریف اور کتنے نرم مزاج ہیں۔ اس کے برعکس ان کے ڈراموں یعنی ان کی تخلیقات پر غور کرو کہ وہ کس قدر کریہہ اور ڈراؤنے کردار پیش کرتے ہیں ـــ کیسے عجیب اور حقیقت سے کس قدر قریب ـــ کیسے خوفناک اور کتنے قوی ـــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کردار ان ہی کی زندگی کا ایک جزو ہیں۔

جیک۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ واقعی یہ حیرت انگیز بات ہے ـــ مجھے تعجب ہے، ایسے تخیلات ان کے پاک دماغ میں کہاں سے آجاتے ہیں ـــ اور پھر یہ کردار! ـــ کتنا خوفناک ہے یہ! ـــ لیکن جین اس کردار کو میں ادا کر رہا ہوں ـــ کتنا سنہری موقع ہے!

جین۔ یہ اچھی بات ہوئی کہ اس کردار کو تم ادا کر رہے ہو۔ وہ اتنا خوفناک کردار ہے کہ اگر تمہارے سوا کوئی اور شخص اسے ادا کرتا تو یقیناً میں "میری" کا پارٹ ادا نہ کر سکتی تھی۔

جیک۔ ہوں! ـــ پھر وہی بچوں کی سی باتیں۔

جین۔ لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ اس کا خیال ہی ـــ مجھے خوفزدہ کئے دیتا ہے ـــ وہ اسٹیج پر کتنا خوفناک معلوم ہوگا ـــ مجھے اس کے ساتھ پارٹ ادا کرنے میں کتنا ـــ اُف!

جیک۔ اری پگلی! یہ بھی کوئی حقیقت ہے جو ڈر لگتا ہے ـــ یہ تو ایک خیالی انسان ہے۔ خیر اس کردار کو میں ادا کروں گا تب تو تمہیں ڈر نہیں لگے گا۔

جین۔ نہیں! ـــ بشرطیکہ تم اس کو ذرا نرمی سے ادا کرو ـــ اوہ! کتنا وحشیانہ کردار ہے!

جیک۔ ہاں ہے تو! ـــ اچھا آؤ۔ ذرا آخری ایکٹ ایک مرتبہ اور پڑھ لیں۔

(دونوں پڑھتے ہیں)

جیک۔ ڈیل ڈولن کا کردار پیش کر کے واقعی تمہارے والد نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے —— ذرا اس منظر کا خیال کرنا اسٹیج پر کتنا موثر اور دردانگیز ثابت ہوگا —— "بچہ خوف زدہ سہما ہوا بھوتوں کی آمدورفت والے کمرہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ خوفناک شکل دہلیز پر سے جھانک رہی ہے!" —— اُف! کتنا خوفناک منظر کھینچا ہے۔ جین تمہارے والد کہاں ہیں۔ میں ان کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔

جین۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت سو رہے ہوں گے کیونکہ وہ کل تمام رات اس ڈرامے کو پورا کرنے میں مشغول رہے۔ اور رات بھر جاگنے کی وجہ سے تمام دن بے چین رہے۔ تم خود جانتے ہو کہ جب وہ کسی ڈرامے کو ختم کر لیتے ہیں تو ان کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ گویا انہوں نے کسی چیز کو گم کر دیا ہے چاروں طرف اس کی تلاش میں پھرتے ہیں۔

(جین کی گفتگو کے درمیان اسطون کمرہ میں باغ کی طرف سے داخل ہوتا ہے اور ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں لے لیتا ہے)

اسطون۔ کیوں جیک کیا ابھی تھیئٹر سے چلے آ رہے ہو؟ میں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ آج کی رات بڑی سہانی ہے۔

جین۔ (جین سخت لہجے میں) ابا آپ کل رات کتنا سوئے تھے جو آج بھی اب تک جاگ رہے ہیں؟ آپ نے تو مجھ سے جلد ہی سو جانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ آپ کو اس وقت بستر میں ہونا چاہئے تھا۔ آپ اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں کرتے۔

اسطون۔ ہاں ہاں۔ بولے جاؤ ننھی جین! جب تم خفا ہوتی ہو تو اچھی لگتی ہو۔

جین۔ اچھا آپ پہلے یہ بتائیے کہ آپ اب تک کیوں جاگ رہے ہیں؟

اسطون۔ واقعی یہ بالکل سچ ہے میں گنہگار ہوں لیکن ننھی جین کو مجھے معاف کر دینا چاہئے کیونکہ قصور چاند کا ہے۔ اور چاند ہی میری اس خطا کا ذمہ دار ہے۔ وہ تم سے میری برأت کے لئے بہت کچھ کہہ سکے گا —— اچھا! تو تم لوگ ڈراما پڑھ رہے ہو —— تو جیوری کا فیصلہ کیا ہے جیک؟

(وہ آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

جیک۔ (جوشیلے لہجے میں) تعجب خیز ہے جناب! —— آپ نے تو واقعی غضب ہی کر دیا ہے —— یہ ڈراما واقعی ایک بہترین ڈراما ہے۔ اور میں بہت شکرگزار ہوں کہ ڈیل ڈولن کے اہم کردار کے لئے آپ نے مجھ خادم کو منتخب کیا۔ یہ کردار واقعی مجھے بہت بڑھا دے گا۔ اگر میں اسے اچھی طرح سے ادا کر سکا —— میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا سنہری موقع میرے ہاتھ آ جائے گا۔

اسطون۔ (پیار بھرے لہجے میں) نہیں یہ انگرام کا کام ہے۔ اس نے پہلے چند ایکٹ ہی پڑھ کر اس ڈرامے کے حقوق مجھ سے خرید لئے تھے۔ جین اس میں لازم طور پر کام کرے گی۔ کیونکہ اس کا انگرام کے ساتھ ایک سال کا ٹھیکا ہے۔ اور جب میں نے ڈولن کے کردار کے لئے تمہارا نام پیش کیا تو فوراً راضی ہو گیا —— ڈراما کچھ خوفناک ضرور ہے۔ تمہارا آخری ایکٹ کے متعلق کیا خیال ہے؟

جیک۔ خدا کی قسم تعریف نہیں کر سکتا۔ اور پھر اس کی طرز نگارش کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ یہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے!

جین۔ اچھا جیک! ادھر سنو! میں اب تمہیں ان کی جھوٹی تعریف نہ کرنے دوں گی۔ وہ ایک سادہ لوح بوڑھے شخص ہیں۔ اور ان کا کام سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ ایک مکڑی کی طرح بیٹھے ہوئے اپنے دماغ میں پلاٹ کا جالا بُنا کریں۔ اور اپنے "کرداروں" کو دھوکے سے گرفتار کرنے کی سعی کریں —— میرے خیال میں تو یہ ایک بیوقوفی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس مرض کا شکار میں نہیں ہوئی

اسطون۔ ہم میں سے ہر ایک مریض ہے اور ہر کسی کو کوئی نہ کوئی "مرض" لاحق ہے مجھے لکھنے کا مرض ہے تو تمہیں ایکٹ کرنے کا مرض ہے تم بھی مرض سے بچی ہوئی نہیں ہو۔ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی خواہش انسان کو ہوتی ہی چاہئے —— ورنہ وہ انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہو سکتا۔

جین۔ (منہ بنا کر) جی ہاں! بجا ارشاد ہے! اور یہ منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے!

جیک۔ جناب آپ نے ڈرامے لکھنا کیوں شروع کئے —— مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کا پہلا ڈراما آج سے دس سال پہلے اسٹیج کیا گیا تھا —— آپ کو ادبی راہوں میں سے صرف ڈراما نویسی ہی کیوں پسند آئی؟

اسطون۔ مجھے خیال نہیں ہے —— البتہ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ مجھے ایکٹ کرنے سے بہت رغبت تھی۔

جیک۔ یہ بہت عجیب اور دلچسپ بات ہے۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کو بھی ایکٹ کرنے کا شوق رہا ہے۔

اسطون۔ ہاں ـــــ اور میں ہمیشہ یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ میں ایک
لانبا اور خوبصورت شخص ہوں۔ ہر شخص میرا کہنا مانتا ہے اور
عزت کرتا ہے ـــــ لیکن افسوس کہ میرے خواب کبھی شرمندۂ
تعبیر نہ ہوئے ـــــ اور میرے قد وقامت نے میرا ساتھ
نہیں دیا۔ پانچ فٹ چھ انچ سے زیادہ کبھی میرا قد ہوا ہی
نہیں ـــــ حکومت کرنے کے ہوائی قلعے بھی مسمار ہوگئے
اور اب تم خود دیکھتے ہو کہ میری بیٹی بھی کس طرح مجھ پر حکم چلاتی
ہے ـــــ یہ کہتے ہوئے مجھے کوئی تامّل نہیں کہ میں اپنے
خیالوں کا بالکل الٹ ہوں۔ اور اسم بے مسمّٰی ہوں ـــــ
تعجب خیز باتیں ہیں یہ بھی! ـــــ ہم لوگ بھی کیا ہیں! ہم وہ
بننا چاہتے ہیں جو دراصل ناممکنات میں سے ہوتا ہے!

جین۔ میں سمجھتی ہوں۔ میں جانتی ہوں۔ میں نے اب تک جتنے پارٹ
ادا کئے ہیں وہ بہت شریف اور متحمّل کرداروں کے تھے۔
اور اگر انصاف کی آنکھ سے دیکھا جائے تو میں نے ان کو بڑی
عمدگی سے ادا بھی کیا ہے ـــــ لیکن میری سب سے بڑی
آرزو ہے کہ میں ایک "چماری" کا پارٹ ادا کروں۔

جیک۔ ہاہاہا۔ تم اور چماری کا پارٹ! کتنی مضحکہ خیز بات ہے!
لیکن کوئی کیا کر سکتا ہے ـــــ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی
ـــــ میں نے سوائے "کیریکٹر رول" کے کوئی اور کام نہیں
کیا۔ لیکن نوجوان ہیرو بننے کی مجھے بھی آرزو رہی ـــــ یہ
مثال بالکل ایسی ہی ہے جس طرح کہ ایک مزاحیہ اداکار
کو "رومیو" کا پارٹ ادا کرنے کی خواہش ہو یا ایک حسین دوشیزہ
جس کا چہرہ مجسّم مسکراہٹ ہو "گرانڈ ٹریجڈی" میں پارٹ
کرنے کی آرزومند ہو!

اسطون۔ اچھا۔ اب یاد آیا۔ اسی قسم کی چیزوں نے مجھے ڈراما لکھنے
کی طرف مائل کیا ـــــ ایک ادیبہ نے جو کہ میری دوست
تھی ایک مرتبہ مجھ سے کہا: "میں نے ڈرامے لکھنا اس لئے
شروع کر دیئے کہ اب میرے سب بچے بڑے ہو گئے ہیں۔
انہیں اب میری ضرورت نہیں رہی ہے۔ اب مجھے انہیں
یہ بتانا نہیں پڑتا کہ وہ کیا پہنیں۔ کب نہائیں۔ بال کس
طرح بنائیں یا کیا کھائیں اور درحقیقت انہیں اب میری
ضرورت محسوس بھی نہیں ہوتی۔ اب مجھے ان کے اچھے کام
انجام دینے پر انہیں شاباشی اور بُرا کام کرنے پر سزا نہیں
دینی پڑتی ـــــ وہ میرے کھیل کی چیزیں تھیں جن سے میں کھیل
چکی۔ اور اب چونکہ میری گڑیاں مجھ سے چھین لی گئی ہیں۔
میں دوسری گڑیاں تخلیق کرنے کی طرف منہمک ہو گئی ہوں۔
جو میرے لئے ایک کٹھ پتلی کی مانند ہوں گی۔ جو میں حکم دوں
گی انہیں کرنا ہوگا۔ جب میں کہوں گی "آؤ" وہ فوراً حاضر
ہو جائیں گی اور جب میں ان سے کھیلتے کھیلتے تھک جاؤں
گی تو اپنے آخری الفاظ لکھ دوں گی اور "پردہ" گرا دوں گی"۔

جین۔ کیسا عمدہ خیال ہے! ـــــ

اسطون۔ ہاں۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ مجھ سے بہت کچھ
ملتا جلتا ہے۔ ناکام امید نے مجھے ڈراما نگاری پر مجبور کیا۔
ـــــ اگر میں ہیرو کا پارٹ ادا نہیں کر سکتا تو میں ہیرو کو حکم
دے سکتا ہوں۔ میں اسے اپنی خواہش کے مطابق چلنے پر
مجبور کر سکتا ہوں ـــــ اچھا۔ ابھی مجھے "پردہ" لکھنا ہے
اور اپنی نئی "کٹھ پتلی" کو خدا حافظ کہنا ہے۔ اس لئے میری
رائے ہے کہ ہم پہلے اس کی صحت کا ایک ایک جام پی لیں۔

(جین اٹھتی ہے اور میز پر سے شراب اٹھا کر سب
کو دیتی ہے ـــــ تینوں اپنے جام اونچے کرتے
ہیں)

اسطون۔ ڈیل ڈولن! ـــــ جیک! میرے بچے! میں تمہیں اس
کے جام صحت کے ساتھ اس کا پارٹ ادا کرنے میں کامیابی
کی دعا کرتا ہوں۔

جیک۔ ڈیل ڈولن! ـــــ اس کی صحت کا جام! ـــــ اس امید
میں پیتا ہوں کہ میں اس کے کردار کو اچھی طرح سے ادا کر
سکوں!

جین۔ (مرتعش آواز میں) ڈیل ـــــ (ایک خوفناک چیخ کے ساتھ
وہ اپنا گلاس گرا دیتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتی
ہے) ـــــ اوہ! نہیں نہیں! میں نہیں کہہ سکتی!

جیک۔ کیوں جین! اچھی جین! بتاؤ تو کیا ہوگیا؟

جین۔ میں نہیں جانتی ـــــ میں نہیں جانتی۔ مجھے اس سے
ڈر لگتا ہے۔ وہ بہت وحشی ہے ـــــ میرے اس خوف
پر تم ہنسو گے ـــــ لیکن مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ میں
اس کی صحت کا جام نہیں پی سکتی!

اسطون۔ پگلی ہی رہی! ـــــ ابھی تک تیرا بچپن کا معصوم اور

تحفظ مضبوط نہیں ہوا ـــــ ارے وہ تو کاغذ پر ہے۔ اس کی اصلیت اور حقیقت ہی کیا ہے۔ وہ تو صرف تخیل کی پرواز تک محدود ہے ـــــ اور تم اس سے سچ مچ ڈرنے لگی ہو۔ ـــــ خیر اب تم زیادہ تھک گئی ہو۔ رات بھی زیادہ جا چکی ہے۔ میں بھی تھک گیا ہوں۔ اور تم جیک؟ تم بھی تھکے ہوئے ہو۔ اب میں تو جاتا ہوں اور جیک تم بھی جاؤ۔ کیونکہ میری لاڈلی بیٹی اب سوئے گی ـــــ شب بخیر!

جیک۔ شب بخیر جناب! ـــــ واقعی اب کافی رات گذر چکی ہے اور میں یہاں بہت دیر ٹھہرا ـــــ کل رات حاضر ہوں گا۔ تاکہ اس ڈرامے کے متعلق تفصیلی گفتگو کر سکوں ـــــ جین کیا تم مجھے کوٹ پہننے میں مدد دے سکوگی؟

(وہ دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ اسطون ڈیسک کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات ہیں۔ وہاں کھڑے ہو کر وہ اِدھر اُدھر سے صفحات پڑھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ قلم اٹھا کر آخری صفحے کے آخر میں "پردہ" لکھ دیتا ہے۔ ـــــ وہ پھر قالین کی طرف جاتا ہے اور نیچے بیٹھ کر اپنی آنکھیں تھکے ہوئے انداز میں بند کر لیتا ہے ـــــ یکایک ڈیسک کے پیچھے سے ایک شکل آہستہ آہستہ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ بہت کریہہ اور موت کی مانند سفید ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ ہونٹ بہت سرخ ہیں ـــــ ایک کاندھے پر تھوڑا سا کوبڑ ہے اور اس کی تمام حرکات اکڑی ہوئی آٹومیٹک (خود عمل) مشین کی مانند ہیں ـــــ اسطون آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور اسے دیکھتا ہے)

اِسطون۔ کیوں؟ ـــــ کیوں؟ ـــــ تمہارا مطلب؟ ـــــ تم کون ہو؟ ـــــ یہاں میری تنہائی میں تم دخل دینے والے کون؟ ـــــ تمہیں کس نے اندر آنے دیا؟ ـــــ اس وقت میرے پاس بغیر اجازت آنے والے تم کون ہو؟

ڈولن۔ آقا ـــــ تم خود ـــــ جانتے ہو ـــــ میں ـــــ کون ـــــ ہوں!

(وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے)

اِسطون۔ کیسی باتیں کرتے ہو ـــــ ڈیسک سے ہٹ کر کھڑے ہو ـــــ تم کون ہو؟

ڈولن۔ آقا میری بات سنو میں سب کچھ بتا دوں گا۔

اِسطون۔ تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا تم پاگل ہو؟

ڈولن۔ میں ـــــ ڈولن ـــــ ہوں!!

اِسطون۔ ڈولن؟! ـــــ میں نہیں سمجھا! ـــــ تمہیں اندر کس نے آنے دیا؟

ڈولن۔ آقا! ـــــ تم نے ہی مجھے اندر آنے دیا! ـــــ میں ڈیل ڈولن ہوں!

اِسطون۔ (غصے میں) سمجھا! ـــــ کوئی شخص خفیہ طور پر میرے ڈرامے کو پڑھ رہا تھا اور یہ اسی کی شرارت ہے کہ تمہیں میرے کردار کے مانند بنا دیا ہے ـــــ کس نے تمہیں اس حرکت پر مجبور کیا؟ کس نے میرے ڈرامے کو پڑھا ہے؟ ـــــ بتاؤ! ـــــ میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا ڈراما ایک راز ہے ابھی تک۔ سوائے انجام کے اس کی بابت کسی اور کو خبر نہیں ہے اور مجھے اس پر پورا بھروسا ہے کہ اس نے ابھی اس کو کسی پر افشا نہیں کیا ہوگا اور میری بیٹی اور ہونے والے داماد نے صرف آخری ایکٹ پڑھا ہے ـــــ جواب دو! بت کی مانند کیا کھڑے ہو؟ ـــــ کیا اپنے کئے پر پچھتا رہے ہو؟ ـــــ لیکن تم اس خیال میں مت رہنا کہ اپنے میک اپ سے تم مجھے دھوکے میں مبتلا کر دوگے۔ یہ پہلے سے طے ہو چکا ہے کہ اس کردار کو کون ادا کرے گا۔

ڈولن۔ آقا۔ وہ میں ہی ہوں گا ـــــ ہاں! وہ پارٹ میں ہی ادا کروں گا۔

اِسطون۔ کیا بک رہے ہو! ـــــ تم اس پارٹ کو نہیں ادا کر سکوگے ـــــ ہاں! اور میرا خیال ہے کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ اور اگر تم یہاں سے فوراً ـــــ رفو چکر نہ ہوئے تو مجھے ڈر ہے کہ مجھے کوئی دوسرا طریقہ اختیار نہ کرنا پڑے ـــــ سمجھے؟!

ڈولن۔ آقا! مجھے کوئی نہیں نکال سکتا ـــــ تم بھی نہیں!

اِسطون۔ تم جانتے ہو یا نہیں ـــــ یا پھر اپنے نوکر کے ذریعے سے کسی کانسٹیبل کو بلوا کر تمہیں مداخلتِ بیجا کے الزام میں گرفتار کراؤں؟

ڈولن۔ ٹھہریئے۔ آقا! آپ کے علاوہ کیا اور کوئی بھی آپ کے ڈرامے کے آخری ایکٹ کے انجام سے واقف ہے

اِسطون۔ صرف میری بیٹی اور جیک رانڈیل۔ کل رات میرے ختم

کرنے کے بعد ڈراما ان ہی دونوں کے ہاتھ میں گیا ہے۔

ڈولن۔ تو پھر یہ ثابت کروں گا کہ مجھے یہاں ہونے کا حق حاصل ہے
—— سنئے! آخری منظر یہ ہے۔ "ڈولن خالی مکان میں واپس
آجاتا ہے: بچہ جو باغ میں گھوم رہا ہے اسے دیکھ لیتا ہے ڈولن
اس کو پکڑ کر بھوتوں کی آمد و رفت والے کمرہ میں بند کر دیتا
ہے تاکہ وہ اس کی آمد کی کسی کو خبر نہ کر سکے (اور پردہ) بچہ کی ڈراؤنی
اور ہیبت ناک چیخ پکاروں کے درمیان گرتا ہے جب کہ خوفناک
بھوتوں کے مانند چیزیں دہلیز پر آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی
دکھائی دیتی ہیں" —— آقا۔ کیا آخری ایکٹ اس پر
ختم نہیں ہوتا؟

اسطون۔ ہاں —— ہاں ہوتا ہے! —— ہوتا ہے! —— مگر خدا
کے لئے جلد بتاؤ یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

ڈولن۔ اوہ! —— آقا! کیونکہ میں "خود" ڈولن ہوں! —— میں
زندہ ہوں! میں سانس لے سکتا ہوں! میں حرکت کر سکتا
ہوں! دیکھو آقا! —— جب تم نے صفحہ پر "پردہ" لکھا تو تم نے
مجھے زندگی کے روپ میں بلالیا —— تم میرے خالق ہو گئے!
—— دیکھو آقا دیکھو! —— میرا منجمد اور اکڑا ہوا جسم دیکھو!
—— لیکن میں زندہ ہوں! میں زندہ ہوں! مجھ میں جان
ہے!

اسطون۔ (سر پکڑ کر) او خدا! کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں! یا میرا
دماغ خراب ہو گیا ہے! کیا میں پاگل ہو گیا ہوں! میری سمجھ
میں کچھ نہیں آرہا! —— ڈراما! تخیل! ڈولن! حقیقت!
—— یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟! —— تمہارا مطلب کیا ہے
آخر بھائی؟ —— تم تو کاغذ پر صرف ایک خیالی کردار ہو۔ تمہاری
کوئی اصلیت نہیں ہے!

ڈولن۔ لیکن آقا۔ ایسا ہی ہے! —— کاغذ پر سینکڑوں اور لاکھوں
کردار ہوتے ہیں اور وہ کاغذ پر ہی رہتے ہیں۔ کاغذ ہی ان کی
پیدائش کی جگہ ہوتی ہے۔ اور کاغذ ہی ان کا مقبرہ! ——
لیکن کبھی کبھی کسی کردار کو کوئی "حیات بخش چنگاری" مل جاتی
ہے جو اس کو زندہ کر دیتی ہے اس میں جان ڈال دیتی ہے۔ مجھے وہ چنگاری
مل گئی ہے۔ جب تم نے "پردہ" نہیں لکھا تھا وہ مجھے نہیں ملی تھی ——
لیکن اب میں حرکت کر سکتا ہوں! —— میں زندہ ہوں۔
(وہ اکڑی ہوئی چال سے اسطون کی طرف دو تین قدم بڑھتا ہے)

اسطون۔ (خوفزدہ لہجے میں) دور رہو! دور رہو! آگے مت بڑھو! ——
خدا کے لئے پیچھے جاؤ —— میں نہیں جانتا —— میں نہیں سمجھ سکتا
—— میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے —— میری طرف آؤ! ——
دور رہو!

ڈولن۔ (لہجہ بدل کر) ہاں تمہیں ڈر لگنا ہی چاہئے! (ڈرامے کے مسودے
کو اٹھا لیتا ہے) تم نے مجھے بھی کیا چیز بنایا ہے! —— ایک کمینہ
خصلت، لرزہ پیدا کر دینے والا، حیوان سیرت انسان! —— ایک
ہستی جس کو دیکھ کر ہر ایک وحشت زدہ ہو جائے! —— اور
اب تم نے مجھے آزاد کر دیا ہے۔ تاکہ میں رات کے وقت انسانوں پر
اپنی حکومت چلاؤں!

اسطون۔ میں نے کیا کیا ہے؟ —— نہیں نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا!
—— میں کبھی ایسی خوفناک جسارت نہیں کر سکتا —— میں
نے آخر کیا کیا ہے؟

ڈولن۔ تم نے ایک ایسی چیز کی تخلیق کی ہے جس پر تمہارا خود قابو نہیں ہے۔
—— تم ایک ایسی ہستی کی پیدائش کا باعث ہو جس نے تم سے انتقام
لینے کا تہیہ کر لیا ہے —— میں تمہاری طاقت سے بلند بہت
بلند ہو گیا ہوں! —— ایک پھونک میں تم جلتی ہوئی دیا سلائی
کو بجھا سکتے ہو لیکن اسے کسی خشک آتش گیر مادے پر پھینک
دو اور پھر دیکھو وہی ننھی سی دیا سلائی کیا کرشمے دکھاتی ہے ——
غراتی ہوئی خوفناک آگ جو ہر اس چیز کو نگل جاتی ہے جو اس کے
راستے میں آجائے۔ —— یہی ہے جو تم نے کیا ہے —— میں
برباد کروں گا! —— مسمار کروں گا!

اسطون۔ ڈیل ڈولن! اگر یہ معاملہ ہے تو تم اپنے اوپر بھروسا مت
رکھو —— میں اس "ننھی سی دیا سلائی" کو ہلکی سی پھونک ہی سے
بجھا دوں گا۔ میں اس غراتی ہوئی خوفناک آگ کو پاؤں سے روند
ڈالوں گا قبل اس کے کہ وہ "لو" دے —— اگر میں نے تمہاری
تخلیق کی ہے تو میں ہی تمہارا آقا بھی ہوں۔ تمہارا خالق ہوں ——
تمہیں میرے حکم پر چلنا ہوگا!

ڈولن۔ آہاہا! میرا خیال ہے کہ خدا نے بھی یہی سوچا تھا جب اس نے
پہلے پہل دنیا کی تخلیق کی —— کیا تم نے کبھی سوچا کہ خدائے
تعالیٰ کو پشیمانی کے آنسو بہانا پڑیں گے جب وہ اپنی کاریگری پر
دوبارہ نظر ڈالے گا؟ —— کیا تم خیال کرتے ہو کہ دنیا کی تخلیق
خدا نے اس لئے کی تھی کہ اس کی تخلیق کی ہوئی "کٹھ پتلیاں"

اس کی مرضی کے خلاف کام کریں؟ — جھوٹ بولیں، قتل کریں، چوری کریں اور اس کے نام کی توہین کریں؟ — کیا دنیا کو پیدا کرنے سے پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنی مخلوق کو ایک دوسرے کے قتل و خون پر آمادہ دیکھے گا۔ اور لاکھوں کو بھوکا مرنا پڑے گا تاکہ دس بارہ عیش کی زندگی گذار سکیں؟ — کیا تم سمجھتے ہو کہ خدا کے کمال کا نمونہ یہی "دنیا" ہوگی؟ — اور اگر نہیں تو پھر وہ کیوں اسے بدل نہیں ڈالتا؟ — میں تم سے کہوں گا آقا اور ڈنکے کی چوٹ کہوں گا کہ وہ اپنی مخلوق کو قابو میں نہیں رکھ سکتا — اور اسی طرح تم بھی مجھ پر قابو نہیں رکھ سکتے!۔ — یقین مانو! بالکل یہی معاملہ ہے!

اِسطون۔ یہ سب غلط ہے — میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں ضرور خواب دیکھ رہا ہوں! ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سب باتیں خیالی اور وہمی ہیں — لیکن کتنی خوفناک! — میں کیا کروں؟ خدایا! یہ کیا ہو رہا ہے! — (پرجوش لہجہ میں) لیکن اگر یہ حقیقت ہے اور میں خواب نہیں دیکھ رہا تو میں ڈولن کے کردار کو بدل دوں گا چاہے ایسا کرنے سے میرا ڈراما ہی خراب ہو جائے — میں بہت پریشان ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں — کیا سوچوں اور کون سی راہ اختیار کروں؟

ڈولن۔ او بے وقوف اور سادہ لوح انسان! — اُس وقت تم نے کچھ نہ سوچا، جب تم پر شیطان سوار تھا؛ جب تم نے ڈیسک پر بیٹھ کر سادہ کاغذ پر قلم کی ایک معمولی جنبش سے ایک "دہشت" کی تخلیق کی؟ — ایک ایسی خوفناک ہستی کی شکل میں جو اپنی خواہش کے مطابق انسانوں میں چل بسے!

اِسطون۔ یہ صحیح نہیں ہے! یہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا!

ڈولن۔ یہ صحیح ہے — تمہارا ان جرموں کی بابت کیا خیال ہے جن کے مرتکب بغیر سزا کے رہتے ہیں — اور ان ڈراؤنے قتلوں کی بابت تم کیا رائے رکھتے ہو جن کا ارتکاب ایسی چیزوں سے ہوتا ہے جن کی تخلیق کا باعث تم جیسے لوگ ہوتے ہیں؟

(وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے)

اِسطون۔ (خوف زدہ ہو کر) دور رہو! — آگے مت بڑھو! — او خدا! — دور رہو!

ڈولن۔ آہاہا۔ ڈرتے ہو! اپنی ہی تخلیق سے ڈرتے ہو! — آہاہا!۔ اف! ہم لوگ تم سے کتنی نفرت کرتے ہیں اور کتنی بد دعائیں دیتے ہیں تمہیں! کیونکہ تم ہمیں ایسا بناتے ہو جس کی نظیر دنیا میں مشکل سے ملتی ہے — بھدے بے ڈول جسم، ناپاک روحیں! — اپنے خالق سے متنفر — ہمیں اپنی "وحشت" سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اس کے "مصنف" سے بھی — اوہ! (غصہ سے) ہم سب وہ "کیلیبان" ہیں جن کی نظریں ہمیشہ ستاروں پر لگی رہتی ہیں۔ لیکن ستارے ہماری پہنچ سے اتنی دور ہیں، کہ مایوسی میں ہم "کیچڑ" میں گر پڑتے ہیں — لیکن — آقا! جو کچھ بھی ہو تم میرے آقا ہو! — تمہارے ڈرامے میں، میں اپنے کردار کو خود ادا کروں گا۔ اور تمہیں بتلا دوں گا کہ میں کتنا فاسد اور وحشی ہوں۔ کیونکہ تم نے مجھے راستا بتلا دیا ہے —

(جین داخل ہوتی ہے)

جین۔ ابا۔ میں نے تو سمجھا کہ آپ سو رہے ہوں گے — آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا — آپ صبح کچھ بھی کام نہ کر سکیں گے۔ (ڈولن کو دیکھ کر) اوہ! مجھے افسوس ہے! میں نے نہیں دیکھا کہ آپ یہاں کسی سے باتیں کر رہے ہیں!

اِسطون۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) ہاں جین میں مشغول ہوں۔ تم اچھی لڑکیوں کی طرح یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔ میں زیادہ دیر نہیں جاگوں گا — جاؤ چلی جاؤ!

جین۔ آپ کتنے عجیب و غریب نظر آ رہے ہیں۔ کیا خدانخواستہ دشمنوں کی طبیعت خراب ہے؟ — ہیں! آپ چپ کیوں ہیں! آپ مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ ضرور آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ آپ اب سو جائیے!

اِسطون۔ نہیں جین۔ میں اچھا ہوں۔ بس تھوڑی سی تھکان ہے — لیکن تم خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔

ڈولن (آگے بڑھ کر) آقا! میرا مس جین سے تعارف کرا دیجئے نا!

(جین گھبرا کر پیچھے ہٹتی ہے)

اِسطون (گھبرا کر) یہ ضروری نہیں ہے — جین تم سے میں نے کیا کہا — جاؤ!

ڈولن۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں — میں اپنا تعارف خود کئے لیتا ہوں — ٹھہریئے مس جین! — میں ڈولن ہوں! — ڈیل ڈولن!!

جین۔ (خوف زدہ لہجے میں) ڈیل! — ڈولن؟! — ابا جان! — آپ کا ڈراما — میرا خیال تھا...... آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ

جیک اس پارٹ کو میرے ساتھ ادا کرے گا۔ میں ڈرامے میں جیک کے علاوہ کسی اور کے ساتھ کام نہیں کر سکتی!

ڈولن۔ میرا خیال ہے مس جین! کہ آپ کو میرے ساتھ اس ڈرامے میں کام کرنا ہوگا! ـــ میں نے ہیرو کے پارٹ کا ٹھیکا لے لیا ہے کیوں آقا؟ ـــ میں عاشق ڈولن کا پارٹ بہت اچھی طرح ادا کروں گا۔ تمہارے جیک سے بھی اچھا۔ تم خود دیکھ لوگی ـــ

(وہ آگے بڑھتا ہے)

جین۔ (خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی آواز میں) وہ! نہیں نہیں، نہیں! آقا کیوں نہیں بولتے؟ ـــ میں کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ میں سوائے جیک کے کبھی اور کسی کے ساتھ یہ پارٹ ادا نہیں کر سکتی ـــ کبھی نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے!

اسطون۔ (ڈولن سے) پیچھے رہو۔ آگے نہ بڑھو ـــ سنتے نہیں! ـــ ابھی جین تم جاؤ۔ فوراً چلی جاؤ۔ مجھ سے ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے ـــ پھر بتاؤں گا۔ لیکن تم جاؤ!

ڈولن۔ نہیں ٹھہرو! کوئی غلطی نہیں ہوئی اور نہ کچھ سمجھانے کی ضرورت ہے ـــ میں ڈیل ڈولن کا پارٹ ادا کروں گا اور مس جین "میری" کا ـــ اور ہم ابھی ریہرسل کریں گے [وہ لیمپ اٹھا کر میز پر رکھ دیتا ہے] میں یہاں کھڑکی کے پاس کھڑا ہوتا ہوں۔ یہاں سوائے چاند کی روشنی کے اور کوئی روشنی نہیں ہے۔ بہت سرد اور ظالم روشنی! ـــ بقول آقا! ـــ میں واپس آگیا ہوں۔ میں میری کو اپنے پاس بلاتا ہوں۔ میری جو میری زندگی میں مجھ سے نفرت اور سخت نفرت کرتی تھی ـــ لیکن موت نے مجھے نئی طاقتیں دے دی ہیں ـــ میں میری کو پکارتا ہوں! ـــ میری! [جین ایک نیند میں چلنے والے شخص کی مانند اس کی جانب بڑھتی ہے ـــ اسطون خوف زدہ نظروں سے دیکھتا ہے] میری! میرے پاس آؤ! ـــ میری! ـــ مجھے تم سے محبت ہے ـــ مجھے اپنے سچے محبوب کی طرح پیار کرو! [جین اس کا بوسہ لیتی ہے] کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟

جین۔ ہاں! میں تم سے محبت کرتی ہوں!

ڈولن۔ کیا تم مجھے اپنا آقا۔ اپنا سرتاج سمجھتی ہو؟

جین۔ تم میرے آقا ہو!

ڈولن۔ کیا تم میری فرمانبرداری کرو گی؟

جین۔ میں تمہاری لونڈی ہوں!

ڈولن۔ جب میں بلاؤں گا تم آؤ گی؟ ـــ خواہ تم دنیا کے کیسے ہی دور دراز حصے پر ہو جب بھی آؤ گی؟

جین۔ اگر تم بلاؤ گے تو خواہ میں دنیا کے کسی حصے میں بھی ہوئی ضرور آؤں گی!

ڈولن۔ (اسطون سے) دیکھا آقا تم نے! ـــ وہ خود اقرار کر رہی ہیں ـــ وہ میرے ساتھ میری کا پارٹ ادا کرنے کو تیار ہیں ـــ اب زیادہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ـــ اچھا مس جین اب تم جا سکتی ہو!

(جین کمرے سے چلی جاتی ہے)

اسطون۔ او شیطان! ـــ پاپی! ـــ تو نے یہ کیا کیا؟ ـــ سچ بتا تو نے اس پر کیا جادو کر دیا؟ ـــ تو کون ہے؟

ڈولن۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں پھر بھی مجھ سے پوچھتے ہو ـــ پھر پوچھتے ہو تو سنو! ـــ میں تمہارے دماغ کی فاسد دھوکا دینے والی۔ وحشی اور بری تحریکات کا مجموعہ ہوں! ـــ تمہاری روح کی گہرائیوں میں جو خیالات پرورش پا رہے ہیں ان ہی سے میری تخلیق ہوئی ہے!

اسطون۔ (سسکتے ہوئے) وحشی! ظالم! بدکار! ـــ لیکن میں تیری جین تک رسائی نہ ہونے دوں گا ـــ تو اسے کبھی نہ دیکھ سکے گا!

ڈولن۔ اف! حسین چڑیا جین! ـــ میں پاک و معصوم جین کو کیچڑ میں گھسیٹ لے جاؤں گا! لیکن ـ لیکن [گھبرائے ہوئے لہجے میں] میں ان سمیت ستاروں تک کیوں نہیں پہنچ سکتا؟ ـــ مجھے جین سے محبت ہو گئی ہے! ـــ تم شیطان ہو! تم ظالم ہو! ـــ تم نے مجھے سؤر کی مانند زندگی بسر کرنے کے لئے کیچڑ اور زندگی کی غلاظت میں پیدا کیا ہے ـــ حالانکہ تم جانتے تھے کہ مجھ میں ستاروں کی سی خوبصورتی ہے ـ لعنت ہے تم پر! اور پھٹکار ہے تمہارے قلم پر!! ـ لیکن اس کی سزا تمہیں اپنی حسین جین کے ذریعہ سے بھگتنا پڑے گی!

اسطون۔ مجھ سے غلطی ہوئی ـــ میں نے بے وقوفی کی۔ اف! ـــ لیکن تم کبھی اپنی باتوں پر یقین نہ کرنا! ـــ تم اپنی باتوں پر بھروسا مت رکھنا! میرے پاس ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے میں تمہیں ایسا کرنے سے روک سکتا ہوں ـــ میں تمہارا خالق ہوں! ـــ صرف مجھے اپنا قلم ایک مرتبہ اور اٹھانا پڑے گا!

ڈولن۔ (قہقہہ) سمجھا ..... کیا تمہارا خیال ہے کہ تم اپنے ڈولن سے "موت کی توبہ" کے ذریعے سے آزاد ہو جاؤ گے؟ ـــ کبھی نہیں! نہیں آقا کبھی نہیں! ـــ تخیلات حقیقت ہوتے ہیں حقیقت! ـــ مجھے بدکار تخلیق کیا گیا ہے۔ لعنت تم پر! لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مجھ میں جتنی شیطنت تم نے اپنے خیال سے رکھی تھی اس

سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

اسطون۔ نہیں۔ میں تمہیں ڈرامے میں "موت کی توبہ" کے ذریعے سے نہیں ختم کرنا چاہتا۔ بلکہ ایک بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے —— میں نے اس وحشی پن کا ارتکاب انسانیت کے خلاف کیا ہے لہذا میں ہی اس کی سزا بھی بھگتوں گا [ڈرامے کا مسودہ اٹھاتا ہے] یہ تھا میرا ڈراما! اگر میں اپنی تمام بقیہ زندگی بھی صرف کر دوں تب بھی اس کے برابر کبھی نہیں لکھ سکتا — لیکن قبل اس کے کہ تم دنیا میں قدم رکھو میں اس کو ضائع کر دوں گا۔ میں اس کو پرزہ پرزہ کر ڈالوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ تم کہاں ہو اور کیا کر سکتے ہو؟

ڈولن۔ کیجئے اور نتیجہ دیکھئے!

[اسطون مسودہ کو پھاڑتا ہے۔ لیکن ڈولن کھڑا مسکرا رہا ہے]

ڈولن۔ آہاہا مسودہ! —— آقا! وہ تو "ماں کا پیٹ" تھا جس سے کہ میں پیدا ہوا۔ لیکن میرا "حمل" تمہارے "دماغ" میں تھا —— تم میرے خالق ہو جب تک تم زندہ ہو میں زندہ رہوں گا —— بیس، تیس یا چالیس چاہے کتنے ہی سال ہوں —— میں دنیا میں ادھر ادھر گھوموں گا —— اپنے پاؤں کیچڑ میں گھسیٹتا ہوا —— چاہے کبھی کبھی ستاروں کی طرف بھی نظر کر لوں — لیکن میری موت کا دارومدار تم پر ہے!

اسطون۔ (تیزی سے دراز کھول کر ریوالور نکالتا ہے) اچھا! — اگر تم انسان ہو اور اگر تم میں جان ہے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا —— ہاں! قتل! —— تب اس کے کہ تم میری جبین کو اپنے گندے، غلیظ ہاتھ اور ہونٹ لگا سکو! —— اگر تم جیسا کہ کہتے ہو دراصل وہی ہو جس کی کہ تخلیق میری بدکاری نے کی ہے — تو میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے!

[وہ فائر کرتا ہے۔ لیکن ڈولن پر کوئی اثر نہیں ہوتا]

ڈولن۔ آقا کیوں بیکار کوشش کرتے ہو —— میں تمہاری روح کا ایک حصہ ہوں — تمہاری زندگی کا حصہ دار! — میری زندگی تم پر منحصر ہے۔ اور تمہاری زندگی میں مجھے کبھی کوئی نہیں مٹا سکتا!

اسطون۔ اگر ایسا ہے تو پھر تم نے مجھے بتا دیا کہ میں کون سی راہ اختیار کروں — میں نے غلطی کی ہے، میں مجرم ہوں —اس لئے سزا کا مستحق بھی میں ہی ہوں۔ اگر میری موت سے وہ بدکار چیز مٹ سکتی ہے جسے میں نے تخلیق دی ہے۔ تو میں ایسا ضرور کروں گا —— [آہستہ آہستہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں] او خدا —— میرے گناہ معاف کر دے! —— میں نے جو کچھ کیا ہے اس پر میں شرمندہ ہوں! — میں ان تخیلات پر پشیمان ہوں! — اے خدا! ——

[وہ ریوالور کو اپنے سینہ پر رکھ کر فائر کر دیتا ہے — ڈولن آہستہ آہستہ اکڑی ہوئی چال سے ڈیسک کے پیچھے پہنچ جاتا ہے۔ جوں ہی اسطون گرتا ہے ڈولن آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ نظروں سے غائب ہو جاتا ہے]

(پردہ)

(ترجمہ)

شہاب سلمانی

نغمۂ عندلیب

کس قدر دلدوز ہیں نغمے ترے اے عندلیب!
رو رہا ہو جیسے کوئی عاشق حرماں نصیب
عشق کے غمہائے جاں فرسا کی خونیں داستاں
کنجِ تنہائی میں اپنے دل سے کرتا ہو بیاں؛
باوجودِ ضبط رُسوا کر رہا ہو رازِ دل؛
روک سکتا ہو نہ آوازِ شکستِ سازِ دل۔

تیرے اس ننھے سے سینے میں ہے کتنا سوز و ساز!
اُف نوائے آتشیں کی گرمیٔ پہلو گداز!
یہ تعجب ہے کہ تیرا جسم جل جاتا نہیں
یا مثالِ شمع چپکے سے پگھل جاتا نہیں۔

محوِ حیرت ہوں تری یہ بے قراری کس لئے
نالہ ہائے آتشیں کی شعلہ باری کس لئے؟
وصل کچھ مشکل نہیں تیرے لئے محبوب کا؛
ہے وفور اس باغ میں تیرے گلِ مطلوب کا۔
تو جدھر دیکھے اُدھر ہے جلوۂ رنگینِ یار،
زندگی تیری ہے گویا سر بسرِ باغ و بہار۔
پھر ترے لب پر نوائے دردِ ہجراں ہے تو کیوں؟
دل ترا یوں آشنائے رنجِ حرماں ہے تو کیوں؟
ہو نہ ہو تو بھی ہے مجھ سا اک شہیدِ آرزو؛
تجھ کو بھی بیتاب رکھتی ہے کسی کی جستجو
وہ گلِ رعنا کہ اس گلشن میں مل سکتا نہیں؛
اس خزاں دیدہ گلستاں میں جو کھل سکتا نہیں
لوگ جن پھولوں کو سمجھے ہیں کہ ہیں تزئینِ باغ
ہیں ترے خونِ تمنا کے یہ زنگار رنگ داغ

محمد ہادی حسین

اصغر کی یاد میں

دو سال ہونے کو آئے کہ سات سمندر پار وہ ایک چھوٹے سے دریا میں شام ہوتے چُھپ گیا!

ہم اُسے دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ چھپ گیا،

ہم اُسے سننے بھی نہ پائے تھے کہ وہ خاموش ہوگیا۔

عزیزوں نے آخری بار اُسے لاہور میں دیکھا،

اُس کی امّی نے اُسے قرآن شریف کے نیچے سے گزارا،

ایک ننھی سی حمائل اُس کے گلے میں تھی،

یوں وہ "المنظر" سے رخصت ہوا ایک شام!

اور کیا میں اُس صبح کو بھول سکتا ہوں جب جہاز

بمبئی کے ساحل سے دُور اُسے لے گیا،

اور مسعود اور میں اپنے رُومال ہلاتے رہے

اور اُدھر وہ بھی اپنا رُومال ہلاتا رہا،

یہ تھا اُس کا آخری دیدار!

اور پھر وہ صبح جب ریل میں جاتے ہوئے ہمیں معلوم ہوا

کہ وہ ایک چھوٹے سے دریا میں ہمیشہ کے لئے............اُف!!!

اے میرے دل! اِس پار اُس نے غوطہ لگایا ایک شام

لیکن کیا کسی صبح وہ اُس پار.........گیا!؟

ب ر

محفلِ ادب

بیوی کی سہیلیاں

اجازت ہو تو میں بھی داستانِ غم بیان کروں لیکن اجازت دینے سے پہلے یہ بھی سن لیجئے کہ "سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری" تو اجازت ہے۔ سنئے! میں ایک بیوی کا شوہر ہوں بیوی سے مجھے کسی قسم کی شکایت نہیں' وہ مجھے سینما دیکھنے سے منع کرتی ہیں تو میں ہنس کر ٹال دیتا ہوں اور کسی نہ کسی دعوت کا بہانہ کر کے سینما چلا جاتا ہوں' وہ میری سستی اور کاہلی پر ناک بھوں چڑھاتی ہیں تو میں طبّی صداقت نامہ پیش کر دیتا ہوں اور کسی نہ کسی شکایت کا عذر مجھے بستر پر لیٹے پڑے رہنے کا موقع فراہم کر دیتا ہے۔ ویسے بھی بیوی کی شکایت کسی خاوند کے لئے زیبا نہیں۔ بیوی آخر بیوی ہی ہوتی ہے۔ خاوند کی فلاح و بہبود کے لئے اسے کیا کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ بعض ہمارے دوست ہیں کوئی اپنی بیوی کے فیشن پرست ہونے کی شکایت کرتا ہے' کوئی تیز مزاجی کا رونا روتا ہے' کوئی تعلیم یافتہ ہونے کی دہائی دیتا ہے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میری بیوی ان ساری متذکرہ بالا خصوصیات کی حامل ہے لیکن کسی سے بھی پوچھ لیجئے جو کبھی حرفِ شکایت میری زبان پر آیا ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں ذرا روشن خیال واقع ہوا ہوں۔ عورت اور بالخصوص بیوی کو مساوی حقوق دینے کا زبردست حامی ہوں' اور یہی وجہ ہے کہ اپنی بیوی کے لئے فرشتہ سیرت قابلِ پرستش اور انتہائی خوبصورت شوہر ہوں وہ ہر ملنے جلنے والے کے آگے میری تعریف کے دفتر کھول دیتی ہیں۔ اور بڑی خوش الحانی سے سنانے لگتی ہیں اور جتنی بھی ان کی سہیلیاں ہیں ان سب کے لئے میری شوہریت قابلِ رشک بنی ہوئی ہے بنتا ہوں کہ وہ میری مثال دے دے کر اپنے خاوند کی اصلاحی کارروائی کو موثر بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن میں یہ دعائیں کرتا ہوں کہ میری بیوی کی سہیلیوں کے خاوند کبھی سدھرنے نہ پائیں نہ میری چھاؤں ان پر کبھی نہ پڑنے دے۔ وہ ویسے ہی سخت مزاج' جاہل اور اکھڑ قسم کے شوہر رہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی بیوی کو روز صبح' دوپہر شام پیٹا کرے' دیدہ زیب ساڑیاں نہ دلائے' عورتوں میں نہ جانے دے۔ آپ کہیں گے عورتوں کو مساوی حقوق دینے والا ان مظالم کو کیسے روا رکھ سکتا ہے۔ آپ ذرا سنئے تو میں عرض کرتا ہوں اس کے بھی وجوہ ہیں یہ جو سہیلیاں کہلاتی ہیں نا عورتوں کا ایک ایسا گروہ ہوتا ہے جو بلا کی طرح آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جب تک اپنی کسی سہیلی کے خاوند کی توبہ قبول نہیں ہوتی برابر اسے دق کرتا رہتا ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بیوی سے مجھے ذرہ برابر شکایت نہیں شکایت اگر ہے تو وہ ان کی سہیلیوں سے ہے۔ ایک دو دفعہ میں نے اپنی بیوی سے انہیں نیک بخت سہیلیوں کے سلسلے میں گفتگو چھیڑ دی تھی۔ لیکن وہ دن ان کی ماما کی گم شدگی کا دن تھا وہ اپنا سامان اور ان کی ایک انگوٹھی لے کر غائب ہو چکی تھی۔ میں بھول ہی گیا کہ انسان کے محسوسات کا اندازہ کر کے بات چیت کی جاتی ہے۔ اس ذکر پر انہوں نے بھویں سکیڑ لیں۔ "تو کیا مطلب ہے آپ کا" انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا' میں لہجے کی سختی اور نرمی سے بالکل غیر متاثر رہتا ہوں۔ کیونکہ بیوی ہمیشہ بیوی رہتی ہے البتہ اس کے مشتقات مثلاً نظریں خیالات' طرزِ عمل اور لہجہ ہمیشہ ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے پوری ملائمت اور سنجیدگی سے کہنا شروع کیا "یہ ہے کہ ...... کہ آپ نے آخر نہیں اتنا سر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ کچھ تو اپنے پٹھان خون کا جوش دکھاتے۔ بن بلائے مہمانوں کی طرح وہ ٹپکتی رہتی ہیں' اور آپ ہیں کہ"۔ "تو اس سے کیا ہوتا ہے' کیا بگڑتا ہے آپ کا؟" "میرا کیا بگڑتا ہے' میرا کچھ نہیں بگڑتا' میں تو آپ کے لئے کہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے زیادہ بات چیت سے مجھے تو منع نہیں کیا ہے۔ آپ ہی کے خیال سے میں نے بھی کہا"۔ میں اس کے سوا اور کیا کہتا۔ ان کی قطع کلامی نے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا ورنہ نہ جانے میں کیا کیا کہتا رہتا' اور وہ کیا کیا سنتی رہتیں۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے "سمجھتی ہوں کسی کا اپنے گھر آنا تمہیں بھاتا ہی نہیں۔ خود تو نہ جانے کن کن سے ملتے ملاتے رہتے ہیں ہم جو کسی سے دو چار باتیں کر لیتے ہیں تو کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے"۔ "سنا آپ نے گویا ہم چاہتے ہی نہیں کہ ہماری بیوی باتوں میں بھی اپنا دل بہلائے۔ شام کو تفریح کو ساتھ چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ سینما ساتھ دیکھتے ہیں' دعوتوں میں ساتھ لے چلتے ہیں۔ وہ تو سب گویا ان کو جلانے اور کڑھانے کے لئے کرتے ہیں' ان کا دل بہلانا ہمارا مقصد ہی نہیں"۔ "خیر جانے دیجئے یہی ہوگا" ہم نیچی گردن کئے آہستہ سے کہہ دیتے ہیں لیکن وہ تو شاید اس قضیہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتی تھیں۔ "دیکھئے میں آپ سے کہے دیتی ہوں میری سہیلیاں میری سہیلیاں ہیں جیسے آپ کے دوست آپ کو عزیز ویسے یہ سہیلیاں مجھے۔ وہ مجھ سے ملنے آتی ہیں میں انہیں بلاتی ہوں آپ کو بیچ میں اثر لینے اور کڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میری آنکھوں سے غصہ ابلنے لگتا ہے۔ وہ اگر میری طرف دیکھ لیتیں تو سمجھ جاتیں کہ میں اس فیصلہ سے ناخوش ہوں۔ میرے دوستوں کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ گن کر انہوں نے میرے جذبا

کو ٹھیس لگائی ہے۔ دل میرا آگ کی طرح جل رہا ہے۔ کاش مجھے شادی سے پہلے ہی معلوم ہوتا کہ میری بیوی کی سہیلیاں بھی ہیں جو رخصتی کے وقت اپنی سہیلی کو رو دھو کر دولھا کے گھر یعنی میرے گھر بھیج دیں گی اور پھر ہر ہفتہ کسی نہ کسی بہانے سے نازل ہوا کریں گی۔ میں سوچتا ہوں اُس وقت رونے دھونے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب کہ میری بیوی کا پیچھا نہ چھوڑنے کا تہیّہ ہو چکا تھا۔ بلکہ قسمیں کھائی ہوں گی انہوں نے۔ اور یہی نہیں کہ سہیلیاں بھی کوئی قرینے کی ہیں ایک سے بڑھ کر ایک قابلِ تعریف اور انہوں نے میرے دوستوں کے برابر انہیں کھڑا کر دیا۔ کہاں ان کی سہیلیاں اور کہاں میرے دوست۔ جو فرق میاں اور بیوی میں، وہی دوست اور سہیلی میں۔ خاوند اگر بیوی کو مساوی حقوق دے بھی تو وہ خاوند کی برابری نہیں کر سکتی۔ بیوی پورے حقوق اور مراعات کے ہوتے ہوئے بھی بیوی ہی رہتی ہے اور خاوند انتہائی روشن خیالی کے ساتھ خاوند کے اعزاز کو برقرار رکھتا ہے اور وہ کہتی ہیں کہ جیسے آپ کے دوست ویسی میری سہیلیاں، میرے دوستوں کی عظمت اور رتبے کو وہ کیا جانیں۔ ایک مشہور کھلاڑی ہے دوسرا مشہور گانے والا ہے۔ تیسرا شاعر ہے۔ اور لطف یہ کہ سب کے سب شادی شدہ۔ یہ لوگ آتے ہیں خوش گپیاں ہوتی ہیں، تاش کھیلنے لگے۔ اس سے جی بھر گیا تو تفریح کو نکل گئے۔ کوئی پکچر دیکھ آئے۔ انہیں کے دل میں میزبانی اور خاوند کے دوستوں کی خاطر مدارات کا جذبہ کروٹ لیتا ہے تو شام کی چائے کچھ بسکٹ کچھ پھل باہر آ جاتے ہیں اور ہزار اصرار پر یہ اُن دوستوں کے حلق سے چائے اور دوسری چیزیں رک رک کر نیچے اترتی ہیں اور انہوں نے ہمیشہ ہماری بیوی کی تعریف اور اس تواضع کی شکایت کی۔ اب اندازہ کیجئے یہ دوست ہیں یا فرشتے۔ سر آنکھوں پر بٹھائیے بھی تو ان کے خلوص کا بدلہ نہ ہو سکے۔

اور وہ سہیلیاں بھی ہیں۔ آپ کو فرصت تو ہے نا۔ ذرا تفصیل کے ساتھ سنیئے گا تو آپ میری شکایت کو حق بجانب بھی قرار دیں گے۔ ان کی ایک سہیلی ہیں۔ اُن کے چار نام ہیں، ایک اصلی نام دوسرا عرف تیسرا تخلص چوتھا قلمی۔ ادب کا انہیں بڑا ستھرا ذوق ہے۔ خطوط لکھنے کی کافی مشق کر چکی ہیں۔ جب کبھی وہ آتی ہیں عام طور پر شام کا وقت ان کی آمد کے لئے مخصوص ہے۔ آتے ہی اپنا ایک آدھ مضمون سنانے لگتی ہیں وہ ختم ہوتا نہیں تو کوئی تازہ غزل سنانے لگتی ہیں غزل کا اصلی مقطع سینما چلنے کی فرمائش ہوتا ہے۔ سینما ان کی محبوب ترین تفریح گاہ ہے۔ میری بیوی کوئی نہ کوئی بہانہ کرتی ہیں تو جس تیزی سے آئی تھیں اسی تیزی سے چلنے لگتی ہیں لیکن جاتے جاتے اپنی سہیلی کے منظورِ نظر خاوند پر تبرا کرتی جاتی ہیں "قید کر رکھا ہے ظالم نے۔ وہی روکتا ہوگا۔ مجھ سے سابقہ پڑتا تو دن کو تارے دکھاتی: وہ ہنس کر چپ ہو رہتی ہیں لیکن یہ سن سن کر سوچئے تو میرا کیا حال ہوتا ہوگا۔" سابقہ پڑ جائے تو ہاں دیکھ لینا۔ تم کہتی ہو دن کو تارے۔ اگر رات کو سورج نہ دکھاتا تو کچھ نہ کرتا۔" اتنا ہوتے ہوئے بھی وہ مجھ سے پوچھتی ہیں۔ "بڑی بھولی ہے کیوں؟"۔ جی بالکل بھولی۔ شاعری کرتی ہے قصے لکھتی ہے چار نام ہیں۔ بڑی بھولی ہے۔ جی ہاں!!

یہ لیجئے یہ دوسری بلا۔ نہیں بلا نہیں سہیلی۔ وہ موٹر سے اُتریں اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں کہ کہیں کوئی غیر محرم تو نہیں۔ میں اپنے کمرے کے دروازے میں جھانکتا رہتا ہوں۔ دور سے دیکھئے تو بالکل مڈل کلاس لیکن اپنی خوبصورتی پر بہت ناز کرتی ہیں ساڑیاں ایسی شوخ پہنتی ہیں مناسبت کا ایسا خیال رکھتی ہیں اور چہرہ پر نیٹ اور پوڈر کی ایسی لیپ لگائی جاتی ہے کہ مجھے اپنی بیوی کی سہیلی کہتے ہوئے لحاظ ہوتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ مسکرائے بغیر بات نہیں کرتیں۔ اور باتیں بھی ایسی سنبھل سنبھل کر جیسے سیتا پھل کے مغز کو گھول گھول کر بیج نکال رہی ہیں۔ آتے ہی پوچھتی ہیں "کہو خیریت سے ہو نا" میری بیوی مسکرا کر ان کی تشفی کر دیتی ہے تو میرے کمرے کی طرف اشارہ کرکے پوچھتی ہیں "ان سے کیسے بن رہی ہے" اس سوال کا جواب بھی تشفی بخش ملتا ہے تو پانی مانگا جاتا ہے پانی کے گھونٹ لیتی جاتی ہیں اور اپنے "شوہر محترم" کی کاگذاریوں کا بیان شروع ہوتا ہے اس وقت اگر میری بیوی کے جسم پر کوئی نئے ڈزائن کی ساڑھی ہو تو لہجہ اور ذکر دونوں ایک لخت بدل جاتے ہیں "تو کس "دوکان" سے خریدی تم نے یہ ساڑھی۔ تو رتو بڑی پیاری ہے اُن سے میں نے اسی رنگ کی قو لانے کو کہا تھا مگر ۔۔۔ کے بعد ہچکیاں اور وہی دکھڑا شروع ہو جاتا ہے۔ میری بیوی دم دلاسا دے کر کچھ لانے کو کہتی ہیں تو آج تک میں نے "نہیں" کا لفظ ان کی زبان سے نہیں سنا۔ کھا پی کر وہ پھر میرا ذکر چھیڑتی ہیں۔ "بی بی ذرا ان کی طرف سے ہشیار رہنا۔ مرد کی ذات۔ طوطے کی ذات ایک ہوتی ہے ان کی ڈوری ڈھیلی نہ چھوڑو" ان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے سے باہر نکل آتا ہوں۔ دیکھئے یہ کیا طریقہ ہے آخر۔ آپ کی سہیلیوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ جتائے دیتا ہوں آپ کو بھی اور اُن کو بھی۔ آئندہ سے میرا ذکر بیچ میں نہ آنے پائے۔ ہاں۔ "چلئے کمرہ کے اندر ہو جائیے کوئی زنانی سواری آئی ہے"۔ بدقسمتی سے میرا کمرہ دالان سے بالکل لگا ہوا ہے۔ دالان میں گفتگو ہوتی رہے تو ایسا سنائی دیتا ہے جیسے سرگوشی کے انداز میں میرے کان کے پاس باتیں ہو رہی ہیں۔ یہ نو وارد سہیلی کون ہے۔ اچھا آپ ہیں۔ آئیے آئیے تشریف لائیے۔ سب آ چکے تھے آپ کے آنے کی دیر تھی۔ ان کو آپ

سمجھئے خفیہ پولیس کی رپورٹ۔ شہر کی جھاڑو۔ یہ آتی ہیں تو دو تین گھنٹوں سے پہلے اٹھنے کا نام نہیں لیتیں، اور مصیبت یہ ہوتی ہے کہ میں اپنے کمرے کے باہر جا نہیں سکتا۔ پردہ کا معقول انتظام کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں انہیں اپنی سہیلیوں کی آمد اور نشست برخاست کا اطمینان ہوتا ہے۔ ان سہیلی صاحبہ کو مجھ سے خاص ہمدردی ہے، کہتی ہیں کہ "تجھے شوہر نہیں بکری کا بچہ ملا ہے۔ کتنا خاموش، کتنا شریف، اور انہیں میرے سامنے آنے کا بھی بڑا شوق ہے۔ "دولھا بھائی سے کیا پردہ" مگر میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا ہے کہ "دور کے ڈھول سہانے، بس جس حال میں ہوں اسی میں خوش ہوں" تو وہ آئیں بزرگانِ دین کے نام دُہرا دُہرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ یہ تصویر کس کی ہے وہ تصویر کس کی ہے۔ یہ کیلنڈر بہت اچھا ہے۔ میں اسے لے جاؤں گی اور اس کے بعد پاندان کھسکا کر "تو سنا تم نے اس بے چاری کے خاوند نے اسے چھوڑ دیا۔ فلاں جو ہیں نا، ان کے گھر بچہ ہوا ہے مگر گھر والے خوش نہیں اور اس سال استانی ماں کے ہاں نیاز نہیں ہوئی" پان پر چونا کتھا لگایا جاتا ہے۔ "وہ جو میرے گھر کے بازو رہتے ہیں ساس بہو میں بس ایسی رہتی ہے" وہ پان کو کشتی میں رکھ کر قینچی کی شکل بناتی ہیں اور دوبارہ پان ہاتھ میں آجاتا ہے۔ "کل بچے کی بسم اللہ ہے تم ضرور آنا میری چمپا کلی تو چوری گئی، تمہارے پازیب ہوں تو میں رات کی رات لے جاتی ہوں۔ اور ایک شادی کی تفصیل پان کے ختم ہونے تک جاری رہتی ہے" خدایا میری بیوی کو ان باتوں میں دلچسپی کیسے ہوتی ہوگی۔ جاتے جاتے وہ پازیب اور کیلنڈر لئے جاتی ہیں اور میرے لئے دعاؤں کا ایک طومار بخشتی ہیں۔ ان کا جانا ہی میرے لئے ایک برکت ہے۔ میں پودوں کی دیکھ بھال کے لئے صحن میں نکل آتا ہوں" ارے توبہ معاف کیجئے "میرے منہ سے نکلتا ہے یہ بھی ان کی ایک سہیلی ہیں۔ تیزی اور شوقِ ملاقات میں اندر گھس آئیں اور مجھ سے مڈبھیڑ ہوگئی، بوٹا سا قد، گورا رنگ، گداز جسم، آنکھوں پر چشمہ، کسی اسکول کی معلمہ ہیں۔ تقریر کا بڑا شوق ہے۔ میری بیوی کے سامنے تقریروں کی مشق کی جاتی ہے اور آپ اندازہ کیجئے کوئی تقریر کرنے پر اتر آئے تو کتنی خوش گوار اور پرسکون فضا مسلط ہو جاتی ہے۔ خدا بچائے میں اپنے کمرے میں جانے کے بجائے باہر چلا جاتا ہوں، ان کے دفعہ ہونے پر اندر بلایا جاتا ہوں۔ دیکھتا کیا ہوں بیوی کے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا ہے، "کیوں کیا بات ہے" میں مسکراتا ہوا پوچھتا ہوں۔ "آپ سے مجھے بڑی شکایت ہے۔ آپ نے میری سہیلی کا پردہ توڑ دیا، اس کو دیکھ کر آپ ہٹ کیوں نہیں گئے۔ وہ کہتی تھی آپ نے اس کا راستہ روک دیا، قصداً۔ آپ کے قریب چھوٹا یا بڑا پتھر ہو تو عنایت فرمائیے ذرا میں اپنا سر پھوڑ لینا چاہتا ہوں" سہیلی بیچاری آئی گھر کا سارا پروگرام ستیاناس کر دیا۔ وقت خراب کر دیا، اور جاتے جاتے یہ شگوفہ کھلا گئی بیچاری" اس پر بھی وہ کہتی ہیں کہ جیسے میرے دوست ویسی ان کی سہیلیاں ہیں۔ زمین آسمان کو ملانے پر کوئی تُل جائے تو سوائے خاموش رہنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ ارے ان کا ذکر تو میں بھول ہی گیا، جو اکثر اپنے خاوند سے لڑ کر آتی ہیں اور دو دو تین تین روز غریب خانہ پر قیام پذیر ہوتی ہیں اور میرا وہ حال ہوتا ہے جیسے کسی غیر کے گھر مہمان ہوں اور مالکِ مکان کسی اہم تقریب میں مصروف ہے، جھولے پڑ جاتے ہیں، تلن ہوتا ہے، قسم قسم کے کھانے پکتے ہیں، کیونکہ انہیں پکوان کا بڑا شوق ہے، گانا ہوتا ہے سننا اور دیکھنا شرط ہے۔ کیا نہیں ہوتا ان دنوں میں، ہم سے روٹھ روٹھ کر لڑ لڑ کر جو قیمتی ساڑھیاں منگوائی جاتی ہیں ان میں سے کوئی اس سہیلی کے پسند آجائے تو اس کے نذر ہوگئی سمجھئے۔ اب اسے اس ساڑھی میں بنا ٹھنا دیکھ کر ہمارے دل پر کیا گزرتی ہوگی، ایک شوہر کا دل اپنے سینے میں رکھ کر محسوس کیجئے، اور سہیلیوں کا یہ ٹپکا سال دو سال میں ایک آدھ دن کا نہیں مہینے میں چھ سات دن تو ضرور ایسے گزرتے ہیں جن میں "ان کے قدوم میمنت لزوم" کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اور ان کے خلاف میرے دوست بلانے بلانے پر گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے آتے ہیں اور ہنس بول کر چلے جاتے ہیں، دوست اور سہیلی کا فرق تو واضح ہو گیا ہوگا۔ اب مرحلہ یہ باقی رہ جاتا ہے کہ کس طرح ان سہیلیوں سے پیچھا چھوٹے، وہ اگر اس بات پر راضی ہوں کہ میں اپنے دوستوں سے قطع تعلق کروں تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں، بشرطیکہ وہ اس مصالحت پر آمادہ ہوں، ورنہ اگر یہ تصفیہ ہو کہ "آپ کے دوست بھی رہیں گے اور میری سہیلیاں بھی" تو مجبوری ہے اور مجبوری کا دوسرا نام صبر۔ اور تیسرا نام دیوان خانے میں بستر ڈلوا لینا۔ دوستوں کو دن رات روک کے رکھنا، ان کے کھانے پینے کا انتظام کرانا، تاش کھیلنا اور گپ اڑانا، یوں تو یوں ہی سہی وہ اپنی سہیلیوں میں خوش، ہم اپنے دوستوں میں خوش۔

(رشید۔ قریشی)

"سب رس"

مطبوعات

رنگ و بو۔ پروفیسر سید فیاض محمود صاحب کے پندرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام افسانے ہندوستانی بلکہ پنجابی سماج کے متوسط طبقے سے متعلق ہیں اور ان کی فضا بھی گھریلو ہے۔ ان افسانوں میں تصنع یا بناوٹ نام کو نہیں۔ بلکہ سادگی اور خلوص ان کی دو سب سے نمایاں خصوصیات ہیں۔ پروفیسر فیاض محمود کے سارے کردار سوسائٹی کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ عام طور پر اکثر افسانوں کا پلاٹ ایک ہی قسم کا ہے تاہم اندازِ بیان اس قدر شگفتہ ہے کہ کوئی افسانہ پھیکا معلوم نہیں ہوتا۔ پروفیسر صاحب کا محبوب موضوع ایک ہی کنبے کے مختلف افراد یا بالفاظِ صحیح تر دو رشتہ داروں کا باہمی عشق ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک سے زیادہ افسانوں میں ماموں زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد بھائی بہنوں میں عشق دکھایا گیا ہے۔ ان افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ عریانی کے عیب سے یکسر پاک ہیں۔ وہ ترقی پسند افسانہ نگار جو جنسی عشق ہی کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں اور جن کے نزدیک ترقی پسندی کا معیار اس عشق کی آڑ میں عریاں نگاری ہے اگر ان افسانوں کا مطالعہ کریں تو ان کے لئے مفید ہوگا اور انہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ تہذیب اور شائستگی کے دائرے کے اندر رہ کر بھی عشق اور جنسی کشش کے متعلق کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر صاحب کے بعض کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ واقعی مستحق داد ہے۔ عام رواج کے خلاف پروفیسر صاحب نے اس مجموعے کا دیباچہ بھی خود ہی لکھا ہے۔ اپنے دیباچہ میں "اچھے افسانہ" کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے "مگر افسانے میں خواہ شعری خوبی ہو خواہ کسی واقعے کا بیان ہو اور خواہ کردار نگاری پر زور دیا گیا ہو وہی افسانہ فنی لحاظ سے اچھا سمجھا جاتا ہے جس میں مصنف کے ملک اور قوم کے تمدن اور تہذیب کی عکاسی ہو۔ اگرچہ افسانے کا میدان محدود ہے تاہم اس میں بھی افسانہ نگار اپنے طرزِ بیان کی مدد سے (کنایۃً ہی سہی) اپنے ماحول کے ان اساسی حقایق کو واضح کر دیتا ہے جو کسی تمدن کی جان ہوتے ہیں۔ اسی لئے افسانے کی حقیقت محض ایک قصے اور کہانی کی نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں افسانہ بھی نظم ڈراما اور ناول کی طرح تمدن و معاشرت کی ترجمانی کا حق رکھتا ہے۔

ان تفصیلات کے بیان سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ میرے افسانے لفظاً و معناً اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تحریر میں میرا مطمحِ نظر یہ ضرور رہا ہے کہ اول ان کی افسانوی حیثیت برقرار رہے، دوم وہ کسی ایک طبقے یا جماعت کی ترجمانی میں محصور نہ ہو جائیں۔ بلکہ ہماری تہذیب اور عام مشرقی طرزِ زندگی کے نمائندہ ہوں۔ اور ان سے ہماری قدیم اور جدید مشرقی شان اور ہمارا مخصوص معاشرتی ماحول اور ہمارا طریقۂ زندگی آشکار ہو"

ان افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنے مطمحِ نظر کے حصول میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ کتاب کی قیمت ۱۲/ ملنے کا پتا۔ مکتبہ اردو لاہور

"نظامی"

حرفِ ناتمام منشی مہاراج بہادر برق دہلوی مرحوم کا مجموعۂ کلام ہے۔ برق کے کلام میں بقولِ علامہ کیفی ہر قسم کے موضوع ملتے ہیں۔ داخلی بھی اور خارجی بھی۔ وہ تخئیل پردازی اور منظر نگاری دونوں میں برق تھے۔ ان کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان تھی۔ ہندو تہذیب اور ہندو تاریخ سے متعلق برق نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ حرفِ ناتمام کے شروع میں علامہ کیفی، خواجہ حسن نظامی، مسٹر آصف علی۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اور خواجہ محمد شفیع دہلوی کے دیباچے بھی شامل ہیں۔ قیمت مجلد دو روپے غیر مجلد ۱۲/۔ پتا۔ طالب دہلوی چاوڑی بازار گلی تباشاں دہلی

"ن"

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ صرف سرورق، اف ٹون پریس رام نگر لاہور میں چھپا

حلوت

رنگ و بو ۔ پروفیسر سید محمد عقیل صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے ۔ بیہ تمام لفسانہ